آتشِ خاموش

الیاس سیتاپوری

25/=

کتاب والا ۲۷۹۴ پہاڑی بھوجلہ دہلی ۶

نام کتاب:۔۔۔۔۔۔۔۔ آتشِ خاموش

مصنف:۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الیاس سیتاپوری

مطبوعہ:۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جے، کے آفسیٹ پریس دہلی

قیمت:۔۔۔۔۔۔۔۔ /۲۵ روپیہ

ناشر: کتاب جا ۲۷۹۴ ۱۱ پہاڑی بھوجلہ دہلی ۶

ہلاکو خان مرگیا۔ اس کا بڑا بیٹا اباقہ خان مراغہ میں موجود تھا۔ باپ کی آخری رسوم سے فارغ ہونے کے بعد عزیزوں رشتے داروں اور منگول نوابوں نے اصرار کیا کہ وہ ہلاکو خان کے جانشین کی حیثیت سے تاج و تخت سنبھال لے۔ لیکن وہ خود اس وقت تک تاج و تخت سے دور رہنا چاہتا تھا۔ جب تک کہ چین کا قبلائی خان اُسے اس کی اجازت نہ دے دیتا۔ رشتہ داروں اور منگول سرداروں نے شہزادے اباقہ خان سے پوچھا: ”اگر قبلائی خان کا فرمان تخت نشینی دو سال تک نہ آئے تو کیا یہ تخت دو سال تک یوں ہی خالی پڑا رہے گا؟“

اباقہ خان نے جواب دیا: ”ہاں، ہونا تو یوں ہی چاہیے۔“

سونجاق نامی ایک نوجوان منگول سردار کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ اس نے خنجر کو ہوا میں لہرایا: ”اب ایل خان آپ ہیں اور قبلائی خان نے ہلاکو خان ہی کو نہیں، اس پورے خاندان کو ایل خان کا خطاب دیا ہے، اب آپ ایل خان ہیں۔“

ہر طرف سے سونجاق کی تائید ہونے لگی۔ اباقہ خان ذہنی طور پر بہت الجھا ہوا اور پریشان تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف غائرانہ نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ اسے صد فی صد افراد کی تائید حاصل ہے۔ اس نے پوچھا: ”کیا قوریلتائی میں منعقد ہوگی؟“

خاموش یلغار

جملہ سرداروں نے تائید میں اپنی تلواریں بلند کر دیں۔

اباقہ خان ہلاکو خان کا جانشین قرار پایا۔ وزیرِ اعظم کا منصب خواجہ شمس الدین جوینی کو دیا گیا۔ ہلاکو خان نے اپنی زندگی ہی میں جوینی کو اباقہ کا وزیر مقرر کر دیا تھا۔ اس خوشی میں شاندار ضیافتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہزاروں مویشی کٹ گئے اور میدانوں میں دور دور تک پتھروں کے چولھوں پر دیگیں چڑھا دی گئیں۔ ان دیگوں میں مسالے اور کٹے ہوئے مویشیوں کے بڑے بڑے ٹکڑے ایک ساتھ ڈال دیے گئے۔ اباقہ خان کا وسیع و عریض خیمہ اتنی گنجائش رکھتا تھا کہ اس میں پانچ ہزار جنگجو بیک وقت شکم سیر ہو سکتے تھے۔ اس خیمے میں کنارے کنارے ایک قطار میں بہت ساری میزیں لگی ہوئی تھیں اور ان میزوں پر شراب کے مٹکے اور گھوڑی کے دودھ کے گھڑے بڑے سلیقے سے سجا دیے گئے تھے۔

جب کھانے کی قابیں اور بڑے بڑے تسلے مویشیوں کے اُبلے ہوئے گوشت کے پارچوں سے بھر دیے گئے تو مہمانوں کو ایکدم خیمے میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ ہر طرف ہاہاکار سی مچ گئی۔ گوشت کے ادھ گلے ٹکڑے ہاتھوں اور دانتوں کی کش مکش سے گالوں پر طمانچے لگانے لگے۔ کھانے کی رفتار اتنی تیز تھی گویا وہ دنوں کے بھوکے تھے۔ کھانے کے بعد شراب اور گھوڑی کے دودھ کا دور چلا اور یہ دونوں چیزیں پی نہیں حلق میں انڈیلی گئیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نشہ میں اور اضافہ کرنے لگے۔ سب کے آخر میں رقص و موسیقی کا دور شروع ہوا۔ رقاصائیں اور مغنیائیں اپنے فن کمال کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ ان رقاصاؤں اور مغنیاؤں کا تعلق ایران، ماوراء النہر اور ایشیائے کوچک سے تھا۔

اباقہ خان کے سامنے جو حسین لڑکیاں رقص و سرود میں مشغول تھیں، وہ ایرانی بھی تھیں اور مصری بھی۔ اباقہ خان نے اس موقع پر اپنے وزیر شمس الدین جوینی کو حکم دیا تھا کہ وہ اس کے پاس موجود رہے۔ چنانچہ شمس الدین جوینی اباقہ خان کے داہنی طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اباقہ خان رقص و موسیقی میں بالکل کھو گیا تھا۔ ان میں ایک لڑکی کچھ زیادہ ہی شوخی اور فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس نے وحشی حسینہ کا رقص پیش کیا۔ کبھی وہ ناچتی ہوئی کسی ہرنی کی طرح اباقہ خان کے قریب چلی جاتی اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ بدک کر واپس آ جاتی اور اباقہ خان کا اس کی طرف بڑھا ہوا دستِ شوق ناکام و نامراد واپس آ جاتا۔

اس موقع پر شمس الدین جوینی نے اباقہ خان کو بہلانے کی کوشش کی۔ "محترم ایل خان! آپ کو کن فکروں نے پریشان کیا ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "جوینی! میرے محترم وزیر! میں اس حسین محفل میں اپنے آباؤ اجداد کو یاد کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی محفلوں میں بھی شرکت کی ہے مگر وہ محفلیں اس محفل کے مقابلے میں بے جان اور بے کیف ہوا کرتی تھیں۔" پھر ایکدم اچانک اس رقاصہ کو آواز دی جو وحشی ہرنی کا رقص پیش کر رہی تھی۔

اباقہ کی گھن گرج والی آواز نے اٹھتے ہوئے قدموں کو روک دیا، اور مطلوبہ رقاصہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اباقہ خان کے پاس چلی گئی۔

اباقہ خان اس کو حرص و ہوس کی نظروں سے دیکھتا رہا۔

رقاصہ نے اپنی گردن جھکا لی۔

اباقہ خان نے لڑکی سے پوچھا۔ "تیرا نام؟"

اس نے جواب دیا۔ "ترمہ شیریں۔"

اباقہ سوالیہ نظروں سے اپنے سرداروں کو دیکھنے لگا۔ وہ حیرت زدہ بھی تھا اور خوش بھی، ہونٹوں پر موجود خفیف سی مسکراہٹ ہر کوئی دیکھ اور محسوس کر سکتا تھا۔ آخر اس نے اپنے وزیر شمس الدین جوینی کو مخاطب کیا، پوچھا۔ "لڑکی نے اپنا نام کیا بتایا ہے؟"

جوینی نے جواب دیا۔ "ترمہ شیریں۔ حالانکہ یہ نام مردوں میں بھی پایا جاتا ہے مگر ہے بہت حسین اور دلکش نام۔"

اباقہ خان نے پوچھا۔ "تیرا وطن؟ تو کہاں کی رہنے والی ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "ہرات کی۔ جب میں چار پانچ سال کی تھی، تو بردہ فروش بدمعاشوں نے مجھے اغوا کر کے پالا پوسا اور رقص و موسیقی سکھا کے بیچ ڈالا۔"

اباقہ خان نے جوینی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور لڑکی کو جواب دیا۔ "اگر تو بردہ فروشوں سے بچ جاتی تو یہاں تک کس طرح پہنچتی؟"

اباقہ خان کو ترمہ شیریں کی ایک ایک ادا اچھی لگ رہی تھی۔ جو سردار ترمہ شیریں کے رقص سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اس کے اچانک رک جانے سے بے مزہ ہو رہے تھے۔

جوینی نے پوچھا۔ "کیا رقص و موسیقی کا سلسلہ ختم ہو گیا؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "نہیں تو۔" اور لڑکی کو حکم دیا۔ "رقص جاری رہے۔"

ترمہ شیریں دوبارہ ناچنے لگی۔ سرداروں کے چہرے کھل اٹھے۔ اس بار ترمہ شیریں کے رقص میں زیادہ جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح حرکت دے رہی تھی گویا وہ کوئی تتلی ہے اور پھولوں کے اوپر محو پرواز ہے۔ اس کے دونوں پاؤں فرش پر اس طرح حرکت میں تھے کہ نہ تو وہ پھسل رہے تھے اور نہ ہی فرش سے اٹھ رہے تھے۔ وہ فرش سے اٹھ کر دوبارہ فرش کو چھو لیتے تھے اور یہ عمل برق رفتاری سے جاری تھا۔ اس کے چہرے پر کیف و مستی چھائی ہوئی تھی، رقص کا نشہ۔ جذبات و احساسات سے عاری چہرے پر جو کچھ محسوس کیا جا سکتا تھا اس میں تھکان کے علاوہ ہنر کا جوش اور فن کی مستی ہو سکتی تھی۔ اس کی نظریں ناظرین پر پڑ رہی تھیں مگر وہ

دیکھ کسی کو بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی پتلی کمر بل پر بل کھاتے بجلی چلا رہی تھی۔ اور لہرا او قلت ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ناگن سطح زمین سے اونچی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی زلفیں کبھی چہرے پر بکھر جاتیں، کبھی دونوں شانوں پر پھیل جاتیں اور کسی لمحہ پشت کو اپنی آرام گاہ بنا لیتیں۔ اس کا لباس اتنا مختصر تھا کہ وہ ستر پوشی میں اپنی بے بسی، اور ناکامی کا بزبان حال اعلان کر رہا تھا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے سرداروں کے نشہ میں کچھ زیادہ ہی اضافہ کر دیا تھا اور وہ اونگھ رہے تھے لیکن ان میں جتنا کچھ بھی ہوش تھا وہ اسے ترمہ شیریں پر صرف کر رہے تھے، خود اباقہ خان پلکیں جھپکائے بغیر ترمہ شیریں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ ایک دو کے خیمے میں چلا گیا اور شمس الدین جوینی کو حکم دیا کہ ترمہ شیریں کو اس کے خیمے میں بھیج دیا جائے۔

اباقہ خان کے جاتے ہی ترمہ شیریں نے اپنا رقص بند کر دیا نشے میں اونگھتے اور جھومتے سرداروں نے حکم دیا۔ "رقص جاری رہے۔"

لیکن وزیر اعظم جوینی نے ترمہ شیریں کو مطلع کیا کہ اسے اباقہ خان نے تخلیہ میں طلب کیا ہے۔

ترمہ شیریں اسی وقت اباقہ خان کی طرف چل پڑی۔ سونجاق بھی اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا تھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ترمہ شیریں کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ترمہ شیریں نے کترا کے نکل جانا چاہا مگر سونجاق نے وہ راستہ بھی بند کر دیا۔

وزیر اعظم جوینی نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔ "یہ کیا غضب کر رہے ہو شہزادے سونجاق!"

سونجاق نے کوئی جواب نہیں دیا اور ترمہ شیریں سے پوچھا۔ "تو نے اپنا نام کیا بتلایا تھا؟ غالباً ترمہ شیریں؟ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

ترمہ شیریں نے پیشانی پر شکنیں ڈال کر پوچھا۔ "ہاں، مگر تم میرا راستہ کیوں روک رہے ہو؟"

سونجاق نے مسکرا کر کہا۔ "بلاشبہ تو اس عہد کی سب سے بڑی رقاصہ ہے، حاضرین کے ہوش و حواس لوٹ لیے تو نے۔"

ترمہ شیریں اپنی تعریف سن کر پھولی نہ سمائی، بولی۔ "مگر ان باتوں کا مقصد؟"

سونجاق نے اپنا تعارف کرایا۔ "ترمہ شیریں! میں چغتائی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اس لیے لوگ مجھے شہزادہ کہتے ہیں۔ میں تو تیرا رقص دیکھ کر دنگ رہ گیا۔"

اس کے بعد اس نے وزیر اعظم جوینی کی طرف دیکھا جو ان دونوں کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ اس نے شہزادے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "شہزادے! محترم ایل خان نے اس لڑکی کو تخلیہ میں طلب فرمایا ہے۔"

کئی سرداروں نے بھی اس گفتگو کو سن لیا تھا۔ انہوں نے بھی ترمہ شیریں کو مشورہ دیا۔ "لڑکی! تو باتوں میں وقت نہ ضائع کر۔"

شہزادہ سونجاق نے ترمہ شیریں کو راستہ دے دیا اور آہستہ سے کہا۔ "میں پھر کبھی تجھ سے تخلیہ میں ملوں گا۔"

ترمہ شیریں اباقہ خان کے خیمے میں چلی گئی اور شہزادہ سونجاق اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اسے نظر آتی رہی۔

کئی گھنٹے بعد شہزادہ سونجاق انگڑائی لیتا ہوا اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ کہیں کہیں آگ کے الاؤ روشن تھے اور ان کی روشنی میں آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ بدروح معلوم ہوتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چل کے ان کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "میرے دوستو! کیا تم بتا سکتے ہو کہ رقاصائیں اور مغنیائیں کہاں ٹھہری ہوتی ہیں؟"

وہ لوگ تو اپنے ذہنوں پر زور دینے لگے مگر ایک بوڑھے نے شمال کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر ذرا دور چلا جا اتنی دور کہ تو خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگے پس جہاں تو تکان محسوس کریگا وہیں رقاصائیں اور مغنیائیں رہ رہی ہوں گی۔"

شہزادہ سونجاق شمال کی طرف چل دیا۔ وہ چاہتا تو گھوڑا لے سکتا تھا مگر وہ پیدل ہی چلتا رہا یہاں تک کہ وہ رقاصاؤں اور مغنیاؤں کی بستی میں داخل ہو گیا۔ یہاں خیموں میں چراغ جل رہے تھے اور کہیں کہیں سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند عورتیں نشے میں دھت زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ سونجاق نے ان سے پوچھا "کیا تم بتا سکتی ہو یہاں ترمہ شیریں کا خیمہ کون سا ہے؟"

دولت اور فقیر

منقول ہے کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے خلیفہ حکیم صدر الدینؒ کو ایک شب پریاں اٹھا کر لے گئیں تاکہ ان سے ایک بیمار پری کا علاج کرائیں۔ خدا تعالیٰ نے دست شفا سے اس پری کو صحت اور شفا عطا فرمائی۔ آپ جب واپس ہونے لگے تو اس پری نے حکیم صدر الدینؒ کو لکھ دیا اور کہا کہ فلاں گلی میں جو ایک کتا بیٹھا رہتا ہے یہ خط اس کو دکھا دینا۔ چنانچہ حکیم صاحب اس پتے پر اس گلی میں پہنچے اور وہاں اس کتے کو وہ خط دکھایا تو وہ کتا آپ کے آگے آگے چلنے لگا۔ کچھ فاصلے کے بعد وہ کتا ٹھہر گیا اور زمین کریدنے لگا۔ حقیقتاً وہاں ایک بہت بڑا خزانہ اور دفینہ تھا جس کی وہ کتا نشاندہی کر رہا تھا مگر صدر الدینؒ نے مخصوص صوفیوں کی طرح بلندی کا ثبوت دیا اور اس دفینے کی طرف مطلقاً کوئی توجہ نہ دی۔ آپ کا مزار مبارک [illegible] پرانی دہلی میں [illegible] کے اندر ہے۔

ایک ادھیڑ عمر عورت نے اپنے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارا اور مسکرا کر بولا: "کیا میں ترمہ شیرین سے کم ہوں؟ ہرگز نہیں۔ آ میرے ساتھ چل۔"

سونجاق نے دوسری عورت سے پوچھا: "کیا تو ترمہ شیرین کا پتہ بتا سکتی ہے؟"

عورت نے جواب دیا: "آ میرے ساتھ چل۔ میں تجھے ترمہ شیرین کے پاس پہنچا دوں گی۔" اس کے بعد طنزیہ لہجے میں پوچھا: "مگر ترمہ شیرین کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ اس کا مطمح نظر یا تو اباقہ خان ہے یا کوئی شہزادہ وہ تجھ سے شاید ہی ملے۔"

سونجاق نے جواب دیا: "تو مجھے کتنا ہی ورغلا، لیکن میں آج ترمہ شیرین سے ملاقات کر کے رہوں گا اور چونکہ تجھے میرے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم، اس لیے جو جی میں آئے کہتی رہ۔"

وہ عورت سونجاق کو اپنے ساتھ لیے خیموں کی بستی میں داخل ہو گئی۔ وہ راستے بھر بڑبڑاتی رہی۔ ایک جگہ شمعوں کی روشنی ذرا تیز تھی اور اس میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ اس جگہ وہ اچانک رک گئی۔ سونجاق کو غور سے دیکھنے لگی۔

سونجاق نے پوچھا: "تو رک کیوں گئی؟"

عورت نے جواب دیا: "میں تیری شکل دیکھ رہی ہوں۔"

سونجاق نے ازراہِ شرارت پوچھا: "کیسی ہے میری شکل؟"

عورت نے جواب دیا: "اچھی ہے مگر ایک بات تو بتا، تو ہے کون؟"

سونجاق نے کہا: "میں اباقہ خان کی فوج کا ایک سپاہی ہوں۔"

عورت ہنسی: "بس سپاہی! اور کچھ نہیں؟"

سونجاق نے جواب دیا: "ہاں بس سپاہی۔ اور کچھ نہیں۔"

عورت نے کہا: "تب پھر ترمہ شیرین تجھے نگاہ بھر کر دیکھے گی بھی نہیں۔"

اچانک وہ ایک خیمے کے سامنے رک گئی: "یہ خیمہ ہے ترمہ شیرین کا۔"

سونجاق اس میں بے دھڑک داخل ہو گیا۔ عورت اس کی دلیری پر حیران رہ گئی۔

خیمے میں دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا پہلے ہی سے موجود تھے اور یہ تینوں ابھی تک جاگ رہے تھے۔ انہوں نے سونجاق کو اپنے خیمے میں دیکھا تو پریشان ہو گئے، پوچھا: "تو۔۔۔ تو کون ہے! یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

سونجاق نے پوچھا: "کیا ترمہ شیرین ابھی تک واپس نہیں آئی؟"

بوڑھے نے طنزاً پوچھا: "یہاں کہیں نظر آ رہی ہے ترمہ شیرین! مگر تو ہے کون اور اتنی رات گئے تو ہمارے پاس کیا لینے آیا ہے؟"

سونجاق نے اپنی راہنما عورت کا شکریہ ادا کیا، بولا: "خاتون! میں آپ کی رہنمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، آپ اپنا نام بتاتی جائیں ممکن ہے زندگی کے کسی موڑ پر آپ سے دوبارہ ملاقات ہو جائے۔ اس وقت میں آپ کو پہچان تو سکوں گا۔"

عورت نے جواب دیا: "ہم اوباشوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ لوگ اپنی مرضی اور پسند کے نام رکھ لیتے ہیں۔" پھر شوخی سے کہا: "اگر تو نے مجھے پسند کر لیا ہے تو، تو ہی کوئی پیارا سا، میٹھا سا نام بھی رکھ دے۔"

سونجاق نے کہا: "اچھا پھر، خدا کے لیے ہمارے پاس تم کسی دن آ جانا، وہیں سوچ کر کوئی اچھا سا نام بھی رکھ دیں گے۔"

بوڑھے نے نرمی سے پوچھا: "مگر میں پوچھ رہا ہوں کہ تو ہے کون اور اس وقت تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

عورت اس کو چھوڑ کر چلی گئی۔

سونجاق نے جواب دیا: "میں نے کہہ جو دیا کہ میں ترمہ شیرین سے ملنے آیا ہوں۔"

بڑے میاں نے کہا: "اور میں نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ترمہ شیرین نہیں ہے۔"

سونجاق نے نہایت اطمینان سے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر وہ نہیں ہے تو میں اس کا انتظار کروں گا، وہ آئے گی تو ضرور ہی۔"

بڑے میاں نے سونجاق کے خدوخال سے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ نوجوان بے منگول ہی۔ وہ خوفزدہ ہو گئے کہ اس سے الجھنا اچھی بات نہیں ہے۔ نرمی سے کہا: "نوجوان! معلوم نہیں وہ کب آئے۔ تو کل صبح آ سکتا ہے، ترمہ شیرین سے ملاقات ہو جائے گی۔"

سونجاق نے جواب دیا: "نہیں دادا میاں! میں اسی وقت ملوں گا ترمہ شیرین سے۔"

بڑے میاں نے کہا: "تیری مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

سونجاق کو بیٹھے بیٹھے نیند آنے لگی۔ وہ خیمے کی دیوار کا سہارا لے کر سو گیا مگر جلد ہی آنکھ کھل گئی۔

پھر مشرق سے صبح نمودار ہونے لگی، اس نے سنا بڑے میاں بڑبڑا رہے تھے: "بلاوجہ لوگ آ جاتے ہیں اور اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔ انہیں یہ تو سوچنا ہی چاہیے کہ ترمہ شیرین اباقہ خان کی محفل میں گئی ہوئی ہے وہاں سے وہ اپنی مرضی سے واپس نہیں آ سکتی۔"

سونجاق نے انگڑائی لی اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھور کر بڑے میاں کو دیکھا، پوچھا: "آپ کچھ مجھ سے فرما رہے ہیں؟"

بڑے میاں نے جل کر جواب دیا: "نہیں! خیمے کے پردوں اور دیواروں سے کہہ رہا ہوں۔ خدا اتنا کم عقل نہ بنائے کسی انسان کو۔ توبہ، توبہ! بات سمجھ کے ہی نہیں دیتا۔"

سونجاق نے ابھی کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ ایک خوبرو عورت خیمے میں داخل ہوئی اور بڑے میاں سے کہا۔ "باوا جی! ترمہ شیریں نے ایک پرچہ بھیجا ہے۔"

بڑے میاں نے بے چینی سے کہا۔ "کہاں ہے وہ پرچہ؟"

عورت نے پرچہ بڑے میاں کو دے دیا۔ اس میں لکھا تھا:

"باوا جان! آج میں نہیں آسکوں گی، کیونکہ اباقا خان مجھ سے خوش ہوگیا ہے۔ اس وقت میں اسی کے خیمے میں ہوں۔ میں خوش ہوں کہ میں نے خواب دیکھا تھا، وہ پورا ہوتا نظر آ رہا ہے۔"

بڑے میاں نے سونجاق سے کہا۔ "تو نے میری بات نہیں مانی اور اپنی پوری رات برباد کر ڈالی۔ ترمہ شیریں اس وقت نہیں آئے گی اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ کل، پرسوں یا اس کے بعد بھی واپس آئے گی یا نہیں۔ اب تو یہاں سے جا سکتا ہے۔"

سونجاق نے جواب دیا۔ "دادا میاں! خفا کیوں ہوتے ہو، میں پھر آجاؤں گا۔"

سونجاق کو ترمہ شیریں کے نہ آنے کا بڑا دکھ تھا۔ جب وہ باہر نکلا تو بڑے میاں نے اس پر الوداعی نظر ڈال کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "لوگ شراب کے نشے میں دھت آجاتے ہیں اور مجھے پریشانی میں ڈال کر خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں۔"

سونجاق نے گویا بڑے میاں کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ ایک کان سے سنا دوسرے سے نکال دیا۔

●

اباقا خان کے سامنے دو محاذ تھے۔ ایک شمال میں برقائی خان دوسرا جنوب میں رکن الدین بیبرس۔ لیکن وہ ان دونوں سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں کی طاقت اور سیاست نے اباقا خان کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد اقوام و ممالک کی تسخیر میں گھوڑوں کی پشت سے نیچے نہیں اترے تھے۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ ختا کے فلسفی لیو چیت سائی نے ایک بار خان اعظم چنگیز خان کو یہ مشورہ دیا تھا۔

"خان اعظم! تو نے جن ملکوں کو گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر فتح کیا ہے ان پر گھوڑے کی پشت سے حکومت نہیں کی جا سکتی۔"

اباقا خان کو حیرت تھی کہ چنگیز خان کی سمجھ میں ختائی فلسفی کی یہ سیدھی سی بات کیوں نہیں آئی تھی۔ اس کا وزیر اعظم شمس الدین جوینی بھی اباقا خان کو یہی سمجھاتا رہتا تھا کہ ملکوں کی تسخیر آسان ہے لیکن ان پر دانشمندی اور انصاف سے حکومت کرنا بہت مشکل ہے۔ جوینی نے اباقا خان کو یہ بھی سمجھایا کہ جن اقوام اور ممالک کو سفاکی اور بے رحمی سے فتح کیا گیا ہو ان سے دوستی اور بھائی چارگی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اباقا خان کو جوینی کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔

اباقا خان مصر کے مملوک حکمراں رکن الدین بیبرس سے اپنے مشہور جنرل قطلوبغا کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس کا باپ ہلاکو خان زندہ ہوتا تو وہ مصر کی تسخیر میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا اور مصر کو فتح کیے بغیر چین سے نہ بیٹھتا۔ اس نے سوچا ان حالات میں اسے خود کیا کرنا چاہیے؟ اس نے شمس الدین جوینی کو فی الفور طلب کر لیا۔ وزیر اعظم نے آتے ہی پوچھا۔ "نصیب دشمناں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اباقا خان نے کہا۔ "جوینی! کیا مصر پر ہمیں حملہ کرنا چاہیے؟"

جوینی نے جواب دیا۔ "آپ مصر پر کیوں حملہ کرنا چاہتے ہیں! آخر کیوں؟ مصر نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

اباقا خان نے کہا۔ "اس نے ہمارے مشہور جنگ جو قطلوبغا کو قتل کر کے منگول سپاہ کو مویشیوں کی طرح ادھر ادھر منتشر کر دیا۔ میرا باپ ہلاکو خان اگر اور زندہ رہتا تو وہ مصر کے مملوکوں اور شریروں کو سبق ضرور دیتا۔"

جوینی نے کہا۔ "محترم ایل خان! اعلیٰ ظرفی کا تقاضا یہی ہے کہ قطلوبغا والی شکست پر صبر کر لیں۔ آپ کے آباؤ اجداد نے کتنے ہی ملکوں اور قوموں کو خاک و خون میں ڈبو دیا تھا۔ کیا ان قوموں کو حملہ کر کے آپ کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے؟ جب انھوں نے صبر کر لیا ہے تو آپ کو بھی صبر کرنا چاہیے۔"

اباقا سوچ میں پڑ گیا۔ جوینی کی باتیں اس کے دل و دماغ کو مسخر کرتی جا رہی تھیں۔ اس کو کئی منگولوں اور سیاحوں نے قبلائی خان کی بابت یہ بتایا تھا کہ وہ بڑے امن و امان سے حکومت کر رہا تھا۔ بتانے والوں نے اسے یہ بھی بتلایا تھا کہ قبلائی خان نے اپنے آباد کردہ شہر شانگ تو میں شاندار قصر تعمیر کرایا تھا۔ اس قصر میں سب کچھ تھا۔ خواب گاہیں، ضیافت گاہیں، مشاورتی محل، تفریح گاہیں، سبزہ، مصنوعی پہاڑیاں اور بہت سارے ستون، جن پر بیلوں کی گھنی جھاڑیاں اس طرح مسلط تھیں کہ ستون ان میں غائب ہو گئے تھے۔ وہ سنگین اونچی اونچی دیواریں جن کے سامنے چھوٹے بڑے درختوں نے سبزہ سا تان رکھا تھا۔ اس نے بڑے وثوق سے یہ بھی سنا تھا کہ قبلائی ان مصنوعی مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ قبلائی خان کے حرم میں ہر سال حسین ترین نوجوان دوشیزائیں داخل کر دی جاتی تھیں۔ اور یہ بھی سنا تھا کہ قبلائی خان ان سے اچھی طرح متمتع ہوتا رہتا تھا۔

ان سوچوں نے اباقا خان کو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اسے حتی الامکان جنگ و جدل سے گریز اور عیش و عشرت میں مشغول ہو جانا چاہیے۔ اس نے مسلمان صوفیوں سے یہ بھی سنا تھا کہ دنیا فانی ہے اور

انسان بار بار نہیں آتا۔ اس نے خود کو عورتوں اور شراب کے حوالے کر دیا۔
اس نے اپنے آدمیوں کو حسین ترین لڑکیوں کی فراہمی پر متعین کر دیا۔
اس کے دربار میں عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی قدم جمانا چاہے مگر شمس الدین جوینی نہایت ہوشیاری اور دانائی سے انہیں دور کرتا جا رہا تھا۔ اور ان کی خالی جگہوں کو مسلمانوں سے پُر کرتا جا رہا تھا۔ وہ بالواسطہ اباقہ خان کو یہ باور کرا رہا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیا بغداد کی تباہی سے مسلمان نیست و نابود ہو گئے۔ ہرگز نہیں، مسلمان اس لیے باقی رہیں گے کہ خدا انہیں باقی رکھے گا۔ ہاں مسلمانوں کو مٹانے والے البتہ مٹ جائیں گے۔"

یہ ساری باتیں اتنے تواتر اور تسلسل سے بار بار کہی گئیں، کہ اباقہ خان کے تحت الشعور نے انھیں محفوظ کر لیا۔

اس کو مسلمان صوفیوں سے دل چسپی ہو گئی تھی۔ اس نے شیخ سعدی شیرازی اور مولانا جلال الدین رومی کا ذکر بہتوں سے سنا تھا۔ ان دونوں کی باتیں بھی اسے بہت اچھی لگی تھیں۔ وہ ان دونوں سے ملنا بھی چاہتا تھا مگر ملاقات کا وقت نہیں نکال پا رہا تھا۔

چونکہ چنگیزی خانوادے میں اختلافات روز بروز بڑھتے ہی جا رہے تھے اس لیے بعض مختلف افراد اس کوشش میں تھے کہ ان میں دوبارہ اتحاد اور اتفاق پیدا کیا جائے۔ چغتائی کی اولاد جوجی تولوئی اور اوغدائی کی اولاد سے حسد کر رہی تھی اور جوجی کی اولاد تولوئی کی اولاد سے برسرِ پیکار تھی۔ چغتائی خاندان کا سوبخاق اباقہ خان کے پاس اس لیے چلا آیا تھا کہ وہ دونوں خاندانوں کی نفرتیں کم کرے اور ان میں دوبارہ محبت اور یگانگت پیدا کر دے مگر اباقہ خان کو سوبخاق پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ سوبخاق کو اپنا دشمن ہی سمجھتا تھا۔ جو موقع کی تلاش اور فکر میں دوست بن گیا ہو اور موقع پاتے ہی ہلاک کر دینے کی نیت رکھتا ہو۔ اس نے سوبخاق پر اپنے آدمی متعین کر رکھے تھے جو اس کی حرکات و سکنات پر گہری نظریں رکھے ہوئے تھے۔ ان ہی مخبروں نے سوبخاق کو ترمہ شیریں کے خیمے میں جاتے دیکھ لیا تھا۔ انھیں اس گفتگو کا بھی علم تھا جو سوبخاق ترمہ کے بڑے میاں سے کر چکا تھا۔ ترمہ شیریں اباقہ کو پسند آ گئی تھی۔۔۔ خاص کر ترمہ شیریں کا رقص۔ اس کو سوبخاق کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ اباقہ خان نے ابھی کسی حرکت سے یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ وہ سوبخاق کی ایک ایک بات سے باخبر ہے۔

اباقہ خان کے محل میں حسین دوشیزائیں جمع ہوتی جا رہی تھیں۔ سوبخاق بھی اباقہ خان کے اس شوق کو بڑی دلچسپی سے دیکھ اور سن رہا تھا۔ مگر وہ ترمہ شیریں کو اباقہ خان کے محل میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ترمہ شیریں کے خیمے کے کئی چکر لگائے مگر ملاقات سے محروم رہا۔ ہر بار بڑے میاں نے یہی بتایا کہ ترمہ شیریں اباقہ خان کے پاس گئی ہوئی ہے۔"

پھر بڑے میاں کو ایک چھوٹا سا محل مل گیا۔ اباقہ خان ترمہ شیریں پر بہت زیادہ مہربان تھا۔

سوبخاق کے دل و دماغ پر ترمہ شیریں نے بری طرح قبضہ جما لیا تھا۔ سوبخاق ترمہ شیریں کی دید کے لیے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا مگر وہ تو ایسی غائب ہوئی تھی کہ اس کی جھلک تک کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ سوبخاق کا خیال تھا کہ اباقہ خان ترمہ شیریں سے محبت نہیں کرتا جس دن کوئی زیادہ حسین اور پسندیدہ لڑکی آ گئی ترمہ شیریں کو اس کے لیے جگہ خالی کر دینا ہو گی۔

اور اباقہ خان کو سوبخاق کی بے چینی اور بے قراری میں مزہ آ رہا تھا۔ جب اباقہ خان کے آدمی سوبخاق کے بارے میں یہ بتاتے کہ وہ ترمہ شیریں کے محل کے بار بار چکر لگا رہے ہیں تو اباقہ خان بہت خوش ہوتا۔

سوبخاق ترمہ شیریں کے محل میں بڑے میاں سے مل کر باہر نکلا تو دل کے ہیجان نے اس کو ایک باغ میں پہنچا دیا۔ یہاں انار کے درختوں کی بہتات تھی۔ انار کی سرخ کلیاں اور اس کے چھوٹے چھوٹے پھل بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ یہاں کچھ اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں دور تک پہنچ رہی تھیں۔ لڑکیوں اور عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں اس کے دل و دماغ پر آرا سا چلا رہی تھیں۔ اس کے اداس دل و دماغ مشتعل کر رہے تھے۔ اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان لڑکیوں کے منہ نوچ لے اور گانے سے منع کر دے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکیوں کی آواز کی طرف چل دیا۔

اس نے انار کے درختوں کے جھنڈ میں رنگین کپڑوں میں ملبوس لڑکیوں کو تتلی کی طرح حرکت کرتے دیکھا۔ وہ ان لڑکیوں میں داخل ہو کر ایک ایک لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے لڑکیوں سے درخواست کی: "پھولوں جیسی نازک اور تتلیوں جیسی دلکش اور پیاری لڑکیو! اس وقت میں یہاں بہت اداس آیا ہوں۔ کیا آپ لوگ زور زور سے ہنس کر میرے زخمی دل و دماغ پر نمک پاشی سے اجتناب برتیں گے؟"

کئی لڑکیاں بے اختیار ہنسنے لگیں۔ ان میں کی ایک لڑکی دونوں ہاتھوں سے کشتیاں کھینے کے انداز میں درختوں کی درمیان حائل شاخوں کو ادھر ادھر ہٹاتی ہوئی سوبخاق کے قریب پہنچ گئی۔

دونوں کی ایک دوسرے سے نظریں ملیں اور سوبخاق اور زیادہ تڑپ اٹھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "ترمہ شیریں تم! میں نے تمہیں معلوم نہیں کہاں کہاں تلاش کیا۔"

ترمہ شیریں اپنے حافظے پر زور دے رہی تھی۔ آخر کار بولی۔ "میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ بتاؤ کہاں؟"

سونجاق کے دل پر گھونسا سا لگا، مایوسی سے پوچھا۔
"تو تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "میں تو تمھیں بتا رہی ہوں کہ میں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے۔"

سونجاق نے کہا۔ "جب تم نے مجھے کہیں دیکھا ہے تو اپنے حافظے اور ذہن پر زور دے کر یہ بھی معلوم کرلو کہ کب اور کہاں دیکھا ہے۔"

ترمہ شیریں نے بڑی بے مروتی سے جواب دیا۔ "لیکن میں اپنے حافظہ اور ذہن پر کیوں زور دوں؟"

سونجاق کو بڑی مایوسی ہو رہی تھی۔ اُس نے گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھا اور عاجزی سے درخواست کی۔ "ترمہ شیریں! دیکھو میں تمھارے نام تک سے واقف ہوں۔ ہم دونوں اباقہ خان کے دربار میں بیٹھے تھے اور میں اباقہ خان کا چچیرا بھائی ہوں۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "تم کوئی بھی ہو، مجھے کیا؟"

سونجاق کو بڑا دکھ تھا، وہ خوب جانتا تھا کہ ترمہ شیریں تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہی ہے، بولا۔ "ترمہ شیریں! خدا کے لیے تم یہ نہ کہو کہ تم مجھے نہیں جانتیں۔ تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔"

ترمہ شیریں طنزاً مسکرائی۔ "یہ خوب رہی کہ جسے میں نہیں جانتی وہ اس پر بضد ہے کہ میں اُس سے واقف ہوں۔"

اتنے میں دُوسری لڑکیاں دوبارہ سونجاق کی طرف آگئیں اُن میں کی ایک لڑکی نے ترمہ شیریں کو آواز دی۔ "ترمہ شیریں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "یہ نوجوان بضد ہے کہ میں اس سے واقف ہوں حالانکہ میں اسے بالکل نہیں جانتی۔"

ایک لڑکی نے ہنس کر کہا۔ "اگر اس سے تم واقف نہیں ہو تو اب واقف ہو جاؤ۔ اُس سے پوچھو کہ یہ کون ہے؟"

سونجاق نے بڑے کرب سے کہا۔ "میں تمھارے حکمراں اباقہ خان کا رشتے میں بھائی لگتا ہوں اور اس کا مہمان بھی ہوں۔"

ایک شرمیلی سی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ "تو تم سونجاق؟ شہزادہ سونجاق ہو؟"

سونجاق نے جلدی جلدی کہا۔ "ہاں! میں سونجاق ہوں شہزادہ سونجاق۔ لڑکی! تو نے مجھے واقعی پہچان لیا ہے۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں نے محل میں تمھارا ذکر سنا ہے۔"

ترمہ شیریں نے اس لڑکی کو آنکھ دکھائی۔ "میں بھی تو اسی محل میں رہتی ہوں۔ میں نے تو یہ نام کبھی سنا نہیں کسی سے۔"

اس کے بعد ترمہ شیریں نے سونجاق سے پوچھا۔ "اچھا چلو اگر میں یہ مان لوں کہ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے تو تم اس کا کیا صلہ دو گے یا اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں نے تمہیں نہیں پہچانا تو تم کیا کرو گے؟"

بھکاری: جناب! میں کل سے بھوکا ہوں۔ ہو سکے تو میری کچھ مدد کیجیے۔
راہگیر: تم صورت شکل سے بھکاری نہیں معلوم ہوتے، اچھے بھلے شریف آدمی لگتے ہو۔ بہرحال یہ لو روپیہ اور یہ بتاؤ تم بھکاری کیسے بنے؟
بھکاری: مجھ میں وہی کمزوری تھی جو آپ میں پائی جاتی ہے۔ میں آپ ہی کی طرح رحم دل اور سخی ہوا کرتا تھا۔

سونجاق نے جواب دیا۔ "میں دونوں ہی صورتوں میں کچھ بھی نہیں کروں گا۔"

لڑکیوں نے ترمہ شیریں کو اپنے نرغے میں لے لیا اور اس کو لے کر کہیں لو چلی گئیں۔ سونجاق پھر تنہا رہ گیا تھا۔

کئی دن بعد جب وہ ایک پہاڑی کے دامن میں ایک چٹان پر بیٹھا اپنے اور اپنی کوششوں کے مستقبل اور حشر پر غور کر رہا تھا۔ ترمہ شیریں اچانک اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس نے سونجاق سے درخواست کی کہ وہ عام معروف جگہ سے ہٹ کر کسی گوشے میں چلے تاکہ وہ چند ضروری باتیں کر سکے۔

سونجاق کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا، وہ چپ چاپ اٹھا اور ایک چٹان کے نیچے چلا گیا۔ یہ چٹان چند بڑے بڑے پتھروں پر جھکی ہوئی تھی۔

ترمہ شیریں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، پوچھا۔ "اُس دن تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے؟"

سونجاق نے جواب دیا۔ "جب تم نے مجھے پہچانا ہی نہیں تو میں کیا بتاؤں کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "وہ ایک مجبوری تھی جو میں نے تمھیں نہیں پہچانا تھا۔"

سونجاق نے پوچھا۔ "وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "میں یہاں تک بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ ہفتہ میں ایک دن اپنی سہیلیوں اور ساتھی لڑکیوں کے ساتھ چند گھنٹے گھوم پھر سکتی ہوں آج میں بڑی مشکل سے یہاں تک آئی ہوں۔" پھر پوچھا۔ "ہاں تو تم نے بتایا نہیں کہ تم مجھ سے کون سی باتیں کرنا چاہتے تھے؟"

سونجاق خاموش رہا۔ ترمہ شیریں نے کہا۔ "سونجاق! میں نے تمہیں پہچان لیا تھا، خوب اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ اباقہ نے تمھارے چاروں طرف مخبر بٹھا رکھے ہیں۔ اباقہ خان تم پر شک کرتا ہے۔"

سونجاق نے کہا۔ "اباقہ خان میرے گرد مخبر بٹھا کر کیا پا جائے گا؟"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "دیکھو سونجاق! میں تمھارے پاس بطور

خالی محل کر آئی ہوں اب وقت نہ ضائع کرو، جو بات کرنی ہے کر گزرو۔"

سونجاق نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ "میں نے تمہیں رقص کرتے دیکھا اور اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا۔ میں نے تمہارے گھر کے چکر لگائے۔ جب سے تمہیں اباقہ خان کے محل میں تلاش کیا مگر نہیں پا سکا۔"

ترمہ شیریں نے وحشت سے کہا۔ "کام کی بات کرو سونجاق! میں اسی وقت واپس چلی جاؤں گی۔"

سونجاق نے پوچھا۔ "تم اباقہ خان کے پاس کیوں رہتی ہو؟ اسکو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

ترمہ شیریں کہنے لگی۔ "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کیا اباقہ خان کوئی معمولی آدمی ہے کہ میں اس کو چھوڑ دوں؟"

سونجاق نے کہا۔ "بیشک وہ معمولی آدمی نہیں ہے لیکن کچھ جانتی ہو کہ تمہارا عنقریب کیا حشر ہوگا؟ محل میں نئی دوشیزائیں آتی رہیں گی اور پرانی کی جگہ لیتی رہیں گی۔ کیا یہی وقت تم پر نہیں آ جائے گا؟"

ترمہ شیریں نے مایوسی سے جواب دیا۔ "ہماری قسمتوں میں یہی لکھ دیا گیا ہے، اسے بدلا نہیں جا سکتا۔"

سونجاق نے کہا۔ "اس کو میں بدل سکتا ہوں۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "تب پھر بدل دو۔ خالی وقت کو میری حمایت میں کر دو۔"

سونجاق نے بھرائی آواز میں کہا۔ "ترمہ شیریں! میں یہاں کسی اور ہی مقصد سے آیا تھا، مگر اب، تم میرا مقصد بن چکی ہو۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "تم بھی تو چغتائی شہزادے ہو، کیا تم اباقہ خان کی طرح عورتوں اور لڑکیوں کی فوج نہیں رکھو گے؟"

سونجاق نے کہا۔ "شاید نہیں۔"

ترمہ شیریں نے پوچھا۔ "شاید نہیں کا مطلب؟"

سونجاق نے جواب دیا۔ "ترمہ شیریں! شاید تم یقین نہ کرو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے تمہیں پہلی ہی نظر میں اپنا سب کچھ دے دیا ہے میرے دل میں تمہارے نام سے ٹیسیں اٹھتی ہیں اور میں اکثر و بیشتر تمہارے تصور سے دل میں میٹھا میٹھا درد محسوس کرتا ہوں۔"

ترمہ شیریں کو ہنسی آ گئی، شوخی سے پوچھا۔ "شہزادے سونجاق تم منگول تلواروں اور تیروں کے انسان ہو۔ میں حیران ہوں کہ تم نے اپنے اسلحہ اتار پھینکے اور شاعری شروع کر دی۔ خوب!"

سونجاق خلاؤں میں گھورنے لگا۔ "تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "میں یقین کس طرح کروں؟ پہلے اباقہ خان نے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔ مگر اب وہ اپنے محل کو نئی نئی دوشیزاؤں سے آباد کر رہا ہے۔"

سونجاق نے کہا۔ "لیکن میں اس سے مختلف ہوں، بہت مختلف۔"

ترمہ شیریں نے پوچھا۔ "تمہیں جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے یا ابھی کچھ باقی ہے؟"

سونجاق نے کہا۔ "مجھے جو کچھ کہنا ہے ایک مرتبہ میں کس طرح کہوں گا۔"

ترمہ شیریں نے شوخی سے کہا۔ "بہر حال میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا تم پر رحم کرے اور صبر عطا فرمائے۔"

سونجاق نے ترمہ شیریں کو پکڑ لیا، بولا۔ "مجھ سے مذاق نہ کرو۔ ترمہ شیریں۔ میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ میں نے تمہیں پسند کیا ہے، تم سے محبت کی ہے۔ اب اگر تمہارا دل مجھ پر مائل نہیں ہے تو میں مسلمانوں کی طرح اس کو اپنی قسمت سمجھ کر صبر کروں گا مگر تم سے رحم اور ہمدردی کی درخواست نہیں کروں گا۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "میں تو یہی سمجھی تھی کہ تم مجھ سے کوئی اہم بات کرو گے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ تم مجھ سے اظہار عشق کرو گے تو میں یہاں کبھی بھی نہ آتی۔"

سونجاق ناکامی اور غصے کی آگ میں جل رہا تھا اور ترمہ شیریں مسکرا مسکرا کر اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "شہزادے اباقہ خان کے مخبر ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ اباقہ خان مجھ سے اس کا جواب طلب کرے گا۔ اگر وہ تم سے پوچھے کہ تم مجھ سے پہاڑی چٹان کے سائے میں کیوں ملے تھے تو یہی کہہ دینا کہ ہم دونوں کی ملاقات محض اتفاق تھی اور کچھ نہیں۔ بقیہ باتیں میں خود کر لوں گی۔"

سونجاق اس کو دیکھتا رہ گیا اور ترمہ شیریں چلی گئی۔

اباقہ خان اپنے عظیم الشان عساکر کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ عساکر کئی پشتوں سے دنیا کے امن و سکون کو تہہ و بالا کرتے رہے تھے۔ ان کے ہتھیار انسانی جانوں کا شکار کرتے رہے تھے۔ یہی عساکر آبادیوں کو ویرانوں میں بدل چکے تھے۔ جدھر سے بھی گزرے شہروں اور آبادیوں کو کھنڈرات اور قبرستان میں تبدیل کرتے چلے گئے۔

ایک ترچھی گردن والے منگول سردار نے اباقہ خان کو روک لیا اور پوچھا۔ "ہم جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے اور سوچتے سوچتے ہمارے اعصاب بیکار ہوتے جا رہے ہیں اور میں خود کو کاہل اور تھکا سا محسوس کرنے لگا ہوں۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "اگر ہم دنیا کے کچھ اور علاقے فتح بھی کر لیں، تو اس سے ہمیں حاصل کیا ہوگا؟"

سردار نے جواب دیا۔ "ہماری سلطنت کی حدود میں اضافہ ہو جائے گا۔ ہم ایک بڑی مملکت کے حکمراں کہلائیں گے۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "پھر پھر کیا ہوگا؟ اس بڑی مملکت سے ہمیں

کیا حاصل ہوگا؟ ہماری بڑی سلطنت ہمیں کیا فائدہ پہنچائے گی؟"

سردار لاجواب ہو گیا، اس نے جواب دیا: "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا آپ نے اپنے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کو بھلا دیا۔ اگر انہوں نے دنیا کو فتح نہ کیا ہوتا تو آپ اتنی بڑی سلطنت کے مالک و مختار نہ بنتے۔"

اباقہ خان نے [illegible] "تیرے جدِ اعلیٰ معلوم دنیا کا بہت زیادہ حصہ فتح کر کے اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کے مفتوحہ اور مقبوضہ علاقے اب بھی موجود ہیں لیکن فاتح اس دنیا سے خالی ہاتھ چلا گیا۔ اس سے فاتح کو کیا فائدہ پہنچا؟"

سردار بالکل لاجواب ہو چکا تھا۔ اباقہ خان نے سردار کی ترچھی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "تیری یہ گردن ترچھی کیوں ہو رہی ہے؟"

سردار نے جواب دیا: "میرے بلند حوصلے اور عزائم میرے سر اور گردن میں قید سر اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن میں انہیں مجبور اور بے بس کر دیتا ہوں۔"

اباقہ خان آگے بڑھ گیا۔ ایک دوسرا سردار اپنے چہرے کو چھپائے کھڑا تھا۔ اباقہ خان نے اس کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا، پوچھا۔ "تیرے چہرے کو کیا ہو گیا؟ اس کو چھپانے کا کیا مقصد؟"

سردار نے جواب دیا: "محترم ایل خان! اچھوتے خان، اب میں اپنے چہرے کو ہمیشہ چھپائے رہوں گا۔ کیونکہ چہروں کی آبرو اور شان ان کے کارنامے اور ان کی اولوالعزم ذاتی روایات ہوا کرتی ہیں۔ لیکن میرا جیسا شخص — میں تو ان سے محروم ہوں پھر کس طرح اور کیوں اپنا چہرہ دوسروں کو دکھاؤں۔"

اباقہ خان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا: "تم سب لڑنے مرنے کے خواہش مند ہو۔ حالانکہ میں اس نتیجے پر پہنچتا جا رہا ہوں کہ جنگ و جدل انسانی حیوانیت کے اظہار کا نام ہے۔ دنیا کا ارتقا، دنیا کی بقا، حیوانیت میں نہیں، انسانیت میں ہے۔ میرے آبا و اجداد انسان کم، حیوان زیادہ تھے۔ وہ جہاں پیدا ہوئے تھے، وہاں انسانی ضروریات اور احتیاجات کی چیزیں کمیاب یا عنقا تھیں۔ انھوں نے انسانی اور حیوانی شکار پر اپنی زندگی کو منحصر کر رکھا تھا۔ وہ صحرائے گوبی کے بے آب و گیاہ ریگزاروں میں اپنی زندگیوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے تھے۔ انھیں دنیا کے تمدن اور ارتقا کا کوئی علم نہ تھا۔ ہمارے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کو چند کام کی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ جھیل بیکال کے چاروں طرف آباد قبائل جو آپس میں خون خرابہ کرتے رہتے تھے، چنگیز خان کی کوششوں سے متحد ہو گئے اور پھر چنگیز خان نے ان کی مدد سے بڑی بڑی حکومتوں اور ملکوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ چنگیز خان کو خونخوار قبائل کے اتحاد اور ان کی طاقت کا علم ہو گیا تھا۔ اسے یہ راز کی بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ رحم اور مروت کتنے خطرناک اور نقصان دہ جذبے ہوتے ہیں۔ اس نے سفاکی اور حیوانی جذبوں سے دنیا کو لرزہ براندام کر دیا۔ اور اس نے بہت سی جنگیں جنگ کیے بغیر ہی جیت لیں اور اس کی ہیبت اور دبدبے نے وہ کام کر دکھایا جو انسانی تدبیر اور عقل کے لیے مشکل تھا۔ یہ چنگیز خان کی خوش قسمتی تھی کہ اسے لیو چت سائی جیسے عقلمند لوگ مل گئے اور انھوں نے نہایت جرأت و بے باکی سے چنگیز خان کو باور کرایا کہ وہ جس دنیا کو گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر فتح کر رہا ہے اس پر گھوڑے کی پشت سے حکومت نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کرنے کے لیے گھوڑے کی پشت سے اترنا پڑے گا۔ چنگیز خان نے ختائی فلسفی کی یہ بات نہیں مانی لیکن اس کی اولاد کو اس پر عمل کرنا پڑا۔ کوئی چین میں گھوڑے کی پشت سے اتر کر حکومت کرنے لگا۔ کسی نے روس میں والگا کے کنارے سرائے باتو خان اور سرائے برکائی خان کو آباد کر کے گھوڑوں کی پشت چھوڑ دی اور نیچے اتر کر حکومت کرنے لگے۔ میرا باپ ہلاکو خان شہر مراغہ میں گھوڑے کی پشت چھوڑ کر نیچے آ گیا۔ ہمارے آبا و اجداد کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ زندگی کا پہیہ بقا کے تنازع سے چل رہا ہے لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ توافق کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں۔"

اباقہ خان نے اپنی فلسفیانہ باتوں سے اپنے سپاہیوں کو خوش نہیں کیا۔ ان سب کی اباقہ خان کی بابت ایک ہی رائے تھی۔ "اباقہ خان شاید عالم ہو گیا ہے جو اپنی باتیں کم اور کتابوں کی باتیں زیادہ کرتا ہے۔"

اباقہ خان اور آگے بڑھا تو ایک تیسرے سردار نے اس سے درخواست کی: "خانِ محترم! ہم جس زندگی کے عادی ہیں، اس سے محروم کر دیے گئے ہیں اس لیے اب ہمیں کہیں اور چلے جانے کی اجازت دی جائے۔"

اباقہ خان نے جواب دیا: "میں تم سب کا کفیل ہوں اگر مال و زر کی ضرورت ہو تو میں تمھاری اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہوں۔ میں نے عسکری زندگی سے توبہ نہیں کی ہے لیکن اس قوت کو جا بے جا نہیں استعمال کروں گا۔ کہیں اور جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اباقہ خان ادھر سے فارغ ہو کر محل پہنچا تو اس کے بڑے بیٹے نکودار اغلن نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی افسردگی اور پریشانی کو محسوس کر لیا اور پریشانی کا سبب معلوم کرنے لگا۔ اس نے باپ سے کہا۔ "بابا جان! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟ کیا آپ اس سلسلے میں مجھ کو اپنے اعتماد میں لینا گوارا فرمائیں گے؟"

اباقہ خان نے شہزادہ نکودار سے جو باتیں کیں اس سے شہزادے نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ آج کل اس کا باپ عالم بنا ہوا ہے۔ اس خیال اور اس انکشاف سے وہ بہت خوش ہو گیا، بولا: "بابا جان! آپ نے اپنے لیے جو زندگی پسند کی ہے وہ موجودہ دور آبائی زندگی سے

کہیں بہتر ہے۔"

اباقہ خان نے شہزادہ نکودار کو حکم دیا: "میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو شیراز کے مشہور شاعر شیخ سعدی اور قونیہ کے جلال الدین رومی سے ضرور ملاقات کرنا۔ یہ دونوں تمہیں صبر و تحمل سے زندگی گزارنے کا درس دیتے ہیں۔"

اباقہ خان نے اپنی تھکن دور کرنے کے لیے رقص و سرود کا حکم دیا۔ محل کے ایک گوشے میں یہ محفل جم گئی اور ترمہ شیریں اور دوسری رقاصاؤں کا رقص پیش کیا جانے لگا۔ اباقہ خان اس میں ڈوب گیا۔ وہ ترمہ شیریں کا عاشق تھا کیونکہ خدا نے ترمہ شیریں کو جہاں حسن اور سلیقہ دیا تھا وہیں رقص کا فن بھی عطا فرمایا تھا۔ جب ترمہ شیریں نے اپنا رقص ختم کیا تو اسے اباقہ خان نے حکم دیا کہ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد وہ اباقہ خان سے ضرور ملے۔

وہ خود اباقہ خان کے پاس پہنچ گئی۔ اباقہ خان نے اس سے یہ بھی نہیں کہا کہ ترمہ شیریں بیٹھ جا۔ وہ نظریں جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا: "ترمہ شیریں کیا تو آ گئی؟"

اس نے جواب دیا: "ہاں میں آ گئی۔ آپ نے مجھے بلوایا جو تھا۔"

اباقہ خان نے کہا: "ترمہ شیریں! کئی دن سے ایک سوال مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔ مجھے اس سوال کا جواب درکار ہے، اور میرے پاس ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو میرے اس سوال کا جواب دے سکے۔"

ترمہ شیریں نے عرض کیا: "آپ سوال بتائیں میں کوشش کروں گی کہ اس شخص کو ڈھونڈ نکالوں جو آپ کے اس سوال کا جواب دے سکتا ہو۔"

اباقہ خان نے حیرت سے پوچھا: "کیا واقعی؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "میں کوشش ضرور کروں گی۔"

اباقہ خان نے کہا: "تو سن میرا سوال۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس وقت روئے زمین وہ کون شخص ہے جس کے حکم کی تعمیل لوگ ہر بات سے مقدم اور فرض سمجھتے ہوں؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "اس سوال کا جواب تو میں خود بھی دے سکتی ہوں۔"

اباقہ خان کے چہرے پر کرختگی پیدا ہونے لگی، بولا: "تو دے سکتی ہے میرے اس سوال کا جواب! مجھے حیرت ہے۔"

ترمہ شیریں نے کہا: "اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، میرے آقا! یہ تو انتہائی آسان اور معمولی سوال ہے۔"

اباقہ خان نے کہا: "کیا ہے اس سوال کا جواب؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "میرے آقا! اس وقت اور اس زمانے میں آپ ہی کی وہ ذات ہے جس کا حکم ہر شے سے مقدم ہے۔"

اباقہ خان بگڑ کر کھڑا ہو گیا: "جب تجھے یہ بات معلوم تھی، تو تو نے ہی اس کا مذاق کیوں اڑایا۔ میری بے عزتی کیوں کی؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "میرے آقا! خان محترم! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

اباقہ خان نے کہا: "میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جب میرا یہ حکم ہے کہ میری پسندیدہ چیز کو کسی اور کے پاس نہیں ہونا چاہیے۔ میں یہ بات برداشت نہیں کر سکتا تو پھر تیری یہ مجال کیونکر ہوئی کہ تو چھپ چھپ کر سونجاق سے ملاقاتیں کرے، اس کے اظہار عشق کو غور سے سنے اور اس سے منع نہ کرے۔ یہ کیا ہے؟ یہ سب کیا ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "میرے آقا! میں سونجاق سے ملی ضرور ہوں لیکن بالکل اتفاقیہ سر راہ مل گئے ہے۔ میں آپ کے حکم کی پابند ہوں۔"

تین عیسائی مبلغ افریقہ کے تین مختلف حصوں میں تبلیغ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایک سال بالکل اتفاقیہ طور پر ان تینوں کی آپس کے ایک شہر میں ملاقات ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کو فخریہ انداز میں اپنے کارناموں کے بارے میں بتانے لگے۔

"میں نے اپنے علاقے کے پچیس فیصدی افراد کو روز و شب کی محنت شاقہ کے بعد عیسائی بنا لیا ہے۔" ان میں سے ایک نے بتایا۔ "اور ہم نے عیسائی بننے والے ان افراد کے لیے چرچ اور اسکول بھی تعمیر کرا دیے ہیں۔"

دوسرے مبلغ نے بتایا: "میں نے اپنے علاقے کے نوے فیصدی افراد کو عیسائی بنا لیا ہے اور ان کے لیے چرچ، اسکول اور ہسپتال تعمیر کرا دیے ہیں۔"

پھر وہ دونوں تیسرے مبلغ کی جانب متوجہ ہوئے۔

"تم تو مردم خوروں کے علاقے میں ہو۔" ان میں سے ایک نے تیسرے مبلغ سے دریافت کیا۔ "کیا تم نے ان لوگوں کی انسانوں کو کھانے والی عادت چھڑوا دی ہے؟"

"دراصل مجھے ایک طویل طریقہ کار پر عمل کرنا پڑ رہا ہے۔ میں اپنی کوششوں میں لگا ہوا ہوں اور میں نے اس حد تک ان کی حالت تبدیل کر دی ہے کہ اب وہ لوگ انسانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کھانے کے بجائے چھری اور کانٹے کی مدد سے کھانے لگے ہیں۔"

اباقہ خان چیخنے لگا: "غلط، بالکل غلط۔ وہ اتفاقیہ سر راہے گلبے کی ملاقات نہیں تھی بلکہ تو خود گیا تھا اس کے پاس۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "آقا! میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ میں بے گناہ ہوں مجھ پر اتنا سنگین الزام نہ لگایئے۔"

ترمہ شیریں گڑگڑانے لگی لیکن اباقہ خان کا دل نہیں پسیجا۔ وہ بدستور غصے میں ٹہلتا رہا، وہ بڑبڑانے لگا: "میں سونجاق کو سلجھا ہوا دیانت دار نوجوان سمجھتا رہا ہوں مگر اس نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ خانوادۂ چغتائی کا شہزادہ ہے، وہ اگر چاہے تو میں اس کو بیس پچیس خوبصورت لڑکیاں پیش کر سکتا ہوں، اس کو تجھ سے دور دور رہنا چاہیے۔"

ترمہ شیریں رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اباقہ خان نے کن انکھیوں سے ترمہ شیریں کو آنسو بہاتے دیکھا کچھ دیر بعد بولا: "ترمہ شیریں! میری تو یہی خواہش ہے کہ تجھ سے میرے علاوہ کوئی شخص بھی راہ و رسم نہ رکھے۔"

لیکن ترمہ شیریں نے کوئی جواب نہ دیا بدستور روتی رہی۔

اباقہ خان نے آہستہ سے تالی بجائی تو دو خدمت گار فوراً اندر داخل ہو گئے۔ اباقہ خان نے انہیں حکم دیا: "سونجاق کو اسی وقت حاضر کیا جائے۔"

اس حکم نے ترمہ شیریں کو خوفزدہ کر دیا۔ وہ رونا بھول گئی۔

اباقہ خان اس کی جملہ حرکات و سکنات پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ ترمہ شیریں کو چپ ہوتے دیکھ کر اس نے حکم دیا: "ترمہ شیریں! تو چپ کیوں ہو گئی؟ میں چاہتا ہوں اس متنازعہ موضوع پر گفتگو تم دونوں کے سامنے ہو جائے۔ میں خود بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی شخص خواہ مخواہ متہم ہو۔" پھر اس نے ترمہ شیریں کو حکم دیا کہ ملحقہ کمرے میں چلی جائے۔

چنانچہ ترمہ شیریں ملحقہ کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب سونجاق کو اس کے روبرو پیش کیا گیا تو اباقہ خان اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔ چغتائی شہزادہ مسکرا رہا تھا۔

اباقہ خان نے شہزادے کو اپنی کھال میں رکھنے کے لیے کھڑا رکھا۔ شہزادہ کچھ دیر تو چپ چاپ کھڑا رہا پھر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا: "آپ بیٹھنے کے لیے یوں بھی کہیں گے۔ ہی پھر میں بیٹھنے کی زحمت خواہ مخواہ آپ کو کیا دوں۔"

اباقہ خان کو سونجاق کی جسارت گراں گزر رہی تھی۔ اپنا بھرم رکھنے کے لیے فوراً بولا: "بیٹھ جا سونجاق بیٹھ جا۔"

سونجاق نے پوچھا: "آپ نے مجھے کیوں طلب فرمایا ہے؟"

اباقہ خان کو یہ سوال بھی گراں گزرا، بولا: "سونجاق! تو یہاں میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

سونجاق نے جواب دیا: "خانوادۂ تولوئی خان اور خانوادۂ چغتائی میں پیدا ہو جانے والی رنجشوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے۔"

اباقہ خان نے پوچھا: "پھر تیری ان مساعی کا کیا ہوا؟"

سونجاق نے جواب دیا: "میرا خیال ہے میں اس میں کامیاب ہوتا جا رہا ہوں۔"

اباقہ خان نے تیوریاں بدلیں اور ترش لہجے میں کہا: "تو سراسر ناکام ہے، بالکل ناکام بلکہ تیری موجودگی اور تیری جسارتیں رنجشوں کو اور زیادہ بڑھا دیں گی۔ کیا تو جانتا ہے کہ تو جو کچھ کر رہا ہے اس کے کیا نتائج نکلیں گے؟"

سونجاق نے پوچھا: "میں کیا کر رہا ہوں، میری وہ جسارتیں کیا ہیں؟ جن سے دونوں خانوادوں میں رنجشیں بڑھ سکتی ہیں؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "میں نے ترمہ شیریں سے بات کرنے کے بعد تجھ کو بلایا ہے۔ تو نے ترمہ شیریں کے گھر کے چکر لگاتے اور پھر اس سے پہاڑی چٹان کے سائے میں ڈھیر ساری باتیں کر ڈالیں۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سونجاق کو اباقہ خان کی باتوں سے غلط فہمی ہو چکی تھی کہ شاید ترمہ شیریں نے اباقہ خان کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے، مگر اس نے اس کی تردید کی۔ بولا: "میں نہیں جانتا کہ ترمہ شیریں نے میری بابت آپ سے کیا کچھ کہا تھا، لیکن میں یہی کہوں گا کہ ہم دونوں جہاں کہیں بھی ملے ہیں اتفاقیہ ملے ہیں۔"

اباقہ خان نے پوچھا: "اور وہ جو تو اس کے گھر جاتا رہا ہے اس کا کیا مطلب لوں؟"

سونجاق نے جواب دیا: "جب میں نے پہلی بار ترمہ شیریں کا رقص دیکھا تھا تو میں اس کے مداحوں میں شامل ہو گیا تھا میری خواہش تھی کہ میں کم از کم ایک بار ترمہ شیریں سے ملوں اور اس کے منہ پر اس کے فن کی والہانہ داد دوں چنانچہ جب وہ گھر پر نہیں ملی تو میں بہت مایوس ہوا۔ آخرکار وہ اچانک سر راہے گلبے کے طور پر دوبارہ ادھر ادھر مل گئی اور میں اس کی قصیدہ خوانی اور مدح سرائی میں اپنا سارا وقت خرچ کر کے واپس آ گیا۔"

اباقہ خان نے کہا: "تو جھوٹ بولتا ہے۔ مجھے تو یہاں تک بتایا گیا ہے کہ تم دونوں کافی کافی دیر تک تخلیے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے ہو۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تم دونوں جب باتیں کر کے الگ ہوتے تو تم دونوں کے چہروں پر ملاقات کی خوشی اور جدائی کے غم کے ملے جلے اثرات پائے جاتے تھے۔"

سونجاق نے کہا: "محترم ایل خان! میں بھی ایک غیرت مند نوجوان ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ترمہ شیریں نے میری بابت کیا جھوٹ

بولا ہے۔"

اباقہ خان نے پوچھا۔ "کیا تو ترمہ شیریں کا سامنا کر سکتا ہے؟"

سونجاق نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ میں ترمہ شیریں کیا کسی بھی شخص کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔"

اباقہ خان چپ ہو گیا۔ سونجاق نے کچھ دیر تو اپنی بات کے جواب کا انتظار کیا لیکن جب جواب نہ ملا تو عرض کیا۔ "آقائے من میں کب تک اپنے سوال کے جواب کا انتظار کروں گا؟"

اباقہ خان نے منہ پھیر لیا، بولا۔ "تیرے سوال جواب درمیان کی احترامی ڈھلتے ہیں، کیا تو چپ نہیں رہ سکتا؟"

سونجاق کھڑا ہو گیا، بولا۔ "میں جانا چاہتا ہوں۔"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "تیری مرضی، تو جا سکتا ہے۔"

اسی وقت تالی بجا کر خدمت گار کو طلب کیا اور اس کو حکم دیا کہ ترمہ شیریں کو بلایا جائے۔ اس حکم نے سونجاق کے پاؤں پکڑ لیے، وہ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اباقہ خان نے سونجاق کی طرف دیکھا اور حیرت سے کہا۔ "تو تو ابھی تک یہیں موجود ہے؟ گیا نہیں؟"

سونجاق نے جواب دیا۔ "جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ترمہ شیریں بھی یہیں آنے والی ہے تو میں رک گیا۔ میں چاہتا ہوں یہ ساری باتیں اس کے سامنے بھی ہو جائیں۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "بات ختم ہو چکی۔ اب تو جا سکتا ہے۔"

سونجاق کو اباقہ خان کا اصرار گراں گزر رہا تھا۔ اسی لمحے اس نے اپنے سامنے سے ترمہ شیریں کو آتے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو گھبرا گئے۔ اباقہ خان کی نظریں بیک وقت دونوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ترمہ شیریں دونوں کے روبرو آ کر کھڑی ہو گئی۔ سونجاق نے ترمہ شیریں کو دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔ ترمہ کے اپنے احساسات کی گرمی تھی جس سے وہ پسینے میں ڈوب گئی۔

اباقہ خان نے دونوں سے کہا۔ "ترمہ شیریں اور سونجاق! اب اس کھیل کو ختم ہو جانا چاہیے۔ اور سونجاق! تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تو اپنے خاندان میں واپس چلا جا۔ اور ترمہ شیریں! تو، اگر تجھ کو اپنی مدح سرائی اور پرستاری کی ہوس ہے تو اس کے لیے میری یہی مدح سرائی کافی ہے کہ میں نے تیرے رقص کو پسند کیا ہے بلاکو خان کے بیٹے اباقہ خان نے تجھے پسند کیا ہے۔"

ترمہ شیریں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "آقائے من! نہایت عجز و انکسار سے عرض کر رہی ہوں کہ مجھے اپنے ہنر کی مدح سرائی کے لیے کسی بھی شخص کی داد و تحسین کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں، خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔"

اباقہ خان نے جیسے ترمہ شیریں کی بات سنی ہی نہ تھی۔ اس نے سونجاق سے کہا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔"

سونجاق کا دل جانے کو نہ چاہتا تھا مگر مجبوراً اٹھ کر چلا جانا پڑا۔ اباقہ خان نے اس ذرا سی دیر میں وہ سب کچھ جان لیا تھا جو وہ جاننا چاہتا تھا۔

سونجاق چلا گیا۔ اباقہ خان نے ترمہ شیریں سے کہا۔ "اب تو بھی جا سکتی ہے مگر خبردار جو پھر تم دونوں کہیں ملے۔"

ترمہ شیریں نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر جب وہ جا رہی تھی تو اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔



شہزادہ سونجاق اباقہ خان سے ملتا تو تھا مگر اب اس میں سرگرمی اور جوش و خروش کی کمی آ چکی تھی۔ اس نے اباقہ خان پر زور دیا کہ وہ اگر پسند کرے تو چغتائی خاندان کے حکمران براق خان سے مفاہمت کر لے۔ براق خان ترکستان، خراسان، غزنین، بلخ اور دریائے سندھ تک حکومت کرتا تھا۔ چغتائی خاندان نے ہمیشہ ہلاکو کے خاندان کی عزت اور اطاعت کی تھی لیکن ادھر کچھ عرصے سے ان میں سرکشی اور انحراف کے آثار پائے جانے لگے تھے۔ شہزادہ سونجاق کی دلی خواہش تھی کہ تو قوتی خان اور ہلاکو خان کے خاندانوں میں اتحاد اور اتفاق قائم رہے وہ اسی مقصد سے اباقہ خان کے پاس آیا تھا لیکن جب ترمہ شیریں ان دونوں کے درمیان وجہ حسد و نفاق بن گئی تو اباقہ خان کی معاندانہ روش نے سونجاق کو دل برداشتہ کر دیا۔ اب اس نے اباقہ خان سے قطع تعلق کر لیا تھا اور وہ دن رات اس فکر میں رہتا تھا کہ ترمہ شیریں سے کس طرح رابطہ قائم کرے — ترمہ شیریں کی جدائی نے اس کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ شاید ترمہ شیریں نے اس پر جادو کر دیا ہے۔

ایک دن اباقہ خان اپنے مسلمان وزیر اعظم شمس الدین جوینی کے ساتھ بازار سے گزر رہا تھا۔ اباقہ خان رتھ نما گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ وزیر جوینی اس کے دائیں جانب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اباقہ خان کا محافظ دستہ گھوڑوں پر سوار دائیں بائیں آگے پیچھے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دوسری طرف سے سونجاق فکروں میں ڈوبا چلا آ رہا تھا۔ وہ اباقہ خان کے رتھ کو دیکھ کر کنارے ہٹ گیا۔ اباقہ خان کی نظر بھی اس پر پڑ گئی۔ اس نے رتھ کو رکوا کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سونجاق کو اس کے پاس بلا لائیں۔

جب سونجاق کو اباقہ خان کے پاس لایا گیا تو اس کے دل کی کدورت اس کے چہرے پر رونما ہو چکی تھی۔

اباقہ خان نے اس سے شکایت کی۔ "کیا بات ہے سونجاق

"تُم نے ملنا ملانا کیوں ترک کر دیا؟"

سونجاق نے جواب دیا: "محترم ایل خان! میں عنقریب اپنے بھائی براق خان کے پاس واپس چلا جاؤں گا۔"

اباقہ خان نے پوچھا: "کیوں؟ آخر کیوں؟ یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے؟"

سونجاق نے جواب دیا: "میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ دونوں خانوادوں میں رشتۂ اتحاد اور یگانگت کو زیادہ مضبوط کر دوں لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان دونوں خانوادوں میں تصادم اور معرکہ آرائی مقدر ہو چکی ہے۔ اسی طرح جس طرح برقائی اور ہلاکو خان میں ہو چکی ہے۔"

اباقہ خان نے کہا: "اگر یہ تیری طرف سے دھمکی ہے تو میں اس سے مرعوب نہیں ہوں گا اور اگر یہ اظہارِ واقعہ ہے تو میں کوشش کروں گا کہ براق خان سے مل کر صلح صفائی کا رشتہ استوار کروں۔"

سونجاق نے پوچھا: "مجھے راستے میں روکا کیوں گیا؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "ازراہِ خلوص اور محبت۔"

سونجاق نے کہا: "تب پھر اب میں جا سکتا ہوں؟"

اباقہ خان نے کہا: "مجھ سے محل میں ایک بار مل ضرور لینا، کیونکہ میں چند ضروری باتیں کر کے تجھے رخصت کر دینا چاہتا ہوں۔"

سونجاق نے کوئی جواب دیے بغیر اپنے گھوڑے کا رُخ موڑا اور اُن سے جدا ہو گیا۔

اباقہ خان کچھ دیر اسے جاتے دیکھتا رہا پھر اپنے وزیر شمس الدین سے پوچھا: "تیرا کیا خیال ہے کیا یہ باغی نہیں ہو گیا ہم سے؟"

شمس الدین جوینی نے جواب دیا: "آقائے من! شاید یہ بات نہیں ہے مجھ کو تو ایسا لگتا ہے کہ شہزادہ سونجاق کے دل میں کوئی پھانس سی چبھ گئی ہے اور اس کی اذیت اور تکلیف نے شہزادے کو آوارہ اور سرگرداں کر رکھا ہے۔"

اباقہ خان ترمہ شیریں کی بات اپنے وزیرِ اعظم کو نہیں بتانا چاہتا تھا اس نے پوچھا: "دانا و بینا وزیر! کیا تو بتا سکتا ہے کہ اس سرگرانی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

وزیر جوینی نے جواب دیا: "جنگ۔ شاید اس کا بھائی براق خان بالکل آمادہ پیکار ہے اور سونجاق بالکل بے دست و پا ہو چکا ہے۔"

اباقہ خان نے دانت پیسے اور جواب دیا: "جوینی! میں بڑی مشکلات میں گھر گیا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ ایک اچھا راعی بن کے اپنی رعایا کو آرام پہنچاؤں، اس کو انصاف دوں اور اس کی بھلائی کے کام کروں۔ میری فوج اور سرداروں کو یہ شکایت ہے کہ ان کے ہتھیاروں کو زنگ لگ رہا ہے اور کوئی کارنامہ نہ دکھا سکنے کے باعث دنیا کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہ گئے۔ دوسری طرف برقائی چھیڑ چھاڑ پر آمادہ ہے اور وہ ہمارے سکون کو ختم کر دینے پر تلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ براق خان خراسان کو اپنا علاقہ کہہ کر اسے واپس لینے پر کمربستہ نظر آتا ہے۔ میں نے گھوڑے کی پشت چھوڑ کر حکومت کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن افسوس کہ اب میں مجبوراً ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہو جاؤں گا اور پتہ نہیں کہ پھر اس کی پشت سے اترنا نصیب بھی ہو گا یا نہیں۔"

وزیر شمس الدین جوینی نے دبی زبان میں عرض کیا: "آقائے من! برقائی خان اور براق مسلمان ہو چکے ہیں۔ براق خان نے اپنا نام غیاث الدین رکھ لیا ہے چنانچہ اب ان دونوں میں تصادم کا امکان ختم ہو گیا ہے اور چونکہ ہمارے چاروں طرف اسلام کی حکمرانی ہے اس لیے ہماری رعایا کے دل تو مسلم حکمرانوں کے ساتھ ہیں ان حالات میں ہم کہاں کھڑے ہیں آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

اباقہ خان اپنے وزیر کی باتیں بہت توجہ سے سنتا رہا۔ اس کے بعد رتھ کو آگے بڑھایا اور اپنے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

•

مراغہ کے نواح سے حسین ترین دوشیزاؤں کے تحائف لائے ہوئے تھے۔ انہیں اباقہ خان کے ملاحظے سے گزارا گیا۔ اباقہ خان نے انہیں خوب جانچا پرکھا اور ان کی ہنرمندی کا جائزہ لیا۔ ایک آرائشی محفلِ طرب منعقد ہوئی اور اباقہ خان ان کے فنی کمال کا جائزہ لینے لگا۔ غم غلط کرنے کے لیے شراب کا دور چلا لیکن شراب نے اندرونی غموں کو اور زیادہ ابھار دیا۔ اباقہ خان کو اس عالم میں ترمہ شیریں بہت یاد آئی۔ اس نے ترمہ شیریں کو فی الفور طلب کر لیا اور پھر معلوم نہیں کیا سوچ کر اس نے سونجاق کو بھی طلب کر لیا۔

ترمہ شیریں تو فوراً حاضر ہو گئی مگر سونجاق نے طبیعت کی خرابی کا عذر کیا اور نہیں آیا۔

ترمہ شیریں نیلے لباس میں بہشتی حور نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے سیاہ گھٹاؤں جیسے بال گلابی رومال سے باندھ رکھے تھے۔ ترمہ شیریں بہت اداس تھی خوشی یا مسکراہٹ کا دور دور پتہ نہ تھا۔

اباقہ خان نے ترمہ شیریں سے شکایت کی: "یہ شہزادہ سونجاق کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ میں نے اسے بلایا تھا مگر وہ بیماری کا بہانہ کر کے نہیں آیا۔"

جب وہ یہ کہہ رہا تھا، اس کی نظریں ترمہ شیریں کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ اور پھیکا پڑ چکا تھا۔

اباقہ خان نے سونجاق کے پاس دوبارہ خدمت گار بھیج دیا کہ شہزادے سے کہو تمہیں حکماً بلایا جا رہا ہے۔ بیماری کا عذر قابلِ سموع نہیں ہے۔

اس سخت حکم نے شہزادے سونجاق کو بے بس اور مجبور کر دیا۔ وہ چلا آیا۔ اور یہاں ترمہ شیریں کو دیکھ کر غمزدہ ہو گیا۔ اباقہ خان دونوں ہی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے ان دونوں میں ربط و تعلق کے آثار محسوس کر لیے۔

ترمہ شیریں کے بائیں جانب وہ دوشیزائیں کھڑی تھیں جنھیں اُن کے عاملوں اور صوبے داروں نے اباقہ خان کی خدمت میں بھیجا تھا۔

اباقہ خان نے ایک لڑکی کو اشارہ کیا: "ادھر آ میرے قریب۔"

وہ لڑکی اباقہ خان کے پاس چلی گئی۔ اباقہ خان نے پوچھا۔

"کیا تجھے رقص آتا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا: "بہت عمدہ۔"

اباقہ خان نے پوچھا: "اور گانا؟"

لڑکی نے جواب دیا: "وہ بھی آتا ہے۔"

اباقہ خان نے حکم دیا: "اپنی جیسی دو چار لڑکیوں کے ساتھ ہمیں اپنے جوہر دکھا۔"

سونجاق نے کن انکھیوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ پانچ لڑکیاں اس لڑکی کے ساتھ شامل ہو گئیں۔

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کو اپنے پاس بٹھا لیا، بولا: "تو ہماری طرح تماشائی بن کر لطف اندوز ہو۔"

سونجاق کی محویت ختم ہو چکی تھی۔

گھنگھرو کھنکے اور چھ لڑکیاں محو پرواز ہو گئیں۔ اُن کے جسم روئی کے بادل جیسے ہلکے پھلکے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کی پھرتی اور چستی میں برق کی صفات پائی جاتی تھیں۔ ماحول میں ایک آگ سی لگ گئی۔ سونجاق بھی اُن کے کمال میں کھو گیا۔ اس کی نظریں رقاصاؤں کے پاؤں اور بل کھاتے لہراتے جسموں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ترمہ شیریں گاہ بگاہ سونجاق کی محویت کو دیکھتی اور حسد کی آگ میں جلنے لگتی۔

اباقہ خان نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے ان دونوں کے مشاہدے میں مشغول تھا۔

ترمہ شیریں زیادہ برداشت نہیں کر سکی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور اپنا رقص شروع کر دیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا تھا کہ اباقہ خان بھی دنگ رہ گیا۔ سونجاق کے شوق کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی اور اب وہ اباقہ خان کی پروا کیے بغیر ترمہ شیریں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ترمہ شیریں کے رقص میں تیزی اور شدت اس بلا کی تھی جیسے زندگی کی آخری سانسوں تک اس کا یہ رقص جاری رہے گا۔

اباقہ خان ترمہ شیریں کی اس حرکت سے خوش نہیں ہوا۔ اس نے سونجاق سے کہا: "میں اس سرکشی اور خود مختاری کو برداشت نہیں کر سکا۔ جی چاہتا ہے ترمہ شیریں کو زندگی بھر کے لیے قید کر دوں۔"

سونجاق نے پوچھا: "مگر ترمہ شیریں کی خطا، اس کی غلطی، گناہ، جرم؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "اس کا یہی جرم کیا کم ہے کہ میرے حکم کے بغیر محفل رقص و سرود میں شامل ہو گئی۔"

اباقہ خان کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا مگر مصلحتوں نے اس کے ہاتھ، پاؤں اور عقل کو ناکارہ کر کے رکھ دیا تھا۔

اباقہ خان نے جب یہ دیکھا کہ ترمہ شیریں یا تو رقص کرتے کرتے ٹوٹ جائے گی یا پھر بے ہوش ہو کر بے سُدھ بدھ کھو بیٹھے گی۔ تو اباقہ خان نے اچانک اسے ڈانٹ کر حکم دیا: "بند کرو ناچ گانا۔ بہت ہو چکا۔"

اس اچانک حکم نے سب کو روک دیا۔ ترمہ شیریں سمٹی سمٹائی اباقہ خان کے پاس چلی گئی۔

سونجاق دیکھ تو سب کچھ رہا تھا مگر حسد ہی محسوس کر رہا تھا۔ آتش حسد نے اس کے شعور و ادراک کو جھلسا کے رکھ دیا تھا۔

اباقہ خان نے نووارد دوشیزاؤں کو وہاں سے ہٹایا اور تیوریوں پر بل ڈال کر ترمہ شیریں سے پوچھا: "ترمہ شیریں! مجھے بتا، کہ تو رقص کے لیے کیوں کھڑی ہو گئی تھی اور تو نے یہ رقص کس کی اجازت اور کس کے حکم سے کیا تھا؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "نئی رقاصاؤں کے رقص نے مجھے اس پر مجبور کر دیا تھا۔"

اباقہ خان نے زیادہ سختی دکھائی: "میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں مجھے اس کا جواب چاہیے۔ یہ شاہی محفل ہے یہاں میرا حکم چلتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ تجھے رقص کا حکم کس نے دیا تھا؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "میرے دل نے، میرے شوق نے میری امنگوں نے، میرے دونوں نے۔"

اباقہ نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارا: "یہاں میرا حکم چلتا ہے، صرف میرا۔"

سونجاق نے ترمہ شیریں کی سفارش کی: "آقائے من! یہ کوئی ایسا کام تو نہیں تھا کہ جس سے کسی کو کوئی نقصان پہنچ گیا ہو۔"

اباقہ خان نے سونجاق کو ڈانٹ دیا: "تو اس وقت تک خاموش بیٹھا رہ جب تک میں تجھ سے مخاطب نہ ہو جاؤں۔"

سونجاق بگڑ کر کھڑا ہو گیا: "میں بھی اسی خاندان کا ایک معزز فرد ہوں جس خاندان کے آپ ہیں۔ میں بھی ایک بہت بڑے قطعۂ زمین کا مالک ہوں۔ میں بھی حکمران خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہ آپ مخاطب کس طرح ہو رہے ہیں؟"

اباقہ خان مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا: "تو ترمہ شیریں کی سفارش کر رہا ہے اور میں اتنا ہی بے وقوف ہوں کہ تیری سفارش مان لوں گا؟"

سونجاق نے بدمزگی سے جواب دیا: "میں کسی کی بھی سفارش نہیں

کر رہا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں اس تکلیف دہ ماحول میں ذرا دیر بھی نہیں رکوں گا۔"

اباقہ خان نے سونجاق کے دونوں کاندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ "یہاں سے میری اجازت کے بغیر چلا جانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تو سمجھ رہا ہے۔ ابھی بیٹھ اور کچھ اور تماشا بھی دیکھ لے۔"

سونجاق بیٹھ گیا اور کہا۔ "محترم خان! آپ جو کچھ کر رہے ہیں اچھا نہیں کر رہے ہیں۔ چغتائی خانوادہ ہمیشہ سے آپ کا دوست ہے۔ آپ کو اس دوستی کا خیال رکھنا چاہیے۔"

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کو مخاطب کیا۔ "ترمہ شیریں! اب رقص شروع کر دے اور اس وقت تک ناچتی رہ جب تک میں تجھے رک جانے کا حکم نہ دے دوں۔ ناچتی رہ، بس ناچتی رہ۔"

ترمہ شیریں نے بڑی بے بسی سے اباقہ خان کی طرف دیکھا اور رقص شروع کر دیا۔ سونجاق نے جانے پر اصرار کیا۔ "محترم خان! میں یہ رقص نہیں دیکھنا چاہتا۔"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "لیکن میں ترمہ شیریں کا رقص تجھ کو ضرور دکھاؤں گا۔"

سونجاق کی یہ کوشش بھی بیکار گئی۔ گھنٹے سوا گھنٹے کے رقص نے ترمہ شیریں کو بے حال کر دیا۔ اب وہ ناچنے سے زیادہ جھوم رہی تھی۔ اباقہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر جاتے ہوئے کہا۔ "لڑکی! تو ناچتی رہ، میں ابھی آتا ہوں۔"

اباقہ خان چلا گیا۔ ترمہ شیریں ناچ رہی تھی۔ سونجاق بے بس تماشائی بنا دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ برداشت نہیں کر سکا، بولا۔ "ترمہ شیریں رقص بند کر دے۔"

لیکن ترمہ شیریں نے رقص بند نہیں کیا۔ ناچتی رہی۔ سونجاق اٹھا اور ترمہ شیریں کے دونوں بازو پکڑ کر اس کا رقص روک دیا۔ ترمہ شیریں نے نیم مدہوشی میں کہا۔ "مجھے ناچنے دو۔ مجھ کو مت روکو۔"

سونجاق نے جواب دیا۔ "نہیں تم بہت ناچ چکیں۔"

ترمہ شیریں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "اباقہ خان ناراض ہو جائے گا، اور جب وہ ناراض ہوتا ہے تو اندھا ہو جاتا ہے وہ غیظ و غضب میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

سونجاق نے کہا۔ "لیکن میں اباقہ خان سے نہیں ڈرتا۔ بالکل نہیں ڈرتا۔ اباقہ خان جو کچھ کر رہا ہے اس سے خود اباقہ خان کو ڈرنا چاہیے۔"

ترمہ شیریں چھڑانے کی کوشش کرتی رہی اور سونجاق نے اس کو اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ وہ سونجاق کو ہلا بھی نہیں سکی۔

اسی دوران اباقہ خان واپس آ گیا۔ اور دونوں کی کشمکش کا تماشہ دیکھتا رہا۔ ترمہ شیریں اباقہ خان کو دیکھ کر سہم گئی۔ خوشامدانہ اپنی صفائی پیش کی۔ "خان محترم! میں تو برابر ناچے جا رہی تھی مگر اس نے مجھے منع کیا۔ اور جب میں نہیں باز آئی تو اس نے مجھے جبراً روک دیا۔"

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کو سونجاق سے چھڑا لیا اور اس کو جھٹکے سے قالین پر گرا دیا۔ "ترمہ شیریں! ہم نے تجھ کو رقص جاری رکھنے کا حکم دیا تھا۔ تجھے ہر حال میں میرے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔" پھر سونجاق سے کہا۔ "چغتائی اور میرے خانوادے کے درمیان جو تعلق چلا آ رہا ہے اس کو یوں ہی رہنے دیا جائے۔ اس میں مزید سلسلہ جنبانی کی کوئی ضرورت نہیں اب تم جا سکتے ہو۔"

سونجاق نے جواب دیا۔ "آپ یہ بات بہت پہلے بھی کہہ سکتے تھے۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "میں کب کیا کہہ سکتا تھا میں جانتا ہوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

سونجاق نے پوچھا۔ "ابھی اسی وقت یا کل صبح؟"

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کو اٹھنے کا حکم دیا۔ اور سونجاق کو جواب دیا۔ "میری طرف سے تمہیں جانے کی اجازت مل چکی ہے تم جب چاہو چلے جاؤ۔ ابھی جانا چاہو تو ابھی، کل جانا چاہو تو کل اور کل کے بعد کسی دن جانا چاہو تو کل کے بعد چلے جانا۔ مطلب یہ کہ میں نے تمہیں واپس جانے کی اجازت دے دی ہے۔"

سونجاق وہاں سے چلا گیا تو اباقہ خان نے ترمہ شیریں کو اپنے پاس بلایا، اب اس کا لہجہ بہت زیادہ نرم ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "ترمہ شیریں! میں تجھ پر سختی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی میری پسندیدہ چیز کو پسند کرنے لگے۔ سونجاق تو چغتائی خانوادے کا ایک شہزادہ ہے، میں یہ حق اپنے بیٹوں کو نہیں دے سکتا۔"

ترمہ شیریں سہمی کھڑی رہی۔ اباقہ خان کا خیال تھا کہ وہ جواب میں کچھ کہے گی مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا آخر اباقہ خان خود ہی بولا۔ "سونجاق یہ سمجھتا ہے کہ اس کی سفارت سے دونوں خانوادوں میں مفاہمت ہو جائے گی مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ چغتائی خاندان کا براق خان جو اب غیاث الدین ہو چکا ہے خراسان پر اپنا حق جتاتا ہے حالانکہ خراسان پر میرا قبضہ ہے اور میں اپنی مقبوضہ شے کو کسی دوسرے کے حوالے نہیں کر سکتا۔ بالکل تیری طرح۔ ترمہ شیریں کی طرح۔ تو میری پسند اور میرے قبضے میں ہے میں تجھے کسی اور کے حوالے کس طرح کر سکتا ہوں۔"

ترمہ شیریں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور ہچکیاں لے لے کر زار و قطار رو رہی تھی۔

اس نے ترمہ شیریں کے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹانے چاہے تو وہ لپٹ گئی۔ اباقہ خان نے اپنا نرم لہجہ برقرار رکھا، کہا۔ "ترمہ شیریں! میں نے تیرے ساتھ جو کچھ کیا اس کا مقصد تھا سونجاق کو خوار کرنا۔ چنانچہ وہ ذلیل و خوار ہو کر چلا گیا۔ اب تو کیوں روتی ہے؟"

ترمہ شیریں نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ "ذلیل تو

میں بوڑھی ہوں۔ سونجاق شہزادہ ہے۔ اسے کون ذلیل کرے گا؟"

اباقہ خان نے کہا: "میں تیرے رقص کا قدرداں ہوں۔ اس لیے اتنی بات بھی کر رہا ہوں ورنہ۔۔۔"

ترمہ شیریں کی سسکیوں میں کمی آ گئی۔

اباقہ خان نے بطورِ تنبیہہ کہا: "اگر تیرے دل میں سونجاق کی گنجائش پیدا ہو چکی ہے تو اس کو دور کر دے کیونکہ میں اپنے رقیب کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ جب میرا دل تجھ سے بھر جائے گا تو میں تجھ کو آزاد کر دوں گا تو جہاں بھی جانا چاہے گی، چلی جائے گی۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہ ہو گا۔"

ترمہ شیریں اپنی آنکھوں کے گوشوں سے بہنے والے آنسوؤں کو انگلیوں پر لے کر جھٹکنے لگی۔

●

سونجاق کو فوراً چلا جانا چاہیے تھا مگر وہ جانے سے پہلے ایک بار ترمہ شیریں سے ملنا چاہتا تھا۔ اباقہ خان کا بیٹا نکودار سونجاق میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا، وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا لیکن ایک دن جب کہ اباقہ خان اپنے وزیر شمس الدین جوینی کے ساتھ اپنے عساکر کے معائنے کے لیے گیا ہوا تھا، شہزادہ نکودار نے سونجاق سے بات کی اور اس سے پوچھا: "بابا جان سے آپ کی ان بن کیوں ہو گئی ہے؟"

سونجاق نے جواب دیا: "شہزادے! ہمارے خاندان کے کئی ذمہ دار افراد نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ شاید یہی بات اباقہ خان کو گراں گزری ہے۔"

نکودار سر کھجانے لگا۔ پوچھا: "شہزادے سونجاق! ایک بات بتائیں یہ لوگ مسلمان کیوں ہو جاتے ہیں؟"

سونجاق نے جواب دیا: "شہزادے! ایک بات یاد رکھو۔ ہر طاقتور چیز کمزور کو مغلوب کر لیتی ہے۔ ہم منگولوں کا کوئی کلچر تھا، نہ مذہب۔ چنانچہ جب یہ دونوں متصادم ہوئے تو اسلام جیت گیا اور منگول ہار گیا۔"

نکودار نے کہا: "شہزادے! میں اسلام کی بابت جاننا چاہتا ہوں۔"

سونجاق نے جواب دیا: "تو میرے ساتھ سرائے قرائی خان چل، پھر میرے بھائی غیاث الدین کے پاس چل۔ وہاں اسلام کی بابت بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

نکودار کسی سوچ میں پڑ گیا۔ سونجاق نے اس سے پوچھا —

"اباقہ خان کہاں چلا گیا؟"

نکودار نے جواب دیا: "وہ اپنے عساکر کا معائنہ کرنے گئے ہیں۔"

سونجاق نے پوچھا: "شہزادے! آپ اسلام کی بابت کیوں پوچھ رہے تھے؟"

شہزادہ نکودار نے جواب دیا: "ہمارا وزیر اعظم مسلمان ہے۔ جب وہ عبادت کرتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

سونجاق نے کہا: "شہزادے! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ رازداری کا وعدہ کریں تو عرض کروں۔"

شہزادہ نکودار سونجاق کا منہ دیکھنے لگا۔ بولا: "کہیے، میں راز میں رکھوں گا آپ کی بات۔"

سونجاق نے کسی قدر پس و پیش اختیار کیا۔ بولا: "میں جانے سے پہلے ترمہ شیریں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

شہزادہ نکودار پریشان ہو گیا۔ بولا: "آپ نے یہ کیسی بات کہہ دی؟ سونجاق! جانتے ہو آپ نے کیا کہا ہے؟"

سونجاق نے جواب دیا: "شہزادے! میں نے جو کچھ کہا ہے ہوش و حواس میں کہا ہے۔ آپ شریف انسان ہیں اس لیے میں آپ کے تعاون کا امیدوار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔"

شہزادہ نکودار کافی غور و فکر کے بعد گویا ہوش میں آیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا: "شہزادے سونجاق! یہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

سونجاق نے جواب دیا: "میں نے جو کچھ کہا ہے اور جو کچھ چاہا ہے اس کا کھلم کھلا اظہار کر دیا ہے۔"

شہزادہ نکودار نے کہا: "اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بابا جان ترمہ شیریں کو بہت عزیز رکھتے ہیں؟"

سونجاق نے کہا: "مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں پھر بھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

شہزادہ نکودار نے کہا: "شہزادے سونجاق! آپ ترمہ شیریں سے مل سکتے ہیں، باتیں بھی کر سکتے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔"

سونجاق نے کہا: "میں آپ کے اس احسان کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

شہزادہ نکودار اس کو اپنے قصر میں لے گیا اور وہیں ترمہ شیریں کو بلوا لیا۔ اس نے ترمہ شیریں سے کہا: "ترمہ شیریں! شہزادہ سونجاق تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہے۔ تم دونوں کی یہ ملاقات چوری سے کرائی گئی ہے۔ اس کا کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہیے۔"

ترمہ شیریں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا: "اگر اس ملاقات کا علم آپ کے والد کو ہو گیا تو۔۔۔ تو کیا ہو گا؟"

شہزادہ نکودار نے کہا: "اس کا علم انہیں نہیں ہو گا۔"

سونجاق نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا: "ترمہ شیریں! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب میں واپس جانے والا ہوں۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "تم واپس جا رہے ہو۔ میں کیا کر سکتی ہوں بس خدا حافظ کہنے کے سوا۔"

شہزادہ نکودار ان دونوں کے پاس سے جا چکا تھا۔ سونجاق نے کہا: "ترمہ شیریں! کیا تو جانتی ہے میں اپنے مقصد میں ناکام کیوں جا رہا ہوں؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "مجھے نہیں معلوم۔ میں نہیں جانتی۔"

سونجاق نے کہا: "تو سن، میری ناکامی کا سبب تو ہے۔ میں

تیری وجہ سے اپنے مقصد میں ناکام جا رہا ہوں۔"

ترمہ شیریں نے بڑی معصومیت سے سونجاق کی طرف دیکھا: "وہ کس طرح؟"

سونجاق نے جواب دیا: "وہ اس طرح کہ اباقہ خان کو جیسے ہی یہ شبہ گزرا کہ ہم دونوں میں کسی قسم کا ارتباط اور تعلق پیدا ہو چلا ہے اس نے ذہنی طور پر مجھے ناپسندیدہ قرار دے دیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس کی حدودِ سلطنت سے جلد از جلد نکل جاؤں۔"

ترمہ شیریں نے کہا: "اباقہ خان نے کئی دن پہلے مجھے جتا دیا ہے کہ وہ مجھے میرے رقص کی وجہ سے پسند کرتا ہے اور جب اس پسندیدگی میں کسی وجہ سے کمی آ جائے گی یا کوئی اور رقاصہ میری جگہ لے لے گی تو وہ مجھے بخوشی آزاد کر دے گا۔" یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔

"جب میں اباقہ خان کے محل میں داخل ہوئی تھی تو میں نے خود کو بہت خوش قسمت سمجھا تھا لیکن اب میں خود کو دنیا کی بدقسمت ترین عورت سمجھ رہی ہوں۔ میری مثال اس گائے یا بیل جیسی ہے جو مفید اور کارآمد ہونے تک تو اپنے مالک کے پاس رہتا ہے لیکن جب اُن کی افادیت ختم ہو جاتی ہے تو انہیں اونے پونے قصائی کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔"

سونجاق کو ترمہ شیریں کی باتیں بہت مایوس کر رہی تھیں۔ اس نے ترمہ شیریں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، بولا: "بس کر ترمہ شیریں بس کر۔ اس وقت میں تجھ سے یہ نہیں سننا چاہتا کہ جب تو اس محل میں آئی تھی تو خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھ رہی تھی۔ میں تو تجھ سے یہ سننا چاہتا تھا کہ تو مجھ سے درخواست کرے کہ میں تجھے اس قید خانے سے رہائی دلاؤں، نجات دلاؤں۔ کیا تیرے دل میں میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "میں شاہی محلات سے خوفزدہ ہو گئی ہوں۔"

سونجاق نے مایوسی سے کہا: "بات ہی ختم ہو گئی۔ اب میں کیا بات کروں؟"

ترمہ شیریں بہت اداس تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس کے مفید یا مضر پہلوؤں سے لاعلم بلکہ بے نیاز تھی۔

کچھ دیر تک دونوں ہی خاموش رہے آخر ترمہ شیریں نے ایک چبھتا ہوا سوال کر دیا: "شہزادے سونجاق! کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟"

سونجاق نے جواب دیا: "ہاں میں تجھ سے شادی کر سکتا ہوں۔"

ترمہ شیریں نے بگڑ کر کہا: "بس مجھے بات چیت کا یہ اسلوب بالکل پسند نہیں۔ شادی کر سکتا ہوں، کیا معنی؟ کہو شادی کروں گا۔"

سونجاق نے کہا: "پہلے میری بات پوری تو سن لو۔ اگر میں تجھے حاصل کر سکا تو ضرور شادی کروں گا۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "حاصل کر سکا، کا کیا مطلب؟ تم مجھے یہاں سے نکال لے چلو۔ میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

سونجاق نے کہا: "نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ میں اس وقت تجھے نہیں لے جاؤں گا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اباقہ خان نے خراسان پر قبضہ جما رکھا ہے۔ میں یہاں سے جاتے ہی اباقہ خان کو متنبہ کروں گا کہ وہ خراسان کو ہمارے حوالے کر دے اباقہ خان خراسان کو ہمارے حوالے نہیں کرے گا اور ہم اس کے نتیجے میں خراسان پر حملہ کر دیں گے حملے کی خبر سنتے ہی تو یہاں سے فرار ہو کر ہمارے لشکر میں پہنچ جائے گی۔ میں تجھ کو وہاں موجود ملوں گا۔"

ترمہ شیریں نے زہرخند کیا، بولی: "میں تم سے شادی کر سکتی ہوں لیکن اس سلسلے میں میری بھی ایک شرط ہے۔"

سونجاق نے حیرت سے پوچھا: "کون سی شرط؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "تم شادی کے بعد شاہی سے دستبردار ہو جاؤ گے اور میرے ساتھ کسی گمنام اور غیر معروف جگہ کو اپنا مسکن بنا لینا پھر — ہم دونوں وہاں پُرمسرت زندگی گزاریں گے۔"

سونجاق نے کہا: "میں شاہی کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔ میں جو کچھ ہوں اسی کی بدولت اور اسی کی وجہ سے ہوں میں اس کو کیونکر چھوڑ دوں؟"

ترمہ شیریں نے کہا: "تب پھر مجھ کو اسی محل میں رہنے دو۔ بار بار پنجرہ بدلنے سے حاصل؟"

سونجاق نے پوچھا: "کیا تو غربت میں گزارا کرے گی؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "بالکل کر لوں گی کیونکہ میں محلاتی کرب اور شاہی حسد اور سازشوں سے عاجز آ چکی ہوں۔ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہوں سونجاق! میں بہت تھک گئی ہوں۔"

سونجاق نے کہا: "بہرحال پھر بھی خراسان پر حملے کی خبر سنتے ہی تم فرار ہو جانا میرے آدمی تمہاری مدد کریں گے اور تمہیں میرے پاس پہنچا دیں گے۔"

شہزادہ نکودار پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے کہا۔
"صاحبان! مزید پھر کبھی کر لینا میرا خیال ہے والد صاحب آنے ہی والے ہیں۔"

ترمہ شیریں اباقہ خان سے اتنی خوفزدہ تھی۔ اتنا سنا کہ خبر سنتے ہی بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ گئی۔ سونجاق کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

شہزادہ نکودار نے سونجاق کی مایوسی کے پیشِ نظر کہا: "افسوس! کہ میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔"

سونجاق نے جواب دیا: "شہزادے! میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔"

ترمہ شیریں چلی گئی اور شہزادہ نکودار سونجاق کے ساتھ اس کی قیام گاہ تک گیا۔ وہ بے چین بے چین سا لگ رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

سونجاق واپس جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شہزادہ نکودار کا شکریہ ادا

کیا، شہزادہ نکودار نے کہا: "شہزادے! میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔"

سونجاق نے کہا: "پوچھیے، میں جواب دوں گا۔"

نکودار نے کہا: "کیا یہ درست ہے کہ واپس جاکے آپ خراسان پر حملہ کر دیں گے؟"

سونجاق نے جواب دیا: "حق مانگنے سے نہ ملے تو پھر چھین لیا جاتا ہے۔ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ لازمی ہے۔"

نکودار نے کہا: "آپ لوگ اس وقت کا انتظار کریں جب میں برسرِ اقتدار آ جاؤں گا۔ میں خراسان کو یونہی آپ کی نذر کر دوں گا۔"

سونجاق نے جواب دیا: "جو چیز اس وقت آپ کے اختیار میں نہیں ہے آپ اس کی ذمہ داری کیوں قبول کریں۔"

سونجاق شہزادہ نکودار کو مایوس کر کے چلا گیا۔

اباقہ خان بازار سے گزر رہا تھا۔ شمس الدین جوینی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ بازار میں بڑی چہل پہل تھی۔ سواریاں شاہی سواری کو دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتی تھیں۔ شمس الدین جوینی نے ایک عمر رسیدہ شخص کو ایک طرف جاتے دیکھا تو فرطِ جوش میں اباقہ خان سے درخواست کی۔ "خانِ محترم! میں ان بزرگ سے مل کر ابھی آیا۔"

اباقہ خان نے جانے کی اجازت دے دی۔ شمس الدین جوینی نے اس شخص کو دوڑ کر پکڑ لیا اور نہایت عقیدت اور احترام سے شیخ کے ہاتھوں کو بوسے دیے۔ کہا: "یا شیخ! آپ ہم سب کے لیے دعا فرمائیں کیوں کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔"

اباقہ خان نے یہ منظر نہایت تعجب اور حیرت سے دیکھا۔ وہ اس شخص کی بابت کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ کچھ دیر بعد جوینی واپس آ گیا، تو اباقہ خان نے پوچھا: "شمس الدین تم کتنے عرصے سے ہمارے ساتھ ہو اور ہماری چاکری کر رہے ہو؟"

شمس الدین نے جواب دیا: "سالہا سال سے، مگر کیوں؟"

اباقہ خان نے کہا: "تو نے سالہا سال میں ایک بار بھی میری تکریم اس طرح نہیں کی۔"

شمس الدین نے عرض کیا: "خانِ محترم! اس شخص کی عزت میں ہی نہیں ایک زمانہ کر رہا ہے۔"

اباقہ خان نے پوچھا: "اس شخص کا نام؟"

شمس الدین جوینی نے جواب دیا: "شیخ سعدی شیرازی۔"

اباقہ خان ان کا نام سن چکا تھا، بولا: "تو یہ ہیں شیخ سعدی شیرازی! کیا میری ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

جوینی نے جواب دیا: "کیوں نہیں، میں شیخ کے گھر آپ کو لے چلوں گا۔"

اباقہ خان کے دل و دماغ پر شیخ سعدی کی شخصیت مسلط ہو چکی تھی۔ اس نے ... اپنے آباؤ اجداد کی عظمت کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس جیسا عقلمند انسان نہیں دیکھا۔"

راستے بھر دونوں شیخ سعدی ہی کا ذکر کرتے رہے۔

محل میں داخل ہوتے ہی اباقہ خان کو پتہ چل گیا کہ سونجاق اس سے ملے بغیر ہی چلا گیا۔ اس خبر نے اسے دکھ تو پہنچایا مگر چپ رہا۔

●

اباقہ خان، سونجاق کے چلے جانے کے بعد کئی دن پریشان رہا۔ اس کا خیال تھا کہ سونجاق اتنی آسانی سے نہیں جائے گا لیکن جب وہ اباقہ خان سے ملے بغیر اچانک چلا گیا تو اباقہ خان کو اس طرزِ عمل میں ذہنی سبکی اور شکست محسوس ہوئی۔ وہ ایک بار پھر طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ ذلت کیا ہے؟ عزت کسے کہتے ہیں؟ اس نے سوچا، کیا اس کے باپ ہلاکو خان کا دادا عزت دار آدمی تھا؟ کیا لوگ اس کی عزت کرتے تھے؟' جواب ملا، لوگ چنگیز خان کی عزت نہیں، اس سے دہشت اور خوف محسوس کیا کرتے تھے۔ اسی لمحے شیخ سعدی کا خیال آ گیا۔ اس کے دل نے اندر سے گواہی دی کہ عزت تو شیخ کی کی جاتی ہے۔ اس نے شمس الدین جوینی کو طلب کیا اور اس سے درخواست کی کہ کچھ کلام سناؤ شیخ کا۔

جوینی بہت خوش ہوا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ شیخ سعدی اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو جائیں۔ جوینی نے اباقہ خان کی آتشِ شوق کو بھڑکانے کی غرض سے گریز اختیار کی، کہا: "خانِ محترم! شیخ کا کلام ناصحانہ و عارفانہ ہے، اس کا اثر گداز دلوں پر ہوتا ہے۔ آپ جنگجو اب جد کے بیٹے ہیں۔ شیخ کا کلام معلوم نہیں آپ کو پسند بھی آئے گا یا نہیں۔"

اباقہ خان نے کہا: "میں شیخ کا کلام اس لیے سننا چاہتا ہوں، کہ اس میں وہ چیز دیکھوں جس نے ایک زمانہ کو شیخ کا گرویدہ کر رکھا ہے۔"

جوینی نے عرض کیا: "خانِ محترم! شیخ نے انسانوں کو رحم و آشتی کا درس دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ جس قدر بھلائی کرو گے اسی قدر لوگ تمہارے دوست اور خیر خواہ اور جاں نثار ہوں گے۔ بکری، ہاتھی، کتا، چیتا اور دوسرے جانور بھی اسی کا دم بھرنے لگتے ہیں جو ان کی پرورش کرتا اور انہیں کھلاتا پلاتا ہے۔ احسان اور عطا سے جنگلیوں کی وحشت اور درندوں سے درندگی دور ہو جاتی ہے۔"

اباقہ خان واہ واہ کرنے لگا۔ بولا: "اور، اور جوینی کچھ اور۔"

جوینی نے کہا: "خانِ محترم! شیخ حرص و طمع کی بابت عجیب سی بات کہتا ہے کہ بچے کو دیکھو، اس کے سامنے سونا رکھو یا مٹی، اس کے لیے دونوں ہی برابر ہیں۔ اے طلف اور صالح انسان! بچے کی طرح حرص و طمع سے پاک ہو جا تاکہ تو کوئی بلند مقام حاصل کرے۔"

اباقہ خان نے حیرت سے کہا: "شیخ کیسی باتیں کرتا ہے۔ میں تو حیران ہوں۔ اور، کچھ اور۔"

جوینی نے کہا: "جناب والا! ماں، بیوی اور اولاد اپنے کفیل اور سرپرست سے کتنی محبت کرتے ہیں؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "بہت زیادہ۔"

جوینی نے کہا: "شیخ نے کہا ہے کہ کفیل اور سرپرست کی موت پسماندگان کے لیے کتنی روح فرسا ہوتی ہے۔ ذرا سوچو تو کہ سرپرست مر چکا ہے۔ اس کے پسماندگان اس پر آنسو بہا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ مصیبت قیامت سے کم نہیں ہوتی۔ مرحوم کا ترکہ وارثوں میں تقسیم ہو جاتا ہے لیکن اسی دوران مرنے والا خدا کی قدرت سے واپس آ گیا ہے اور اپنا ترکہ ہر ایک سے واپس مانگ رہا ہے۔ اس وقت میراث کا واپس دینا اس کی موت کے رنج سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

اباقہ خان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا: "میں نے سنا ہے شیخ نے بغداد کی تباہی کا کوئی مرثیہ بھی لکھا ہے کیا درست ہے؟"

جوینی نے جواب دیا: "شیخ نے بغداد کی تباہی پر ایک مرثیہ لکھا ہے لیکن وہ مرثیہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے ورنہ ضرور سناتا۔"

اباقہ خان نے کہا: "چلو پھر کل شیخ کی زبان سے بغداد کا مرثیہ سنیں۔"

اباقہ خان نے وہ رات بڑی بے چینی سے گزاری۔ دوسرے دن صبح اس نے اپنے دو شہزادوں کو ساتھ لیا اور جوینی سے کہا: "شیخ کی خدمت میں چل۔ میں خاص طور پر بغداد کی بربادی کا مرثیہ شیخ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

شہزادوں میں تکودار اور ارغون خان کو ساتھ لے لیا۔ جوینی ان سب کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ شیخ سعدی ان دنوں اسی شہر میں مقیم تھے۔

جوینی نے اباقہ خان کو سمجھایا: "حضور والا! آپ لوگ دنیا کو زیر دست اور شالی بنا سکتے ہیں اور شیخ، شیخ کی نصیحتیں اور ان کا عارفانہ کلام کئی ملکوں میں سند مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔"

اباقہ خان نے جوینی کو ڈانٹا: "آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

جوینی نے جواب دیا: "حضور والا! میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ لوگ اس بے نوا اور بے لوث انسان کی دل سے عزت کریں۔"

اباقہ خان نے جواب دیا: "میں شیخ کی دل سے عزت کرتا ہوں اور جب میں عزت کرتا ہوں تو شہزادوں کی مجال نہیں کہ وہ شیخ کی عزت نہ کریں۔ شاید وہ مجھ سے زیادہ عزت کریں گے۔"

جب شیخ کو اباقہ خان اور شہزادوں کی آمد کا علم ہوا تو بہت پریشان ہوئے اور جوینی سے کہا: "تو نے اچھا نہیں کیا۔"

شیخ نے اباقہ خان اور دونوں شہزادوں کی بہت عزت کی اور انہیں اپنا کلام بھی سنایا۔ اباقہ خان نے کہا: "شیخ! میں آپ کی زبان سے بغداد کی بربادی کا مرثیہ بھی سننا چاہتا ہوں۔"

شیخ نے ٹالنا چاہا، بولے: "اس مرثیہ کو زمانہ گزرا جن احساسات اور جذبات میں وہ مرثیہ لکھا گیا تھا وہ مجھ میں کہاں۔ پھر تجھے کیا مزہ آئے گا؟"

شمس الدین جوینی کی روح فنا ہو گئی۔ اباقہ خان سے شیخ کا یہ تحقیر آمیز طرز تخاطب شیخ کے لیے کتنا خطرناک اور مضر ہو سکتا تھا۔ وہ شیخ کو سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ اباقہ خان سے اس لب و لہجے میں بات نہ کریں لیکن اس کا موقع ہی کہاں تھا۔

دونوں شہزادے خوفزدہ کبھی شیخ کی صورت دیکھتے کبھی اپنے باپ اباقہ خان کی شکل۔

اباقہ خان نے کہا: "مجھ میں ان احساسات اور جذبات کا پیدا ہونا یا پایا جانا محالات میں سے ہے مگر میں وہ مرثیہ سننا چاہتا ہوں۔"

شیخ نے جواب دیا: "اگر تو بضد ہے تو میں اس کا کچھ حصہ ضرور سنا دوں گا۔"

اباقہ خان نے کہا: "بہتر ہے چلو یوں ہی سہی۔"

شیخ نے اپنا مرثیہ سنانا شروع کر دیا:

"اے آسمان! تیرا یہ فرض ہے کہ تو مسلمانوں کے خلیفہ مستعصم کی تباہی پر خون برسائے۔

یا رسول اللہ! اگر آپ کی مرقد سے باہر تشریف آوری کے لیے قیامت کا نزول ضروری ہے تو میں بتاتا ہوں کہ دنیا میں قیامت کا نزول شروع ہو چکا ہے۔

محل کے ناز و نعم میں پلے ہوئے ڈیوڑھی میں ذبح کر دیے گئے۔

اس بیت الحرام کو دیکھو یہاں کل تک روم کے قیصر اور چین کے خاقان سربسجود رہتے تھے۔

لیکن آج! یہاں رسول اللہ کے چچا کے بیٹے مستعصم کا خون بہہ رہا ہے۔

دجلہ کا پانی انسانی خون سے سرخ ہو چکا ہے۔

مگر اے سعدی! شہیدوں کی خاک پر نوحے کی کیا ضرورت۔

شہید مرتا نہیں زندہ رہتا ہے۔

شہادت کا ادنیٰ صلہ جنت ہے۔

سائل مجھ سے یہ نہ پوچھ کہ پھر میں مستعصم کے لیے کیوں رو رہا ہوں۔

میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ ایک دوست مجھ سے جدا ہو گیا اور دوست کی جدائی میں میرا دل کڑھ رہا ہے۔

سعدی! کل تک صبر کر، قیامت کو آ لینے دے۔ اس دن قبر والے خون میں لتھڑا ہوا چہرہ لیے نمودار ہوں گے۔

دنیا کی گردش اور زمانے کا انقلاب۔ آہ! اس سے پناہ مانگ۔ کسے معلوم تھا کہ یوں سر اوپر ہو جائے گا۔

یارو! دنیا پر بھروسا کرنا اور اس سے دل لگانا عقلمندی نہیں کیونکہ آسمان کبھی دوست بن جاتا ہے اور کبھی دشمن۔

شجاعت کا نور موت پر غالب نہیں آ سکتا جب قضا آتی ہے تو صائب الرائے کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔
جس بہادر کی گھات میں اجل ہو اس کی صیقل تلوار لڑائی کے دن نیام سے باہر نہیں نکلتی۔
جب مقدر برگشتہ ہو گیا ہو پھر اس کا امتحان لینا بے فائدہ ہے اور
اور جب زین الٹ گئی ہو تو پھر حملہ کرنا فضول ہے۔
یارو، ہم مردار دنیا کے لیے آپس میں لڑتے ہو! اگر تم عقلمند ہو تو سیمرغوں کی طرح الگ بیٹھو۔"

شیخ نے سماں باندھ دیا تھا۔ اباقہ خان نڈھال ہو گیا اور شہزادہ تکودار آزردہ و پژمردہ۔

شہزادہ تکودار نے اپنے باپ سے پوچھا: "باوا جان! کیا میں شیخ کی صحبت میں اٹھ بیٹھ سکتا ہوں؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "کیوں نہیں۔ میں نے تجھے اجازت دی لیکن کیا شیخ بھی اپنی ہم نشینی کا شرف بخشنا پسند فرمائیں گے؟"

شیخ نے کہا: "میری طرف سے اجازت ہے۔"

اباقہ خان نے کہا: "شیخ! میری خواہش ہے کہ میں آپکو کچھ دوں۔"

شیخ نے جواب دیا: "میں تجھ سے ضرور کچھ لوں گا مگر شرط یہ ہے کہ تو جو کچھ دے وہ تیرا اپنا ہو۔"

شمس الدین جوینی پر پھر خوف طاری ہو گیا۔

اباقہ خان نے پوچھا: "اس سے آپ کا مطلب؟"

شیخ نے جواب دیا: "اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ تیرے پاس تیرا کچھ بھی نہیں، دوسروں کا ہے، دوسروں کا چھینا ہوا، غصب کیا ہوا۔"

اباقہ خان نے بدمزگی سے کہا: "شیخ ایسی باتیں نہ کر۔"

شیخ نے کہا: "اباقہ خان! کمزور رعیت پر رحم کر تاکہ تو زبردست دشمن سے محفوظ رہے۔ جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی اس نے ایک لغو خیال پکایا اور بے ہودہ امید باندھی۔"

اباقہ خان نے درخواست کی: "شیخ! مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔"

شیخ نے جواب دیا: "اباقہ خان! دنیا سے آخرت میں کوئی چیز نہ جائے گی، نیکی بدی کے سوا۔ تجھے اختیار ہے کہ جو پسند کرے اپنے ساتھ لے جا۔"

اباقہ خان نے پوچھا: "میں کیا ہوں نیک یا بد؟"

شیخ نے جواب دیا: "اباقہ خان! اس سوال کا جواب میں کیا دوں؟ یہ سوال تو خود سے کر اور جو جواب ملے اس سے آگاہ کر۔"

اباقہ خان نے اصرار کیا: "اس سوال کا جواب آپ ہی دیں گے۔"

شیخ نے پھر وہی جواب دیا: "تو خود کو کیا سمجھتا ہے نیک یا بد؟ کیونکہ تیرے اپنے بارے میں تیری ہی رائے صائب اور وقیع ہو گی۔"

اباقہ خان نے پھر اصرار کیا: "میں آپکی رائے جاننا چاہتا ہوں۔"

شیخ نے پھر وہی جواب دیا: "اور میں تیری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

اباقہ خان نے پانچ بار یہی سوال کیا اور شیخ نے ہر بار یہی جواب دیا۔ وزیر اعظم جوینی سانس روکے کھڑا تھا۔ وہ بار بار اباقہ خان کے چہرے سے اس کے غیظ و غضب کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ اس نے دیکھا اباقہ خان کی آنکھیں نم ہو چکی ہیں۔

اباقہ خان نے شیخ کی تعریف کی: "میں نے شیخ جیسا دلیر اور حق گو انسان نہیں دیکھا۔" پھر شہزادوں سے کہا: "تم شیخ سے ملتے رہنا تاکہ ان سے عقل کی باتیں سیکھو۔"

جب یہ لوگ شیخ کے پاس سے واپس آئے تو اباقہ خان نے اپنے وزیر اعظم کا شکریہ ادا کیا جس نے شیخ جیسی عظیم شخصیت سے اس کی ملاقات کرا دی تھی۔ جوینی نے اباقہ خان کو راستے ہی میں بتایا: "شیخ ہی جیسی ایک ہستی اور بھی ہے۔ قونیہ کے مولانا جلال الدین۔ اگر موقع ملے تو ان سے ضرور ملیے گا۔"

اباقہ خان نے جواب دیا: "ضرور ملوں گا، ضرور ملوں گا۔"

اباقہ خان اپنے محل میں واپس پہنچا تو اس کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ اس کے آبا و اجداد نے اب تک جو کچھ کیا تھا وہ بیکار اور ہیچ نظر آنے لگا۔

اس نے ترمہ شیریں اور چند دوسری رقاصاؤں کو طلب کیا اور انہیں رقص کا حکم دیا۔ اسے شیخ نے جو کچھ بتایا تھا اس سے اس کی طبیعت پژمردہ اور اداس ہو گئی تھی۔ وہ اس اداسی کو رقص و موسیقی سے دور کرنا چاہتا تھا۔ اس محفل میں اسے چغتائی شہزادہ سوتغاق بھی یاد آیا۔ سوتغاق اباقہ خان سے ملے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ اس کا اباقہ خان کو دکھ تھا مگر اس خیال نے اسے خوش کر دیا کہ ترمہ شیریں کا عاشق اور اس کا رقیب دفع ہو چکا تھا۔

ترمہ شیریں کے رقص میں اب وہ پہلی جیسی بات نہیں تھی۔ وہ چلت پھرت اور لچکاؤ لہراؤ اور وہ تھرکن اور چمک دمک جس نے اباقہ خان کو اس کا شیدائی بنا دیا تھا، ان میں اب وہ پہلی جیسی شدت نہیں رہ گئی تھی۔ دوسری رقاصائیں ترمہ شیریں پر سبقت لے گئیں۔

شراب کا دور چلتا رہا اور اباقہ خان سب کچھ بھلا کے رقص و موسیقی میں غرق ہو گیا۔

اسی نشہ کے عالم میں اس نے ترمہ شیریں سے شکایت کی۔

"ترمہ شیریں! سچ بتا کیا میں نے بہت زیادہ پی لی ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "پتہ نہیں اس کا علم تو آپ کو ہونا چاہیے۔"

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے منہ کے پاس اپنا منہ لے گیا۔ بولا: "کیا تو بھی شیخ سعدی کی طرح صوفی ہو گئی ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "خانِ محترم! اگر میں نے تصوف اختیار کر لیا ہوتا تو یہاں دربار میں رقص نہ کرتی نظر آتی۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "شیخ بھی یہی کہتا تھا کہ اپنے بارے میں تو خود بہتر جانتا ہوگا اور اب تو بھی یہی کہہ رہی ہے کہ اس کا علم تو آپ کو ہونا چاہیے۔"

ترمہ شیریں نے عرض کیا۔ "خانِ محترم اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "طبیعت تو میری بھی صحیح نہیں ہے۔ لیکن میں آرام نہیں کرنا چاہتا۔"

اس نے ترمہ شیریں کو زبردستی اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ اس نے ترمہ شیریں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، بولا۔ "ترمہ شیریں! شیخ کے پاس ہرگز نہ جانا۔ میں جا کے پچھتایا۔ میرے اندر باہر آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ آگ آخر بجھے گی کیوں کر؟ اس کو بجھائے گا کون؟"

ترمہ شیریں سمجھ چکی تھی کہ اباقہ خان ہوش میں نہیں ہے وہ بری طرح بہک رہا ہے اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔

اباقہ خان پھر بڑبڑایا۔ "اور یہ شمس الدین جوینی۔ کم بخت یہی ورغلا کر لے گیا تھا، اب وہ قونیہ لے جانے کے چکر میں ہے۔"

ترمہ شیریں اس کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔

اباقہ خان پہلے تو برداشت کرتا رہا لیکن پھر وہ بے قابو ہو گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "اب میں کہیں بھی نہیں جا رہا ہوں۔ جوینی اب تو مجھے کہیں بھی نہیں لے جا سکے گا۔"

ترمہ شیریں نے مشورہ دیا۔ "آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میرے خیال میں آپ کو آرام کرنا چاہیے۔"

اباقہ خان ایک دم مشتعل ہو گیا، بولا۔ "کیا خراب ہے میری طبیعت بکس نے کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں۔ ترمہ شیریں! میں جنگ کی تیاریاں کر رہا ہوں کیونکہ مجھ کو ابھی ابھی یہ معلوم ہوا ہے کہ چغتائی خراسان کو واپس لینے کی نیت سے حملہ آور ہونے والے ہیں۔"

ترمہ شیریں خاموش رہی۔ اباقہ خان نے اس کو ڈانٹ دیا۔

"ترمہ شیریں! تو چپ کیوں ہو جاتی ہے؟ میں خوب جانتا ہوں کہ تو سونجاق سے مل گئی ہے اور چغتائی خانوادہ تیرے مشورے اور اجازت کے بغیر خراسان پر حملہ کرے گا۔"

ترمہ شیریں ان الزامات اور اتہامات سے کانپ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "محترم خان! یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ مجھ پر الزام کیوں لگا رہے ہیں۔ شہزادہ سونجاق سے میرا کیا تعلق؟"

اباقہ خان نے بہکتے ہوئے کہا۔ "میں تجھ پر تہمت لگا رہا ہوں، الزام لگا رہا ہوں۔ نہیں۔ میں نشے میں نہیں ہوں، میں ہوش میں ہوں کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ میں کچھ جانتا ہی نہیں؟ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔

سونجاق کہیں بھی نہیں گیا۔ اس کو تو نے کہیں چھپا دیا ہے۔۔۔۔۔"

دوسری رقاصہ لڑکیاں حیرت سے ترمہ شیریں کو دیکھ رہی تھیں شک و شبہے سے مشتبہ انداز میں۔ ترمہ شیریں نے اباقہ خان کی پروا کیے بغیر اس جگہ کو چھوڑ دیا، بولی۔ "اب میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکوں گی"

وہ چلی گئی اور اباقہ خان نشیلی آنکھوں سے اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دوسری رقاصاؤں کو مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔ "چلی گئی میں جانتا تھا وہ چلی جائے گی۔ سچائی کڑوی ہوتی ہے، شراب کی طرح بلکہ نیم کی طرح۔ میں سچا ترمہ شیریں جھوٹی۔ پھر سچ کے سامنے جھوٹ کس طرح ٹھہرتا؟"

اباقہ خان مدہوش ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ بڑبڑاتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے دن صبح جب کچھ کچھ ہوش آنے لگا تو اس نے نشہ کو برقرار رکھنے کے لیے تھوڑی اور پی لی۔ شمس الدین جوینی اور شہزادہ نکودار اباقہ خان کی شراب نوشی سے پریشان ہو رہے تھے۔ ان دونوں نے اباقہ خان کو سمجھانے کی کوشش کی مگر دونوں ناکام رہے شہزادہ نکودار نے پوچھا۔ "وزیر محترم! مجھے ایک بات تو بتائیں۔"

جوینی نے پوچھا۔ "کون سی بات؟ پوچھیے۔"

نکودار نے کہا۔ "کیا دعائیں قبول ہو جاتی ہیں؟"

جوینی نے جواب دیا۔ "ہاں شہزادے! دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔"

شہزادے نے کہا۔ "تب پھر میں شیخ کے پاس جاؤں گا اور ان سے دعا کی درخواست کروں گا۔"

جوینی نے پوچھا۔ "کس قسم کی دعا کرائیے گا آپ؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "میں شیخ سے کہوں گا کہ میرے بھائی کی شراب نوشی میں کمی واقع ہو جائے۔"

جوینی نے کسی قدر تامل اختیار کیا۔ شہزادے نے پوچھا۔ "کیا آپ نہیں چاہتے کہ میں شیخ سے دعا کی استدعا کروں؟"

جوینی نے جواب دیا۔ "نہیں میری خاموشی کا یہ سبب نہیں ہے بلکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دعا تو آپ کی بھی قبول ہو سکتی ہے۔"

شہزادے نے حیرت سے کہا۔ "کیا کہا؟ دعا ہماری بھی قبول ہو سکتی ہے؟ وہ کس طرح؟"

شمس الدین جوینی نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "شہزادے! میں جو کہنا چاہتا ہوں، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

شہزادے نے کہا۔ "آپ مجھ سے ڈرتے ہیں؟ کس بات کا ڈر؟"

جوینی نے جواب دیا۔ "جب کوئی مسلمان ہوتا ہے تو اسے اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اللہ کے رسول محمدؐ کی رسالت کی تصدیق کرنا پڑتی ہے چنانچہ جب کوئی کہتا ہے لا الٰہ الا اللہ (کوئی خدا نہیں اللہ کے سوا) تو اس کا یہ مطلب ہوتا

ہے کہ عبد اور معبود کا براہِ راست تعلق قائم کر دیا گیا۔ اب انسان یا مسلمان کو خدا سے جو کچھ مانگنا ہے براہِ راست مانگ لے۔ شیخ سعدی آپ کے لیے دعا تو کر سکتے ہیں مگر، اگر آپ خود اپنے حق میں یا اپنے باپ کے لیے دعا فرمائیں گے تو وہ جلدی قبول ہو جائے گی۔"

شہزادے نے کہا "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں پہلے اسلام قبول کروں اس کے بعد دعا مانگوں۔"

جوینی نے جواب دیا "یہ بات میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اسلام دینِ فطرت اور خدا کا آخری دین ہے آپ لوگ اس سے کہاں تک بھاگیں گے؟ آخر کار پکڑے جائیں گے۔"

شہزادے نے کہا "اتنا بڑا کام میں اپنی عقل سے تو نہیں کر سکتا میں اس سلسلے میں مشورہ لوں گا۔"

جوینی نے جواب دیا "نہیں شہزادے! ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ اگر آپ کو اسلام قبول کرنا پڑے تو آپ سیدھے شیخ سعدی کے پاس تشریف لے جائیے گا ورنہ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

شہزادہ کچھ سوچ رہا تھا، اس نے پھر پوچھا "کیا میری دعا قبول ہو سکتی ہے؟"

جوینی نے جواب دیا "آپ کی دعا ضرور قبول ہو گی، مگر اس کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔"

شہزادہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا "یعنی اگر میں مسلمان ہو جاؤں، تو میری دعا قبول ہو جائے گی؟"

جوینی نے جواب دیا "انشاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا)۔"

شہزادے کا اسلام سے متعلق اشتیاق بڑھ رہا تھا، اس نے جوینی سے کہا "مجھے اسلام کی بابت کچھ اور بتائیں۔"

جوینی نے جواب دیا "شہزادے! اسلام کے پیچھے خدا کی ذات کارفرما ہے، وہ اسلام کا محافظ ہے، آپ کے دادا اور والد نے اسلام کو مٹانے کی کتنی کوششیں کیں مگر نہیں کامیاب ہوئے۔"

شہزادہ یہ ساری باتیں بہت غور سے سن رہا تھا وہ کوئی اور بات کیے بغیر ہی وہاں سے چلا گیا۔ جوینی خوش تھا کہ اس نے چٹان میں بیج بو دیا تھا۔



اباقہ خان نے لہو و لعب کا ایک شاندار اہتمام کیا۔ اس نے محل کے سامنے والے میدان میں مہمانوں کی ضیافت کی اور اسی میدان میں کھیل کود اور مقابلوں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ شہزادہ نکودار سب کچھ دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔

اباقہ خان نے شہزادگان کو ادھر ادھر تعینات کر دیا مگر نکودار کو اپنے پاس بٹھایا۔

یہاں پہلوانوں کے مقابلوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ان میں منگول جفاکش طبقہ بھی پیش پیش تھا۔

اباقہ خان نے منگول پہلوانوں کو قیدیوں سے لڑوا دیا۔ اس نے مچھیروں کو حکم دیا کہ وہ خشکی میں جال پھینکیں اور مچھلیاں پکڑ کر دکھائیں اس نے تلوار بازوں کے مقابلے اتنی شان سے کرائے کہ دیکھنے والے دلدادہ اور عش عش کر اٹھے۔

اباقہ خان نے ان کی دوڑ کرائی اور خود تماشا دیکھتا رہا۔ اس دوڑ میں کئی رتھوں کے پہیے نکل گئے۔ اور ان کی سواریاں قلابازیاں کھاتی ہوئی دور جا گریں۔ اور پیچھے سے آنے والے رتھوں نے ان سواریوں کو کچل کر ان کا کام تمام کر دیا۔

اباقہ خان نے شہزادے نکودار سے کہا "شہزادے! اب اپنی طبعی زندگی کو جنگوں میں نہیں ضائع کر رہا۔ میرے آدمیوں کو مجھ سے ....." اور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

شہزادہ نکودار نے خلاف توقع سوال کر دیا "بابا جان! میں چند باتیں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔"

اباقہ خان نے شہزادے کو غور سے دیکھ کر جواب دیا "مجھ سے تو کچھ پوچھنا چاہتا ہے؟ پوچھ پوچھ، ضرور پوچھ۔"

اس وقت بھی اباقہ خان شراب پی رہا تھا۔

شہزادے نے پوچھا "آپ اتنی شراب کیوں پیتے ہیں؟"

اباقہ خان نے پوچھا "کیا میں بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں؟"

شہزادے نے جواب دیا "ہاں آپ بہت پینے لگے ہیں۔"

اباقہ خان نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا "پھر؟ میں حکمران ہوں میں ایل خان ہوں۔ میں جتنی شراب پیوں کہے ہے تیرا یہ سوال فضول ہے۔"

شہزادے نے کہا "ہم آپ جن لوگوں میں بستے ہیں وہ شراب نہیں پیتے ان کے مذہب میں شراب حرام ہے۔"

اباقہ خان نے رعونت سے جواب دیا "ہم کن لوگوں میں بستے ہیں؟ مسلمانوں میں؟ اگر ان کے مذہب میں شراب حرام ہے تو ہم کیا کریں؟ ہمارے آباؤ اجداد بھی شراب پیتے تھے۔ شراب اور گھوڑیوں کا دودھ پی کر معلوم دنیا کے بیشتر حصوں کو فتح کر ڈالا اور جن کے مذہب میں شراب حرام ہے ہمارے محکوم ہمارے غلام بن گئے ہیں۔ نکودار! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے محکوموں اور غلاموں کی پیروی کریں؟"

شہزادہ نکودار لاجواب ہو چکا تھا۔

اباقہ خان نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا "ہمیں معلوم ہے تو ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ مسلمانوں کی صحبت تجھے گمراہ کر رہی ہے۔ اگر تو نے اس قسم کی باتیں جاری رکھیں تو ہمیں تجھ کو مسلمانوں سے دور رکھنا پڑے گا۔"

رتھوں کی دوڑ بڑے زور شور سے جاری تھی۔ ان کے بڑے بڑے پہیے تیزی سے گھوم رہے تھے۔ ان میں جتے ہوئے گھوڑے بھی تیز

رفتاری کے سبب اپنے پیٹ کو زمین سے لگائے دے رہے تھے۔ اُن کے دونوں پچھلے پیر حد درجہ پیچھے اور اگلے دونوں پاؤں انتہائی آگے پڑ رہے تھے۔ جس سے اُن کے پیٹ تقریباً زمین کو چھونے لگے تھے۔ اُن میں کے ایک رتھ پر نکودار سوار تھا اور اس کا رتھ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اباقہ خان خوش تھا کہ ولی عہدِ سلطنت نے مقابلے میں شریک جملہ رتھوں کو شکست دے دی تھی۔ کئی رتھ اُلٹ چکے تھے اور اُلٹے ہوئے رتھوں کے دونوں پہیے ہوا میں تیزی سے گھوم رہے تھے اور اُن کے گھوڑے زخمی حالت میں بار بار اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسی عالم میں ایک گھڑ سوار اباقہ خان سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ اباقہ خان کے آدمی اس پُرلطف مشغلے میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اس آدمی کو اباقہ خان تک نہیں جانے دیا اور کہا "خان سے ملاقات محل میں ہو سکتی ہے۔"

گھڑ سوار نے جواب دیا "میں ایک اہم خبر لایا ہوں۔ اگر مجھے اسی وقت اباقہ خان سے نہ ملایا گیا تو وہ میری لائی ہوئی نازک اور خطرناک خبر کے پیشِ نظر تم سب سے ناراض ہو جائیں گے۔"

وہ لوگ اسے اباقہ خان سے ملانے پر رضامند ہو گئے۔

اباقہ خان اس اجنبی سے ملا اور اس سے سرگوشی میں باتیں ہونے لگیں۔ نووارد کہہ رہا تھا "خانِ محترم! میں خراسان سے چلا آ رہا ہوں۔ چغتائی فرماں روا براق خان جو اب غیاث الدین ہو چکا ہے خراسان پر حملہ کرنے والا ہے۔"

اباقہ خان نے پوچھا "کیا حملہ آور فوج میں شہزادہ سوغاق بھی موجود ہے؟"

مخبر نے جواب دیا "موجود ہے اور شاید وہی فوج کی کمان بھی کر رہا ہے۔"

اباقہ خان نے تفریح کے مشاغل کو یک لخت منسوخ کر دیا اور محل واپس چلا گیا۔ اباقہ خان نے خراسان کے دفاع کے لیے شہزادہ نکودار کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور ترمہ شیریں سے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کی۔

ترمہ شیریں حیران تھی کہ اباقہ خان تو ساتھ چلنے کا حکم دے سکتا تھا پھر ساتھ چلنے کی درخواست کیسی؟

ترمہ شیریں نے ساتھ نہ چلنے کا عذر پیش کیا "خانِ محترم! جنگوں میں عورتوں کا کیا کام! میرا خیال ہے اس مہم میں میرا جانا مناسب نہیں ہے۔"

اباقہ خان نے درشت لہجہ اختیار کیا "کیا مناسب ہے کیا مناسب نہیں ہے اس کا فیصلہ میں کروں گا، تو نہیں۔ تیرا اس جنگ میں ہمارے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس جنگ کی بنیاد تو نے ہی ڈالی ہے تو ہی اس جنگ کا سبب ہے۔"

ترمہ شیریں نے حیرت سے کہا "یہ جنگ میری وجہ سے ہو رہی ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا "ہاں اس جنگ کا سبب تو ہے۔ یہ جنگ شہزادہ سوبخاق ہم پر مسلط کر رہا ہے تیرا عاشق شہزادہ سوبخاق۔"

ترمہ شیریں نے خوفزدہ ہو کر آہستہ سے کہا "اگر شہزادہ سوبخاق مجھ پر عاشق ہو گیا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں کس حد تک قصوروار ہوں؟"

اباقہ خان نے کہا "ترمہ شیریں! میں تجھ کو کب قصوروار قرار دے رہا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس قصے کو خراسان ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا جائے۔ خراسان شہزادہ سوبخاق کا مقتل بھی ہو سکتا ہے اور میرا بھی۔ وہاں تو موجود ہو گی تو ہم دونوں میں سے کوئی ایک اپنے رقیب کا سر تیری خدمت میں پیش کر سکے گا۔"

ترمہ شیریں سوگوار ہو گئی "خانِ محترم! آپ مجھے خوار نہ کیجیے۔"

اباقہ خان نے جواب دیا "خوار میں نے نہیں سوبخاق نے کیا ہے۔ ہمیں بھی اور تجھے بھی اور اب ہم اُسے خوار کرنا چاہتے ہیں۔"

اباقہ خان نے اپنی افواج کو بڑی عجلت میں تیار کیا۔ اس نے اپنے سرداروں کو اپنے سامنے کھڑا کر کے مخاطب کیا "مجھے شکایت تھی کہ تمھارے ہتھیاروں کو زنگ لگ رہے ہیں اور تمھاری جنگجویانہ صلاحیتیں مرتی جا رہی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے وجود کو ثابت کرو۔ اگر خراسان ہاتھ سے نکل گیا تو دشمنوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے اور تبریز اور مراغہ بھی خطرات میں گھر جائیں گے۔"

سرداروں کے چہرے خوشی اور جوش سے سرشار نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تلواریں نیام سے نکال کر فضا میں بلند کیں اور وعدہ کیا کہ اباقہ خان کو مایوس نہیں کریں گے۔

اباقہ خان اپنے عساکر کے ساتھ خراسان روانہ ہو گیا۔ خراسان کے مشرق اور شمال میں چغتائی افواج جمع ہو رہی تھیں۔ اباقہ خان کی فوجوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چغتائیوں کے مقابل صف آرا ہونا شروع کر دیا۔ اباقہ خان اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی فوج کے سامنے سے کئی بار گزرا۔ دوسری طرف چغتائی شہزادہ سوبخاق بھی اپنی فوج کا معائنہ کر رہا تھا۔ دونوں کے درمیان فاصلہ اتنا زیادہ تھا، کہ سوبخاق اور اباقہ خان ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔

مقابلے سے پہلے اباقہ خان اپنے گھوڑوں کو دوڑاتا ہوا چغتائیوں کے مقابل پہنچ گیا اور وہاں اعلان کیا "کیا شہزادہ سوبخاق یہاں موجود ہے؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اباقہ خان کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ اب وہ چغتائیوں کے بہت زیادہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اعلان کیا "اگر شہزادہ سوبخاق یہاں موجود ہو تو اس کو یہاں میرے سامنے بھیج دیا جائے۔ میں اس سے چند ضروری باتیں کروں گا۔"

اسی دوران اباقہ خان کو اپنے پیچھے سے گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے گرد و غبار کے بادل میں چند سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ جب وہ بالکل قریب آ گئے،

تو اباقہ خان نے انھیں پہچان لیا۔ اُن میں ایک تو اس کا اپنا بیٹا، اور سلطنت کا ولی عہد نکودار تھا اور بقیہ سات اس کی فوج کے سردار تھے۔ اباقہ خان نے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "میں آپ کو اس طرف تنہا آتے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "تم لوگ واپس جاؤ۔ میں شہزادہ سونجاق سے چند ضروری باتیں کر کے واپس آ جاؤں گا۔"

نکودار نے کہا۔ "آپ کو تنہا پا کر اگر شہزادے سونجاق نے دغابازی کی تو؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "ایسا نہیں ہوگا۔ میں اپنی قوم کے مزاج سے واقف ہوں۔ اور اگر اس نے مجھ سے دھوکا بھی کیا تو اس سے سونجاق کو فائدہ کیا پہنچے گا؟ میری فوج اور سلطنت کے ولی عہد دونوں ہی اُن کا سر کچلنے کے لیے زندہ اور سامنے موجود رہیں گے۔"

لیکن نکودار واپس جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔

اباقہ خان نے کہا۔ "اچھا، اگر تو واپس نہیں جانا چاہتا تو خیر کوئی بات نہیں تم لوگ یہیں میرے پیچھے کھڑے رہو۔ میں جنگ سے پہلے شہزادہ سونجاق سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

جب اباقہ خان سونجاق کو للکار رہا تھا، سونجاق ایک مُشکی رنگ کے گھوڑے پر سوار اپنی سپاہ سے نکل کر اباقہ خان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ تقریباً بیس قدم دُور رُک گیا اور اباقہ خان سے پوچھا۔ "کہو تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "میں تجھ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ یہ جنگ کیوں ہو رہی ہے؟"

شہزادے سونجاق نے کہا۔ "اباقہ خان وہ دن یاد کر جب میں تمہارے پاس اس غرض سے ٹھہرا ہوا تھا کہ چغتائی اور تولوئی خانوادوں میں ایکا ہو جائے۔ اور باہمی رنجشیں اور غلط فہمیاں دُور کر دی جائیں۔ لیکن تم نے اس کا کیا جواب دیا تھا، یاد کرو۔"

اباقہ خان نے اسے جھٹلا دیا۔ "یہ جھوٹ ہے، تو نے یہ جنگ اس لیے مسلط کی ہے کہ تو ترمہ شیریں کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ تیرے دل میں آتشِ عشق موجزن ہے اور وہی آگ تجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔"

شہزادہ سونجاق ہنس دیا۔ "ترمہ شیریں میں چاہتا تو تمھاری عدم موجودگی میں ترمہ شیریں کو اپنے ساتھ لے آتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔"

اباقہ خان چیخا۔ "اُسے تو اپنے ساتھ کس طرح لا سکتا تھا؟ اور وہ تو اس وقت بھی ہمارے ساتھ آئی ہے اگر ہمت ہے تو اسے حاصل کر لے۔"

شہزادہ سونجاق نے جواب دیا۔ "کوئی اور کام کی بات کرو اباقہ خان ترمہ شیریں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

اباقہ خان بہت جذباتی ہو رہا تھا، بولا۔ "میں ترمہ شیریں کو اپنے ساتھ اس لیے لایا ہوں کہ اس جنگ کے نتیجے میں تیرا سر اس کی خدمت میں پیش کروں اور اگر تو کامیاب ہو جائے تو میرا سر اس کی خدمت میں بطورِ نذرانہ پیش کر دے۔ دیکھئے اس میں کون کامیاب ہوتا ہے۔"

اس دوران براق خان محمد غیاث الدین بھی اپنے گھوڑے پر اباقہ خان کے رُوبرو پہنچ گیا۔ اور شہزادہ سونجاق نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کیا مفاہمت کی باتیں ہو رہی ہیں؟ اب مفاہمت اسی صورت میں ممکن ہے کہ خراسان کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "مفاہمت اور میں؟ میری طرف مفاہمت کی درخواست؟ ہم واپس جاتے ہیں طبلِ جنگ بجوا دیا جائے۔"

براق خان نے کہا۔ "جنگ۔ پھر فتح یا شکست۔ اب اس بنیاد پر جنگ لڑی جائے گی۔"

اباقہ خان نے اپنی فوج میں واپس جاتے ہی تیاری کا حکم دے دیا۔

اب دونوں فوجیں پہل کرنے کے لیے بے چین تھیں۔ شہزادہ نکودار میمنہ پر فائز تھا۔ اس نے اپنی فوج کو شمال کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔ شہزادہ سونجاق اس کے ارادوں سے باخبر تھا۔ اس نے اپنے میسرے کو شمال کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔ وہ بھی ایک ہی گھاگ تھا۔ جب یہاں سونجاق اور نکودار کا آمنا سامنا ہوا تو سونجاق سے عین میدانِ جنگ میں شہزادہ نکودار نے پوچھ لیا۔ "سونجاق! ان دنوں کو تو یاد کرو، جب میں نے تجھ کو اپنا مہمان بنا کے رکھا تھا اور اپنے باپ اباقہ خان کی مرضی کے خلاف تُن کی عدم موجودگی میں اپنا مہمان بنایا تھا۔"

سونجاق نے جواب دیا۔ "اسی بات نے ابھی تک میرے پاؤں کو باندھ رکھا ہے ورنہ میں اتنی دیر کہاں انتظار کرتا۔"

اس دوران ایک دم ہاہاکار شروع ہو گئی۔ اباقہ خان اپنے محاذ پر جنگ شروع کر چکا تھا۔ نکودار نے سونجاق سے کہا۔ "جنگ کا آغاز ہو چکا ہے اب بات چیت بند اور مقدر کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔"

سونجاق نے حیرت سے کہا۔ "مقدر کا فیصلہ؟ یہ تو مسلمانوں کی باتیں ہیں۔ منگول تو مقدر کے قائل نہیں ہوتے۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "جب ہم دونوں میں مفاہمت کا کوئی امکان ہی نہیں رہا اور جنگ ناگزیر ہو چکی ہے تو ہم اس کو مقدر نہیں تو اور کیا کہیں گے؟"

سونجاق کے لشکر میں سے کسی نے تیر چلا کے جنگ کا آغاز کر دیا۔

عورتوں کے خیمے بالکل پیچھے آخر میں تھے۔ سونجاق ایک دُوسرا ہی منصوبہ بنا رہا تھا۔

جنگ میں دیکھتے ہی دیکھتے شدت پیدا ہو چکی تھی۔ اباقہ

اپنی پوری کوشش اور بھرپور قوت سے حملہ کرکے جلد از جلد جنگ کے نتائج اپنے حق میں حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے اپنی فوج میں بار بار یہی اعلان کیا کہ جنگ کے بعد جس کسی کو بھی سونجاق کی لاش ملے میرے پاس لے آئے۔ میں اس کے صلے میں انعام و اکرام سے مالا مال کر دوں گا۔"

دوسری طرف سے سونجاق نے بھی یہی اعلان کر دیا۔" جس کو بھی اباقہ خان کی لاش ملے میرے پاس لے آئے۔ میں اس شخص کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دوں گا۔"

اب سونجاق اور اباقہ خان کو میدانِ جنگ میں ڈھونڈنا دوبھر ہو گیا تھا۔ دونوں ہی ادھر ادھر چھپے پھر رہے تھے۔ کئی بار تیر ان کے پاس سے سنسناتے گزر گئے تھے۔

اباقہ خان چغتائیوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور سونجاق بھی کہیں غائب ہو چکا تھا۔

سونجاق مارتا کاٹتا بچتا بچاتا اباقہ خان کی فوج کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں جہاں خواتین تھیں اور ترمہ شیریں تھی۔ یہاں چند محافظوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو ہلاک کر دیے گئے۔

سونجاق نے خواتین کے خیمے کے پاس ایک نعرہ لگایا۔" ترمہ شیریں تم کہاں ہو آ جاؤ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

خیموں کے اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

سونجاق نے کہا۔" ترمہ شیریں! کیا تم نے میری آواز سنی ہے؟ نہیں سنی تو اب سن لو۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اتنے میں نکودار کا ایک دستہ سونجاق کی طرف پہنچ گیا اور سونجاق اور اس دستے میں جنگ شروع ہو گئی۔

سونجاق اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے نکودار کو للکارا۔" نکودار! شرارتوں سے باز آجا اور اپنے باپ کے پاس چلا جا۔ میں تجھ کو نہیں مار سکتا۔"

شہزادہ نکودار کا دستہ پسپا ہو کر اور مشرق میں چلا گیا۔

سونجاق نے موقع غنیمت جان کر ایک بار پھر ترمہ شیریں کو آواز دی۔" ترمہ شیریں! زیادہ وقت نہیں ہے میں یہاں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

خواتین کے خیمے کا پردہ اٹھا اور اس میں سے ترمہ شیریں نمودار ہوئی۔ ترمہ شیریں کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی سونجاق کی طرف بڑھی۔ سونجاق بھی گھوڑے سے اتر کر ترمہ شیریں کی جانب دیوانہ وار بڑھا۔ اسی وقت ایک طرف سے تیروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ سونجاق بال بال بچ گیا۔ اس نے پہلے تو ترمہ شیریں کو گھوڑے پر بٹھایا اور اس کے بعد آگے خود بیٹھ گیا۔ بولا۔" ترمہ شیریں! تو میری کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھ رہ۔ کیونکہ جب گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا ہو گا تو تو گر بھی سکتی ہے۔"

ترمہ شیریں نے سونجاق کی کمر بہت مضبوطی سے پکڑ لی۔

سونجاق نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور یہ جا وہ جا۔ بہت جلد وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد چغتائیوں نے پسپائی اختیار کر لی اور یہ جدھر سے آئے تھے اسی طرف واپس چلے گئے۔

اباقہ خان جب اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو اسے اطلاع دی گئی کہ شہزادہ سونجاق ترمہ شیریں کو لے گیا۔

اباقہ خان چیخ کر بولا۔" کون لے گیا میری ترمہ شیریں کو؟"

کسی نے جواب دیا۔" شہزادہ سونجاق۔ غالباً شہزادہ سونجاق۔"

اباقہ خان نے کہا۔" اور تم سب اس کو لے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اُف! تمہاری بہادری پر، افسوس! شرم کرو اپنی مردی پر۔"

اباقہ خان خواتین کے خیمے میں گیا اور پوچھا۔" ترمہ شیریں کس طرح گئی؟"

ایک عورت نے جواب دیا۔" کسی مرد نے خیمے کے قریب آکر ترمہ شیریں کو آواز دی اور وہ اپنے زیورات کی پوٹلی لے کر اسی وقت باہر چلی گئی۔" مزید کہا۔" مگر میں ترمہ شیریں کی ہمت کو داد دوں گی۔ اس نے نہایت بے شرمی سے اپنے آگے بیٹھے ہوئے نوجوان کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا۔"

اباقہ خان دانت پیسنے لگا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر طیش میں بولا۔" سونجاق مردود افسان! ترمہ شیریں تجھ کو بہت زیادہ گراں پڑے گی۔ تو نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے تجھے اس بے جا جسارت کی سزا ضرور ملے گی۔"

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ چغتائیوں کا ایک سپاہی بھی دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاں میدانِ جنگ میں دونوں طرف کے سپاہیوں کی لاشیں دور دور تک بکھری ہوئی تھیں۔

نکودار البتہ غائب تھا۔ کئی گھنٹے بعد جب وہ واپس آیا تو اباقہ خان نے طیش میں پوچھا۔" تو کہاں غائب تھا؟"

شہزادہ نکودار نے جواب دیا۔" میں سونجاق کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں اس کو سزا دینا چاہتا تھا۔"

اباقہ خان نے بڑے چین سے پوچھا۔" پھر کیا ہوا؟"

شہزادے نے جواب دیا۔" پھر کیا ہوتا وہ اپنے علاقوں میں داخل ہو گیا میں واپس چلا آیا۔"

اباقہ خان نے جوش سے کہا۔" میں چغتائیوں کو تباہ و برباد کر دوں گا۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہے انہیں اس کی سزا دی جائے گی۔"

شہزادہ نکودار باپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا بالآخر بمشکل تمام رک رک کر کہا۔" آپ کو ترمہ شیریں کو یہاں نہیں

لاتا تھا۔"

اباقہ خان نے طیش میں جواب دیا: "مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ اس کا فیصلہ میں خود کرتا چلا آیا ہوں۔ آئندہ تو اس طرح بات نہیں کرے گا۔"

شہزادہ نکودار نے کہا: "باوا جان! اب آپ کیا کریں گے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "اب میں چغتائیوں کو خاک میں ملا دوں گا۔"

شہزادے نے پوچھا: "کیوں؟ اور کس لیے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "اپنے لیے، اپنی عزت کے لیے، اپنی آن کے لیے۔ ترنہ شیریں کے لیے۔"

نکودار نے عرض کیا: "پدرِ محترم! ترنہ شیریں ہماری آن، ہماری عزت تو نہیں بن سکتی۔ جو عورت اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی جائے وہ ہماری آن، ہماری عزت تو نہیں بن سکتی۔"

اباقہ خان کو جیسے ہوش آگیا، بولا: "نکودار! تو نے کیا کہا؟ ذرا ایک بار پھر تو اپنی باتیں دہرا۔"

نکودار نے اپنی ساری باتیں پھر سے کہہ دیں۔ اباقہ خان نے کہا: "ترنہ شیریں! تو نے یہ اچھا نہیں کیا حالانکہ تیرا سب کچھ مراغہ میں ہے۔ میں چاہوں تو تیرے رشتے داروں کو خوب خوب ستا سکتا ہوں۔"

اباقہ خان مراغہ واپس چلا گیا لیکن وہ بہت دل برداشتہ تھا۔ اس کے سردار بھی خاصے شرمندہ تھے کہ وہ ترنہ شیریں کو خراسان کے محاذ پر گنوا آئے تھے۔

وزیرِ اعظم شمس الدین جوینی نے اباقہ خان کو بہت سمجھایا اور کہا: "حضور والا! ترنہ شیریں یہ جانتی ہے وہ شہزادہ سوبناق کے بس میں بھی نہیں رہے گی۔ آپ صبر کریں اور نتائج کا انتظار کریں۔"

اباقہ خان اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ آہستہ آہستہ کہنے لگا: "جوینی! میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ چین سے ہمارا رابطہ منقطع ہو چکا۔ چغتائی ہمارے دشمن بن گئے۔ برقائی خان بھی ہمارا دوست نہیں رہا۔ میں بالکل تنہا ہو گیا۔ بتاؤ اب میں کیا کروں؟"

وزیرِ اعظم جوینی نے جواب دیا: "خانِ محترم! آپ جتنے تنہا آج ہیں اس سے زیادہ تنہائی کچھ دنوں بعد محسوس کریں گے اور اس کا علاج یہ ہے کہ آپ حوصلے کے لیے شیخ سعدی اور مولانا رومی کی صحبت اختیار کریں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ ایک جہاں، ایک زمانہ جو دکھی ہے، انہی کے پاس جاکے سکون حاصل کرتا ہے۔"

اباقہ خان نے کہا: "لیکن میں چغتائیوں کو ان کے کیے کی سزا دینا چاہتا ہوں۔"

وزیرِ اعظم نے جواب دیا: "اگر آپ کسی کو سزا دینا چاہتے ہیں تو اس کا کیا طریقہ ہے، کیا آپ جانتے ہیں؟"

اباقہ خان نے کہا: "نہیں، مجھے وہ طریقہ نہیں معلوم۔"

وزیرِ اعظم نے عرض کیا: "آپ میرے ساتھ مولانا رومی کی خدمت میں ضرور چلیں کیونکہ وہاں کا سا سکون کہیں اور نہیں مل سکتا۔"

اباقہ خان کو اس میں تامل تھا، پوچھا: "میں سکون کی خاطر وہاں جانا چاہتا ہوں۔ کس قسم کا سکون؟ میرا سکون میدانِ جنگ میں ملے گا اور میں پوچھتا ہوں یہ سکون ہے کیا چیز؟"

وزیرِ اعظم گھبرا گیا۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ ان وحشیوں اور سرکشوں کا کوئی بھروسہ نہیں، ابھی خاصی سمجھداری کی باتیں کرتے کرتے اچانک بہک جاتے ہیں اور ان کی جبلّت عود کر آتی ہے۔ اس نے نہایت تحمل سے سمجھایا: "جنابِ والا! میری خواہش تھی کہ آپ کم از کم ایک بار مولانا رومی کی خدمت میں ضرور حاضری دیں۔"

اباقہ خان بھڑک اٹھا: "حاضری دیں، کیا مطلب؟ حاضریاں تو لوگ میرے دربار میں دیا کرتے ہیں اور میں اس درویش کے در پر حاضری دوں۔ جوینی! سچ بتا، تیرا ان باتوں سے مقصد کیا ہے؟ تو چاہتا کیا ہے؟"

جوینی نے اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھا اور بڑے اطمینان سے جواب دیا: "خانِ محترم! میں آپ کا ہمدرد ہوں اور میں نے ہمیشہ ہر معاملے میں آپ کا مفاد مدِنظر رکھا ہے۔ میرا کیا مقصد ہو سکتا ہے اور میں کیا چاہوں گا۔ میں شیخ سعدی کا، ان کی عقل و دانش سے معترف ہوں اسی طرح میں مولانا رومی کا نہ صرف مداح بلکہ پرستار ہوں۔ مولانا بے لوث اور حد درجہ عقلمند انسان ہیں۔ قانع اور بے نیاز۔"

اباقہ خان نے کہا: "میں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں اس طرح تو اسلام کی تبلیغ تو نہیں کرنے لگا۔ میں نے ان عیسائیوں سے ہمیشہ نفرت کی ہے جو ہر وقت میری ماں دوقوز کو گھیرے رہتے تھے۔ اور اس کے سرخ چوبی چیپل میں حاضریاں دیا کرتے تھے۔ میری ماں تو مسیحی ہو بھی گئی تھی لیکن میں نے اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں لیا۔ میں عیسائی نہیں بنا۔ میں نے ہمیشہ اپنے باپ کی تقلید کی ہے۔ وہ بھی کبھی عیسائی نہیں بنا۔"

جوینی نے کہا: "خانِ محترم! میں اسلام کی تبلیغ کیوں کروں گا؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ماحول انسان کا سب سے بڑا مبلغ ہوتا ہے۔ ہمارا آپ کا پورا ماحول اسلام کی تبلیغ کر رہا ہے۔ اسی تبلیغ کے نتیجے میں چغتائی مسلمان ہو گئے اور جوچی خانوادہ بھی اسلام کے زیرِ سایہ آگیا۔ آپ نے اسے نظر انداز کر رکھا ہے اور دھارے کی مخالف سمت تیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا آپ کب تک اس مخالف سمت میں بہتے رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن آپ کو یہ ضرور سوچنا پڑے گا کہ قراقرم سے رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد کس سے رشتہ قائم کرنا بہتر رہے گا؟ شیخ سعدی

اور مولانا رومی انسانوں کے دل و دماغ پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ زمانہ انہی دونوں کا ہے کیا آپ اس زمانے کے باہر قدم رکھ سکتے ہیں؟"

اباقہ خان کو غصہ آ گیا: "اچھا اب اپنی بکواس بند کر۔ یہ زمانہ میرا ہے۔ شیخ سعدی یا مولانا رومی جنہیں عقل و خرد کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملا۔ جو ہمارے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ جن کی روزی اور معیشت ہمارے رحم و کرم پر ہے ان کا زمانے پر کیا اختیار ہو سکتا ہے؟"

جوینی نے بے دلی سے جواب دیا: "بیشک یہ آپ کا زمانہ ہے لیکن یہ ان دونوں کا زمانہ بھی ہے۔ ان کی خرد کا زمانہ، ان کے دلپذیر نصائح کا زمانہ، ان کے دل آویز سبق آموز حکایات کا زمانہ۔ آپ مولانا رومی کو مراغہ سے کس طرح بھیجیں گے؟"——

اباقہ خان نے بات ٹالنی چاہی، بولا: "جب تک میں چغتائیوں کو مزہ نہ چکھا لوں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

وزیر اعظم نے عرض کیا: "خانِ محترم! آپ کو شاید یہ بات نہیں معلوم کہ چغتائی اور برقائی خانوادے مولانا رومی کی خدمت میں برابر حاضریاں دیتے رہتے ہیں۔ مولانا رومی کی دعائیں ان کے حال میں شامل ہو چکی ہیں......"

اباقہ خان چڑ گیا: "میں مولانا رومی کے پاس جاؤں گا اور دیکھوں گا وہاں چغتائی اور برقائی خانوادوں کے کتنے آدمی موجود ہیں؟"

وزیر اعظم کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ بولا: "اور میں دکھا دوں گا کہ وہاں کتنی حکومتوں کے آدمی موجود رہتے ہیں۔"

●

ترزہ شیریں کی جدائی نے اباقہ خان کو بہت اداس کر دیا تھا۔ اسے عورتوں کی اس روایت پر یقین نہیں آتا تھا کہ ترزہ شیریں کسی مغل کی آواز سن کر اس کے ساتھ چلی گئی۔ اباقہ خان کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ اس نے ترزہ شیریں کو بہت چاہا تھا اور اس کا بے حد خیال رکھا تھا مگر وہ پھر بھی وفادار نہ نکلی۔

پھر اچانک اباقہ خان گوشہ نشین ہو گیا۔ نظم حکومت نکودار چلاتا تھا۔ اباقہ خلوت تنہائی میں سوچ رہا تھا کہ ترزہ شیریں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ وہ کاروبار حیات سے اکتا چکا تھا۔ لیکن انہیں ان کے حال پر بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے سوچا ترزہ شیریں کی طرح اقتدار بھی بڑا ہرجائی ہوتا ہے۔ یہ اسی وقت تک اس کا ساتھ دیتا ہے جس حد تک اس کا مقصد اس کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ عورت اور اقتدار میں بڑی مماثلت اور مشابہت دیکھ رہا تھا۔ عورت کی طرح اقتدار بھی کسی سے وفادار نہیں ہوتا۔ عورت کی طرح اس کے بھی کئی کئی چاہنے والے ہوتے ہیں۔ ترزہ شیریں دھوکہ دے گئی۔ اقتدار بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ اس نے سوچا اگر ترزہ شیریں کی طرح اقتدار سے بھی لاپروائی برتی گئی تو یہ بھی کسی اور کے پاس جا سکتا ہے۔ اس کے سامنے چنگیز خان اور ہلاکو خان کی مثال تھی۔ دادا چنگیز خان اور ہلاکو خان ہمیشہ اقتدار کو وسعت دیتے رہے لہٰذا اقتدار ان کا غلام رہا لیکن جب اس پر توجہ نہیں دی گئی، یہ باغی ہو کے بے وفا ہو گیا۔

وہ تخلیہ سے باہر آیا اور اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے باپ ہلاکو کے نامکمل کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائے گا، ادھورے کام پورے کرے گا۔

اس نے وزیر شمس الدین جوینی کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔

"میرا باپ ہلاکو خان اگر زندہ رہتا تو کیا کرتا؟"

شمس الدین نے جواب دیا: "وہ برقائی خان سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتا تھا اور قفقاز کے شمال کے دریائے تریک کو اپنی اور برقائی خان کی حکومتوں کی حد فاصل قرار دینا چاہتا تھا۔"

اباقہ خان نے بے چینی سے پوچھا: "اور، اور؟"

شمس الدین جوینی نے جواب دیا: "اور مصر کے مملوک فرمانروا سلطان رکن الدین بیبرس کو سزا دینا چاہتا تھا جس نے اس کے لائق اور نامور جنرل قطبوغا کو شکست دے کر قتل کر دیا تھا۔"

اباقہ خان نے اعلان کیا: "اور میں اپنے باپ کے نامکمل کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ میں برقائی خان سے بھی جنگ کروں گا۔ اور مصر کے رکن الدین بیبرس کو بھی اس کی گستاخیوں کی سزا دوں گا۔"

شمس الدین جوینی خاموش رہا۔ اباقہ خان اس کی معنی خیز خاموشی سے چڑ گیا۔ بولا: "تم کیوں چپ ہو؟ کیا تم میری تجویزوں سے متفق نہیں ہو؟"

عقلمند وزیر نے جواب دیا: "خانِ محترم! یہ بات نہیں ہے۔ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

اباقہ خان نے پوچھا: "تو کیا سوچ رہا ہے؟"

وزیر نے جواب دیا: "انسان جہاں رہتا ہے اپنے پڑوسیوں سے خوشگوار تعلقات رکھتا ہے۔ چغتائی خانوادہ اور برقائی خاندان آپ کے چچا زاد تایاؤں کی اولاد ہیں اور ساتھ ہی پڑوسی بھی۔ قراقرم سے آپ کا رشتہ منقطع ہو چکا۔ چین آپ کے ملک سے بہت دور ہے اب آپ کو اپنے پڑوسیوں سے جنگ کے بجائے دوستی کرنی چاہیے۔ چغتائی اور برقائی خانوادے رشتہ دار ہونے کے علاوہ پڑوسی بھی ہیں۔ اور پڑوسیوں سے لڑنے جھگڑنے والا کبھی بھی خوش نہیں رہ سکتا۔"

اباقہ خان نے مضطربانہ پوچھا: "اور مصر کے بیبرس کی بابت تیری کیا رائے ہے؟"

وزیر نے جواب دیا: "مصر کا فرماں روا مسلمان ہے۔ اس کی برقائی خان سے بڑی گہری دوستی ہے۔ آپ کے خاندان اور فوج میں اسلام نے ہلچل سی مچا رکھی ہے بہت سے تو اعلانیہ مسلمان ہو چکے ہیں اور بہتوں نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں آپ کی فوج کسی مسلمان سے کس طرح جنگ کرے گی؟"

اباقہ خان نے جوش و خروش سے کہا "میں تیری بات نہیں مانوں گا۔ تو چونکہ خود مسلمان ہے اس لیے تو نہیں چاہتا کہ مسلمانوں سے جنگ کروں۔ میں سب سے لڑوں گا، ہر ایک سے جنگ کروں گا۔"

وزیر نے نہایت تحمل سے مشورہ دیا "تب پھر حضور والا! اس مشورے میں ولی عہد نکودار کو بھی شامل کر لیا جائے تو بہتر ہے۔"

اباقہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں یہ مشورہ قابل قبول ہے۔"

چنانچہ شہزادہ نکودار کو بھی ان مشوروں میں شامل کر لیا گیا۔ وزیر شمس الدین نے نکودار کو ان مشوروں میں اس لیے شامل کر لیا تھا کہ نکودار مسلمانوں کا ہمدرد تھا اور اس شہزادے کی بابت یہ بھی مشہور ہو چلا تھا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن اس کا اعلان نہیں کیا۔

جب اباقہ خان نے شہزادہ نکودار کو حکم دیا کہ وہ بھی ساتھ چلنے کی تیاری کرے تو اس نے نہایت لوث احترام سے عرض کیا کہ آج وہ کہیں بھی نہیں جائے گا۔ اور نہ ہی وہ جنگوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کرنا چاہتا ہے۔

اباقہ خان نے جواب دیا "جنگ سے پرہیز! یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ میں تیرے دادا ہلاکو خان کی وہ خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں جنھیں وہ نامکمل اور ادھورا چھوڑ گئے۔"

نکودار نے جواب دیا "وہ زمانہ اور تھا یہ زمانہ اور ہے۔ اگر آج دادا ہلاکو خان ہم میں موجود ہوتے تو ان کی سوچ بھی بدل گئی ہوتی۔ وہ بھی اسی طرح سوچتے جس طرح ہم اور وزیر اعظم جوینی سوچ رہے ہیں۔ جنگیں کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ فاتح اور مفتوح دونوں ہی ایک قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں۔"

اباقہ خان ایک دم برہم ہو گیا "وزیر اعظم جوینی! کیا تو نے نکودار کو اپنا ہم خیال بنا لیا ہے؟"

وزیر نے جواب دیا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

اباقہ خان نے شہزادے کو حکم دیا "ہم برقائی خان سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے جنگ کی تیاریاں اسی وقت سے شروع ہو جانی چاہئیں۔"

نکودار نے جواب دیا "میں باپ کے حکم کی تعمیل آنکھ بند کر کے کروں گا لیکن یہ بھی کہوں گا کہ ہم جو کچھ کرنے جا رہے ہیں، سعیٔ لاحاصل سے کم نہیں۔"

اباقہ خان بیدار ہو چکا تھا۔ برقائی خان کے خلاف جنگی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دوسری طرف برقائی خان پہلے ہی سے تیار تھا۔ اس جنگ میں ہلاکو خان کے نامی گرامی فوجی سردار بیچو خان کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اور اس کو ہراولی دستوں کے ساتھ پہلے ہی برقائی خان کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

اباقہ خان کے دل کا حال ناگفتنی تھا خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ جب جنگ کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اس نے اعلان کر دیا کہ وہ جنگ بعد میں کرے گا اور قونیہ کے مولانا رومی سے پہلے ملے گا۔

نکودار اور وزیر جوینی ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ آخر وزیر جی نے زبان کھولی "خان محترم! مولانا رومی سے بعد میں بھی ملا جا سکتا ہے پہلے برقائی خان سے محاذ آرائی کا فیصلہ ہو جائے۔"

اباقہ خان نے بگڑ کر کہا "تو ہمیشہ میری مخالفت کرتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر کیوں؟ تو ایسا کیوں کرتا ہے؟"

وزیر جوینی نے دلیری سے جواب دیا "میں آپ کا نمک خوار ہوں اور میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کو صائب رائے دوں۔ برقائی خان کے خلاف ہراولی دستے بھیجے جا چکے ہیں۔ اگر ان کے پیچھے ہماری فوجیں نہ گئیں تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

اباقہ خان نے آہستہ سے کہا "اچھا، تو یہ بات ہے۔ چلو جو تم کہتے ہو وہی کرو، وہی ہو جانے دو۔"

اور اباقہ خان اپنے عساکر کے ساتھ قفقاز کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں برقائی خان کا نامور بھتیجا نوگائی ان کے استقبال کے لیے پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے ہراولی دستوں کو اپنے ہراولی دستوں سے ٹکرا کر برباد کر دیا اور خود اباقہ خان کے مقابلے پر آ گیا۔ دونوں میں خوفناک تصادم ہو گیا۔ نہایت بے دردی سے مار کاٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اباقہ خان نے اپنے شہزادے نکودار کو حکم دیا۔

"دیکھ اگر نوگائی تیرے سامنے آ جائے تو اسے جانے نہ دینا۔"

یہی ہدایات دوسرے سرداروں کو بھی دی گئیں۔ سردار بیچو کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ موقع غنیمت ہے تو اپنے کام کو جاری رکھا جائے۔ ورنہ جنگ کو آنے والے سال تک طول دے دیا جائے۔

اباقہ خان جنگ کو فیصلہ کن بنانا چاہتا تھا مگر اس کے سردار بے دلی سے لڑ رہے تھے۔ وہ اندر سے مسلمان تھے اور باہر سے مشرک۔ برقائی کا بھتیجا نوگائی ہر محاذ پر کامیاب تھا یہاں تک کہ اس نے اباقہ خان کی افواج کو قفقاز سے باہر نکال دیا۔ اباقہ خان ناکام اور نامراد اپنے محل میں پہنچا تو اس کا حال ہی کچھ اور ہو چکا تھا۔ ناکامی نے اس کے دل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے رقاصاؤں کو حکم دیا "کوئی طربیہ گیت چھیڑیں اور رقاصائیں کوئی ایسا رقص پیش کریں جسے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔"

ایک مغنی نے موسم بہار کا گیت پیش کیا جب ہر شے خوش و خرم ہوتی ہے اور شاخوں سے نکلے ہوئے نرم و ملائم اور چکنے پتے آنکھوں کو تازگی اور دلوں کو سرور بہم پہنچاتے ہیں۔ پھولوں کا جوبن کیف و مستی سے انسانی دلوں کو سرشار کر دیتا ہے اور ان کے

خوشبوئیں دل و دماغ کو معطر اور آسودہ کر دیتی ہیں۔ لیکن اس گیت کا انجام المیہ تھا۔ بہار کا نغمہ خزاں پر ختم ہو جاتا تھا۔ جس میں نہایت افسوس اور دکھ سے یہ کہا گیا تھا کہ موسم بہار کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس کا بھی انجام ہوتا ہے، رُوح فرسا، المناک انجام۔

اباقہ خان نے چیخ کر کہا۔ "بند کرو اپنا گیت۔ میں یہ گیت نہیں سنوں گا۔"

مغنیہ نے گانا بند کر دیا اور اس کے ساتھ ہی رقاصاؤں کے پاؤں بھی رُک گئے۔ اباقہ خان دوبارہ چیخا۔ "یہ رقص کیوں بند کر دیا گیا؟"

رقاصاؤں نے پھر سے رقص شروع کر دیا لیکن اب ان کے رقص میں زندگی نہیں تھی اباقہ خان رقص سے بھی دل برداشتہ ہو گیا اور آخر کار اسے بھی بند کر دیا۔ اس نے انہیں اسی وقت اپنی نظروں سے دُور کر دیا۔ بے سکونی اور بے اطمینانی نے اس کو ہلکان کر رکھا تھا۔ اس نے وزیر اعظم جوینی کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔ "شمس الدین! تو بہت سمجھدار اور عقلمند آدمی ہے، ذرا بتا تو سہی، کہ ہمیں یہ شکست کیوں ہوئی ہے؟"

دلیر اور عقلمند وزیر نے جواب دیا۔ "حضور والا! اگر میں سچ بولوں گا تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کو ناراض کروں گا اور اگر میں جھوٹ بولوں گا تو میں اپنے دل پر ایک بوجھ ڈال دوں گا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

اباقہ خان نے کہا۔ "میں سچ سننا چاہتا ہوں۔ تو میری ناراضی کی پروا کیے بغیر سچ بول۔"

وزیر نے جواب دیا۔ "حضور والا! کیا میں نے آپ کو پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ ہماری فوج میں بہت سارے ایسے لوگ موجود ہیں جو اندر سے مسلمان اور باہر سے مشرک ہیں۔ یہ دوغلا انسان مسلمانوں سے جنگ نہیں کر سکتا۔"

اباقہ خان نے پوچھا۔ "ان دوغلوں کو مسلمان کس نے کیا؟ تو نے! شیخ سعدی نے؟ مولانا رُوم نے؟ یا کسی اور درویش نے؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "ان میں سے کسی نے بھی نہیں۔ میں نے ایک بار پہلے بھی حضور والا کو جتا دیا تھا کہ زمانہ اور ماحول نہایت کامیاب خاموش مبلغ ہوتے ہیں، نہایت کامیاب معلم۔ ان دوغلوں کو ہمارے معاشرے اور ہمارے ماحول نے مسلمان کر لیا ہے۔ اب ان کو ذرا چھیڑنے کی ضرورت ہے یہ فوراً ہی باہر سے بھی مسلمان ہو جائیں گے۔"

اباقہ خان نے آہستہ سے کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں بھی اسلام۔۔۔۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ میں نے اپنے آباؤ اجداد کی رُوحوں کو آسمانی دریچوں سے جھانکتے دیکھا ہے وہ مجھے ایسا کرنے سے روکتی رہتی ہیں۔"

وزیر نے جواب دیا۔ "میں کب آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جو کام آپ نہیں کر سکیں گے آپ کی اولاد اسے کر گزرے گی کیونکہ آپ کی اولاد کو آسمانی دریچے ہی نظر نہیں آتے، وہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح کو کس طرح دیکھے گی؟"

اباقہ خان نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جوینی! تو ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے کیا تُو نے میرے شہزادوں میں کوئی ایسی بات محسوس کر لی ہے جس سے تو یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ وہ میرے بعد مسلمان ہو جائیں گے؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "نہیں، میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ مگر میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ جوجی خان اور چغتائی کے خانوادے جب اسلام کی خاموش یلغار نہیں روک سکے تو تو کوئی خاندان اس سے کب تک محفوظ رہے گا۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "ہم مولانا رومی سے ملنا چاہتے ہیں، قونیہ چلنے کی تیاری کی جائے۔"

اباقہ خان کے حکم کی دیر تھی کہ قونیہ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شہزادہ تکودار نے جو ولی عہد بھی تھا، اس سفر میں جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن شہزادہ ارغون خان نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے اباقہ خان سے گستاخانہ رویّہ اختیار کیا۔ اس نے کہا۔ "باوا جان آپ شیخ سعدی اور مولانا رومی کے اتنے مدّاح کیوں ہو گئے ہیں؟ ہمارے اور ان کے مسلک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "یہ دونوں بہت عقلمند انسان ہیں۔"

ارغون خان نے کہا۔ "ان کی عقلیں نہیں کتنا فائدہ پہنچا رہی ہیں؟ سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنے آس پاس دنیا سے نفور اور بے عمل لوگوں کی ایک فوج جمع کر لی ہے، ان کے پاس نہ تو دولت ہے نہ کوئی۔۔۔ آپ کا ان سے کیا تعلق ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ مجھے ان کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔"

شہزادہ تکودار کو اپنے بھائی ارغون خان کی باتیں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں اس نے ارغون خان کے خیالات کی مذمت کی اور کہا۔ "ارغون خان! ہم نے اسلام کے خلاف بہت کچھ کیا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی خواہش کے احترام میں دارالاسلام بغداد کو برباد کر دیا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا کیا اسلام ختم ہو گیا؟ اسلام کی خاموش یلغار ہمارے آس پاس جاری ہے کیا ہم اس یلغار کو روک سکتے ہیں؟ ہم نے عیسائیت اور یہودیت سے بہت دوستی کر لی اب ذرا اسلام سے دوستی کر کے دیکھیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو چغتائی اور برقائی خانوادے مصر کے مملوک حکمران سے اتحاد کر کے ہمیں بے بس اور بے دخل

کر دیں گے۔"

اباقہ خان اپنے ولی عہد کی باتوں سے بہت خوش ہوا۔ اس نے تحسین آمیز نظروں سے نکودار کو دیکھا اور کہا "نکودار! تو تو بڑی عقل کی باتیں کرنے لگا ہے' واہ کتنی عقل کی باتیں کی ہیں تو نے، واہ وا۔"

اس کے بعد شہزادہ ارغون کو ڈانٹ پلائی "دفع ہو جا یہاں سے خبردار آئندہ اس قسم کی باتیں نہ کرنا۔"

شہزادہ ارغون اباقہ خان کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ باہر نکلا تو سعداللہ نامی ایک یہودی نے پوچھا "شہزادے! خیریت تو ہے، کیا بات ہوئی؟ آپ برہم اور دل برداشتہ سے نظر آ رہے ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے بددلی سے جواب دیا "نکودار اسلام پر مائل ہے۔ میرا باپ اباقہ خان شیخ سعدی اور مولانا رومی کا پرستار ہے۔ میں اپنے انجام پر غور کر رہا ہوں تو لوئی خان کے خاندان کا کیا حشر ہوگا؟"

سعداللہ یہودی نے نہایت تحمل سے کہا "خرابی کی جڑ شمس الدین جوینی ہے۔ آپ کے دادا ہلاکو خان بھی دھوکا کھا گئے۔ شمس الدین انہی کا مسلط کردہ ہے۔ جب تک یہ وزارت کے منصب پر فائز ہے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

ارغون خان نے کہا "لیکن سعداللہ! میں تیری عقل اور فراست پر یقین رکھتا ہوں، بتا کہ میں کیا کروں جس سے تولوئی خاندان اسلام سے محفوظ رہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

سعداللہ یہودی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا "ایک تدبیر ایسی اب بھی موجود ہے جس سے آپ حالات کا رخ بدل سکتے ہیں۔"

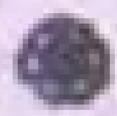
ارغون خان نے بے چینی سے پوچھا "یعنی! وہ کیا؟ کون سی تدبیر؟"

سعداللہ یہودی نے جواب دیا "آپ اپنی افواج میں ہر دلعزیز بننے کی کوشش کیجیے اور آپ آئندہ ایسی باتیں ہرگز نہ کیجیے جس سے آپ کے احساسات و جذبات کا آپ کا مخالف اندازہ لگا سکے۔ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کا آپ کے سوا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔"

ارغون خان نے سعداللہ کی باتوں پر غور کیا اور کچھ دیر آنکھیں بند کیے کھڑا رہا پھر پوچھا "یعنی! یعنی مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

سعداللہ یہودی نے جواب دیا "نکودار اور اباقہ خان جو کچھ کر رہے ہیں کرنے دیجیے، آپ ان کی مخالفت سے باز رہیں۔ آپ ان کے فرماں بردار بن جائیں اور جب آپ کے والد اباقہ خان اپنے بیٹوں میں عہدے اور مناصب کی تقسیم شروع کریں آپ ان سے حملہ عساکر کی سپہ سالاری مانگ لیں۔ جب آپ یہ منصب حاصل کر لیں گے تب میں آپ کو بتاؤں گا کہ اب آپ کیا کریں گے۔"

ارغون خان سعداللہ یہودی کو اپنے ساتھ لے کر چلا گیا کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں کوئی اور مشتبہ انداز میں باتیں کرتے دیکھ لے اور اس سے ان کے مقاصد کو نقصان پہنچے۔



اباقہ خان اپنے وزیر شمس الدین جوینی اور ولی عہد شہزادہ نکودار کے ساتھ ترکی کے شہر قونیہ پہنچا۔ یہاں مولانا جلال الدین رومی رہتے تھے۔ مولانا رومی جن کی مثنوی کو 'ہست قرآں در زبان پہلوی' کہا گیا۔ جب مولانا کو مطلع کیا گیا کہ اباقہ خان آپ سے ملنا چاہتا ہے' تو آپ نے اسے آنے کی اجازت دے دی اور کہا "میں نے دنیا کو کب کا چھوڑ رکھا ہے مگر دنیا مجھے نہیں چھوڑ رہی۔"

اباقہ خان نے اپنے وزیر شمس الدین کی طرف دیکھا اور آہستہ سے پوچھا "یہ درویش کیا کہہ رہا ہے؟"

وزیر نے جواب دیا "مولانا فرما رہے ہیں کہ میں خود تو درباروں سرکاروں سے محترز رہتا ہوں مگر دربار سرکار میری طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔"

نکودار نے مولانا سے عرض کیا "میرے حق میں دعا کیجیے۔"

مولانا نے جواب دیا "جو جس کا مقسوم ہو چکا وہ اسے مل کر رہے گا پھر میں کون ہوتا ہوں مشیت ایزدی سے جنگ کرنے والا۔"

اباقہ خان نے اپنے وزیر سے کہا "شیخ کی باتیں تو پھر بھی میری سمجھ میں آ گئی تھیں مگر اس کی باتیں میری سمجھ سے بالا ہیں۔"

شمس الدین جوینی نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ مولانا نے اپنے کسی مرید سے کہا "آدمی ایک پیالے کی طرح ہے' ایک برتن کی طرح اس برتن کو باہر سے صاف کرنا لازم ہے اور اندر سے دھونا لازم تر۔ میرے پاس کبھی کبھی ایسے لوگ بھی آ جاتے ہیں جن کا باہر بھی گندا ہوتا ہے اور اندر بھی۔ میں پریشان ہوں کہ اس گندے برتن میں کوئی قیمتی چیز کس طرح ڈالوں؟"

اباقہ خان نے جوینی سے پوچھا "مولانا کیا کہہ رہے ہیں؟"

وزیر نے جواب دیا "مولانا فرما رہے ہیں کہ جب تک کسی انسان کے دل و دماغ کو عرفان اور علم سے نکھارا جائے وہ مولانا کی پراز معنی باتیں کس طرح سمجھے گا؟"

اباقہ خان نے فرط رعب سے اپنا سر پکڑ لیا "یہ تو بہت زیادہ عقل کی باتیں کر رہا ہے۔"

مولانا نے اباقہ خان کو براہ راست مخاطب کیا "اے منگول فاتح! کیا تجھے معلوم ہے کہ انسان کا تعارف کیا ہوتا ہے؟ کیا انسان کا نام کہ یہ اباقہ خان ہے یہ ہلاکو خان ہے یہ چنگیز خان ہے۔ نہیں یہ تو محض نام ہیں۔ یہ نام کسی اور کے بھی ہو سکتے ہیں۔ انسان کا تعارف اس کے صفات ہوتے ہیں جس طرح کسی درخت کا تعارف اس کے پھل ہوتے ہیں۔ [illegible] حلاوت بھی ہو [illegible] ترشی بھی اور کڑواہٹ [illegible] پھل کی یہی صفات اس کا تعارف [illegible] اباقہ خان! [illegible]

کیا ہے؟ عادل، رحم دل، ہمدرد اور غمگسار اباقہ خان یا ظالم اور خونخوار اباقہ خان؟"

اباقہ خان نے پوچھا: "آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟"

مولانا نے جواب دیا: "میں نے تجھے آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے، میں کیا بتاؤں کہ تجھے کیا سمجھتا ہوں۔" پھر شمس الدین جوینی سے پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "یہ میرا وزیر اعظم شمس الدین جوینی ہے۔"

مولانا نے وزیر سے کہا: "تو اپنے آقا کا تعارف کرا۔ خدا اس پر رحم فرمائے کہ اپنا تعارف خود نہیں کرا سکتا، دوسروں کا محتاج ہے۔"

شمس الدین نے جواب دیا: "حضرت! یہ اباقہ خان ہم مسلمانوں کا دوست ہے، برقائی خان کی طرح چغتائیوں کی طرح۔"

مولانا نے فرمایا: "خدا اسے دوست ہی رکھے، میں اس کے حق میں دعا کروں گا۔"

اسی دوران کسی مرید نے عرض کیا: "حضرت! میں نے بڑی کوشش کی کہ حرص و طمع اور خود غرضی سے پیچھا چھڑا لوں مگر اس میں کامیاب نہیں ہوا، چونکہ میرے باپ نے اپنے پیچھے کافی جائیداد اور جاگیر چھوڑی ہے اس لیے حرص و طمع اور خود غرضی نے میرا پیچھا پکڑ رکھا ہے۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں جملہ جائیداد اور جاگیر کو اپنے بھائیوں کے نام کر دوں تاکہ میں یکسوئی سے اللہ کا ہو رہوں۔"

مولانا نے فرمایا: "نہیں ایسا نہ کر، پہلے اپنے نفس امارہ کو مار۔ اس کی ہلاکت سے تو فاتح بن جائے گا اور فرداً فرداً بتوں کو نہیں مارنا پڑے گا۔"

شمس الدین جوینی نے عرض کیا: "مولانا! میری ناچیز رائے میں یہی بہتر ہے کہ یہ شخص اپنی جائیداد اور جاگیر سے پیچھا چھڑا لے تاکہ حرص و طمع اور خود غرضی سے نجات مل جائے۔"

مولانا نے جواب دیا: "جوینی! تُو تو بہت عقلمند انسان ہے پھر بھی یہ نکتہ نہیں سمجھ سکا کہ ایک نفس امارہ کی ہلاکت سے بہت سے دشمن ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ دھوئیں اگر ناگوار خاطر ہو تو انسان آگ بجھانے کے درپے ہو جائے حالانکہ اس کو سوچنا چاہیے کہ دھواں آگ سے نہیں ایندھن سے نکلتا ہے۔ اگر ایندھن خشک ہو گا تو دھواں کم نکلے گا، گیلا ہو گا تو زیادہ نکلے گا۔" پھر مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں سمجھایا: "ایک شخص اپنی ماں کو قتل کر رہا تھا، کسی نے اس سے پوچھا، تو اپنی ماں کو کیوں قتل کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا، میں نے اپنی ماں کو ایک مرد کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں دیکھا ہے۔ سوال کرنے والے نے کہا: تو اپنی ماں کے بجائے اس مرد کو قتل کر دے کیونکہ یہی مناسب ہے۔"

اس شخص نے جواب دیا: "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ہر روز ایک مرد کو قتل کروں؟"

مولانا اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

وزیر شمس الدین پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اباقہ خان حیران تھا کہ بات کیا ہوئی لیکن جب اس کا مفہوم اباقہ خان پر واضح کیا گیا تو وہ بھی اپنا سر دھننے لگا، بولا: "بخدا میں نے اتنی عقلمندی کی بات کہیں اور کسی سے نہیں سنی۔"

نکودار نے عاجزی سے درخواست کی: "مولانا! ہمیں کوئی نصیحت کیجیے۔"

مولانا نے جواب دیا: "نصیحت کے لیے انسان کو اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھنا چاہئیں ہر طرف نصیحتیں بکھری ہوئی ہیں۔"

اباقہ خان نے پوچھا: "حضرت! کیا یہاں برقائی خان اور چغتائی خاندان کے لوگ بھی آتے ہیں؟"

مولانا نے جواب دیا: "کیا تو نے میری وہ بات نہیں سنی کہ میں نے تو دنیا کو چھوڑ دیا لیکن دنیا مجھے نہیں چھوڑ رہی ہے۔"

اباقہ خان کو اس موقع پر ترمہ شیریں یاد آ گئی، بولا: "چغتائی خاندان کا ایک شہزادہ میری محبوبہ ترمہ شیریں کو اغوا کر کے لے گیا، آپ دعا کیجیے کہ میں اس کو اس کے کیے کی سزا دے سکوں۔"

مولانا نے جواب دیا: "تو نے ترمہ شیریں کو جس قیمت پر حاصل کیا تھا، اسی قیمت میں وہ کسی اور کے پاس چلی گئی۔ اب شکوہ کس بات کا؟"

اباقہ خان کو مولانا کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ شہزادہ نکودار بھی مولانا سے بہت زیادہ متاثر تھا، بولا: "میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے قدموں میں پڑا رہوں اور آپ کی خدمت کرتا رہوں۔"

مولانا نے جواب دیا: "جب تو حکمرانی کرے گا تو خدا تجھ کو خدمت خلق کا عظیم الشان موقع عطا فرمائے گا۔ تو اس وقت کا انتظار کر۔ کیونکہ مخلوق کی خدمت کرنا عبادت سے کم نہیں۔"

اباقہ بالکل مفتوح ہو چکا تھا۔ یہ لوگ کچھ دیر مولانا کی خدمت میں رہ کر واپس ہو گئے۔ راہ میں قیصریہ کے پاس سے جب یہ لوگ گزر رہے تھے تو انہیں ایک قافلہ قونیہ کی طرف جاتا ملا۔ یہ قافلہ بھی کسی امیر کا تھا کیونکہ ہتھیار بند آدمیوں کی بڑی تعداد نے اپنے آقاؤں کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

اباقہ خان نے شمس الدین جوینی سے کہا: "معلوم کر کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟"

وزیر شمس الدین جواب لے کر آ گیا۔ یہ تاجروں کا قافلہ تھا اور یہ لوگ قونیہ جا رہے تھے۔ تاکہ اپنا مال فروخت کر کے نفع کمائیں اور مولانا رومی کی زیارت سے بھی شاد کام ہوں۔ اباقہ خان نے رشک آمیز لہجے میں کہا: "جوینی! یہ مولانا رومی کتنا خوش قسمت انسان ہے،

جس کے پاس ہر قسم کے لوگ خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں اور ایک میں ہوں کہ دنیا مجھ سے ڈرتی ہے اور اہلِ غرض ہی میرے پاس آنے کی ہمت کرتے ہیں۔"

اباقہ خان نے چند لومڑیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ کتے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ اباقہ خان نے کہا: "جوینی کیا ہم ان لومڑیوں جیسے نہیں ہیں؟ چالاک اور عیار۔ حرص وطمع اور خود غرضی کے کتے ہمارا تعاقب کر رہے ہیں اور ہم سرپٹ بھاگ رہے ہیں۔"

وزیر جوینی نے اباقہ خان کی زبان سے دانش و بینش کی باتیں سن کر انھیں مولانا رومی کا فیضان سمجھا اور بہت خوش ہوا۔

نکودار اپنے خیالوں میں مگن ان کی باتیں سن رہا تھا اور مستقبل کو تصور میں اس طرح دیکھ رہا تھا کہ ہر طرف مولانا رومی اور شیخ سعدی کے افکار اور خیالات کی حکمرانی تھی اور وہ ان کی ترویج واشاعت کے لیے فرامین جاری کر رہا تھا۔

مراغہ میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ شہزادہ ارغون خان جو اباقہ خان سے بدتمیزی کا مرتکب ہوا تھا، استقبال کرنے والوں میں پیش پیش تھا۔ سعد اللہ یہودی اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس منظر نے اباقہ خان اور نکودار کو بہت متاثر کیا لیکن شمس الدین جوینی کی نظریں سعد اللہ یہودی پر جمی رہ گئی تھیں۔ اس نے سعد اللہ سے پوچھا "اس پُرجوش استقبال میں تو کس حد تک شریک ہے؟"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا: "اسی حد تک جس حد تک آپ مولانا رومی اور شیخ سعدی کی زیارت اور ملاقات کرانے میں شامل تھے۔"

شمس الدین جوینی نے کہا: "بخدا مجھے تیری نیت پر شبہ ہے۔ تو مخلص اور دیانت دار نہیں معلوم ہوتا۔"

سعد اللہ نے جواب دیا: "نیت کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہوگا اور میں دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے آپ کی نیت کا علم ہو گیا ہے۔"

اباقہ خان نے شمس الدین سے پوچھا: "کیا بات ہے؟ کوئی خاص بات؟"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا: "خانِ محترم! میں نے شہزادہ ارغون کو سمجھایا کہ والدین کا احترام اولاد پر فرض ہے۔ میری اسی نصیحت کا یہ ثمرہ ہے جو شہزادے نے آپ کا والہانہ استقبال کیا مگر وزیرِ موصوف کو میری نیت اور دیانت پر شبہ ہے۔"

اباقہ خان کو ہنسی آ گئی۔ بولا: "میری نظر میں تم دونوں اچھے انسان ہو مگر تمھارے مذہبی تعصب نے تم دونوں کو ایک دوسرے کی نظر میں مشکوک اور مشتبہ کر دیا ہے۔"

شمس الدین نے جواب دیا: "یہ بات نہیں ہے خانِ محترم! مسلمانوں کے دورِ حکمرانی کو دیکھ لیجیے۔ ہم نے ہمیشہ رواداری برتی ہے۔ ہم نے کبھی بھی تعصب سے کام نہیں لیا لیکن ان کی رواداری کی ایک بھی مثال نہیں ملے گی۔"

سعد اللہ یہودی نے کہا: "وزیرِ محترم! بات کو یہیں ختم کیجیے۔ میں آپ کی رواداری سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

اباقہ خان نے دونوں کو سمجھایا: "میں تم دونوں پر فخر کرتا ہوں میری نظر میں تم دونوں یکساں ہو۔ ہاں شمس الدین جاہ و منصب میں سعد اللہ تجھ سے زیادہ ہے۔ ہم نے مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ رواداری ہمارا مسلک رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

ارغون خان دونوں کی جھڑپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے اباقہ خان سے کہا: "باوا جان! سعد اللہ بہت ہی نیک انسان ہے۔ اس نے مجھ کو تہذیب و شائستگی اور اخلاق کی اعلیٰ تعلیم دی اور آج میں یہ عہد کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ چغتائی شہزادے سوغجاق کے خلاف ایک جامع اور کارآمد منصوبہ بناؤں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ترمہ شیریں شہزادہ سوغجاق کے پاس رہے۔ میں شہزادہ سوغجاق سے ترمہ شیریں کو حاصل کر کے رہوں گا کیونکہ ترمہ شیریں جب تک سوغجاق کے پاس رہے گی، ہماری سبکی اور بے عزتی ہوتی رہے گی۔"

اباقہ خان نے شہزادہ ارغون خان کو سینے سے لگا لیا۔ بولا۔ "شہزادے ارغون! آج میں تجھ سے بے حد خوش ہوں لیکن یہ ساری باتیں یہاں سرِراہ نہیں ہونی چاہئیں۔ ہم محل میں چلتے ہیں اور وہاں کوئی منصوبہ بناتے ہیں۔ ترمہ شیریں کا سوغجاق کے پاس ہونا ہماری مستقل بے عزتی اور اہانت ہے۔ اس کو دور ہونا چاہیے۔ اس سے نجات ملنی چاہیے۔"

شہزادہ نکودار خوب سمجھ رہا تھا کہ اباقہ خان اور ارغون خان کا حد سے زیادہ ملاپ اور یگانگت کیا رنگ لائیں گے۔ شمس الدین جوینی بھی ان باتوں کے پیچھے چھپی ہوئی کسی سازش کی بو محسوس کر رہا تھا۔

اباقہ خان اور شہزادہ ارغون خان تخلیے میں چلے گئے۔ شہزادہ نکودار وزیر شمس الدین سے صلاح مشورے کرنے لگا۔ نکودار نے پوچھا۔ "وزیرِ محترم! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

جوینی نے جواب دیا: "خانِ اعظم چنگیز خان کے دور سے ہی اور یہودی اسلام کے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں۔ سعد اللہ یہودی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہمیں ان سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

نکودار کو ایک دوسرا وہم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا: "وزیرِ محترم! کہیں ایسا تو نہیں کہ ولی عہدی کو ارغون خان کے نام کر دیا جائے۔"

وزیر نے جواب دیا: "شاید ایسا نہیں ہوگا۔ میں جو آپ کی

خدمت کو موجود ہوں۔"

نکودار نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا: "لیکن میں بہت زیادہ فکر مند ہوں۔"

وزیر نے جواب دیا: "فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ارغون خان کو ترمہ شیریں کی بازیابی کے لیے جانے دیجئے۔ چغتائی اس کو واپس نہیں آنے دیں گے۔ اس طرح وہ اباقہ خان کی ہمدردی تو حاصل کر سکتا ہے مگر چغتائیوں سے اپنی جان نہیں بچا سکتا۔"

نکودار پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔ وہ سعد اللہ یہودی سے خوفزدہ تھا۔ سازشوں اور عیاریوں کا پیکر سعد اللہ یہودی۔

ارغون خان اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے فوجی تیاریوں میں مشغول تھا۔ اباقہ خان اس کی پشت پر تھا اور وہ ارغون خان کو ہدایات دے رہا تھا: "اگر وہ چغتائیوں کو شکست دے دے تو ترمہ کو اپنے قبضے میں کرنے کے بعد شہزادہ سونجاق کو گرفتار کر لے اور اسے اباقہ خان کے پاس بھیج دے تاکہ وہ خود اس گستاخ شہزادے کو سزا دے سکے۔"

سعد اللہ یہودی نے شہزادہ ارغون خان کو مشورہ دیا کہ یہی وہ لمحہ ہے جب ارغون خان اپنے باپ اباقہ خان سے جملہ عساکر کی سپہ سالاری حاصل کر سکتا ہے لیکن ارغون خان نے عجلت سے کام نہیں لیا۔ اس نے ترمہ شیریں کو دیکھا تھا۔ اس کے رقص سے مزہ حاصل کیا تھا۔ اس کو جو جذبہ چغتائیوں کی طرف کھینچے لیے جا رہا تھا، وہ ترمہ شیریں کا عشق تھا۔ اسے ترمہ شیریں بہت پسند آئی تھی اور پہلے اس کا یہی خیال تھا کہ جب اباقہ خان چل بسے گا تو وہ ترمہ شیریں کو نکودار سے مانگ لے گا۔ منگول قوانین کی رو سے بیٹا باپ کی جائیداد اور جاگیر کے ساتھ ہی اس کی بیویوں کا بھی حقدار ٹھہرتا ہے۔ اسی قانون کی رو سے ہلاکو خان نے اپنی سوتیلی ماں دوقوز کو اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ اور اب ارغون خان ترمہ شیریں کو اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ حالانکہ سعد اللہ یہودی نے ارغون خان کو نکتے کی یہ بات بھی بتا دی تھی کہ ولی عہد نکودار کسی بھی وقت مسلمان ہو سکتا ہے اور جب یہ مسلمان ہو جائے گا تو پھر ترمہ شیریں کو حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ کیونکہ اسلام اس رشتے کا احترام کرتا ہے اور نکودار بحیثیت مسلم اس حرمت کو برقرار رکھے گا۔

نکودار نے اپنے بھائی ارغون خان کو فوجوں کی تیاری میں مشغول جو دیکھا تو وزیر شمس الدین کے مشورے کے مطابق ارغون خان کے پاس گیا اور بڑی نرمی اور ملائمت سے پیش آیا۔ بھائی کو رخصت کرنے سے پہلے اس نے شاندار ضیافت دی۔ بڑی بڑی دیگوں میں دنبوں اور بھیڑوں کے بڑے بڑے ٹکڑے ڈال دیے گئے۔ اوپر سے مسالا بھی ڈال دیا گیا۔ شراب اور گھوڑی کا دودھ وافر مقدار میں بڑے بڑے تختوں پر رکھ دیا گیا۔ قابوں میں خشک میوہ بھی بھر دیا گیا تھا۔ جب وحشی منگولوں کو کھانے کی اجازت مل گئی تو وہ اس پر ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ پوری پوری رانیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ ادھ گلے گوشت کی بوٹیاں جب ہاتھ سے چھوٹ جاتیں تو بھرپور طمانچے یا چانٹے کی طرح منہ پر لگتیں اور کھانے والا بوٹی کو چند موٹی موٹی گالیاں دے کر دوبارہ کھانے میں مشغول ہو جاتا۔

اس موقع پر نکودار نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو ارغون خان پہلے ہی اختیار کر چکا تھا۔ نکودار نے اپنے بھائی ارغون خان کی بڑی تعریفیں کیں اور اس نے بڑے بڑے سرداروں اور اپنے باپ اباقہ خان کی موجودگی میں اس کا اعتراف کیا کہ ولی عہد کی حیثیت سے جو کام مجھے کرنا تھا، ارغون خان انجام دے رہا ہے۔ اس موقع پر اس نے ارغون خان کی فراست و شجاعت کی بڑی تعریفیں کیں اس نے کہا: "اس مہم سے کامیاب واپسی کے بعد میں ارغون خان کو اپنی جگہ دینے کو تیار ہوں۔"

اباقہ خان نے اس سے اختلاف کیا کہا: "نکودار! یہ تو کیا کر رہا ہے، بڑا تو ہے پھر ارغون خان تیری جگہ کس طرح لے سکتا ہے؟"

نکودار نے جواب دیا: "باوا جان! میں اپنی کوتاہی پر نادم ہوں جیسا کہ میں ابھی ابھی اس کا اعتراف کر چکا ہوں کہ یہ کام جو ارغون خان انجام دے رہا ہے میرا تھا۔ میرا فرض تھا کہ میں ترمہ شیریں کو سونجاق کے دست برد سے رہائی دلاتا۔"

اباقہ خان نے کہا: "نہیں یہ کام تیرا نہیں تھا۔ تو آنے والے دنوں کا ایل خان ہے اور ایل خان کا یہ کام ہے کہ وہ دوسروں کو حکم دے اور ان پر حکومت کرے۔"

ارغون خان نے اپنے ولی عہد بھائی نکودار کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بولا: "ان ہاتھوں پر مسلمان بیعت کیا کرتے ہیں چنانچہ میں بھی ان پر پیشگی بیعت کر رہا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا۔"

اباقہ خان اس ولولہ انگیز وفاداری اور چاہت سے بے حد خوش تھا۔ وہ شمس الدین جوینی کو اپنے محل میں لے گیا اور دونوں بھائیوں کی باہمی محبت اور وفاداری کی باتیں کرنے لگا۔

دوسری طرف نکودار اور ارغون خان اپنے مطلب کی باتیں کر رہے تھے۔ نکودار نے ارغون خان کا دل ٹٹولا۔ اس نے پوچھا: "بھائی ارغون خان! میں حیران ہوں کہ اتنی بڑی ذمہ داری کو میں نے کس طرح بھلا دیا۔ میں آدمی ہوں یا جانور؟"

ارغون خان نے پوچھا: "کیسی ذمہ داری؟"

نکودار نے جواب دیا: "یہ ذمہ داری کہ والد کو کون آرام و آسائش

سے دیکھے گا؟"
ارغون خان کی جان میں جان آئی، بولا" بھائی! تم سونجاق کو اس وقت دیکھنا جب میں پابجولاں لا کر آپ کے سامنے کھڑا کر دوں گا۔"
نکودار نے کہا" اور ہاں دیکھو ترمہ شیرین کا خاص خیال رکھنا وہ مجھے بے حد پسند ہے میں اس کو باوا جان سے مانگ لوں گا۔"
ارغون خان گھبرا گیا، پوچھا" تجھے کون پسند ہے؟"
نکودار نے جواب دیا" ترمہ شیرین۔ میں اسے باوا جان سے مانگ لوں گا اور باوا جان کی مجال نہیں جو مجھ سے انکار کریں۔"
ارغون خان کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی، پوچھا" آپ ترمہ شیرین کو باوا جان سے مانگ لیں گے؟"
نکودار نے بے رخی سے جواب دیا" ہاں، ہاں، ہاں! کیا تمھیں میرے اس ارادے پر حیرت ہے؟"
ارغون خان نے کہا" مجھے حیرت کیوں ہو گی، لیکن میں آپکو ایک مشورہ دوں گا۔"
نکودار نے پوچھا" کیسا مشورہ؟ کس قسم کا مشورہ؟"
ارغون خان نے کہا" ترمہ شیریں اب بھی والد اباقہ خان کی بیوی ہے ہم اس پر اپنا حق کس طرح جتا سکیں گے؟"
نکودار نے جواب دیا" منگول قوانین میں یہ حق موجود ہے کہ باپ کے بعد اس کا ولی عہد بیٹا ترکے کے علاوہ باپ کی بیویوں کا بھی حقدار قرار پاتا ہے چنانچہ میں ترمہ شیرین کو اپنے لیے مانگ لوں گا اور پدر بزرگوار انکار نہیں کریں گے۔"
ارغون خان خوشامد پر اتر آیا، بولا" بھائی نکودار! ایسا نہ کرو ترمہ شیرین کو مت مانگو۔"
نکودار نے جواب دیا" یہ میرا ذاتی معاملہ ہے میں اسے ضرور مانگوں گا میں ترمہ شیرین سے محبت کرتا ہوں۔"
ارغون خان کا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا، بولا" اگر یہ بات ہے تو میں اس مہم پر نہیں جاؤں گا۔"
نکودار نے پوچھا" کیوں؟ آخر کیوں؟ کیوں نہیں جاؤ گے؟"
ارغون خان نے پوچھا" بھائی نکودار! تم مجھے چاہتے ہو یا نہیں؟"
نکودار نے جواب دیا" میں تجھے بے حد چاہتا ہوں مگر تو یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟"
ارغون خان نے ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ سے کہا" اگر تم اجازت دو تو میں ایک تلخ حقیقت کا اعتراف کروں؟"
نکودار نے جواب دیا" کیسی تلخ حقیقت؟ میں نے تجھے اجازت دی۔"
ارغون خان نے کہا" تب پھر میری باتیں ذرا غور سے سنیئے۔ میں آپ ہی کی طرح ترمہ شیریں سے محبت کرتا ہوں۔ اتنی زیادہ محبت کہ اس کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے اور اسی جذبے نے مجھ کو اس مہم پر آمادہ کیا ہے میں ترمہ شیرین کو آپ سے مانگ رہا ہوں آپ کی محبت کو آپ سے طلب کر رہا ہوں۔"
نکودار نے اپنا سر جھکا لیا، بولا" یہ تو مجھ سے بڑی چوک ہو گئی تو میرا بھائی ہے اس لیے میں اپنی محبت کو تجھ پر قربان کر دوں گا۔ لیکن یہ مجھ پر بڑی زیادتی ہوتی ہے۔"
ارغون خان نے نکودار کو اپنی آغوش میں لے لیا، فرطِ جوش میں بولا" بھائی نکودار! آپ شریف ترین انسان ہیں۔ میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں! آپ نے میری زندگی مجھے دے دی۔"
نکودار نے اس کی پشت تھپتھپائی اور کہا" جا۔ اس مہم سے کامیاب اور سرخرو واپس آ، ترمہ شیریں تیری ہوگی۔"
ارغون خان نکودار کے گلے سے لگا آنسو بہاتا رہا اور نکودار مسکرا مسکرا کر اس کو تسلیاں دیتا رہا۔ وہ اس لیے بے حد خوش تھا کہ اس نے ارغون خان کو ایک ہی جھٹکے میں ننگا کر دیا تھا۔
ارغون خان کی افواج ہرات کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اباقہ خان نکودار اور شمس الدین جوینی نے پانچ میل اُن کے ساتھ چل کے ان کی ہمت بڑھائی۔ اباقہ خان نے ارغون خان کو بڑی نصیحتیں کیں اور یہ اعلان کیا کہ ارغون خان جب فاتحانہ شان سے مراغہ میں داخل ہو گا تو وہ اپنے جملہ عساکر کا ارغون خان کو سپہ سالار بنا دے گا۔"
اس اعلان سے سب سے زیادہ خوشی سعد اللہ یہودی کو ہوئی۔ وہ بھی ارغون خان کے ساتھ ہی ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے دوسروں سے نظریں بچاتے ہوئے ارغون خان کے کان میں کہا" مبارک ہو۔ سپہ سالاری تو آپ نے حاصل کر لی۔"
ارغون خان نے بھی آہستہ سے جواب دیا" اور تجھے بھی مبارک ہو کیونکہ سپہ سالاری کی حصولیابی میں تیری تدابیر اور مساعی بھی شامل ہیں۔"
اباقہ خان پانچ میل چھوڑ کر واپس آ گیا اور آتے ہی زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا۔ ولی عہد نکودار اباقہ خان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب اباقہ خان نے اسے دیکھا تو پوچھا" کیا بات ہے، نکودار؟"
نکودار نے جواب دیا" پدر بزرگوار! میں چند اہم باتیں آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔"
اباقہ خان نے کہا" پھر پھر تامل کیسا؟ یہ تاخیر کیسی؟"
نکودار نے کہا" کیا آپ جانتے ہیں کہ بھائی ارغون خان، سونجاق سے پنجہ لڑانے کیوں گیا ہے؟"
اباقہ خان نے جواب دیا" ہاں معلوم ہے خوب معلوم ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے۔"

نکودار نے کہا: "پھر بتلایئے کہ وہ ہرات کیوں گیا ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا: "میری عزت میری آبرو کی بازیابی کے لیے۔ سونجاق کو اس کی گستاخی اور ذلیل حرکت کی سزا دینے کے لیے۔"

نکودار نے عرض کیا: "اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں تو؟"

اباقہ خان نے کہا: "تو کیا؟ یاد رہے کہ تو جو کچھ بھی کہے گا مجھے اس کا ثبوت درکار ہوگا۔"

نکودار نے عرض کیا: "یہ میرا وعدہ ہے کہ میں جو کچھ بھی کہوں گا ثبوت کے ساتھ کہوں گا۔"

اباقہ خان نے کہا: "اچھا تو اب بتا کہ ارغون خان ہرات کیوں گیا ہے؟"

نکودار نے جواب دیا: "وہ گیا ہے ترمہ شیریں کو حاصل کرنے۔ مجھے یقین ہے کہ ارغون خان سونجاق کو شکست دے دے گا اور ترمہ شیریں کو اس سے چھین لے گا۔"

اباقہ خان ہنسنے لگا: "اور میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ کہیں تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟"

نکودار نے رک رک کر کہا: "پدر محترم! اب میں جو کہنے والا ہوں وہ بہت تلخ اور تکلیف دہ ہے۔ آپ مشتعل نہ ہو جایئے گا۔"

اباقہ خان نے نکودار کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کی نظروں میں جستجو پائی جاتی تھی، کہا: "کہہ، جو کچھ کہنا ہے جلد از جلد کہہ دے۔ یہ مجھے بلاوجہ کیوں پریشان کر رہا ہے؟"

نکودار نے کہا: "پدر محترم! ارغون خان ترمہ شیریں سے محبت کرنے لگا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جب وہ ترمہ شیریں کو حاصل کر لے گا تو یہاں واپس نہیں آئے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مصر چلا جائے۔"

اباقہ خان نے کہا: "ایسا نہیں ہو سکتا نکودار — اور اگر وہ واپس آ گیا تو؟"

نکودار نے جواب دیا: "تب پھر آپ میری یہ بات یاد رکھیں کہ وہ ترمہ شیریں کو آپ سے مانگ لے گا۔"

اباقہ خان نے کہا: "اس میں اتنا حوصلہ ہے؟"

نکودار نے جواب دیا: "حوصلہ ہے یا نہیں ہے مجھے یہ سب معلوم نہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ عشق نے اس کو بہت زیادہ دلیر کر دیا ہے۔"

اباقہ خان نے کہا: "اگر وہ ایسی غلطی کرے گا تو ضرور پچھتائے گا۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

نکودار نے پُر اعتماد لہجے میں کہا: "وہ ایسی غلطی ضرور کرے گا اور آپ اس کو معاف بھی کر دیں گے۔"

اباقہ خان نے جواب دیا: "شاید اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

نکودار نے کہا: "یہ بات مجھے اس طرح معلوم ہوئی کہ پہلے میرے ترمہ شیریں سے اپنا عشق جتایا اور ارغون خان کو یہ تاثر دیا، کہ ترمہ شیریں جیسے ہی واپس آئے گی میں اسے اپنے لیے مانگ لوں گا۔"

اباقہ خان نے ارغون خان کا مذاق اڑایا: "احمق کہیں کا۔ جب میں زندہ ہوں تو ترمہ شیریں کو مجھ سے کوئی اور کس طرح لے گا؟"

اباقہ خان کو ارغون خان پر سخت غصہ آیا ہوا تھا۔ ارغون خان کی اتنی ہمت کیونکر ہوئی۔ ترمہ شیریں جو اس کے باپ اباقہ خان کی محبوبہ ہے اس کو کس طرح دی جائے گی؟

نکودار نے ارغون خان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ جب یہ ساری باتیں شمس الدین جوینی کو معلوم ہوئیں تو وہ بھی بہت خوش ہوا کہ اس طرح وہ سعد اللہ یہودی کو شکست دے رہا تھا۔



ارغون خان یلغار کرتا ہوا ہرات کی طرف بڑھا۔ سونجاق کو اس کے مخبر یہ خبر پہنچا چکے تھے کہ شہزادہ ارغون خان ترمہ شیریں کو رہائی دلانے آ رہا ہے۔

پہلے تو سونجاق کو اس پر یقین نہیں آیا لیکن جب یقین آ گیا تو اس نے بھی جنگی تیاریاں کیں اور ہرات سے دس میل آگے بڑھ کر ارغون خان کا انتظار کرنے لگا۔ چنانچہ جب ارغون خان وہاں پہنچا تو سونجاق کو اپنے استقبال کے لیے موجود پایا۔ اس نے اپنی افواج کو یہیں خیمہ زن ہونے کا حکم دیا۔ ارغون کی فوجیں ہرات سے تیس میل دور خیمہ زن ہو رہی تھیں۔

یہ بڑی بے چینی کے لمحات تھے۔ ارغون خان کسی طرح سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سونجاق کے ساتھ ترمہ شیریں بھی آئی ہے یا نہیں۔

تیسرے دن ارغون خان نے اپنی فوجوں کی صف آرائی کی۔ اس کے سامنے سونجاق کی فوجیں تھیں۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ان کے پاؤں پٹکنے کی آوازوں سے میدان گونج رہا تھا۔ تلواریں نیام سے باہر آ چکی تھیں اور دھوپ میں ان کی چمک سے آنکھیں چکاچوند ہو رہی تھیں۔

ارغون خان یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ آیا ترمہ شیریں بھی یہاں موجود ہے یا نہیں لیکن مخبروں نے اسے یہ خبر دے دی تھی کہ سونجاق کی افواج کے پیچھے تقریباً دس میل دور خواتین کے خیمے موجود ہیں۔

اسی دوران چند گھڑ سوار ارغون خان کی فوج کے سامنے آ گئے اور ان میں سے ایک سپاہی نے بآوازِ بلند کہا: "شہزادہ سونجاق یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس لشکر کشی کا مقصد کیا ہے؟"

شہزادہ ارغون اپنے چند سرداروں کو لے کر ان کے مقابل پہنچ

گیا۔ اور اس نے ان میں شہزادہ سونجاق کو پہچاننے کی کوشش کی۔ شہزادہ سونجاق ان کے بیچ میں کھڑا تھا۔

ارغون خان نے جواب دیا: "میں ارغون خان شہزادہ سونجاق سے براہِ راست بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اب شہزادہ سونجاق نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور جواب دیا: "ہاں، میں یہی جاننا چاہتا ہوں۔"

ارغون خان نے پوچھا: "ترمہ شیریں کہاں ہے شہزادہ سونجاق؟"

سونجاق نے کہا: "اس سے میرے سوال کا تعلق؟ پہلے میرے سوال کا جواب دو اس کے بعد میں بھی جواب دوں گا۔"

ارغون خان نے نہایت دلیری سے کہا: "میرے سوال کے جواب میں تیرے سوال کا جواب ہے۔ میں ترمہ شیریں کو واپس لینے آیا ہوں۔ تو نے ترمہ شیریں کو اغوا کر کے اچھا نہیں کیا سونجاق!"

سونجاق ہنسنے لگا: "ایک معمولی سی عورت کی خاطر ہزاروں آدمیوں کو کٹوا دو گے؟"

ارغون خان نے جواب دیا: "ایک عورت کی خاطر؟ معمولی کی خاطر؟ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ جنگ اپنی عزت اپنی خاطر لڑنے آیا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ تم ترمہ شیریں کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ وجہ فساد ترمہ شیریں ہے وہ ہمیں واپس ملنی چاہیے۔"

سونجاق نے کہا: "اور اگر وہ واپس نہ ملے تو؟"

ارغون خان نے جواب دیا: "پھر ہم اسے جبراً بزورِ شمشیر حاصل کریں گے۔"

سونجاق نے کہا: "تب پھر آؤ۔ ہم بزورِ شمشیر ہی فیصلہ کر لیں۔"

ارغون خان اپنی فوج میں واپس گیا اور دوسری طرف سے شہزادہ سونجاق بھی اپنی فوج میں جا ملا۔ طبلِ جنگ بجا اور دونوں فوجوں نے تیروں کی بوچھار سے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔ زخمیوں کی چیخوں سے میدانِ جنگ گونجنے لگا۔ اپنے گرے ہوئے زخمی ساتھیوں کو روندتے ہوئے فریقین ایک دوسرے کی طرف بڑھے پھر جب فاصلہ ختم ہو گیا تو تلواریں چلنے لگیں۔ نیزے چلے اور دستی جنگ شروع ہو گئی۔

ارغون خان نے انہیں لڑتا ہوا چھوڑا اور کافی لمبا چکر کاٹ کر وہ سونجاق کی خواتین والے خیموں تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی وہ تین ساڑھے تین میل کا سفر طے کر چکا تھا کہ اسے دوسری طرف سے بھی چند فوجی آتے دکھائی دیے۔ ارغون خان کا خیال تھا کہ ان سے جنگ ناگزیر ہے مگر اس وقت اس کو بڑی حیرت ہوئی جب دوسری طرف سے چغتائی فرماں روا براق خان جو اب غیاث الدین کہلاتا تھا، آگے بڑھا۔ اس نے ارغون خان کو دور ہی سے پہچان لیا تھا، پھر بھی اس نے پوچھا: "کیا تم میں شہزادہ ارغون خان موجود ہے؟"

ارغون خان نے جواب دیا: "ہاں میں یہاں موجود ہوں۔"

غیاث الدین نے کہا: "میں چغتائی فرمانروا غیاث الدین ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دو چنگیزی خانوادے ایک عورت کے لیے خون خرابہ کریں۔ میں ترمہ شیریں کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ یہ جو کچھ ہوا شہزادہ سونجاق کی کم عقلی اور حسن پرستی سے ہوا۔ ترمہ شیریں ہمارے پاس اباقہ خان کی امانت تھی، اب میں اس امانت کو واپس کر رہا ہوں۔"

ارغون خان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، اس نے شک و شبہے سے پوچھا: "کیا سچ مچ؟ ترمہ شیریں کہاں ہے؟"

غیاث الدین کے چند آدمی ترمہ شیریں کو ارغون خان کے حوالے کر گئے۔

غیاث الدین نے کہا: "اب جنگ بندی کا اعلان کر دو۔ میں بھی یہی کروں گا۔ تم یہاں سے فوراً واپس چلے جاؤ اور اباقہ خان سے کہنا یہ جو کچھ ہوا ہے اس پر میں بے حد شرمندہ ہوں۔"

ارغون خان نے سوچا کہیں اس میں کوئی سازش تو نہیں۔ اس نے ترمہ شیریں کو دیکھا وہ مسکرا رہی تھی لیکن اس مسکراہٹ میں بھی اس کا خوف اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

ارغون خان نے پوچھا: "ترمہ شیریں تو خیریت سے تو ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "میں بالکل خیریت سے ہوں۔"

ارغون خان دیوانہ وار واپس گیا اور اسی وقت جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ دوسری طرف غیاث الدین نے بھی یہی کیا لیکن شہزادہ سونجاق اس جنگ بندی کے خلاف تھا۔ اس نے بڑا شور کیا اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ترمہ شیریں ارغون خان کے حوالے کی جا چکی ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

غیاث الدین بار بار یہی کہہ رہا تھا: "محض ایک عورت کی خاطر دو چنگیزی خانوادوں میں تلوار نہیں چلنی چاہیے۔"

غیاث الدین نے شہزادہ سونجاق کو ہندی غلام کی طرح بندھوا کر ہرات روانہ کر دیا۔

دوسری طرف شہزادہ ارغون خان فتحمندی کے نشے سے سرشار ترمہ شیریں کو لیے ہوئے مراغہ روانہ ہو گیا۔

(جاری ہے)





شام سحر

الیاس سیتاپوری

ارغون فاتحانہ شان سے مراغہ میں داخل ہوا۔ اباقہ خان اور ولی عہد تکودار نے اس کی شاندار پذیرائی کی اباقہ خان ترمہ شیریں سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن دہ اپنی اس بے چینی کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اباقہ خان نے شہزادہ ارغون کو گھوڑے سے اتار لیا۔ اور اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے اُسے شاباشی دی: "ارغون! میں تجھ پر فخر کرسکتا ہوں۔ تجھ میں سوبدائی بہادر جیسی دُور اندیشی اور میرے باپ ہلاکو جیسی بہادری پائی جاتی ہے ترمہ شیریں کہاں ہے؟"

ارغون اپنی تعریف سن کر آدا ترچھا ہوگیا۔ بولا: "میں نے سونجاق کو وہ سبق دیا ہے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ رہی ترمہ شیریں، تو اب وہ آپ کے کس کام کی۔ کیونکہ میں نے سنا ہے شیر کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔"

اباقہ خان نے ارغون کو ایسی نظروں سے گھورا، گویا وہ ارغون کے جواب سے بہت برہم ہے۔ اس نے پوچھا: "ارغون! آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

ارغون نے جواب دیا: "ترمہ شیریں کو شہزادہ سونجاق نے جھوٹا کردیا ہے اب وہ آپ کے کسی کام کی نہیں رہی۔"

اباقہ خان نے طیش میں کہا: "لیکن میں انسان ہوں، جانور نہیں۔ ہمارے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کی بیوی بورتے کو دشمن قبیلے نے اغوا کرکے دو سال تک اپنے پاس رکھا تھا، پھر جب چنگیز خان نے بورتے کو دوبارہ حاصل کرلیا تو اس کے کسی عزیز رشتہ دار نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیر کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔ اس نے بورتے کو بھی رکھا اور اس کے ناجائز بیٹے جوچی کو بھی پیار محبت سے پالا اور جب وہ جوان ہوگیا تو روس کی حکومت اس کے حوالے کردی۔ کیا میں اپنے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کی اتباع نہ کروں؟"

ارغون لاجواب ہوکر چپ ہوگیا۔ اباقہ خان نے پھر سختی سے پوچھا۔

"ترمہ شیریں کہاں ہے؟"

ارغون نے پژمردگی سے جواب دیا: "پدرِ محترم! آپ خاطر جمع رکھیں۔ ترمہ شیریں آپ کو مل جائے گی۔"

نکودار نے اپنا تیر چلایا۔ عرض کیا: "پدرِ محترم! بھائی ارغون، ترمہ شیریں کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے ہیں۔"

اباقہ خان نے غصے میں ادھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا اور سپاہ کو حکم دیا: "ترمہ شیریں کو برآمد کر کے میری خدمت میں پیش کیا جائے۔"

شہزادہ ارغون نے ناگواری سے منہ بنایا اور کہا: "والدِ بزرگوار! آپ عجلت نہ کیجیے اور ترمہ شیریں کو میرے پاس ہی رہنے دیں۔"

اباقہ خان نے بحالتِ برہمی حکم دیا: "ارغون! ترمہ شیریں کو میرے حوالے کر دے۔"

شہزادہ ارغون ڈر گیا، وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلا گیا، اور جب وہ واپس آیا تو ترمہ شیریں اس کے ساتھ تھی، اُس کو دھکا دے کر اباقہ خان کے سامنے گرا دیا، بولا: "سنبھالیے اپنی ترمہ شیریں کو۔ مگر والدِ بزرگوار! میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ ترمہ شیریں کو قبول کر لینا آپ کے شایانِ شان نہیں۔"

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کو سنبھال کر اٹھایا اور پھر پھرتی سے جھک کر ارغون کو گردن سے پکڑ لیا: "گستاخ لڑکے! ذرا سی کامیابی نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔" اُس نے ولی عہد نکودار کو حکم دیا: "ارغون کو قید کر دیا جائے۔"

لیکن نکودار نے ارغون کی حمایت کی، بولا: "پدرِ محترم! ارغون جذباتی نوجوان ہے، اسے ایک بار معاف کر دیا جائے۔"

اباقہ خان نے نکودار کو بھی ڈانٹ دیا: "اگر تو بھی میری نافرمانی کرے گا تو میں کسی اور کو ولی عہد بنا دوں گا۔"

نکودار چھ نامور سرداروں کو لے کر ارغون کی طرف بڑھا، اور ارغون کے کان میں کہا: "ارغون! میں مجبور ہوں لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تیرے ساتھ زیادتی نہیں کروں گا۔ میں تجھے گرفتار کرتا ہوں۔"

نکودار نے ارغون کی کمر میں بندھی ہوئی پیٹی کھلوا کر اپنے قبضے میں کی اور اُس کے خنجر اور پیش قبض کو ایک سردار کے حوالے کر دیا، بولا: "اس کو احتیاط سے رکھنا، یہ ایک شہزادے کی امانت ہے۔"

ارغون کو محل کے ایک حجرے میں قید کر دیا گیا۔ ترمہ شیریں نے اس سارے واقعے کو مزے لے لے کر دیکھا اور منہ پھیر پھیر کر مسکراتی رہی۔ جب ارغون کو قید خانے میں ڈال دیا گیا تو ترمہ شیریں نے افسوس کرتے ہوئے کہا: "افسوس! کہ اس کی ساری محنت اکارت گئی۔ اب اس کا کیا ہوگا؟"

لیکن اباقہ خان ترمہ شیریں کو جواب دیے بغیر محل میں چلا گیا۔

ترمہ شیریں اس کے ساتھ تھی۔ یہاں اس کو چند نئی لڑکیاں نظر آئیں۔ ترمہ شیریں نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "ان جیسی اور کتنی لڑکیاں محل میں آ چکی ہیں؟"

اباقہ خان کی ذہنی کیفیت بگڑ چکی تھی۔ وہ ترمہ شیریں پر بگڑ گیا: "آخر یہ تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ ترمہ شیریں! میں ایل خان ہوں، تم سب کا حکمران۔ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں، پھر تو نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا کہ ان جیسی اور کتنی لڑکیاں محل میں آ چکی ہیں؟"

ترمہ شیریں بھی سہم گئی، بولی: "مجھ پر رحم کر دیجیے، میں معافی چاہتی ہوں۔"

اباقہ خان نے بدستور درشت لب و لہجے میں کہا: "میں نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تو سونجاق کے ساتھ کیوں چلی گئی تھی اور میں نے تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو سونجاق کے علاوہ کس کس کے پاس رہی، میں نے تجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور تو مجھ سے سوال کر رہی ہے، خوب!"

ترمہ شیریں کا خون خشک ہو چکا تھا۔

اباقہ خان ٹہلنے لگا، وہ ٹہلتا رہا اور بڑبڑاتا رہا: "میں نہ تو کسی کا باپ ہوں اور نہ کسی کا عاشق۔ میں ایل خان ہوں۔ یہاں کا سب سے بڑا اور سب سے طاقتور حکمران۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔"

اسی دوران شراب اور گوشت کا انتظام کر دیا گیا۔ اباقہ خان بڑبڑانا اور ٹہلنا بھول گیا اور گوشت کو بھوکے بھیڑیے کی طرح جلدی جلدی کھانے لگا۔ حسین و جمیل لڑکیاں اس کے چاروں طرف کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اباقہ خان کو شراب کے جام پیش کیے، وہ انھیں جلدی جلدی خالی کرنے لگا۔ ترمہ شیریں منہ پھلائے اس سے ذرا دُور بیٹھی ہوئی تھی۔

جب نشہ چڑھا تو اسے اچانک ترمہ شیریں یاد آ گئی، اس نے ہاتھ کے اشارے سے ترمہ شیریں کو قریب بلایا: "تو وہاں، اتنی دُور بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ میرے پاس آ جا۔"

ترمہ شیریں بے دلی سے اٹھی اور اباقہ خان کے پاس بیٹھ گئی۔

اباقہ خان نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور شرمندگی سے کہنے لگا: "کیا تو خفا ہو گئی؟ ترمہ شیریں! کیا تو ناراض ہے مجھ سے؟ مگر کیوں؟ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے تھا تجھ سے۔ تو مجھے چھوڑ کر شہزادہ سونجاق کے پاس چلی گئی تھی۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا: "محترم ایل خان! میں مالِ غنیمت ہوں، لوٹ کا مال، حملہ آور آتے ہیں اور مجھے لوٹ کر لے جاتے ہیں، میں کسی کے ساتھ کیوں جانے لگی۔"

اباقہ خان نے اُسے اپنی طرف کھینچا: "ترمہ شیریں! جب میں نے یہ سُنا تھا کہ شہزادہ سونجاق تجھے لے گیا تو مجھے دکھ بھی پہنچا

تھا اور غصہ بھی آیا تھا۔ ہم منگول اب فاتح اور حکمراں کم اور عاشق زیادہ ہو گئے ہیں۔"

ترمہ شیریں اب بھی ناراض تھی، یوں بھی اسے شہزادہ سوبخاق یاد آرہا تھا، جذباتی نوجوان پُرجوش شہزادہ، وہ اباقہ خان سے بڑا عاشق تھا اور پیارا محبوب بھی۔ اباقہ خان نشہ میں اسے دیر تک مناتا رہا۔ ترمہ شیریں من گئی کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اگر وہ نہیں بھی منتی تب بھی ہونا وہی کچھ ہے جو اباقہ خان چاہے گا۔

اباقہ خان اس کی خاموشی کا یہ مطلب لے رہا تھا کہ شاید وہ شہزادہ سوبخاق کو یاد کر رہی ہے، اس وہم نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا، اس نے ترمہ شیریں کا چہرہ اپنے روبرو کر لیا، پوچھا "کیا بات ہے ترمہ شیریں! تو کیا سوچ رہی ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا "محترم خان! میں جو کچھ سوچ رہی ہوں، اگر اس کا اظہار کر دوں تو آپ اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔"

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کے سر کو کئی بار جھٹکا دیا "یعنی! تو بیان تو کر، میں برداشت کروں گا۔"

ترمہ شیریں نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا "اب اس بات کو رہنے دیجئے، میں نہیں چاہتی کہ فاتح کے خاندان میں پھوٹ پڑ جائے۔"

اباقہ خان کا نشہ ہرن ہو رہا تھا۔ اس نے ترمہ شیریں کو ایک سخت جھٹکا دیا، بولا "میں تجھ سے معلوم کر کے رہوں گا کہ تو کیا کہنا چاہتی ہے؟"

ترمہ شیریں نے کہا "آپ مجھے جھٹکے دیں اور جس بات کو میں چھپانا چاہتی ہوں، اس کے اظہار پر مجھے مجبور نہ کریں۔"

اباقہ خان پاگل ہوا جا رہا تھا، اس نے ترمہ شیریں کے بال پکڑ لیے بولا "ترمہ شیریں! میرا امتحان نہ لے۔ اول تو تجھے ایسی بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی اور اگر کی ہے تو اس گرد آلود مطلع کو صاف کر دے۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

ترمہ شیریں نے اباقہ خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں پوچھا "تب پھر میں بتا دوں وہ بات؟"

اباقہ خان نے بے باکی سے جواب دیا "ہاں بتا دے وہ بات۔"

ترمہ شیریں نے کہا "آج جب شہزادہ ارغون سے آپ نے مجھے طلب کیا تھا تو اس نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟"

اباقہ خان نے جواب دیا "اس نے کہا تھا کہ شیر کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔"

ترمہ شیریں نے کہا "اس نے یہ کیوں کہا تھا، آپ نے کچھ سوچا؟ ارغون میرا تیسرا عاشق ہے۔ پہلے عاشق آپ ہیں، دوسرا عاشق شہزادہ سوبخاق ہے اور تیسرا عاشق شہزادہ ارغون ہے۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ میں نے تین بڑوں کے دل جیت لیے ہیں۔"

اباقہ خان دم بخود رہ گیا، پوچھا "کیا تو یہ سچ کہہ رہی ہے؟"

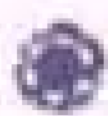
ترمہ شیریں نے جواب دیا "میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔ جب شہزادہ ارغون مجھے لے کر آ رہا تھا تو راستے میں کئی جگہ اس نے مجھ سے اظہارِ عشق کیا اور میں اس کو ٹالتی رہی۔ اس نے میرا سفر کرنا دوبھر کر دیا تھا۔"

اباقہ خان نے پوچھا "کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا "میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں، اسی لیے میں اس کو چھپا رہی تھی۔ میں جانتی تھی آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔"

اباقہ خان نے کہا "شہزادہ ارغون اپنے کیے کی سزا پا کر رہے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔"

ترمہ شیریں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی، وہ ارغون کو اس لیے سزا دلوانا چاہتی تھی کہ اس نے ترمہ شیریں کو شہزادہ سوبخاق سے جدا کرایا تھا۔



شہزادہ ارغون قید خانے میں بند اپنی بدقسمتی پر غور کر رہا تھا۔ ترمہ شیریں کو شہزادہ سوبخاق سے چھین لینے کے بعد وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جملہ عساکر کا سپہ سالار بنا دیا جائے گا مگر عین وقت پر قسمت نے منہ پھیر لیا، اور وہ قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ قید خانے کے باہر پہریداروں کی بھاری جمعیت پہرہ دے رہی تھی۔ اسی عالم میں ارغون کو مطلع کیا گیا کہ سعد اللہ یہودی اس سے ملنا چاہتا ہے۔

سعد اللہ یہودی جب اس سے ملا تو اس نے اپنا چہرہ ایک بڑے رومال سے چھپا رکھا تھا۔ ایک سپاہی ان دونوں کے قریب کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ ان دونوں کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ سعد اللہ یہودی نے پوچھا "میرے آقا! یہ کیا ہو گیا، یہ میں آپ کو کس حال میں دیکھ رہا ہوں؟"

ارغون نے جواب دیا "سعد اللہ! میری قسمت مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے اور میرے سر پر کبھی خوش قسمتی کا سورج طلوع ہو جاتا ہے اور کبھی میری بدقسمتی کے بادل سایہ فگن ہو جاتے ہیں۔"

سعد اللہ یہودی نے دبی زبان میں کہا "میرے آقا! انسان کی بیشتر مصیبتیں اس کی زبان کے بے جا استعمال کی پیداوار ہوتی ہیں آپ کو ترمہ شیریں سے عشق نہیں کرنا تھا اور اگر عشق کیا ہی تھا تو اس کو اپنے سینے میں چوری کی قیمتی شے کی طرح چھپا کر رکھنا تھا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور اپنی بے احتیاطی اور زبان کے لگتے ہوئے زخم کی اذیتیں جھیل رہے ہیں۔"

ارغون نے پوچھا "پھر اب میں کیا کروں؟"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا "آپ اگر چاہیں تو اب بھی

اپنی بدقسمتی کو خوش قسمتی میں بدل سکتے ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے بے چینی سے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

دانا یہودی نے جواب دیا۔ "آپ فی الحال ترمہ شیریں کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیں اور اباقہ خان کو یہ باور کرا دیں کہ آپ نے جو غلطی یا جرم کیا ہے وہ بحالتِ نشہ کیا ہے اور آپ اس پر شرمندہ ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ "کیا اس طرح میرا باپ مجھے معاف کر دے گا؟"

یہودی نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے اس کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ آپ کا باپ بہت عقلمند اور شفیق ہے۔"

شہزادہ ارغون اپنی غلطی پر نادم تھا۔ اس نے بڑے کرب سے کہا۔ "افسوس کہ میں جملہ عساکر کا سپہ سالار نہیں بن سکا۔"

سعداللہ یہودی نے اسے تسلیاں دیں۔ "شہزادے! آپ مایوس نہ ہوں آپ ابھی اپنی بازی ہارے نہیں ہیں۔ وقتی تعطل آپ کو ہراساں اور مایوس کر رہا ہے مگر آپ اب بھی سپہ سالار ہیں۔ سپہ سالار بننا آپ کا مقدر ہے۔ آپ کی قسمت اور خدا کی مشیت ہے۔"

شہزادہ ارغون کے چہرے پر امید کی چمک پیدا ہو گئی۔ کہا۔ "خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔"

سعداللہ یہودی نے آہستہ سے آمین کہا اور شہزادے کو سمجھانے لگا۔ "شہزادے! دنیا کے جملہ ناکام انسانوں میں ایک قدر مشترک ملے گی، ایک نقص عام، ایک مشترکہ غلطی۔ دنیا کے سارے ناکام، جذباتی غیر محتاط اور زبان کے ہلکے ہوتے ہیں۔ آپ میں بھی یہی عیوب پائے جاتے ہیں۔ اب جب آپ کی اپنے باپ سے ملاقات ہو، آپ ان سے معافی مانگ لیجیے گا۔ اللہ نے چاہا تو حالات بدل جائیں گے۔ قسمت ایک بار پھر آپ پر مہربان ہو جائیں گے۔"

پہرے دار سپاہی نے سعداللہ یہودی کو مزید رکنے اور باتیں کرنے سے روک دیا۔ سعداللہ نے پہرے دار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "میرے عزیز دوست! میں چند لمحوں بعد چلا جاؤں گا۔ بس چند لمحے اور۔"

سپاہی نے درشت آواز میں کہا۔ "بس جناب! میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔"

شہزادہ ارغون کو غصہ آ گیا۔ بولا۔ "دو درہم کے خدمت گار! اگر میں بادشاہ بن گیا تو تجھے دیکھ لوں گا۔ آخر تو خود کو سمجھتا کیا ہے!"

سپاہی ایک دم اکھڑ گیا۔ سختی سے کہا۔ "اب میں ایک لمحہ بھی نہیں دوں گا تجھے۔ مجھ سے جب یہ پوچھا جائے گا کہ آپ نے یہاں کس قسم کی باتیں کی تھیں تو میں کیا جواب دوں گا۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "جب تجھ سے کوئی اس قسم کا سوال کیا جائے تو صاف صاف کہہ دینا کہ ہم دونوں اپنے باپ اباقہ خان کے خلاف سازش کر رہے تھے۔"

سعداللہ یہودی ایک دم برہم ہو گیا۔ بولا۔ "پھر وہی زبان کا ہلکا پن اور جذباتیت۔ شہزادے! میں آئندہ آپ سے نہیں ملوں گا۔"

شہزادہ اس کو روکتا ہی رہ گیا مگر وہ نہیں رکا۔ بعد میں شہزادے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

اباقہ خان شہزادہ ارغون خان سے بہت ناراض تھا۔ کئی سمتوں سے شہزادہ ارغون کے لیے سفارشیں بھی آئیں مگر اباقہ خان نے اسے معاف نہیں کیا۔ سعداللہ یہودی شہزادہ ارغون کے لیے فوج میں کام کر رہا تھا وہ فوجیوں کو ورغلا رہا تھا کہ جب ان کا سپہ سالار ایل خان کی قید میں پڑا ہے تو فوجیوں کی طرف سے یہ خاموشی کیوں؟ اس نے فوجیوں کو بغاوت پر اکسایا اور انھیں مشورہ دیا کہ اباقہ خان کے خلاف اپنی تلواریں نیام سے نکال لیں۔

شمس الدین جوینی حالات سے باخبر تھا۔ اس نے ولی عہد نکودار کو سمجھایا۔ "اس سے پہلے کہ بغاوت ہو آپ سفارش کر کے شہزادہ ارغون کو رہائی دلوا دیں۔"

شہزادہ نکودار نے پوچھا۔ "مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ "اس سے دو بھائیوں کی رنجشیں کم یا بالکل ختم ہو جائیں گی اور سعداللہ یہودی اپنے ارادوں میں ناکام ہو جائے گا۔"

● وزیراعظم کے مشورے پر ولی عہد نکودار نے اپنے بھائی شہزادہ ارغون کو رہائی دلوا دی۔ جب وہ آزاد ہوا تو قید خانے کے دروازے پر اسے خوش آمدید کہنے والوں میں ولی عہد نکودار بھی تھا اور سعداللہ یہودی بھی۔ شہزادہ ارغون نے ان دونوں پر چبھتی نظریں ڈالیں اور پھر ولی عہد نکودار سے پوچھا۔ "ولی عہد بہادر آپ کی تشریف آوری کا مقصد؟"

سوال کے پیچھے جو طنز چھپا ہوا تھا ولی عہد نکودار نے بھی اچھی طرح محسوس کر لیا۔ بولا۔ "بھائی ارغون! میرے چھوٹے بھائی! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟"

شہزادہ ارغون کی خدمت میں موجود سعداللہ یہودی سنجیدہ مسکرایا اور شہزادے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں سعداللہ یہودی نے شہزادہ ارغون کو سمجھایا۔ "شہزادے خدا کے لیے اپنی جذباتیت کم کریں۔ آپ کی آزادی کا سبب فوجی سرداروں کی یہ دھمکی ہے کہ اگر شہزادہ ارغون کو رہا نہ کیا گیا تو فوجیوں کی بہت بڑی تعداد بغاوت کرے گی۔"

شہزادہ ارغون اپنی رہائی سے بہت خوش تھا۔ سعداللہ یہودی سے پوچھا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

یہودی نے جواب دیا "اس کے بعد ... اس کے بعد پھر کسی مناسب موقع پر آپ موجودہ حکومت کے خلاف ..."

وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم اٹھا اور کمرے سے نکل گیا اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ سعداللہ یہودی کچھ کھسیایا ہوا تھا۔ بولا "اور جب آپ یہ محسوس کریں کہ فوج کی فضا آپ کے حق میں سازگار ہے آپ فوراً یہاں سے کہیں اور ..."

شہزادہ ارغون بڑی تشویش میں تھا، کہا "فضا میرے حق میں ذرا بھی سازگار نہیں ہے شاید، کیونکہ ابھی میرا باپ اباقہ خان اور اس کی فوج کے حمایتی سردار موجود ہیں۔"

سعداللہ یہودی نے کہا "پھر بھی کوشش کر دیکھنے میں ہرج ہی کیا ہے؟"

شہزادہ ارغون بہت دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ چہرے پر مایوسی اور بے زاری کے آثار موجود تھے، بولا "آپ کہتے ہیں تو یہ کوشش بھی کر دیکھوں گا ورنہ مجھے امید کی کوئی ننھی سی کرن تک نہیں نظر آ رہی۔"

سعداللہ یہودی نے کہا "شہزادے! آپ ہمت نہ ہاریں۔ آپ کی باتوں سے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا "سعداللہ میرے مشفق ساتھی میں نے ہرات کے میدان میں چغتائیوں کو شکست دے کر اور تورشیز میں کو حاصل کر کے اپنے باپ سے یہ آس لگائی تھی کہ وہ مجھے اپنے جملہ عساکر کا سپہ سالار اعلیٰ بنا دے گا مگر اس نے میرا مرتبہ بڑھانے کے بجائے گھٹا دیا اور میں قید کر دیا گیا۔"

سعداللہ یہودی نے برہمی اور مایوسی سے کہا "شہزادے! میں پھر بھی کہوں گا کہ آپ اپنی جذباتیت اور عجلت پسندی سے پیچھا چھڑا لیں پھر دیکھیے گا آپ کے سارے کام خود بخود ہوتے چلے جائیں گے۔"

شہزادہ ارغون نے پوچھا "شہزادہ نکودار میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ میں کیا کروں؟ دوست بن جاؤں یا دور دور رہوں؟"

سعداللہ یہودی نے بشاشت بھرے لہجے میں جواب دیا "سبحان اللہ سبحان اللہ، کیسی خوشخبری سنائی ہے شہزادے آپ نے! لہٰذا آپ اس سے فوراً دوستی کر لیں اور میری یہ بات ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ اپنے دشمن کو دشمن بن کے نہیں، دوست بن کے جیسی شکست دی جا سکتی ہے کسی اور طرح ممکن نہیں ہے۔ آپ شہزادہ نکودار سے پہلی فرصت میں دوستی کر لیں۔"

شہزادہ ارغون سوچتے سوچتے اٹھا اور سیدھا ولی عہد نکودار کے پاس پہنچا۔ اس وقت شمس الدین جوینی ولی عہد کو عقل و دانش کی باتیں بتا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "ولی عہد بہادر کھلے دشمن کا مقابلہ کرنا آسان ہے مگر دوست نما دشمن سے جیتنا تقریباً ناممکن ہے۔ اعتماد کرنا بڑی اچھی بات ہے مگر اعتماد نہ کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔"

جب خدمت گار نے اندر داخل ہو کر ولی عہد کو یہ بتایا کہ شہزادہ ارغون شرف باریابی کا خواستگار ہے تو شمس الدین جوینی اور ولی عہد نکودار ایک دوسرے کا سوالیہ انداز میں منہ دیکھنے لگے۔

شمس الدین جوینی نے کہا "ولی عہد بہادر ہوشیار۔ جس طرح حبشی لاکھ بار نہانے سے گورا نہیں ہو سکتا اسی طرح بدباطن احسان کے بوجھ تلے دب کر احسان مند اور شکرگزار نہیں ہو سکتا۔"

ولی عہد نے پوچھا "کیا میں شہزادہ ارغون سے ملاقات کروں یا نہ کروں؟"

وزیر نے جواب دیا "آپ ملاقات ضرور کریں مگر مجھ کو یہاں سے چلا جانے دیں کیونکہ میری موجودگی میں شہزادہ اپنے دل کی باتیں نہیں کر سکے گا۔"

ولی عہد نے کہا "بہتر ہے۔"

وزیر چلا گیا اور شہزادہ اندر داخل ہوا۔ راستے میں ان دونوں کا آمنا سامنا جو ہوا تو دونوں ہی لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے کے مقابل رک کے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور اپنی اپنی راہ لی۔

شہزادہ ارغون کے درجہ حرارت میں کچھ اضافہ ہو چکا تھا، اس نے طنزاً پوچھا "برادرِ محترم! یہ مسلمان وزیر آپ سے کس قسم کی باتیں کرتا رہتا ہے؟"

ولی عہد نے جواب دیا "میں نے اس کی باتیں کبھی بھی غور سے

نہیں سُنیں۔ وہ بولتا رہتا ہے میں سنتا رہتا ہوں لیکن یاد کچھ بھی نہیں رکھتا۔"

شہزادہ ارغون نے کہا: "مجھے جوینی کی شکل سے نفرت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ ہمیں یا ہمارے آدمیوں کو مسلمان کر لے گا۔"

ولی عہد نے موضوع بدلنا چاہا: "شہزادے! آپ کی تشریف آوری کا مقصد؟ کوئی خدمت میرے لائق؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا: "اُس دن جب میں آپ کی سفارش پر آزاد ہوا تھا، میں نے آپ کے اتنے بڑے احسان کا شکریہ تک نہیں ادا کیا، اب میں اپنے ضمیر سے تنگ آکر معافی مانگنے حاضر ہو گیا ہوں۔"

ولی عہد نے شہزادے کی پیٹھ تھپتھپائی، کہا: "اس کی کیا ضرورت ہے شہزادے! تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔"

شہزادے نے جواب دیا: "برادرِ محترم! میں شرمندہ ہوں میرا ضمیر شرمندگی کے اس بوجھ تلے دبتا چلا جا رہا ہے۔"

ولی عہد نے کہا: "عزیز از جان بھائی! جب میں بار بار یہ کہہ رہا ہوں کہ جا، میں نے تجھے معاف کیا، تب پھر یہ شرمندگی اور ضمیر کا یہ دباؤ کیوں؟"

شہزادہ ارغون نے کہا: "اچھا چلیے آپ نے تو مجھے معاف کر دیا، اب آپ یہ بتائیے کہ میں پدرِ بزرگوار سے کس طرح معافی مانگوں؟"

ولی عہد نے چونک کر پوچھا: "کیا وہ اب بھی ناراض ہیں تجھ سے؟"

شہزادے نے جواب دیا: "ہاں جناب! شاید وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو گئے ہیں۔"

ولی عہد نے وعدہ کیا: "میں کوشش کروں گا کہ پدرِ بزرگوار تجھے معاف کر دیں۔"

شہزادہ ارغون نے ولی عہد کے تخت پر چند کتابیں رکھی ہوئی دیکھیں، اس نے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا، ان میں کی ایک تو شیخ سعدی کی گلستان تھی اور دوسری سنسکرت کی پنچ تنتر کا عربی ترجمہ کلیلہ دمنہ۔ شہزادے نے پوچھا: "برادرِ محترم! ان کتابوں میں کیا لکھا ہے؟"

ولی عہد نے جواب دیا: "ان کتابوں میں انسانی تجربوں کا نچوڑ محفوظ کر دیا گیا ہے۔ چونکہ فانی انسان لمبی عمریں لے کر نہیں آتا، اس لیے یہ کتابیں جو بہتوں کے تجربات اور علم و دانش کا احاطہ کرتی ہیں، ہماری راہنمائی کرتی ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے پوچھا: "کیا میں انہیں پڑھ اور سمجھ سکتا ہوں؟"

ولی عہد نے جواب دیا: "پڑھ تو سکتے ہو مگر سمجھ نہیں سکتے۔"

شہزادے نے پوچھا: "کیا میں انہیں سمجھنے کے لیے ہر روز آپ کے پاس آ سکتا ہوں؟"

ولی عہد نے جواب دیا: "تم میرے پاس آنے کے بجائے وزیر جوینی کی صحبت اختیار کرو کیونکہ شمس الدین جوینی علم کا سمندر ہے۔"

شہزادہ مایوس ہو گیا، بولا: "لیکن وزیر تو اسلام کی باتیں کرنے لگتا ہے اور مجھے اسلام کی باتیں ذرا بھی پسند نہیں۔"

ولی عہد نے تلخ رویّہ اختیار کیا، بولا: "اور وہ سعد اللہ یہودی فتنہ و شرارت کی جڑ۔ کیا وہ یہودیت کی بات نہیں کرتا؟"

شہزادہ ارغون جب لاجواب ہوا تو چُپ ہو گیا۔

ولی عہد دیر تک اُسے سمجھاتا رہا، شہزادہ اس کی باتیں بہت توجہ سے سنتا رہا۔ آخر میں یہ وعدہ کر کے چلا گیا کہ اب وہ ولی عہد اور جوینی کی صحبت اختیار کرے گا اور رفتہ رفتہ سعد اللہ یہودی سے نجات حاصل کرے گا۔

ولی عہد نکودار نے اباقہ خان سے شہزادے ارغون کی سفارش کی اور باپ نے اسے معاف کر دیا۔ سعد اللہ یہودی نے اسے مبارک باد پیش کی اور کہا: "شہزادے! اگر تم اسی طرح میرے مشوروں پر عمل کرتے رہے تو ایک دن تم کامرانیوں کی معراج دیکھو گے۔"

شہزادہ سعدی کی گلستان لیتا آیا تھا۔ سعد اللہ یہودی اس کی حکایتیں شہزادے کو سناتا اور پھر خوب ہنس ہنس کر ان حکایات اور شیخ سعدی کا مذاق اڑاتا۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے شہزادہ ارغون کو یہ یقین دلاتا کہ گلستان میں شیخ سعدی کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ سعدی نے بھی ادھر ادھر سے لے کر اپنا گلستاں سجا لیا ہے۔ اس نے مزید کہا: "اور اس سے زیادہ علم و دانش کی باتیں تو عہد نامۂ قدیم میں لکھی گئی ہیں۔"

ولی عہد نے شوق ظاہر کیا: "شہزادے! میں عہد نامۂ قدیم پڑھنا چاہتا ہوں۔"

شہزادہ بہت خوش ہوا، بولا: "برادرِ محترم! اس سلسلے میں آپ کو سعد اللہ یہودی کی صحبت اختیار کرنا پڑے گی کیونکہ وہ جدید اور قدیم مذہبی ادب کا مجموعۃ العلوم ہے۔"

ولی عہد نے کہا: "اس شرط پر کہ وہ مجھ سے مذہبی باتیں نہیں کرے گا۔ اس کے دین کی بڑائی اور برتری سے مجھے کیا لینا دینا، لیکن یہ چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں جو پند و نصائح کا بھیس بدل کر کسی انسان میں داخل ہو جاتی ہیں تو اسے ہاتھی کی طرح پچھاڑ دیتی ہیں۔"

شہزادہ ارغون ولی عہد کی عاقلانہ باتوں سے لطف حاصل کر رہا تھا۔ محل کے اندرونی حصے سے کسی کے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شہزادے کی توجہ گانے کی طرف منعطف ہو گئی۔ ولی عہد نے کچھ دیر بعد پوچھا: "شہزادے! کیا گانا تمہیں بہت زیادہ پسند ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا: "واہ جناب! کیا گانا بھی کسی کو ناپسند ہو سکتا ہے، موسیقی روح کی غذا ہے، اس غذا سے محروم روح جاہلی

اور بے کیفی کا شکار ہو جائے گی۔"

ولی عہد شہزادہ ارغون کو اندر لے گیا جہاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چند حسینائیں بیٹھی گا رہی تھیں۔

جب یہ دونوں اُن کی لاعلمی میں اُن کے سروں پر جا کھڑے ہوئے تب بھی انھیں کسی کی آہٹ سنائی نہیں دی۔ وہ گانے میں اس حد تک منہمک تھیں کہ انھوں نے اپنے وجود کے سوا سب کچھ بھلا دیا تھا۔

کچھ دیر بعد آخر انھیں معلوم ہو گیا اور وہ سب ادھر اُدھر دیکھنے لگیں، لیکن ولی عہد نے انھیں حکم دیا۔ "شہزادہ ارغون اس وقت تمھاری محفل میں موجود تمھارے فن سے محظوظ ہونا چاہتا ہے۔"

دونوں گھاس کے فرش پر بیٹھ گئے۔ اُن کے خدمت گار دیر تک ان کی خوشامدیں کرتے رہے کہ وہ کچھ کھا پی لیں لیکن دونوں کچھ کھائے پیے بغیر ہی وہاں بیٹھے رہے۔ اس محفل میں جس انداز میں گایا جا رہا تھا اس میں ترمہ شیریں کی جھلک پائی جاتی تھی۔ شہزادہ اتنا بے چین ہوا کہ اس نے مغنیہ کو ٹوک دیا، پوچھا۔ "تو نے یہ فن کس سے سیکھا؟"

اُس نے جواب دیا۔ "کسی ایک سے نہیں میرے کئی اُستاد ہیں۔"

شہزادے نے پوچھا۔ "اور یہ جو ابھی ابھی تو گا رہی تھی؟"

مغنیہ نے پورا سوال بھی نہیں سنا، بولی۔ "اس گائیکی میں ترمہ شیریں کا فیض شامل ہے کیونکہ اس انداز اور دھن میں ترمہ شیریں سے اچھا کوئی اور نہیں گا سکتا۔"

ولی عہد کو شہزادہ ارغون پر حیرت تھی کہ اس نے انداز اور دھن سے اس کے اُستاد کا پتہ چلا لیا تھا۔

دوسری طرف ترمہ شیریں کے ذکر نے شہزادہ ارغون کے صبر و قرار کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھا بیٹھا پہلو بدلتا رہا پھر بولا۔ "اس انداز اور اس دھن میں ترمہ شیریں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

ولی عہد نے اس کے دل کو ٹٹولنا چاہا، بولا۔ "میں نے ترمہ شیریں کو بہت زیادہ نہیں سنا، اب ارادہ ہے کہ اس کو بلا کر سنوں، شاید میری بات رد نہ کی جائے کیونکہ ان دنوں میری قسمت کا ستارہ عروج پر ہے۔"

شہزادہ ارغون نے تڑپ کر درخواست پیش کر دی۔ بولا۔ "برادرِ محترم! ترمہ شیریں کو سنتے رہنے کی تو حسرت ہی رہ گئی دل میں۔ اب پتہ نہیں پھر کبھی بھی سن سکوں گا یا نہیں۔"

ولی عہد نے مغنیہ کو حکم دیا۔ "تو چپ کیوں ہو گئی؟ گاتی کیوں نہیں؟"

مغنیہ پھر گانے لگی۔ شہزادے نے اُسے ٹوک دیا۔ "اسی دھن میں، اسی انداز میں، ترمہ شیریں والے انداز اور دھن میں۔"

مغنیہ نے ایک بار پھر ترمہ شیریں کے انداز اور ڈھنگ میں گانا شروع کر دیا۔

ولی عہد کا تو حال ہی کچھ اور تھا جب گانا ختم ہو گیا تو ایک مغنیہ نے اُس سے پوچھا۔ "آپ کچھ اور بھی سنیں گے یا بس؟"

ولی عہد نے ہاتھ کے اشارے سے اُس کو روک دیا۔ شہزادہ ارغون بہت زیادہ پی جانے کے سبب اُٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ گھاس کے فرش پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اوپر آسمان کے علاوہ کوئی سائبان بھی نہیں تھا۔ ولی عہد نے شہزادے کو جھنجھوڑا۔ "اٹھ شہزادے اُٹھ۔ یہ کہاں سو گیا تو؟"

شہزادے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بولا۔ "میں یہیں رہوں گا۔ میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔"

ولی عہد نے خدمت گاروں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ "شہزادے کو اٹھا کر بڑی کوٹھری میں ڈال دو۔ پھر جب اُسے ہوش آ جائے تو مجھ کو بلوا لینا۔"

خدمت گاروں نے حکم پاتے ہی شہزادے کو دبوچ لیا۔ وہ نشہ میں چور انسان اس وقت تک نشے میں رہا جب تک اُسے ننگے فرش پر نہایت بے دردی سے پٹک نہیں دیا گیا۔ خدمت گار کوٹھری کو باہر سے بند کر کے چلے گئے۔ اس بار ولی عہد خود ابھی وہاں سے ٹل گیا۔

فرش پر پٹکنے کی وجہ سے شہزادہ ارغون کے سر میں چوٹ آ گئی تھی۔ کئی گھنٹے بعد جب اس کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سر میں تکلیف محسوس کی۔ اس نے ہوش میں آتے ہی پہلے تو اس جگہ کا معائنہ کیا جو ہر طرف سے بند تھی، پھر اُٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی دروازہ بھی نہیں کھلا۔ اس نے ولی عہد کو آواز دی۔ "ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے؟"

اس کی آواز قید خانے ہی میں گونجنے لگی جیسے کوئی اور اس کا منہ چڑا رہا ہو۔ "ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے۔"

شہزادہ ارغون نے ذرا زور سے آواز دی۔ "ولی عہد شہزادے! تم کہاں چلے گئے ہو؟ تم سنتے کیوں نہیں؟"

لیکن جواب پھر نہیں ملا۔ اب تو وہ گھبرا گیا، وہ اٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنے اور نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ کافی دیر کی جستجو کے بعد اس کو احساس ہوا کہ یہ بدترین قید خانہ ہے وہ سوچ رہا تھا۔ "مگر اس کو قید کیوں کیا گیا؟"

وہ ایک بار پھر بیٹھ گیا اور معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے وحشت نے زور کیا اور وہ ایک بار پھر تڑپ کر اُٹھا، اور آوازیں دینے لگا۔ "ولی عہد بہادر کہاں چلے گئے ہو؟ یہ مجھے قید کس نے

اس کو اپنی کسی بات کا بھی جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہ ایک ایسا قید خانہ تھا جس میں سلاخ نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں، ٹھوس چوحدی دیواروں کے علاوہ ایک دروازہ بھی تھا لیکن اس دروازے میں بھی جھری یا سوراخ نہیں تھا۔

شہزادہ ارغون پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے قید کس نے کیا ہے لیکن یہ معلوم تھا کہ محل کے اس حصے میں ولی عہد نکودار کے علاوہ کسی کی رسائی ناممکن تھی۔ اسے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ اب اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کو نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے راستے سے ہٹایا جا رہا ہے۔

باہر شہزادہ ارغون کی گمشدگی کی خبر گشت کرنے لگی۔ سعد الدولہ یہودی سب سے زیادہ فکرمند تھا۔ ولی عہد نکودار نے اضطراری حالت میں جو کر دیا تھا، اس سے خود بھی پریشان تھا۔ اباقہ خان بھی شہزادہ ارغون کی گمشدگی سے حیران تھا۔ کچھ لوگوں نے اباقہ خان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ شہزادہ ارغون سپہ سالاری نہ ملنے کی وجہ سے خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے اور وہ جب بھی ظاہر ہو گا ایک باغی کے روپ میں ظاہر ہو گا۔

ولی عہد نکودار کے خاص محرمِ راز خدمت گار نے جب شہزادہ ارغون کو کھانا پہنچایا تو اس نے اپنا چہرہ ایک چادر میں چھپا لیا تھا اس خدمت گار کے ساتھ کئی خدمت گار .... اور بھی تھے اور ان سبھوں نے اپنے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ یہ ساتھی خدمتگار کوٹھری کے باہر کسی ناخوشگوار ہنگامی واقعے کے انتظار میں موجود تھے۔ شہزادہ ارغون نے کھانا لانے والے کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ "بتا مجھ کو یہاں کس نے قید کر رکھا ہے؟"

خدمت گار نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر شہزادہ ارغون کی مضبوط گرفت نے اسے نہیں چھوڑا۔ شہزادہ اس کے چہرے پر سے چادر ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن طاقتور خدمت گار نے سخت مزاحمت کی اور منہ سے عجیب و غریب بے معنی آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ ان آوازوں کو سن کر دوسرے خدمت گار تیزی سے اندر داخل ہوئے اور کھانا لانے والے خدمت گار کو شہزادے ارغون کی گرفت سے آزادی دلا کے باہر نکال کر دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ اندر شہزادہ ارغون غصے میں چیخ رہا تھا۔ "بدمعاشو تم سب کس کی ایما اور کس کے حکم سے کر رہے ہو؟ میں باہر نکل کر ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو اس سازش کے سرغنہ کا نام بتا دو۔"

لیکن خدمت گاروں نے شہزادے کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا۔

ولی عہد نکودار کو جب اس ناخوشگوار واقعے کی خبر ملی تو وہ بہت پریشان ہو کر شمس الدین جوینی سے ملا اور اس کو پورا واقعہ بتا کے پوچھا۔

"وزیرِ محترم! اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

شمس الدین جوینی نے پوچھا۔ "پہلے آپ یہ بتائیں کہ ایسا آپ نے کیا کیوں؟"

ولی عہد نے جواب دیا۔ "میرے بھائیوں میں شہزادہ ارغون ہی میرا سب سے بڑا دشمن ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کو قتل کر کے اس کی لاش ویرانے میں پھینکوا دوں۔"

شمس الدین نے کہا۔ "ولی عہد! آپ کی سوچ غلط ہے اس طرح آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

ولی عہد نے جواب دیا۔ "اس کے بعد میں کسی فکر اور اندیشے کے بغیر حکومت کروں گا۔"

شمس الدین نے مشورہ دیا۔ "شہزادے! شہزادہ ارغون زندہ اور آپ کے آس پاس موجود رہے اور آپ اس کی سازشوں اور حرکتوں پر اپنے فکر و تدبر سے قابو پاتے رہیں یہ ہے ایک کامیاب اور لائق و فائق حکمراں کی خوبی۔ اگر آپ نے شہزادہ ارغون کو ہلاک کر دیا تو ہلاکو خان کا پورا خانوادہ آپ ہی پر شبہ کرے گا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ دنیا کی ہمدردیاں مظلوم کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ہلاکت کے بعد شہزادہ ارغون مظلوم قرار پائے گا اور آپ ظالم۔ آپ کو اس وقت اس قصے سے بچنا چاہیے۔"

ولی عہد نے پوچھا۔ "مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "آپ قید خانے میں جائیے اور شہزادہ ارغون سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے قید خانے سے باہر لے آئیے۔"

ولی عہد نے بے چینی سے پوچھا۔ "اور پھر؟ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے"

وزیر نے جواب دیا۔ "میں سب کچھ بتاؤں گا ولی عہد بہادر! آپ پریشان نہ ہوں۔ قید خانے سے باہر نکلتے ہی شہزادہ آپ سے پوچھے گا کہ اس کو قید کس نے کیا تھا؟ آپ اس جرم میں چند ناکارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیں......"

ولی عہد بات کاٹ کر بولا۔ "کون سے ناکارہ آدمی؟ اور وہ ناکارہ آدمی اپنے ناکردہ جرم کا اقرار کریں گے ہی کیوں؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "شہزادے! حکومت اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے۔ جرم کرنے والے اپنے جرم کا اقرار کب کرتے ہیں۔ اقرار تو زبردستی کرایا جاتا ہے آپ بھی ان سے زبردستی اقرارِ جرم کرائیں گے اور اقرار کے بعد انھیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

ولی عہد کو شہزادہ ارغون کی رہائی پسند نہیں تھی وہ اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، بولا۔ "وزیرِ محترم! میرا خیال ہے قابو میں آئے ہوئے دشمن کو چھوڑ دینا بہت بڑی غلطی ہے۔"

وزیر نے سختی سے انکار کیا۔ بولا۔ "ولی عہد بہادر! آپ غلطی پر ہیں۔ اس معاملے میں میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔"

ولی عہد مجبور ہو گیا۔ "اچھا! میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا

لیکن بعد میں اس کے نتائج کا مقابلہ آپ کو کرنا ہوگا۔"

وزیر نے جواب دیا۔ "میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

ولی عہد تخلیہ میں چلا گیا۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اس کے نشیب و فراز پر اچھی طرح غور کرنا چاہتا تھا۔ گھنٹوں کے غور و فکر کے بعد وہ وزیر ہی کے مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے وزیر ہی کے مشورے سے چار ناکارہ آدمیوں کا انتخاب کیا۔ ان میں ایک تو شامان تھا، مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے والا، ایک گویا تھا جو گویا ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا، مسخرہ شاعر، دوسروں کی ہجو کہنے والا۔ تیسرا بزعم خود ایک ایسا عقلمند تھا جو خود تو دوسروں کے دسترخوان سے پیٹ بھرتا تھا مگر دوسروں کو نہایت قیمتی مشورے دیا کرتا تھا۔ یہ تیسرا شخص بلاکو خان کے بیٹے طراقائی کا بیٹا الغوخان تھا۔ چوتھا شخص ایک قسمت آزما شمشیر زن تھا، ساجیر یا کاٹ دینے والا اور اباقہ خان کی ملازمت میں اس لیے آیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ جنگوں میں شریک ہو کر مال و زر حاصل کرے گا۔ اس کا نام قتلق نویان تھا۔ ولی عہد نکودار نے ان چاروں کو گرفتار کر لیا۔ الغوخان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ زمام حکومت اباقہ خان سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ شامان پر یہ الزام لگا کہ اس نے یہ جھوٹی پیش گوئی کی تھی کہ حکومت آخر کار الغوخان کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔

گویّے پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے اپنے اشعار میں الغوخان کی تعریف کی تھی اور اباقہ خان اور اس کے بیٹوں کو خوب خوب برا بھلا کہا تھا۔ یہ چند اشعار بھی کسی سے لکھوا کر تیار رکھے گئے تھے۔

خود ساختہ عقلمند پر یہ الزام لگا کہ وہ اباقہ خان کے خاندان کی بربادی کے درپے تھا۔ ان چاروں کو گرفتار کر کے انہیں ان کی فردِ جرم سنائی گئی۔ چاروں نے جرم کا اقرار نہیں کیا اور اس وقت تک اقرار نہیں کیا جب تک انہیں بدترین جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچا کر انہیں ناکردہ جرائم کا اقرار کرنے پر مجبور نہیں کر دیا گیا۔

ان چاروں سے باری باری پوچھا گیا۔ "اب تم سب یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

گویّے نے جواب دیا۔ "ولی عہد بہادر! ہماری پٹائی کیا ہم سے پوچھ کر کی گئی تھی؟"

شمشیر زن نے جواب دیا۔ "میں نے اپنے فن اور اپنی طاقت کو اباقہ خان کے نام ہبہ کر دیا ہے اور میں ہی اباقہ خان سے لڑنے کا منصوبہ بناؤں گا بھلا؟ شرم شرم۔"

الغوخان نے اپنی صفائی پیش کی۔ "ہم نے ہلاکو خان کی زندگی ہی میں اباقہ خان سے وفاداری کا عہد کیا تھا پھر اب ہم ہی غداری کریں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

ان چاروں کو اباقہ خان کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ گویّے

تیز اس کو راستے ہی میں کسی نے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ اپنے جرم کا اقرار کرے گا

تو اس کو آزاد کر دیا جائے گا لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ وہ بقیہ تینوں کو اپنا شریکِ جرم قرار دے گا۔"

گویتے نے وعدہ کر لیا لیکن ساتھ ہی زور دے کر اقرار کرایا کہ وہ اقرارِ جرم کے بعد آزاد کر دیا جائے گا۔

اباقہ خان نے چاروں سے فرداً فرداً ان کے جرائم کی بابت پوچھا۔ تین نے تو اپنے اوپر عائد کردہ جرموں کو ماننے سے انکار کر دیا مگر گویتے نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس نے کہا: "چونکہ الغو خان نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب میں زمامِ حکومت سنبھالوں گا تو تجھے مالا مال کر دوں گا۔"

اباقہ خان نے تخت سے اتر کر گویتے کے رخسار پر ایک طمانچہ رسید کر دیا اور پوچھا: "شہزادہ ارغون کہاں ہے؟"

گویتے کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ بولا: "میں کیا جانوں شہزادہ ارغون کہاں ہے۔"

اس کے بعد گویتے نے ولی عہد کی طرف دیکھا۔ ولی عہد نکودار نے جلدی جلدی عرض کیا: "پدرِ بزرگوار! میں اس شخص کو تخلیے میں لیے جا رہا ہوں تاکہ تخلیے میں اس سے شہزادہ ارغون کا پتہ معلوم کروں۔"

اباقہ خان نے مشورہ دیا: "یہ بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔ اس سے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے بات کرنا اور دیکھنا اس پر کڑی نظریں بھی رکھنا تاکہ یہ مسخرہ بھاگ نہ سکے۔"

ولی عہد اس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے محل کی راہداری میں چلا گیا۔ بولا: "دیکھ خبردار جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے اس سے پھر نہ جانا۔ میں تجھ کو شہزادے ارغون کے قید خانے میں لے جاؤں گا اور یہ ظاہر کروں گا کہ شہزادہ ارغون تیری نشاندہی اور رہنمائی میں برآمد کر لیا گیا ہے۔ جب یہ سارا کھیل اپنے اختتام کو پہنچ جائے گا تو تجھ کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

اس کے بعد ولی عہد نے پانچ سپاہیوں کو اپنے ساتھ لیا، اور گویتے کی رہنمائی میں شہزادہ ارغون کو قید خانے سے آزاد کرا لیا۔

شہزادہ ارغون نے ولی عہد بھائی کو اپنے سامنے دیکھ کر پوچھا۔ "آپ یہاں کہاں؟ مجھے یہاں کس نے قید کیا تھا؟"

ولی عہد نکودار نے شہزادے کو تسلی دی، بولا: "شہزادے! تم مت گھبرانا۔ سازشی سارے کے سارے پکڑے گئے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے پوری کہانی سنا دی اور کہا: "شہزادے! تم یقین کرو تمہاری گمشدگی اور سازشیوں کا پتہ لگانے میں مجھے بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں اگر یہ شخص" گویتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے: "ہمارا ساتھ نہ دیتا تو ہم مشکل ہی سے تم تک پہنچتے۔"

گویتے نے ولی عہد کی طرف معنی خیز نظروں سے گھورا: "اور میرا انعام۔ مجھے یہیں چھوڑ دیا جائے۔"

ولی عہد نے جواب دیا: "نہیں تمہیں یہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

ولی عہد، شہزادہ ارغون اور گویتے کو اپنے ساتھ لیے ہوئے دوبارہ اباقہ خان کے دربار میں پہنچ گیا۔ ولی عہد نے گویتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "جناب والا میں اس گویتے کی نشاندہی پر شہزادہ ارغون کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔"

اباقہ خان نے طیش میں کہا: "تم لوگوں نے ایسا کیا کیوں؟ کیا تم مجھ کو موم سمجھتے ہو؟ میں کسی کو بھی معاف نہیں کروں گا۔ میں ہر ایک کو اس کے کیے کی عبرتناک سزا دوں گا۔"

گویتا چیخا: "لیکن حضور والا! مجھ کو چھوڑ دیں کیونکہ ولی عہد بہادر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں ۔۔۔۔۔"

وہ ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ ولی عہد کے اشارے پر اس کے آدمی گویتے کو کھینچ کر باہر لے گئے۔

گویتے کی عدم موجودگی میں ولی عہد نے اباقہ خان کو سمجھایا: "میں نے گویتے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ سچ سچ اس سازش کی بابت بتا دے گا تو میں اسے معاف کر دوں گا۔"

اباقہ خان نے کہا: "لیکن میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

ولی عہد نے کہا: "اور اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی معاف نہ کرتا۔"

گویتا باہر نکل کر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "ولی عہد نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ چھوڑ دینے کا لالچ دے کر مجھ سے جھوٹ بلوایا گیا اور اب مجھے میرے ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔"

اس کی اس چیخ پکار کو اس نام نہاد سازش کے سرغنہ الغو خان کے بھائی بایدو نے بھی سنا۔ بایدو نہایت ہوشیار اور سمجھدار جوان تھا۔ ہلاکو خان کا بیٹا طرقائی خان اپنے بیٹے بایدو پر بہت ناز کرتا تھا۔ وہ بایدو بھاگ کر گویتے کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا: "گویتے! سچ سچ بتا یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا اس سازش میں میرا بے وقوف بھائی الغو شامل ہے؟"

گویتے نے جواب دیا: "جھوٹ۔ سراسر جھوٹ ہے۔ مجھ سے ولی عہد نے جھوٹ بلوایا ہے۔"

لیکن اسی وقت ولی عہد نکودار کے ایک جلاد نے گویتے کو قتل کر دیا۔ بایدو نے اس شخص کو گریبان سے پکڑ لیا، بولا: "ظالم! یہ تو نے کیا کر دیا۔ مجھ کو تو اس سے چند راز اگلوانے تھے۔"

گویتے کے قاتل نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور جواب دیا: "محترم ایل خان نے اس کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔"

بایدو نے اس کو پھر بھی نہیں چھوڑا اور اس کے گریبان کو جھٹکے دیتا رہا۔ اسی دوران ولی عہد بھی وہاں پہنچ گیا اور گویتے کو مقتول دیکھ کر پوچھا: "اس کو کس نے قتل کر دیا؟"

بایدو نے گویتے کے قاتل کو نیچے گرا دیا۔ بولا: "اس نے میرے

اس حمایتی نے قتل کیا ہے اسے اور میں اس وقت قتل کیا ہے جب یہ تیری سازش کا بھانڈا پھوڑنے والا تھا۔"

ولی عہد نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔ بولا: "بایدو! اس کو چھوڑ دے ورنہ میں تجھے بھی قتل کر دوں گا۔ میرا خیال ہے اپنے بھائی الغو کی سازش میں تو بھی شریک ہے۔"

بایدو نے کہا: "یہ جھوٹ ہے۔"

ولی عہد نے بھی چیخ کر جواب دیا: "یہ سچ ہے۔"

بایدو نے کہا: "ہم سب شہزادہ ارغون کے حمایتی ہیں اور تو شہزادہ ارغون سے حسد کرتا ہے اسی حسد نے تجھے ارغون کے حمایتیوں کا دشمن بنا دیا ہے۔"

ولی عہد نے بایدو کو نرمی سے سمجھایا: "بایدو! پاگل نہ بنو۔ تیرے چچا اباقہ خان نے سازشیوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنے کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تیری حمایت خود تجھے بھی موت کے قریب نہ کر دے۔"

موقع شناس بایدو نرم پڑ گیا۔ "اگر چچا اباقہ خان نے ان تینوں مجرموں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنے کا فیصلہ سنا دیا ہے تو میں خاموش ہو جاؤں گا لیکن چچا اباقہ خان کو اصل واقعات کا علم نہیں ہے شاید۔"

ولی عہد نے طنز کیا: "اگر پدرِ محترم کو صحیح واقعات کا علم نہیں ہے تو تو انھیں صحیح واقعات بتا دے جا کر۔ ایک لائق حکمران، ایک مثالی فاتح تیری نظر میں غافل اور لاعلم ہے۔"

بایدو ولی عہد کے الزامات سے خوفزدہ تھا، بولا: "ولی عہد بہادر! چچا اباقہ خان کو غافل اور لاعلم تم نے کہا ہے۔ میں نے نہیں کہا۔"

اسی وقت شاہان، الغو اور قتلق نویان رسیوں میں جکڑے ہوئے سامنے سے گزرے۔ بایدو تلملا گیا۔ بولا: "اپنے وفادار ساتھیوں کو ہلاک کر دینا بہت بڑا ظلم ہے۔"

اب اس کو شہزادہ ارغون کی تلاش تھی۔ قیدیوں کے پیچھے وہ بھی نمودار ہوا۔ وہ شہزادہ ارغون کو کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ بولا: "شہزادے یہ ان تینوں کو کہاں لیے جا رہے ہیں؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا: "ان سب نے میرے اور حکومت کے خلاف سازش کی اور اب اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں گے۔"

بایدو نے بڑے شکر سے کہا: "شہزادے! یہ جھوٹ ہے۔ یہ بے گناہ ہیں۔ انہوں نے تیرے خلاف کوئی سازش نہیں کی یہ سازش کسی اور ہی کی ہے۔ انہیں بچا لے شہزادے یہ بے گناہ ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے نفرت سے منہ بنایا، بولا: "انھوں نے مجھے ایک ایسی کوٹھری میں بند کر دیا تھا جس میں ہوا کا بھی گزر نہ تھا۔ اب انہیں بھی قبروں میں زندہ دفن کر دیا جائے گا۔"

بایدو نے اصرار کیا: "شہزادے! میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ میں تیرے چچا کا بیٹا بھی ہوں اور تیرا دوست بھی۔ میں تیرا برا نہیں چاہتا۔ میں تجھ کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شہزادے نے پوچھا: "تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

بایدو نے گویتے کی حق گوئی اور موت کا چشم دید واقعہ سنا کے بیان کیا: "یہ جھوٹی سازش ہے۔ یہ سب بے گناہ ہیں۔ میں تیرے ساتھ چچا اباقہ خان کے پاس چلتا ہوں اور ساری باتیں خود کروں گا۔"

ولی عہد تکودار ان دونوں کی باتیں غور سے سنتا رہا اور جب اس نے یہ دیکھا کہ دونوں میں اتحاد ہونے ہی والا ہے، درمیان میں مداخلت کر دی۔ بولا: "شہزادے ارغون! تو میرا بھائی ہے اور بایدو چچا کا بیٹا ہے۔ اور چچا کے بیٹے کا مطلب ہوتا ہے دشمن۔ یہ تیرا، میرا اور ہم سب کا دشمن ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آ۔"

بایدو نے شہزادے ارغون کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو بھگاتا ہوا ولی عہد سے دور لے گیا اور وہاں شہزادے کو کچھ اس طرح سمجھایا کہ ساری باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں اور قید کیے جانے سے پہلے کے وہ واقعات بھی یاد آ گئے جب وہ نشہ میں مدہوش سا ہوا جا رہا تھا کہ کسی آواز نے خدمت گاروں کو حکم دیا تھا کہ شہزادے کو کسی کوٹھری میں قید کر دیا جائے۔ وہ آواز شہزادہ تکودار کی آواز سے بہت ملتی جلتی تھی۔

ولی عہد بھاگا بھاگا تینوں مجرموں کے پیچھے پہنچا۔ اب اس کی یہ کوشش تھی کہ تینوں کو جلد از جلد قبروں میں زندہ دفن کر دیا جائے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جتنی بھی جلدی ممکن ہو تینوں کے لیے قبریں کھود کر تیار کر لی جائیں۔

دوسری طرف شہزادہ ارغون اور بایدو اباقہ خان کو سمجھا رہے تھے اور شہزادہ ارغون تینوں مجرموں کی سفارش بڑے جذباتی انداز اور لہجے میں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "دادا جان! اگر وہ میرے دشمن بھی ہیں تب بھی میں انہیں معاف کرتا ہوں اپنے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کے نام پر ان تینوں کو بچا لیجیے۔"

اباقہ خان نے جواب دیا: "لیکن میں اپنے ہی حکم کو کس طرح منسوخ کر دوں۔"

شہزادہ ارغون نے پوچھا: "کیا آپ اس میں خوش ہیں کہ میرے سارے حمایتی ہلاک کر دیے جائیں؟"

اباقہ خان خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا، بولا: "اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ولی عہد تکودار نے آخر اتنی بڑی سازش کی کیوں؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا: "تکودار میرا بھائی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ میں جملہ مغل افواج کا سپہ سالار بنا دیا جاؤں۔ وہ مجھ کو اپنے اس پہلے مرحلے میں ہی میرے اچھے اور مخلص دوستوں سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔"

اباقہ خان نے اپنا سر اور ٹھوڑی دونوں ہی اپنی ہتھیلیوں پر ٹکا

لیے اور پوچھا۔ "کیا تم دونوں سچی باتیں کر رہے ہو؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں باوا جان! آپ میری باتوں پر یقین کیوں نہیں کرتے! کیا ہم پیدائشی جھوٹے اور اجڈ ہیں نا عاقبت اندیش۔"

اباقہ خان نے تالی بجا کر خدمت گاروں کو طلب کر لیا، اس نے انہیں حکم دیا۔ "تم لوگ میرا ایک پروانہ لے کر فوراً ان تینوں مجرموں کے پاس پہنچ جاؤ ورنہ تین بے گناہ انسان خواہ مخواہ قبروں میں دفن کر دیے جائیں گے۔"

انھیں اباقہ خان نے تینوں کا فرمانِ رہائی دیا اور اسی وقت وہ تینوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

تینوں کی قبریں کھودی جا چکی تھیں۔ انھیں قبروں کے پاس کھڑا کر دیا گیا تھا، وہ تینوں یہاں بھی یہی کہہ رہے تھے۔ "لوگو! ہم بے گناہ ہیں۔ ہم پر تہمت لگائی گئی ہے ہم پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔"

ولی عہد نکودار انہیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اس نے جواب دیا۔ "گویا مر گیا، اس نے تم تینوں کو شریکِ جرم قرار دیا تھا۔۔۔۔۔"

اسی دوران ولی عہد نکودار نے اپنے پیچھے گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سنیں۔ اس نے پچیس تیس سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھا اور حکم دیا۔ "تینوں کو قبروں میں گرا دیا جائے۔"

تینوں کے ہاتھ ان کی پشتوں پر باندھ دیے گئے۔ ولی عہد نکودار کے حکم پر انھیں قبروں میں گرا دیا گیا لیکن اسی وقت شہزادہ ارغون کے آدمیوں نے قبروں کو اپنے گھیرے میں لے لیا، شہزادہ ارغون چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ "دوستو! محترم ایل خان نے انھیں معاف کر دیا ہے۔"

ولی عہد نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔ قبروں کو مٹی سے پاٹ دو۔"

لیکن شہزادہ ارغون کے ساتھیوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے تینوں کو قبروں کے اندر سے نکال لیا اور ان کے پشت پر بندھے ہاتھ کھول دیے۔ بایدو نے اپنے بھائی الغو خان سے پوچھا۔ "بھائی الغو! تیرے چوٹ تو نہیں آئی؟"

الغو کی ناک زخمی ہو گئی تھی۔ قبر میں وہ اوندھے منہ گرا تھا، جس سے ناک میں ایک نوکیلا پتھر گھس گیا تھا۔ بایدو نے اپنے بھائی کی ناک کا خون اپنی آستین سے پونچھ کر حکم دیا۔ "جا اس کو پانی سے دھو ڈال، ٹھیک ہو جائے گا۔"

ولی عہد نکودار سینہ تان کر شہزادہ ارغون اور بایدو کے پاس جا کھڑا ہوا، بولا۔ "میں پدرِ محترم کا وہ فرمان دیکھنا چاہتا ہوں جس نے ان کے پہلے فرمان کو منسوخ کر دیا۔"

شہزادہ ارغون نے اباقہ خان کا فرمان ولی عہد کو دکھا دیا۔

ولی عہد نے شہزادے ارغون سے پوچھا۔ "مگر یہ تو خود اپنے مجرموں کو معافی دلانے کیوں آ گیا؟"

شہزادے ارغون نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "کیونکہ میں اپنی مجبوری سے اپنے دشمنوں کے بچانے کا کام کروں گا۔"

ولی عہد نے حیرت سے کہا۔ "میں تیری باتوں کا مطلب نہیں سمجھا۔"

شہزادے ارغون نے جواب دیا۔ "لیکن میں نے ولی عہد کی باتوں کا مطلب خوب سمجھ لیا ہے۔"

ولی عہد نے زور دے کر کہا۔ "لیکن یہ تینوں تیرے دشمن ہیں ارغون۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "صرف دشمن ہی نہیں، پیدائشی دشمن ہیں۔ میں نے ان کی دشمنی اور دوستی کو سمجھ لیا ہے۔"

ولی عہد کا چہرہ اتر گیا، وہ بہت اداس ہو چکا تھا، بولا۔ "ارغون! ایک نہ ایک دن تو بہت پچھتائے گا۔"

بایدو ابھی تک اپنے بھائی الغو کی ناک ہی درست کر رہا تھا۔

ولی عہد نے کہا۔ "میں باوا جان سے خوب خوب جھگڑوں گا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ وہ ایک فرمان دیتے ہیں اور دوسرے فرمان سے اسے منسوخ کر دیتے ہیں۔ یہ تو خاصی مضحکہ خیز بات ہو گئی۔"

شہزادہ ارغون نے کہا۔ "اور میں بھی یہ باور کراتا ہوں کہ اب ہم بے وقوف نہیں بن سکتے۔"

بایدو نے دور سے پوچھا۔ "کون بے وقوف بن رہا ہے؟"

شہزادہ ارغون اور بایدو خان جب اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس جا رہے تھے تو ان کی چالوں سے ایک قسم کی تازگی اور فتحمندی کا احساس ہوتا تھا اور ولی عہد نکودار اور اس کے ساتھیوں کی چالوں سے تھکاوٹ اور شکست خوردگی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ سب اپنے باپ اباقہ خان کی خدمت میں جا رہے تھے۔

اباقہ خان انھیں راستے ہی میں مل گیا۔ اس کے ساتھ شمس الدین جوینی بھی تھا۔ اباقہ خان اپنے ابلقی گھوڑے پر سوار اپنے بیٹوں کی چپقلش کا صحیح اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس کو یہ خوف تھا کہ کہیں اس کے فرمانِ رہائی سے پہلے ہی تینوں کو زندہ دفن نہ کر دیا جائے لیکن جب اس نے سب کو صحیح سلامت دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی۔ اس کو ولی عہد پر غصہ تھا کہ اس نے ایسی سازش کیوں کی؟

شہزادہ ارغون اور بایدو نے اباقہ خان کو آتے دیکھا تو دونوں بڑی گرم جوشی سے آگے بڑھے اور اباقہ خان کی رکاب پکڑ لی۔ بھتیجا الغو شرمندہ تھا اس نے اپنا سر جھکا رکھا تھا۔ ولی عہد نکودار کو اپنی ناکامی پر جھنجھلاہٹ تھی۔ اس نے اباقہ خان سے شکایت کی۔ "باوا جان! یہ تینوں سازشی تھے آپ نے انھیں معاف کیوں کر دیا؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "محل چل، وہاں تفصیلی بات کروں گا۔"

الغو نے خلافِ توقع اپنی زبان کھولی۔ "ولی عہد بہادر! آپ کو

غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں نے کوئی سازش نہیں کی اور نہ ہی کسی سازش میں شریک رہا ہوں۔ میں ایک نکما انسان ہوں، سُست اور کاہل انسان۔ دوسروں کے دسترخوان سے اپنا پیٹ بھرنے والا ایک پست حوصلہ انسان۔ سازش تو وہ لوگ کرتے ہیں جن میں حوصلہ ہوتا ہے اور جو کچھ بننا چاہتے ہیں۔"

اباقہ خان نے الغو کو ملامت کی۔ "تو میرا بھتیجا ہے اور افسوس کہ تو نکما ہے۔ اگر تو نکما نہ ہوتا تو شاید تجھے اتنی آسانی سے کسی سازش میں ملوث نہ کیا جا سکتا۔"

شمس الدین جوینی نے سب کو مفاہمانہ مشورہ دیا۔ "شہزادوں کو اتفاق سے رہنا چاہیے۔ اگر گھر میں پھوٹ پڑ گئی تو دشمن سے مقابلہ کس طرح ہوگا؟"

شہزادہ وزیر سے ناخوش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سازش کے پس پردہ جوینی ہی کی ذات ہے۔ اس نے پیشانی پر بل ڈال کر وزیر کو دیکھا اور تلخ لہجے میں کہا۔ "وزیر محترم! آپ خاموش رہیں کیونکہ اس نفاق اور نااتفاقی میں آپ ہی کی ذات کارفرما ہے۔"

اباقہ خان نے شہزادہ ارغون کو گھور کر دیکھا۔ "ارغون! جوینی ایک مخلص انسان ہے۔ اس پر کسی جرم کا الزام لگا کر خود کو میری نظروں سے نہ گرا۔ تم لوگ جوینی کی فراست کے کام لے کر کارآمد بن سکتے ہو نہ کہ اس کو دشمن بنا کر نقصان اُٹھاؤ۔"

شمس الدین جوینی نے نہایت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ مُسکراتے ہوئے کہا۔ "شہزادے کو میری طرف سے کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے جو دُور ہو جائے گی اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اُسے دور کرنے کی کوشش کروں۔ شہزادہ ارغون کو میری بابت کم از کم یہ تو سوچنا ہی چاہیے کہ میرا عروج میرا اقبال، میرا مقام جو کچھ بھی ہے اس حکومت کے بقا اور استحکام سے وابستہ ہے۔"

اباقہ خان نے اُن سب کو اپنے خاص ہال نما کمرے میں لے جا کر حکم دیا کہ اس کے تیسرے بیٹے کیخاتو خان کو حاضر کیا جائے۔

جب کیخاتو خان بھی آ گیا تو اباقہ خان نے اُن سب کو سمجھایا۔ "دیکھو جب چنگیز خان نے جھیل بیکال کے چاروں طرف آباد قبائل کو متحد اور متفق کر دیا تھا تو اس نے دنیا کو فتح کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد بھی جب تک ہم میں اتحاد برقرار رہا دنیا ہم سے مرعوب اور لرزہ براندام رہی لیکن پھر ہم میں نفاق اور نااتفاقی نے گھر کر لیا اور ہم آپس ہی میں برسرِ پیکار ہو گئے تو ہمارا رعب بھی کم ہو گیا اور مصر کے مملوک ہمارے مقابلے پر آ گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے مشہور جرنل قطلو بوغا کو شکست ہو گئی ہے۔ اور حقیقی بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے یہ ساری ادبار کی نشانیاں ہیں۔"

اباقہ خان بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا اور ولی عہد تکودار کا ہاتھ پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ پوچھا۔ "یہ کون ہے؟ یہ تمھارا کون ہے؟"

شہزادہ ارغون اور کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "ہمارا بڑا بھائی اور ولی عہدِ سلطنت۔"




دوسری شادی ممنوع تھی۔ پھر بھی جمیل نے دوسری شادی کر لی۔ دوسرے ہی دن اُسے معلوم ہُوا کہ اُس کے جرم کا بھانڈا پھوٹ گیا ہے اور اُسے گرفتار کیا جانے والا ہے۔ جمیل نے شہر کے حاکم کو فون کیا کہ وہ اُس سے ملنا چاہتا ہے۔ حاکم نے ملاقات کا وقت دے دیا۔ جمیل نے اپنی دونوں بیویوں زہرہ اور ناہید کو کار میں بٹھایا اور روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک قبرستان پڑتا تھا۔ جمیل نے اپنی پہلی بیوی زہرہ کو قبرستان میں اُتار دیا اور دوسری بیوی کے ساتھ حاکم کے پاس پہنچ گیا۔ حاکم نے دریافت کیا۔ "ہمارے علم میں آیا ہے کہ تم نے دوسری شادی کی ہے؟"

"دُرست ہے جناب!" جمیل نے اقرار کیا۔ "یہ ہے وہ عورت جس سے میں نے کل شادی کی ہے۔"

"تمھاری پہلی بیوی کہاں ہے؟"

جمیل نے رومال نکالا اور آنکھیں صاف کیں۔ "میری پیاری زہرہ اس وقت قبرستان میں ہے۔"

"اوہ، مجھے افسوس ہے۔" حاکم شرمندہ ہو گیا۔ "آپ جائیے مسٹر جمیل! پولیس آپ کو ہرگز تنگ نہیں کرے گی، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔"

چار لیات

* کئی سال ہوئے، میں نے اپنے ایک دوست کی مدد کی تھی۔ اُس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ زندگی بھر مجھے نہیں بھول سکتا اور واقعی اس نے مجھے نہیں بھلایا۔ ابھی ابھی اس کا فون آیا ہے۔ وہ پھر ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور مجھ سے مدد کا خواہاں ہے۔

---

* "بیگم صاحبہ! ہم نے شرابیوں کی اصلاح کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ کیا آپ ہمیں کوئی عطیہ دینا پسند کریں گی؟"
"آپ گیارہ بجے رات کو آ کے میرے شوہر کو لے جائیے گا۔"

---

* ایک پادری چرچ میں وعظ کر رہا تھا۔ "خدا نے جو کچھ بھی بنایا ہے، اُس میں کسی قسم کی کمی یا خامی نہیں ہے۔ اس کی بنائی ہوئی ہر چیز مکمل ہے۔"
ایک کبڑا اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ "میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"
پادری نے ہمدردی سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے آپ کو مکمل کبڑا بنایا ہے۔ آپ میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔"

اس کے بعد الغو اور بایدو نے جواب دیا: "شہزادہ، ولی عہد شہزادہ ہمارا چچازاد بھائی ہے۔"

اباقہ خان نے کہا: "تم سب کا یہ فرض ہے کہ اس کا احترام کرو۔ اس کا حکم مانو اور کوئی ایسی بات نہ کرو جس سے آپس میں نااتفاقی پیدا ہو۔"

اور ولی عہد نکودار سے کہا: "اور شہزادے نکودار! تم پر واجب ہے کہ اپنے بھائیوں اور عزیزوں کا خاص خیال رکھو۔ سازش جس نے کی اور کس کے خلاف کی اس کو بھلا دو اور نئے سرے سے اتحاد اور یگانگت کا پیمان باندھو۔"

شہزادہ ارغون کھڑا ہو گیا: "بابا جان! اگر شکایت نہ سمجھی جائے تو تو میں اپنے دل کی خلش آپ پر ظاہر کر دوں۔"

اباقہ خان نے جواب دیا: "تم سب کو جو کچھ کہنا سننا ہو، اس وقت کہہ سن لو۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں کہیں یہ نہ ہو کہ میری آنکھیں بند ہوں اور حکومت کا شیرازہ ہی بکھر جائے۔"

شہزادہ ارغون نے کہا: "میں نے ہرات کی جنگ میں چغتائیوں کو شکست دی اور ترمہ شیریں کو سوتماق سے چھین لایا۔ میرا خیال تھا کہ میری ان خدمات کے صلے میں مجھے اپنی جملہ افواج کا سپہ سالار بنا دیا جائے گا لیکن مجھے اس سے محروم رکھا گیا۔"

اباقہ خان نے اعلان کیا: "میں نے تجھے آج سے اپنی جملہ افواج کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کیا۔"

شہزادہ ارغون اپنے باپ اباقہ خان کی طرف بڑھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بولا: "میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اپنے بھائی نکودار کا وفادار رہوں گا۔"

الغو خان بھی سب سے پہلے شہزادہ ارغون کی طرف بڑھا اور اس کو مبارکباد پیش کی۔ اباقہ خان مسکرایا اور کہا: "الغو! تو شاید اس طرح ارغون کے دسترخوان پر اپنی جگہ بنا رہا ہے۔"

بایدو خان نے اپنے بھائی کو ملامت کی: "بھائی الغو! تم مجھے ہر جگہ شرمندہ کراتے ہو۔ تم تلوار سنبھال کر میدان میں کیوں نہیں نکلتے۔ ہمارا رزق تلوار سے وابستہ ہے اب نکما پن چھوڑو اور ہتھیاروں سے لیس ہو جاؤ۔"

اب اباقہ خان بہادر قتلق نویان سے مخاطب ہوا، بولا: "قتلق نویان میں نے تجھ پر ہمیشہ ہی فخر کیا ہے تو وعدہ کر کہ تو ہمیشہ نکودار کا وفادار رہے گا۔"

قتلق نویان نے کمر سے بندھی ہوئی پیٹی کھول کر شہزادہ نکودار کی طرف بڑھا دی، بولا: "ولی عہد بہادر! آپ یہ پیٹی اپنے ہاتھ سے میری کمر سے باندھ دیجیے تاکہ میں ان ہاتھوں کا ہمیشہ وفادار رہوں۔"

ولی عہد نکودار نے پیٹی اپنے ہاتھ سے قتلق نویان کی کمر سے باندھ دی۔ قتلق نویان ولی عہد کے روبرو دوزانو بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو ادب و احترام سے بوسہ دیا، بولا: "ان ہاتھوں کو مضبوط کرنے کے لیے میں اپنی جان تک داؤ پر لگا دوں گا۔"

اب اباقہ خان شامان سے مخاطب ہوا۔ پوچھا: "ہاں شامان! اب تو بتا کہ ولی عہد نکودار کیسا حکمراں ثابت ہوگا اور اس سلطنت کے استحکام اور زوال کا کیا حال رہے گا؟"

شامان نے اپنی آنکھیں بند کر کے گردن کو جھکایا اور ہاتھوں کو ہوا میں بے معنی سی حرکت دیتا رہا۔ پھر آنکھیں کھول کر بولا: "ابھی ابھی مجھے پراسرار روحوں نے جو کچھ بتایا ہے اس کو صاف صاف بتا دوں گا تو آپ اور شہزادگان اسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

اباقہ خان نے کہا: "نہیں! ہم سب توجہ اور حوصلے سے سنیں گے۔ تجھ کو جو کچھ بھی نظر آیا ہے اسے صاف صاف بتا دے۔"

شامان نے کہا: "چونکہ مجھ پر ایک الزام لگ چکا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ کوئی بات کہہ کر قتل ہو جاؤں۔"

اباقہ خان نے وعدہ کیا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری کسی بھی بات پر تجھے کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔"

شامان نے نہایت احتیاط سے بولنا شروع کر دیا: "پراسرار روحوں نے سرگوشیوں میں مجھے بتایا ہے کہ بھائیوں کے ایک دوسرے سے دل صاف نہیں ہیں، یہ آپس میں جھگڑیں گے، دو بھائی اپنے باپ دادا کے مسلک ترک کر دیں گے لیکن حکومت کو استحکام حاصل ہو گا۔"

اباقہ خان جھنجھلا کر بولا: "چپ! اب بند کر اپنی بکواس۔ اگر میں نے جاں بخشی نہ کی ہوتی تو تجھے اس منحوس پیش گوئی پر قتل کر دیتا۔"

شمس الدین جوینی سب کی باتیں سن رہا تھا اور خاموش تھا۔ اباقہ خان نے اس سے پوچھا: "شمس الدین! تو کیوں خاموش ہے؟ کچھ بولتا کیوں نہیں؟"

وزیر نے جواب دیا: "میں شامان کی باتوں پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ غیب کا علم صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان دنوں، مہینوں اور سالوں کا حال کس طرح بتا سکتا ہے جب کہ اسے چند ساعتوں بعد پیش آنے والے واقعات کا بھی علم حاصل نہیں۔"

اباقہ خان نے شامان کو اسی وقت نکال باہر کیا اور یہ کہہ کر محفل برخاست کر دی کہ "آپس میں محبت کرو اور کینہ اور بغض کو اپنے دلوں سے نکال دو ورنہ پچھتاؤ گے۔ میرا کیا ہے آج ہوں کل نہیں ہو سکتا ہوں۔"

جب محفل برخاست ہوئی تو بظاہر شہزادوں کے چہرے بشاش تھے اور وہ خوش خوش جا رہے تھے۔ مگر بایدو اور الغو کے چہرے فکر و تردد کی غمازی کر رہے تھے۔ ان دونوں نے باہر نکل کر ایک درخت کے پیچھے کھڑے ہو کر شہزادہ ارغون کا انتظار کیا۔ ولی عہد نکودار نے انہیں کھڑے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ شمس الدین جوینی نے ان دونوں کی بابت ولی عہد نکودار کو سمجھایا: "ولی عہد بہادر! میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں کے دلوں میں کھوٹ ہے۔ یہ دونوں کسی بھی وقت آپ پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔"

ولی عہد نکودار نے جواب دیا: "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں ان سے ہوشیار رہوں گا۔"

نکودار کے سب سے چھوٹے بھائی کینخاتو خان نے کہا: "میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ چچا طرقائی کے بیٹوں کے دلوں میں حکومت کا سودا سمایا ہوا ہے بس وہ وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔"

شمس الدین جوینی نے اس کی تائید تو نہیں کی لیکن دل سے اس کا قائل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد شہزادہ ارغون بھی ادھر سے گزرا۔ اس کے ساتھ شاہان بھی تھا۔ بایدو نے ارغون کو روک لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر کہا: "شہزادے! ہم دونوں بھائی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا: "اور میں بھی، لیکن اس وقت نہیں کسی اور وقت۔"

اتنا کہہ کر شہزادہ ارغون چلا گیا۔ اس کے بعد بایدو اور الغو بھی چلے گئے۔ شہزادہ ارغون سیدھا اپنے استاد اور مشیر سعد اللہ یہودی کے پاس پہنچا اور اس کو جملہ عساکر کا سپہ سالار اعلیٰ بننے کی خوشخبری سنائی۔

سعد اللہ یہودی کی باچھیں کھل گئیں: "سچ؟ مگر یہ اچانک کس طرح ہو گیا؟"

ارغون نے پوری تفصیل بتا دی اور کہا: "پدر بزرگوار نے ہم بھائیوں میں بگاڑ تو کرا دیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ولی عہد نکودار اس سے خوش نہیں ہے۔"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا: "جناب والا! خوش ہونے کی کوئی بات ہوتی تو وہ خوش بھی ہوتا۔ آپ کا سپہ سالار ہو جانا اس کے لیے بڑی خطرناک بات ہے۔"

ارغون نے کہا: "ہم بھائیوں نے پدر بزرگوار سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم سب متحد اور متفق رہیں گے۔"

سعد اللہ یہودی نے کہا: "نہ نہ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ نکودار وزیر شمس الدین جوینی کے زیر اثر تقریباً مسلمان ہو چکا ہے اور حکومت پر قبضہ جمانے کے بعد وہ آپ سب کے خلاف کوئی قدم اٹھائے گا۔"

ارغون نے جوش میں جواب دیا: "اگر وہ ایسا کرے گا تو سخت غلطی کرے گا کیونکہ جملہ افواج تو میرے قبضے میں ہیں۔"

سعد اللہ یہودی بہت بے چین اور اضطرابی حالت میں تھا۔ بولا: "مگر ایک بات کا بطور خاص خیال رکھیے گا۔ آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہو، انتہائی صبر اور تحمل سے کیجیے گا۔ دشمنی کسی سے بھی نہیں، دوستی بھی سے بظاہر آپ کا یہی نصب العین ہونا چاہیے مگر اندر سے دوست کسی کے بھی نہیں دشمن سب کے، پر کار بند بنا رہنا ہو گا۔ آپ کی زبان بھی کچھ کہے گی اور دل کچھ اور کر گزرے گا۔ آپ بظاہر سب پر اعتماد کریں گے لیکن باطن کسی پر بھی اعتماد نہیں کریں گے۔"

شہزادہ ارغون سعد اللہ یہودی کی عقل و فراست کا بے حد قائل تھا۔ اس نے کہا: "میں تیرے مشوروں پر عمل کرتا رہوں گا اور جب میں برسر اقتدار آ جاؤں گا تو تجھ کو اپنا وزیر بنا لوں گا۔"

☆

ولی عہد نکودار شیخ سعدی کی خدمت میں کئی گھنٹے بیٹھا رہا۔ اس فقیر منش شخص کی ذات بڑی پرکشش تھی۔ یہاں دور دور سے لوگ آتے تھے اور علم و دانش کی مزے دار نصیحتیں اور حکایتیں گرہ میں باندھ لے جاتے تھے۔ شیخ سعدی نے نکودار کو سمجھایا کہ تیرا باپ کب تک اسلام سے بچتا رہے گا، مہذب دنیا پر غیر مہذب لوگ کب تک حکومت کریں گے؟

ولی عہد نکودار نے عرض کیا: "شیخ! میں اپنے باپ سے یہ بات نہیں کہہ سکتا۔"

شیخ نے پوچھا: "اور خود تو نے کیا طے کیا ہے؟"

نکودار نے جواب دیا: "جب تک میرا باپ زندہ ہے میں اس کا تابع ہوں، جب وہ نہیں ہو گا تب میں خود کوئی فیصلہ کروں گا۔"

شیخ اس کو دیر تک نصیحتیں کرتے رہے۔ انھوں نے کہا: "دنیا آخرت کی کھیتی ہے یہاں جو بویا جائے گا آخرت میں وہی کاٹا جائے گا۔"

نکودار خوفزدہ ہو گیا۔ بولا: "شیخ! میں اپنے آبائی دین سے مطمئن نہیں ہوں لیکن باپ کی موجودگی میں اپنا آبائی دین ترک بھی نہیں کر سکتا۔ میں برائی کو برائی ہی سمجھتا ہوں اور اگر برائی کو اپنی زبان سے برا کہہ نہیں سکتا تو دل میں اس کو برا ضرور سمجھتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اسلام میں اس کا بھی ثواب ہے۔"

شیخ نے جواب دیا: "بیشک اس کا بھی ثواب ہے اور میری دعا ہے کہ خدا تجھ کو برائی کو برائی سمجھنے کی حد سے نکال کر برا کہنے اور برائی کو روکنے کی حدود میں داخل فرما دے۔"

نکودار شیخ کے پاس سے اٹھا تو بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ جیسے تیسے محل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی۔ شاہی محلات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ انہی محلات میں بایدو اور الغو کے محل بھی تھے۔ بایدو کا خاندان محرابی دروازوں والے محل میں رہتا تھا۔ محرابی شکل کا پھاٹک ہر وقت بند رہتا تھا۔ اس پھاٹک میں ایک چھوٹا سا دروازہ بھی تھا۔ بایدو اور اس کے خاندان والے آمد و رفت کے لیے اسی چھوٹے دروازے کو استعمال کرتے تھے۔ پھاٹک کے دائیں بائیں چھوٹے بڑے درختوں کا ایک گھنا سلسلہ تھا۔ اس حصے میں بایدو خان کے خاندان کے بچے ہر وقت کھیل کود میں مشغول رہتے اور اسی حصے میں وہ تلوار بازی کی مشقیں بھی کیا کرتے تھے۔ یہاں پھولوں کی روشیں بھی تھیں کئی قسموں کے گلاب اور جوہی چنبیلی کے پودوں کی بہتات تھی۔

جب ولی عہد نکودار اس کے سامنے سے گزرا تو اچانک الغو اس کے سامنے آ گیا۔ اور بولا: "ولی عہد بہادر! کیا آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں گے؟"

نکودار نے پوچھا: "کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟"

الغو نے جواب دیا: "ہم دونوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، میں انھیں دور کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

نکودار نے کہا: "لیکن میرے دل میں تو کوئی غلط فہمی نہیں۔"

الغو نے عاجزی سے عرض کیا: "نکودار ولی عہد بہادر! آپ ٹھیرے ایل خان کے بیٹے۔ میں ایک معمولی آدمی ہوں لیکن خدا نے مجھے عقل بہت زیادہ دے دی ہے۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو مفت مشورے دے سکتا ہوں۔ اُن پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہوگا۔"

ولی عہد نکودار کو اس کی باتوں میں بڑا مزہ آیا۔ بولا: "اچھا چلو میں کچھ دیر تو تمھارے پاس بیٹھ ہی سکتا ہوں۔"

الغو نکودار کو گلابوں کی روشوں میں لے گیا اور وہاں سبزے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

الغو نے کہا: "ولی عہد بہادر! میں اپنے نکمے پن سے عاجز آ چکا ہوں۔ کسی حکمراں کا مشیر بننا چاہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھے اپنا مشیر بنا لیں۔ میں بہت کارآمد انسان ہوں لیکن دوسروں کے لیے، اپنے لیے نہیں۔"

نکودار نے پوچھا: "اس وقت تمھیں کون سی بات کرنا ہے؟"

الغو نے جواب دیا: "میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ بایدو خان اور میں، یعنی ہم دونوں بھائی آپ کے دوست ہیں۔"

نکودار نے چڑ کر کہا: "میں کب یہ کہتا ہوں کہ تم دونوں میرے دشمن ہو۔"

الغو نے کہا: "مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نکما ہوں، کوئی کام نہیں کرتا۔ میں طعنوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ اور اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی کام کروں۔ میں بنیادی طور پر سپاہی نہیں ہوں مشیر یا تاجر ہوں۔ عنقریب میں ہندوستان جانے والا ہوں۔ وہاں سے میں کاری گر اور مزدور لاؤں گا پھر ان کاریگروں اور مزدوروں سے اس طرح کام لوں گا کہ جو کچھ وہ کمائیں گے اس کا نصف مجھے دے دیا کریں گے۔"

نکودار نے جواب دیا: "الغو! شاید تمھیں یہ نہیں معلوم کہ ہندستانی اپنی خوشی سے اپنی سرزمین نہیں چھوڑتے۔ اُن کا یہاں تک لانا یا تو کسی فاتح کا کام ہے یا پھر کسی شاطر کا کام اور اتفاق کی بات کہ تم ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں۔"

الغو نے مایوسی سے کہا: "میرا یہ منصوبہ ناقص ہے۔ چلو اس کو بھی چھوڑو۔ میں گھوڑوں کی تجارت شروع کر دوں؟"

نکودار نے پوچھا: "گھوڑوں کی تجارت کے لیے آپ کے پاس دولت کتنی ہے؟"

الغو نے جواب دیا: "اس میں دولت کا کیا کام؟ حکومتوں سے پیشگی رقوم لے کر یہ کام کروں گا۔"

نکودار ہنسنے لگا: "حکومتیں تم پر اعتبار ہی کیوں کریں گی؟"

الغو نے اکڑ کر جواب دیا: "اگر وہ مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتیں تو میں اُن پر اعتبار کیوں کروں؟ چلو یہ کام بھی چھوڑا۔ اب میں طبابت کروں گا۔"

نکودار نے ہنس کر کہا: "یہ کام بھی بہت مشکل ہے۔ یہ علم پڑھے لکھے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور تم ذرا بھی پڑھے لکھے نہیں۔"

الغو نے پریشان ہو کر پوچھا: "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

نکودار نے جواب دیا: "تمھارے لیے ایک کام ہے میرے ذہن میں، بشرطیکہ تم اسے کر بھی سکو۔" الغو نے پوچھا: "کون سا کام؟"

نکودار نے جواب دیا: "میدانِ جنگ کے مقتولوں کے لباس اور ہتھیار اتار اتار کر اُن کا ذخیرہ کر دو اور پھر اُسے بیچ ڈالو۔ اس میں دولت کی بھی ضرورت نہیں اور کام بھی نہایت آسان ہے۔"

الغو کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ بولا: "بہت خوب، بہت خوب۔" لیکن پھر فوراً ہی سرد پڑ گیا۔ بولا: "لیکن ولی عہد بہادر! یہ کام تو بہت خطرناک ہے۔ عین حالتِ جنگ میں مرنے والوں کے جسم سے کپڑے اور ہتھیار اتارنا کیا خطرناک بات نہیں؟ کوئی مجھے قتل بھی کر سکتا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی نیم مردہ سپاہی میرے ہی پیٹ میں اپنا خنجر اتار دے۔"

نکودار کو ہنسی آ رہی تھی مگر وہ ضبط کیے ہوئے تھا۔ بولا: "ہے تو یہ بھی خطرناک کام۔ چلو کوئی اور کام سوچیں گے۔"

درختوں کے جھنڈ میں سے بایدو خان اچانک نمودار ہوا۔ اس نے نکودار کو الغو سے باتیں کرتے دیکھا تو تیکھے تیوروں سے پوچھا۔ "ولی عہد بہادر! آپ یہاں کیسے؟"

نکودار نے جواب دیا: "میں اپنے محل جا رہا تھا کہ بھائی الغو نے مجھے بُلا لیا اور کاروباری باتیں کرنے لگے۔"

بایدو نے خشک لہجے میں کہا: "ویسے میں خود بھی آپ سے ملنا چاہتا تھا، چلو اچھا ہوا جو یہاں ملاقات ہو گئی۔"

نکودار نے ازراہِ مذاق پوچھا: "کیا تمھیں بھی اسی قسم کی باتیں کرنا ہیں جیسی بھائی الغو نے کیں۔"

بایدو نے تنک کر جواب دیا: "ولی عہد بہادر! میں کوئی بے سر و پا انسان نہیں ہوں۔ الغو کا میں بھائی ضرور ہوں لیکن الغو جیسا ہرگز نہیں۔ میں بہت دنوں سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے وہ سازش کیوں کی تھی؟"

نکودار نے کہا: "سازش کس نے کس کے خلاف کی تھی۔ میں خود بھی یہ جاننا چاہتا ہوں اور اس کا منہ توڑ جواب معقول طریقے سے دیا بھی تھا لیکن افسوس کہ باوا جان نے درگزر کیا حالانکہ میں خود درگزر کا قائل نہیں تھا۔"

بایدو نے سختی سے کہا۔ "وہ سازش آپ کی تیار کردہ تھی اور آپ نے گویتے کو لالچ اور دھمکی دے کر اقراری گواہ بنا لیا تھا پھر اس کو قتل بھی کرا دیا اگر وہ گویا زندہ رہتا تو اصل سازشیوں کے چہروں سے نقابیں اتر چکی ہوتیں۔"

نکودار مشتعل ہو گیا۔ "بایدو! زیادہ باتیں نہ کرو۔ ہمیں تمہارے ارادوں کا علم ہو چکا ہے در اصل تم لوگ حکومت کے خواب دیکھ رہے ہو۔"

بایدو اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ بھی آپ کا الزام ہے ولی عہد بہادر! ایسی باتیں نہ کیجئے جس سے قبائلی اور خاندانی اتحاد پارہ پارہ ہو جائے۔"

نکودار زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

نکودار بھاگا بھاگا وزیر شمس الدین جوینی کے پاس پہنچا اور ساری باتیں اس کے علم میں لا کر مشورہ طلب کیا۔ "وزیر محترم! ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

وزیر اعظم نے جواب دیا۔ "ولی عہد بہادر! آپ کو یہ ساری باتیں بایدو سے نہیں کرنی تھیں تحمل سے کام لیجئے ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

نکودار نے مشورۃً پوچھا۔ "کیا میں اس واقعہ کو پدر بزرگوار کے علم میں لے آؤں؟"

وزیر اعظم نے جواب دیا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

نکودار کو سخت غصہ تھا کہ اس کی کوئی بات مانی ہی نہیں، پھر بھی خاموش تھا۔

❁

سعد اللہ یہودی نے شہزادہ ارغون کو ہر بار یہی نصیحت کی کہ وہ تحمل سے کام لیتا رہے اس طرح ہر کام آسان ہو جائے گا۔ اور شہزادہ ارغون بھی حالات حاضرہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسری طرف ولی عہد نکودار، شہزادہ ارغون سے مطمئن نہیں تھا وہ شمس الدین جوینی کے مشوروں کی روشنی میں اپنا ہر قدم اٹھا رہا تھا۔ نکودار کو بار بار یہ خبر مل رہی تھی کہ بایدو اور الغو شہزادہ ارغون سے مسلسل ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ اور سعد اللہ یہودی کی پر اسرار حرکات بھی علم میں آ رہی تھیں۔ یہ یہودی اپنا زیادہ وقت شہزادہ ارغون کے پاس گزار رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ بایدو کے پاس بھی دیکھا گیا تھا۔

اباقہ خان اپنے بیٹوں کی کشمکش کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس اندرونی اور محلاتی خلفشار کے علاوہ برقائی خان اور چغتائی خاندان سے بھی برسر پیکار تھا۔ وہ جنگ سے بچنا چاہتا تھا۔ لیکن جنگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اسی دوران وہ بیمار پڑ گیا قابل ترین اطبا کی ایک جماعت اس کے علاج معالجے پر مامور ہو گئی اباقہ خان اپنی بیماری کی خبر چھپا رہا۔ وزیر شمس الدین جوینی، شہزادگان اور بایدو اور الغو کے علاوہ بیماری کا کسی کو علم نہیں تھا۔

سعد اللہ یہودی شہزادہ ارغون کو تاکید کر رہا تھا کہ وہ اپنے باپ اباقہ خان کے ساتھ اپنا بیشتر وقت گزارے۔

شمس الدین جوینی ولی عہد نکودار کو سمجھا رہا تھا کہ انسان کی زندگی کا کیا بھروسا، اباقہ خان کی زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں معلوم نہیں یہ چراغ کب بجھ جائے۔ اس لیے انسان کو مستعد اور چوکس رہنا چاہیے

شہزادگان باپ کی بیماری کو مرگ کا آغاز سمجھ رہے تھے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں کا طومار باندھے ہوئے تھے اباقہ خان ان سے تنگ آ چکا تھا اس نے سبھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "حالانکہ تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تم سب کو متحد اور متفق دیکھنا چاہتا ہوں، مگر تم سب نفاق اور نا اتفاقی کے شکار ہو، آخر ایسا کیوں ہے؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "پدر بزرگوار! اتحاد اور اتفاق کے لیے خیالات اور آرا کا اتفاق بھی ضروری ہے جب کہ میں شہزادگان میں سے بعض کو اسلام کی طرف مائل دیکھ رہا ہوں۔ کیا منگول عساکر کسی مسلمان حکمراں کا اقتدار گوارا کر لیں گے؟"

اباقہ خان نے پوچھا۔ "تیرا اشارہ کس کی طرف ہے؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔"

ولی عہد نکودار کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وزیر نے اس کے پاؤں کا انگوٹھا دبا کے روک دیا۔

اباقہ خان نے سختی سے پوچھا۔ "میں اس کا نام تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "اگر میں یہاں اس کا نام لے لوں گا تو





نفاق اور اختلاف کی خلیج میں کچھ اور اضافہ ہو جائے گا۔"

اباقہ خان نے اصرار کیا۔ "اس کا نام تو تجھے بتانا ہی پڑے گا۔"

ارغون نے جواب دیا۔ "تب پھر میں اُس کا نام تخلیہ میں بتادوں گا۔"

اباقہ خان نے اس موضوع کو یہیں پر ختم کر دیا اور شہزادہ ارغون کو حکم دیا کہ وہ رات کو سونے سے پہلے اُس سے ملاقات کرے۔

جب سب لوگ چلے گئے تو اباقہ خان نے ولی عہد نکودار کو مخاطب کیا اور ترچھی نظروں سے گھورتے ہوئے بے رُخی سے کہا۔

"نکودار! تجھ کو کچھ معلوم ہے کہ ارغون کا اشارہ کس طرف تھا؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں۔ میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ارغون نے جو کچھ کہا درست ہے۔"

نکودار نے بے توجہی سے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے درست ہو۔"

اباقہ خان نے جھنجھلا کر کہا۔ "ارغون کا اشارہ تیری طرف تھا۔ دراصل وہ تیری شکایت کر رہا تھا۔"

نکودار نے مشتعل ہوئے بغیر جواب دیا۔ "ارغون کو معلوم نہیں کیوں غلط فہمی سی ہو گئی ہے۔"

اباقہ خان نے پوچھا۔ "کیا تو اسلام کی طرف مائل نہیں ہے؟"

نکودار نے اُلٹا سوال کر دیا۔ "اسلام کی طرف مائل ہونا کیا معنی! آپ نے شمس الدین جوینی کو اپنا وزیر بنایا اور آپ سے پہلے دادا ہلاکو خان نے شمس الدین جوینی پر بے حد اعتماد کیا اور دادا کی ہدایت اور وصیت کے مطابق ہی آپ نے جوینی کو اپنا وزیر بنالیا کیا اپنے اس عمل سے آپ دونوں مسلمان تصور کیے جائیں گے؟"

اباقہ خان نے گھبرا کر جواب دیا۔ "نہیں تو۔ اس طرح ہم مسلمان کیوں تصور ہوں گے؟"

نکودار نے کہا۔ "میں شمس الدین جوینی کا احترام کرتا ہوں اور اپنے مشکل معاملات میں اس سے مشورے لیتا ہوں بس اسی سے میری بابت یہ رائے قائم کر لی گئی کہ میں اسلام کی طرف مائل ہوں۔"

اباقہ خان لاجواب ہو گیا۔

رات کو تخلیہ میں جب شہزادہ ارغون نے ولی عہد نکودار کا نام لے کر یہ شبہ ظاہر کیا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے تو اباقہ خان نے اس الزام کو مسترد کر دیا اور شہزادہ ارغون اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اس موقع پر اباقہ خان نے کہا۔ "ارغون! نکودار تجھ پر الزام لگا رہا تھا کہ تو یہودیت کی طرف مائل ہے کیونکہ تو سعد الدولہ یہودی پر بہت اعتماد کرتا ہے لیکن میں نے نکودار کے اس الزام کو اسی طرح مسترد کر دیا جس طرح تیرا الزام نکودار پر۔۔۔"

اباقہ خان کے جوڑوں میں بڑی تکلیف تھی اس نے باتیں کرتے کرتے اپنا داہنا ہاتھ اوپر جو اٹھایا تو درد کی ٹیس سے اُس کی آہ نکل گئی۔ اُس نے کراہتے ہوئے شہزادہ ارغون کو سمجھایا۔ "بیٹے ارغون! جس طرح بہت سارے ریشے آپس میں پیوست و پیہم رشتہ ہو کر مضبوط رسی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح خاندانی اور نسلی اتفاق انسان کو چنگیز خان خاقان اور ہلاکو خان بنا دیتا ہے۔ ارغون! اپنے بھائیوں سے بدظن نہ ہو۔ ان پر اعتبار کر اور خلافت کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جا۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں ترمہ شیریں اچانک آگئی۔ کافوری شمعوں کی تیز روشنی میں شہزادہ ارغون اور ترمہ شیریں کی نظریں متصادم ہوئیں۔ اباقہ خان نے شہزادے کو حکم دیا۔ "اب تو جاسکتا ہے۔"

لیکن شہزادہ رُکا رہا۔ اُس نے ترمہ شیریں کے چہرے پر بلا کی تازگی اور کشش محسوس کی، جیسے ترمہ شیریں پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی۔

اباقہ خان نے سختی سے کہا۔ "ارغون! اب تو جاسکتا ہے۔"

لیکن شہزادہ ارغون پھر بھی بیٹھا رہا۔ اس نے کہا۔ "میں آپ کی صحت کی طرف سے بہت زیادہ فکر مند ہوں باوا جان۔ آپ فرمائیں تو اصفہان اور بغداد سے مزید طبیب بلالیے جائیں۔"

ترمہ شیریں کو بھی شہزادہ ارغون کی حکم عدولی گراں گزر رہی تھی اس نے شہزادے کا نام لیے بغیر کہا۔ "ایل خان کا حکم واجب التعمیل ہے اس کو نہ ماننا گستاخی ہے بلکہ جرم بھی۔ اگر ایل خان کا حکم نہ مانا گیا، تو میں خود یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

اباقہ خان کو غصہ آگیا وہ مشتعل ہو کر اٹھا تو اُس کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا پھر بھی اس نے شہزادے کو ڈانٹا۔ "ارغون! تو نے میرا حکم نہیں سنا! اب تو چلا جا یہاں سے۔"

شہزادہ ارغون چلے جانے پر مجبور ہو گیا تو اس نے چلتے چلتے کہا۔ "باوا جان! میں جاتا ہوں لیکن یہ خاتون ہم دونوں میں اختلاف کا سبب خواہ مخواہ بن رہی ہیں، افسوس کہ انہوں نے میری ماں کا حق غصب کر لیا۔ میں انہیں بھول نہیں سکتا ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

شہزادہ چلا گیا۔ ترمہ شیریں نے اس کی شکایت کی۔ "ایل خان! آپ کا یہ بیٹا مہذب نہیں ہے اس کی باتوں میں سرکشی پائی جاتی ہے اور یہ ہم میں سے کسی کا وفادار نہیں ہے۔"

اباقہ خان درد اور غصے سے کراہ رہا تھا، بولا۔ "ترمہ شیریں! میں خود کو بدقسمت سمجھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میری اولاد متحد رہے اور مل جل کر حکومت کرے لیکن اس کا مزاج نفاق اور انتشار پر مائل ہے۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "ولی عہد نکودار آپ کی جانشینی کا مستحق ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتے۔"

اباقہ خان بہت افسردہ تھا، بولا۔ "نکودار بھی زیادہ سمجھ دار نہیں

ہے، اس کی اپنی رائے نہیں ہوتی۔ وہ کسی عقلمند پر تکیہ کرنا چاہتا ہے جبکہ میرے آباؤ اجداد سُنتے سبھی کی تھے مگر کرتے وہ تھے جس کو ان کا دل گواہی دیتا تھا۔ میرا ولی عہد ایک ایسا شخص بن سکتا ہے جو اپنی عقل سے فیصلے کر سکتا ہو جس کی اپنی رائے ہو اور جو مصلحت اندیشی کا شکار نہ ہو جاتا ہو۔"

ترمہ شیریں باتیں کرتے کرتے اداس ہو گئی۔ اس نے بات چیت کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔

اباقہ خان نے پوچھا۔ "تو کیا سوچنے لگی ترمہ شیریں! تو خاموش کیوں ہو گئی؟"

ترمہ شیریں نے پژمردہ لہجے میں جواب دیا۔ "محترم ایل خان! میرا عروج اور اقبال آپ کی زندگی اور ذات سے وابستہ ہے۔ آپ بیمار ہیں تو میں پریشان ہوں۔ اگر خدانخواستہ آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا، تو میں کہاں جاؤں گی میرا کیا حشر ہو گا؟"

اباقہ خان نے اسے تسلی دی۔ "ترمہ شیریں! تو بلاوجہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہے، اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ میرے بعد منگول قانون کے مطابق تو میرے کسی بیٹے کے حوالے کر دی جائے گی تو یہ تیرا غلط خیال ہو گا۔ ولی عہد تکودار ذہناً اسلام کی طرف مائل ہے اس لیے وہ تیرا احترام کرے گا اور تجھ کو اپنی ماں کی طرح سمجھے گا۔ تکودار کی موجودگی میں اس کا کوئی دوسرا بھائی تجھ پر اپنا حق نہیں جتا سکے گا۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "محترم ایل خان! آپ کے بعد میں یہاں نہیں رہوں گی کہیں اور چلی جاؤں گی۔"

اباقہ خان اُٹھ کر بیٹھ گیا، بولا۔ "تو نے کیا کہا؟ میرے بعد تو یہاں نہیں رہے گی، کہیں اور چلی جائے گی اور کہاں چلی جائے گی۔ کس کے پاس چلی جائے گی؟ کیا چغتائی شہزادے سونجاق کے پاس چلی جائے گی کیا وہ ابھی تک تیرے دل میں موجود ہے؟"

ترمہ شیریں نے گھبرا کر جواب دیا۔ "نہیں محترم ایل خان! ایسا نہیں ہو گا۔ میں شہزادہ سونجاق کے پاس کیوں جاؤں گی۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "ترمہ شیریں! مرنے سے پہلے میں تیری بابت یہ فیصلہ کر کے جاؤں گا کہ تو میرے بعد بھی اسی محل میں رہے گی۔ تو اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکے گی۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "تب پھر ایل خان! آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اگر آپ کے بعد بھی اسی محل میں رہی تو پھر مجھے شہزادہ ارغون سے کوئی بھی نہیں بچا سکے گا اس کا دل ابھی تک میری طرف سے صاف نہیں ہے۔"

اباقہ خان درد کی شدت کی وجہ سے پھر لیٹ گیا۔ وہ تڑپنے لگا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "اگر شہزادہ ارغون نے تجھ کو اپنی بیوی بھی بنا لیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے آخر میرے باپ ہلاکو خان کی بیوی بھی تو پہلے اس کی ماں تھی۔ میری ماں دوقوز پہلے میرے دادا تولوئی کی بیوی تھی، پھر جب میرا دادا مر گیا تو میرے باپ ہلاکو خان نے اُسے اپنی بیوی بنا لیا۔ منگول قانون جب ہمیں اس کی



ایک

شخص رات کے وقت گھبرایا ہوا ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بولا۔ "جناب میری بیوی کی حالت بہت خراب ہے براہ کرم ابھی میرے ساتھ چلے چلیے۔"

ڈاکٹر اپنا بیگ اٹھا کر اس شخص کے ساتھ روانہ ہو گیا اور اس کے گھر پہنچ کر کہا کہ بیوی کہاں ہے۔ "جناب وہ سامنے والے کمرے میں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"اچھا تم یہیں ٹھہرو میں ابھی جا کر تمہاری بیوی کو دیکھتا ہوں۔" ــــــ قہر درویش بر جان درویش وہ شخص وہیں انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے باہر آ کر کہا۔ "تمہارے پاس اسکرو ڈرائیور ہے۔"

وہ شخص یہ سوچتا ہوا کہ ڈاکٹر واقعی قابل ہے، اور اس نے فوراً معلوم کر لیا کہ میری بیوی کا اسکرو ڈھیلا ہو گیا ہے اسکرو ڈرائیور تلاش کرنے لگا۔ اور پھر ڈاکٹر کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر پھر کمرے سے باہر آیا اور ہتھوڑا طلب کیا۔ اس بار اس شخص کا ماتھا ٹھنکا۔ بہر حال اُس نے خاموشی سے ہتھوڑا بھی ڈاکٹر کے حوالے کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر پھر نمودار ہوا اور چھینی طلب کی۔ اس بار اس شخص سے ضبط نہیں ہو سکا اور کہنے لگا۔ "ڈاکٹر کیا تم میری بیوی کا بھیجا ہی نکال پھینکنا چاہتے ہو۔ ڈاکٹر ہو یا قصائی۔"

ڈاکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بھائی ابھی تو میرا بریف کیس ہی نہیں کھلا۔"

مرسلہ: ظفر عباس علی

اجازت دیتا ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔"

ترمہ شیریں حیرت سے اباقہ خان کی صورت دیکھے جا رہی تھی۔

"لیکن میں۔ مجھے اس رشتے سے گھن آتی ہے۔"

اباقہ خان نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "اچھا اب تو چپ ہو جا۔"

اباقہ خان خود بھی چند لمحوں کے لیے چپ ہو گیا پھر آہستہ آہستہ اٹھا اور رک رک کر تین بار تالی بجائی۔ جواب میں کئی خدمتگار خواتین اندر داخل ہوئیں اور حکم کا انتظار کرنے لگیں۔

اباقہ خان نے انھیں حکم دیا کہ اس کے پورے جسم پر تیل کی مالش کی جائے۔ یہ تیل حکیموں نے نہایت قیمتی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا تھا اور اس کی مالش سے اُسے کسی قدر افاقہ حاصل ہو جاتا تھا۔

خدمت گار خواتین نے نہایت توجہ اور محنت سے تیل کی مالش شروع کر دی۔ اباقہ خان درد سے کراہ رہا تھا۔ وہ کبھی چت ہو جاتا، کبھی اوندھے منہ لیٹ جاتا، کبھی داہنی کروٹ پر ہو جاتا اور کبھی بائیں کروٹ۔

☆

دو ماہ دس دن تک وہ بستر مرگ پر پڑا موت سے لڑتا رہا۔ پھر دواؤں نے اپنا اثر دکھایا اور وہ ٹھیک ہونے لگا۔

شہزادہ ارغون اپنے یہودی مشیر سعد اللہ سے مشورے کر کے نہایت اہم منصوبے بنا چکا تھا مگر جب اباقہ خان صحت یاب ہو گیا تو اس کو بڑی مایوسی ہوئی۔

شمس الدین جوینی بہت خوش تھا کیونکہ اباقہ خان کی علالت کے دوران حالات جو رخ اختیار کر رہے تھے، اس سے وہ فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا اباقہ خان کے طفیل اور مرضی سے۔ ولی عہد تکودار بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا باپ اس بیماری سے جانبر نہیں ہو سکے گا مگر جب وہ ٹھیک ہو گیا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی۔

اباقہ خان کو غسل کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اطبا نے خصوصی غسل کے لیے بہت ساری دواؤں پر مشتمل ایک نسخہ تیار کیا۔ ان ادویات کو پانی سے بھری ہوئی دیگوں میں ڈال دیا گیا اور چولھوں میں آگ جلا دی گئی۔ یہ دوائیں کافی دیر تک پانی میں ابلتی اور جوش کھاتی رہیں۔ اسی دوران اباقہ خان کو غسل کے لیے تیار رکھا گیا۔ کئی حسین و جمیل عورتوں نے اباقہ خان کو اپنے ہاتھوں سے نہلایا کمزوری کی وجہ سے جو اُسے تکلیف پہنچا رہی تھی۔

دوسری طرف وزیر شمس الدین جوینی نے صحت یابی کی خوشی میں ایک جشن کا اہتمام کیا تھا۔ شاہی عمارتوں کو خوب سجا دیا گیا تھا اور ان کی دیواروں کو ہندوؤں کی دیوالی کی طرح چراغاں سے جگمگا دیا گیا تھا۔ محل کے باہر میدان میں زریں خیمہ نصب کرا دیا گیا تھا۔ اس خیمے میں کئی ہزار آدمی دعوت کے مزے لوٹ سکتے تھے۔ اس خیمے میں خشک میوے، پھل، گوشت کی بڑی بڑی قابیں، شراب اور گھوڑی کا دودھ وافر مقدار میں رکھ دیا گیا تھا۔ جب امراء اور سرداروں کو جشن صحت یابی سے لطف اندوز ہونے کی اجازت مل گئی تو وہ کھانے پینے پر ٹوٹ پڑے۔

محل کے اندر شہزادگان اور شاہی خاندان کے دوسرے لوگوں کے لیے علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں خواتین اور مرد یک جا تھے۔ ان میں ولی عہد تکودار، شہزادہ ارغون اور شہزادہ کیخاتو خان بھی تھے اور بایدو اور النوبھی۔ ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا۔ خود اباقہ خان ایک چھوٹے مگر اونچے تخت پر بیٹھا خوش و خرم مرد اور خواتین کا نظارہ کر رہا تھا۔ انہی میں ترمہ شیریں بھی شامل تھی۔ شہزادہ ارغون کی نظریں ترمہ شیریں کا پیچھا کر رہی تھیں۔

ترمہ شیریں شہزادہ ارغون سے دور چلی گئی۔ ایک جھاڑی میں جہاں مہندی اور لیموں کے درختوں کی کثرت تھی، ترمہ شیریں خواتین کے ساتھ اس جھاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ بھی بہت خوش تھی۔ شہزادہ ارغون ترمہ شیریں کو جھاڑی میں چھپتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ ادھر ادھر تلاش کرتا ہوا جھاڑی تک جا پہنچا۔ یہاں ترمہ شیریں اپنی سہیلی کی کسی بات پر زور زور سے ہنس رہی تھی۔ وہ اس ہنسی پر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر مہندی اور لیموں کے درختوں کو تکتا رہا پھر دونوں ہاتھوں سے درختوں کی شاخیں ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

ترمہ شیریں اور اس کی سہیلیاں گھبرا گئیں لیکن اپنے سامنے شہزادے کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ ترمہ شیریں نے منہ بنایا۔

شہزادہ ارغون نے انہیں مخاطب کیا۔ "ترمہ شیریں کے سوا ہر عورت جا سکتی ہے۔ در اصل میں ترمہ شیریں کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔"

دل نہ چاہنے کے باوجود عورتیں وہاں سے جانے لگیں، ان کے ساتھ ترمہ شیریں بھی چلی مگر شہزادے نے اس کا راستہ روک لیا۔ بولا۔ "ترمہ شیریں! تم کہاں چلیں؟"

ترمہ شیریں نے ٹھٹک کر کہا۔ "ارغون! میرا راستہ چھوڑ دو، میری راہ سے ہٹ جاؤ۔"

شہزادے نے کہا۔ "مگر کیوں؟ میں تم سے ملنے آیا ہوں، میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "لیکن میں تم سے نہیں بات کرنا چاہتی۔"

شہزادے نے کہا۔ "کوئی بات نہیں تم مجھ سے بات نہ کرو، میری باتیں سن تو سکتی ہو۔ بس میرے لیے یہی کافی ہے۔"

ترمہ شیریں نے دھمکی دی۔ "اپنی ان جسارتوں کا انجام بھی معلوم ہے تمہیں؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "کیسی جسارتیں، اور کیسا ان کا انجام،

میں سر دست اس رشتے کا احترام کروں گا جو ہمارے درمیان حائل ہے کیونکہ میرا باپ ابھی زندہ ہے۔"

عورتیں جا چکی تھیں، شہزادے نے ترمہ شیریں کے شانوں کو زور سے دبایا۔ "بیٹھ جاؤ ترمہ شیریں، کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاؤ، میری خاطر، میری خوشی کے لیے۔"

ترمہ شیریں نے اُسے دھکا دے کر اپنی راہ سے گرا دینا چاہا مگر طاقتور شہزادہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ شہزادے کو ہنسی آ گئی، بولا۔ "خوب! ایک بار اور سہی، میں ان باتوں کا بُرا نہیں مانتا۔"

ترمہ شیریں عاجز آ کر بیٹھ گئی۔ "بولو تم مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

شہزادہ ارغون نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ترمہ شیریں، میں بُرا آدمی نہیں ہوں۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "میں نے یہ کب اور کس سے کہا کہ تم بُرے آدمی ہو۔"

شہزادہ اس کی آنکھوں میں جھانکے جا رہا تھا۔ "تم نے کہا تو کسی سے بھی نہیں لیکن تمہارا طرزِ عمل تو یہی بتاتا ہے۔"

ترمہ شیریں نے منہ پھیر لیا۔ "یہ تم میری آنکھوں میں کیا دیکھ رہے ہو؟ میں تمہارے باپ کی محبوبہ ہوں۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں ترمہ شیریں۔ یہ سوچ سوچ کر میں خوش ہوتا رہتا ہوں کہ میں یا میرا باپ مسلمان نہیں ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہوتے تو بڑی اذیت اور پریشانی کی بات ہوتی۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "یہاں اسلام کا ذکر کیسے آ گیا۔ اگر تم دونوں مسلمان ہوتے تو انسان ہوتے۔"

شہزادے نے کہا۔ "ایسی بات نہ کہو ترمہ شیریں! اگر میں مسلمان ہوتا تو میں کسی طرح بھی تمہیں حاصل نہ کر سکتا لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم منگول ہیں اور منگول قانون ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنے باپ کی بیویوں کو اس کے بعد اپنی بیوی بنائیں۔"

ترمہ شیریں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "چھی چھی، بڑا جاہلانہ قانون ہے مجھے تو سوچ سوچ کر گھن آتی ہے۔"

شہزادے نے اپنا ہاتھ ترمہ شیریں کے بالوں پر رکھ دیا۔ "ترمہ! میں حد سے تجاوز نہیں کروں گا، بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں جب تب دیکھ لیا کروں، تم سے باتیں کر لیا کروں، اس کے سوا کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "شہزادے میرے بالوں پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لو، اور یہاں سے نکل کر کسی کھلی جگہ بیٹھ کر باتیں کرو، تمہارا باپ اباقہ خان ایک مغضوب الغضب انسان ہے وہ ناراض ہو سکتا ہے۔"

شہزادے نے کہا۔ "میں خود بھی یہی چاہتا ہوں لیکن وہاں ہم دونوں بہتوں کی نظر میں آ جائیں گے اور اس بات کا بھی ڈر ہے کہ نیم مسلمان نکودار ہم سے جھگڑ پڑے جب کہ بادا جان نے شہزادگان کو اتحاد اور اتفاق کا درس دیا ہے۔"

ترمہ شیریں تیزی سے اٹھی اور جھاڑی سے باہر نکل گئی، بولی۔ "لیکن میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔"

شہزادہ اس اچانک اقدام سے ہکا بکا رہ گیا۔ وہ بھی جھاڑی سے نکلا۔ جھاڑی سے باہر کا منظر ہی عجیب تھا، وہاں بایدو، الغو اور نکودار، اور چند خواتین چپ چاپ کھڑی اُن دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ شہزادے نے ان سب کو دیکھا اور کوئی پروا کیے بغیر جانے لگا۔ ترمہ شیریں کہیں غائب ہو چکی تھی۔ ولی عہد نکودار نے نفرت سے منہ بنایا اور شہزادے کو سمجھایا۔ "ارغون! ترمہ شیریں تیری ماں ہے۔"

شہزادے نے بیزاری سے جواب دیا۔ "اگر ماں ہے تو میں کیا کروں؟"

نکودار نے کہا۔ "وہ تیری ماں ہے تو اس کا احترام کر۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "میں اس کا احترام کر رہا ہوں اور اس وقت تک احترام کرتا رہوں گا جب تک وہ میری ماں ہے۔"

بایدو نے شہزادے کی حمایت کی۔ "بیشک یہ احترام اسی وقت تک واجب بھی ہے۔"

نکودار نے کہا۔ "اب ہم لوگ قراقرم میں نہیں رہتے۔ اب ہم جن اقوام اور مذاہب کے درمیان رہتے ہیں اُن کے ہاں یہ رشتہ جائز نہیں ہے۔"

بایدو نے پوچھا۔ "ولی عہد بہادر! کیا ہم اپنے قانون چھوڑ دیں گے؟ کیا ہم اپنے آبائی قوانین کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے قوانین پر قربان کر دیں گے؟ کیا مسلمانوں اور عیسائیوں نے ہمارے قوانین اختیار کر لیے ہیں؟ جب انھوں نے ہمارے قوانین نہیں اختیار کیے تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ اُن کے قوانین اختیار کریں۔"

نکودار نے بایدو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "بایدو! تم ہم دونوں بھائیوں کے معاملات میں نہ بولو تو بڑی اچھی بات ہے۔"

بایدو برہم ہو گیا۔ "یہ کیسی بات ہے کہ میں کسی کے معاملے میں بول ہی نہیں سکتا۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "بایدو شہزادے! تم میرے معاملات میں دخل نہ دو۔ یہ آخری موقع دے رہا ہوں تجھ کو۔"

بایدو نے کہا۔ "ولی عہد بہادر! آپ بھی منگول قوانین میں بے جا دخل اندازی نہ کریں۔"

الغو اُن کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا، بولا۔ "بھائیو! آپس میں جھگڑو نہیں، اگر پسند کرو تو میں تمہیں گراں قدر مشورے دے سکتا ہوں میرے پاس منصوبوں اور تجربوں کی کوئی کمی نہیں۔"

نکودار نے الغو کو ڈانٹ دیا۔ "چپ رہو بکّے نوجوان، آئندہ میں تیری دخل اندازی برداشت نہیں کروں گا۔"

الغو نے جواب دیا۔ "میں دخل کب دے رہا ہوں، میں تو مشورہ دے رہا ہوں۔ میرا مشورہ آپ دونوں کو یہ ہے کہ جو اسلام سے متاثر ہے وہ اسلامی قوانین پر چلے اور جو منگول قوانین کا احترام کرتا ہے وہ منگول قوانین کا احترام کرے۔"

شہزادہ ارغون ہنسنے لگا، اس نے تالی بجائی۔ "زندہ باد الغو میرے بھائی زندہ باد کیا اچھا مشورہ دیا ہے تو نے۔"

الغو خوشی سے پھولا نہ سمایا، بولا۔ "پھر بھی لوگ مجھے نکما اور کاہل کہتے ہیں، میرے مشوروں سے دوسرے تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن میں خود نہیں اٹھا سکتا۔"

ولی عہد نے شہزادہ ارغون سے کہا۔ "تم تو یہیں رکو، بقیہ لوگ جا سکتے ہیں۔"

شہزادہ ارغون قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "جب سب لوگ جا سکتے ہیں تو میں بھی جا سکتا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ جلدی سے الغو کے ساتھ چلا گیا۔ ولی عہد نکودار انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا انھیں جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ ترمہ شیریں کو تلاش کر کے ملا، بولا۔ "مادر محترم! آپ نے ارغون کو مایوس کر دیا، بہت اچھا کیا۔ بہرحال کوئی آپ کا ساتھ دے یا نہ دے لیکن میں ضرور دوں گا۔"

ترمہ شیریں نے سرگوشی میں کہا۔ "نکودار! تم چاہو تو میری ایک مدد کر سکتے ہو۔"

نکودار نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "جب میں اس محل میں تنہا رہ جاؤں تو تم مجھے کسی طرح یہاں سے نکلوا دینا۔"

نکودار نے کہا۔ "وقت آنے دو، جو مناسب ہوگا، اس پر عمل کروں گا۔"

اباقہ خان کو ترمہ شیریں کی تلاش تھی، کئی خدمت گار خواتین اسے تلاش کرتی ہوئی نکودار کے پاس پہنچ گئیں اور اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔

اباقہ خان نے ترش لہجے میں کہا۔ "تم کہاں چلی گئی تھیں، میں تمہیں بڑی دیر سے تلاش کرا رہا ہوں۔"

ترمہ شیریں نے بھی تلخ لہجہ اختیار کیا، بولی۔ "ایل خان! آپ کے شہزادے ارغون نے مجھے آج پھر پکڑ لیا تھا۔ میں کہتی ہوں، اس کا کوئی حل نکالیے ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔ میں خود کو اس رشتے پر مائل نہیں کر سکتی۔"

اباقہ خان نے تردد سے پوچھا۔ "وہ کیا کہتا تھا؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "وہ کہتا تھا میں خوش قسمت انسان ہوں کہ مسلمان نہیں ہوں اور منگول قوانین مجھے یہ حق دیتے ہیں کہ اپنے باپ کے بعد اس کی بیوی کو اپنی محبوبہ بنا لیں۔"

اباقہ خان نے سرد آہ بھری۔ "ترمہ شیریں! ارغون صحیح کہتا ہے اس کو یہ حق منگول قانون نے دیا ہے، اسے چھینا نہیں جا سکتا۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "لیکن میں خود کو اس پر آمادہ کس طرح کروں، مجھے تو سوچ کر ہی گھن آتی ہے۔"

اباقہ خان بہت اداس تھا، وہ معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا، کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "ترمہ شیریں! میری صحت یابی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ آج ہر کوئی خوش ہے لیکن یہ بات میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ میں صحت یاب نہیں ہوا۔ میں اس وقت بھی بیمار ہوں، میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔"

ترمہ شیریں گھبرا گئی، بولی۔ "کیا طبیبوں کو بلوایا جائے؟"

اباقہ خان ٹہلنے لگا۔ وہ بہت پریشان اور گھبرایا گھبرایا نظر آ رہا تھا، اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، وہ کہہ رہا تھا۔ "ترمہ شیریں! میں اپنی سلطنت کو انتشار سے بچانا چاہتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میری موت آنا ہی چاہتی ہے تو چند دن ٹھہر کر آ جائے۔ اس غسل صحت کے جشن میں لوگوں کو پہلے ہی معلوم ہوگا کہ میں صحت مند نہیں ہوں، بدستور بیمار ہوں تو وہ سازشیں شروع کر دیں گے۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "لیکن طبیبوں کو بلائے بغیر طبیعت کی خرابی دور بھی تو نہیں ہوگی۔"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "میں اسی لیے ٹہل رہا ہوں کہ شاید طبیعت سنبھل جائے۔ اگر نہیں سنبھلے گی تو مجبوراً طبیبوں کو بلواؤں گا۔"

وہ ٹہلتے ٹہلتے بستر پر گر گیا اور ترمہ شیریں کو حکم دیا۔ "میری خدمت کے لیے صرف دو خدمت گار خواتین میرے پاس موجود رہیں۔ اور نکودار اور شمس الدین جوینی کو حاضر کیا جائے۔"

ترمہ شیریں نے گھبراہٹ میں ان احکامات پر عمل کرنا چاہا تو اباقہ خان نے اسے روک دیا۔ "جو حکم دینا ہے میں خود دوں گا تو میرے بستر پر ہی بیٹھ جا۔" اس کے بعد تالی بجا کے خدمت گار خواتین کو اندر بلایا اور ایک خدمت گار خاتون کو حکم دیا۔ "وزیر شمس الدین جوینی اور ولی عہد نکودار کو حاضر کیا جائے۔" دو خدمت گار خواتین کو حکم دیا۔ "تم دونوں یہیں میرے پاس موجود رہو۔"

جب خدمت گار خاتون شمس الدین جوینی اور ولی عہد نکودار کو بلانے کے لیے جانے ہی والی تھی کہ اباقہ خان نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ "میں تجھ کو کیسا نظر آ رہا ہوں؟"

خدمت گار خاتون نے جواب دیا۔ "نصیب دشمناں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

اباقہ خان گرجا۔ "میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔ خبردار جو باہر میری بابت یہ کہا گیا کہ میں بیمار ہو گیا ہوں۔"

خدمت گار خاتون نے گردن جھکائی، کہا۔ "آپ بالکل ٹھیک ہیں خانِ محترم! آپ کو بیمار کون کہے گا؟"

اباقہ خان نے اسے باہر جانے کی اجازت دے دی اور دونوں خدمت گار خواتین کو پاس بلا کر حکم دیا۔ "میرے جسم پر ادویات کا روغن ملا جائے۔"

دونوں خواتین تیل کی مالش کرنے لگیں۔

ترمہ شیریں محسوس کر رہی تھی کہ اباقہ خان کی طبیعت بگڑتی جا رہی ہے اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں لیکن اباقہ خان نہیں جبڑا کھولے ہوئے تھا۔

ولی عہد نکودار اور شمس الدین جوینی کو اباقہ خان کے پاس پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔

وزیر اس کے سینے پر جھک گیا۔ "آپ کو کیا ہو گیا خانِ محترم؟"

نکودار دوسری طرف کھڑا تھا وہ بھی اپنے باپ کے چہرے کے پاس منہ لے جا کر بولا۔ "آج تو آپ بالکل صحت مند تھے، پھر یہ آپ کو کیا ہو گیا؟"

اباقہ خان نے رک رک کر جواب دیا۔ "میری طبیعت بگڑتی جا رہی ہے آج جشنِ صحت یابی جس طرح برپا ہے اس کو اسی طرح برقرار رکھا جائے۔ جو لوگ میری بابت پوچھیں انہیں بتایا جائے کہ اطبا کے مشورے پر میں آرام کر رہا ہوں۔"

وزیر شمس الدین نے پوچھا۔ "کیا طبیبوں کو بلوا لیا جائے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "طبیبوں کی بھیڑ بھاڑ کو نہیں، صرف دو طبیبوں کو بلوا لیا جائے۔"

وزیر شمس الدین طبیبوں کو بلانے خود چلا گیا۔ اباقہ خان نے زندگی میں شاید پہلی بار حکم دینے کے بجائے استدعا کی۔ "جوینی! تم کوشش کرو کہ جلد از جلد میرے پاس آ جاؤ، خدا کے لیے۔ کیونکہ وقت بہت کم ہے اور مجھے باتیں بہت زیادہ کرنا ہیں۔"

ولی عہد نکودار نے پوچھا۔ "کسی اور کو بھی بلوانا پسند فرمائیں گے یا نہیں؟"

اباقہ خان نے آہستہ سے جواب دیا۔ "کسی کو بھی نہیں۔" پھر اس نے ترمہ شیریں کی طرف دیکھا اور نکودار سے کہا۔ "نکودار! ترمہ شیریں کا خاص خیال رکھنا یہ ارغون سے بہت خوف زدہ ہے۔"

ترمہ شیریں رونے لگی۔ بولی۔ "اس وقت آپ میری فکر نہ کیجیے میری دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت یاب کرے۔"

اباقہ خان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "خدا مجھے صحت یاب کرے تو شیریں! افسوس کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں کوئی دوسرا وہ نہیں دیکھ سکتا۔ خانِ اعظم! اور اس کی اولادیں آسمانی دریچوں سے نکل کر میری طرف بھاگی چلی آ رہی ہیں، وہ سب مجھے بلا رہی ہیں۔"

نکودار نے باپ کے سینے پر سر رکھ دیا۔ "آپ ٹھیک ہو جائیں گے بابا جان!"

اباقہ خان نے اسے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش تھا۔ نکودار کو اس کی خاموشی نے چونکا کر دیا۔ اس نے اپنے باپ کی آنکھیں جو دیکھیں تو وہ تقریباً بند تھیں اور اس کی سانس بہت سست چل رہی تھی۔ اباقہ خان بے ہوش ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد دو طبیب اور وزیر شمس الدین جوینی بھی آ گئے۔ اباقہ خان اس وقت بیہوش تھا، دونوں طبیب اس کو نہایت توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ انھیں اباقہ خان کی نبضیں نہیں مل رہی تھیں۔ ایک طبیب نے نکودار سے پوچھا۔ "ولی عہد کون ہے؟ آپ یا کوئی اور؟"

نکودار نے گھبرائے لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی اس بات کا مطلب؟"

طبیب نے جواب دیا۔ "میری بات کا مطلب ہے کہ ولی عہد کو بیمار خان کے قریب رہنا چاہیے کیونکہ پتہ نہیں کس وقت وصیتوں اور ہدایتوں کی ضرورت پیش آ جائے۔"

شمس الدین جوینی نے طبیب سے پوچھا۔ "کیا مرض نے مہلک شکل اختیار کر لی ہے؟"

طبیب نے جواب دیا۔ "ایسا لگتا ہے جگر نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔"

دونوں طبیبوں نے چند دوائیں دیں، پلانے کی اور مالش کی۔ جب دونوں طبیب واپس جانے لگے تو ولی عہد نکودار نے پہلی بار ایل خان کا لب و لہجہ اختیار کیا۔ دونوں طبیبوں سے کہا۔ "تم دونوں ابھی نہیں جاؤ گے۔ تمہیں اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک بیمار خان ہوش میں نہیں آ جاتا اور یا پھر اس وقت تمہیں چھوڑا جائے گا جب بے ہوش خان قیدِ ہستی سے نجات حاصل کر لے گا۔"

طبیبوں نے گڑگڑا کر عرض کیا۔ "ولی عہد بہادر! ہماری خطا؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "منگول رسم و رواج کے مطابق خان کی موت کی خبر چھپائی جاتی ہے اور تم دونوں باہر نکلتے ہی یہ خبر عام کر دو گے۔"

ایک طبیب روہانسا ہو گیا، بولا۔ "ولی عہد بہادر! ہم قسم کھانے کو تیار ہیں خان کی بیماری یا موت راز میں رکھی جائے گی۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "میں تم دونوں کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا میرا فیصلہ اٹل ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔"

شمس الدین جوینی خاموش کھڑا بے ہوش اباقہ خان کی حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اباقہ خان نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وزیر بے ساختہ بول اٹھا۔ "محترم خان کو ہوش آ گیا۔"

دونوں طبیب فوراً خان کے پاس آ گئے۔ نکودار نے ہوش میں آتے ہوئے اباقہ خان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی ہونٹ ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

دونوں طبیب اباقہ خان پر جھک گئے اور نکودار کی شکایت کی۔ "محترم ایل خان! آپ ہوش میں آ گئے؟ براہِ کرم ولی عہد بہادر کو حکم دیجئے کہ وہ ہمیں چلا جانے دے، انھوں نے ہمیں بلاوجہ روک رکھا ہے۔"

شمس الدین جوینی نے دونوں کو منع کیا۔ "طبیب صاحبان! کیا آپ دونوں کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتے؟"

اباقہ خان نے نکودار کو اشارے سے قریب بلایا، جب وہ اپنے باپ کے داہنی طرف جا کھڑا ہوا تو اباقہ خان نے ہاتھ کے اشارے سے نکودار کو اپنے منہ کے قریب بلایا۔ وہ نکودار کے کان میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔

نکودار نے اپنا ایک کان اباقہ خان کے منہ سے ملا دیا، بولا۔ "آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

اباقہ خان میں اچانک طاقت عود کر آئی اس نے بلند آواز سے کہا۔ "نکودار! اگر میں اچھا ہو گیا تو دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کا فیصلہ میں خود کروں گا لیکن اگر میں مر جاؤں تو تم دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کو قتل کر دینا تاکہ یہ لوگ میری موت کی خبر باہر عام نہ کر سکیں۔"

دونوں طبیب خوشامدیں کرنے لگے۔ "خانِ محترم! ہم سے آپ قسم لے لیں ہم محل کی خبریں باہر نہیں پہنچائیں گے۔"

اباقہ خان نکودار سے مخاطب تھا۔ "نکودار! میں نے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔" پھر وہ غمزدہ ترمہ شیریں کو دیکھنے لگا اور نکودار کو ہدایت کی۔ "ترمہ شیریں کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے میرے بعد اس پر کسی بھی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔"

نکودار رونے لگا۔ "اب آپ کا کیا حال ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "یہ میرا آخری وقت ہے۔ سعد الدولہ یہودی سے ہوشیار رہنا اور تمام بھائی آپس میں متحد رہیں۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "میں زندگی بھر آپ کے حکم کا پابند رہوں گا۔"

شمس الدین جوینی نے پوچھا۔ "خانِ محترم میرے لیے کیا حکم ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "جوینی! تم بدستور وزیر رہو گے میرے بعد نکودار کے وزیر ہو گے ویسے نکودار خود مختار ہو گا جس کو چاہے وزیر بنائے۔"

نکودار نے وزیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ "میں پدر بزرگوار کی خواہشات کا زندگی بھر احترام کروں گا۔"

اباقہ خان نے آہستہ سے کہا۔ "شہزادہ ارغون کو بلاؤ۔"

نکودار باپ کی بات ٹال گیا، کہہ دیا۔ "میں نے آدمی بھیج دیا ہے جیسے ہی آئے گا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔"

ترمہ شیریں نے اباقہ خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اباقہ ترمہ شیریں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی نظر دھندلا چکی تھی۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔ "میرے بعد مصر کے مملوک حکمراں کو سزا ضرور دینا قطبوغا کے قاتل کو۔۔۔"

وہ بات پوری نہیں کر سکا، اس کا سر ڈھلک گیا، اباقہ خان مر گیا۔ ہلاکو خان کا جانشین اچانک مر چکا تھا۔

نکودار نے اس ہال کو جہاں اباقہ خان کی لاش رکھی تھی لوبان اور عنبر کی خوشبو سے مہکا دیا۔

شمس الدین جوینی نے نکودار سے پوچھا۔ "شہزادے! اب ان دونوں خدمت گار خواتین اور طبیبوں کا کیا بنے گا؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "میں اپنے باپ کی وصیتوں پر عمل کر کے رہوں گا۔" پھر وہ اچانک ترمہ شیریں سے رجوع ہو گیا، بولا۔ "محترمہ میرا بھائی ارغون منگول عساکر کا سالار ہے اور آپ کا عاشق بھی۔ ابھی میرے باپ اباقہ خان کی موت کا کسی کو بھی علم نہیں، کچھ دیر بعد یہ خبر محلسرا میں عام ہو جائے گی اور ارغون اس خبر کے بعد جو پہلا قدم اٹھائے گا وہ آپ کو اپنے قبضہ و اختیار میں لانے سے متعلق ہو گا۔ میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ اب آپ جہاں بھی جانا چاہیں، چلی جائیں۔"

ترمہ شیریں بہت پریشان تھی، بولی۔ "میں کہاں جاؤں، میں کتنی ہی تیز بھاگوں گی پھر بھی خان کی حدودِ سلطنت سے باہر نہیں جا سکوں گی۔ ولی عہد بہادر آپ میری مدد کریں۔"

نکودار نے شمس الدین جوینی کو ایک فرماں روا کی طرح حکم دیا۔ "ترمہ شیریں کو آپ اپنے ساتھ لے جائیں۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میں انہیں کہیں بھجوا دوں گا۔"

شمس الدین جوینی ہراساں ہو رہا تھا، بولا۔ "خانِ محترم! اگر ارغون نے میرے گھر کی تلاشی لی اور وہاں سے ترمہ شیریں کو برآمد کر لیا تو میں کیا جواب دوں گا؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "آپ اس کی پروا نہ کریں۔ شہزادہ ارغون آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لے سکتا۔"

شمس الدین جوینی نکودار کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ وہ چادر میں منہ چھپائے ترمہ شیریں کو نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اپنے گھر لے گیا اور اس کو ایک تہ خانے میں چھپا دیا۔ چھپاتے وقت ترمہ شیریں سے کہا۔ "محترم خاتون! یہ چند روزہ تکلیف تو آپ کو جھیلنا ہی ہو گی، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اباقہ خان کی موت کی خبر محل سرا میں پھیل گئی۔ ہر طرف سے رونے دھونے کی آوازیں آنے لگیں۔ شہزادہ ارغون بھاگا بھاگا آیا اور نکودار سے شکایت کی کہ اگر تم چاہتے تو باپ کی نازک حالت کی اطلاع مجھے دے دیتے لیکن تم نے اسے مصلحتاً چھپائے رکھا۔

نکودار نے جواب دیا۔ "نہیں ارغون ایسی بات نہیں تھی۔ میں نے طبیبوں کی مدد سے بڑی کوشش کی کہ بابا جان کو بچالوں لیکن پھر بے بس ہو گیا۔"

شہزادہ ارغون محل میں داخل ہو گیا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر ترمہ شیریں کو تلاش کرتا رہا۔ جب وہ نہیں ملی تو اس نے نکودار سے پوچھا۔ "یہ ترمہ شیریں کہاں چلی گئی؟ کہیں نظر نہیں آتی۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "ارغون! میں خود بہت پریشان ہوں اور مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کون کہاں ہے۔"

شہزادہ ارغون نکودار کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

قرب و جوار کے امراء اور سرداروں کو اباقہ خان کی موت کی خبریں خفیہ خفیہ روانہ کر دی گئیں اور ان کی آمد کا انتظار کیا جانے لگا۔ عام طور پر یہ خبر مشہور کر دی گئی تھی کہ اباقہ خان صحت مند ہو چکا ہے اور وہ سیر سپاٹے کیلئے کی غرض سے کچھ دنوں کیلئے چپ چاپ بغداد چلا گیا ہے۔

اباقہ خان کی لاش کو برف کی سلوں میں رکھ دیا گیا۔ یہ برف قریب کے پہاڑوں سے منگوائی گئی تھی۔

نکودار نے دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کو قتل کرا دیا۔ گو کہ اس کا جی نہیں چاہتا تھا مگر مرتے ہوئے باپ کی خواہش ہی یہی تھی وہ مجبور تھا۔

شہزادہ ارغون نے اباقہ خان کی قبر تیار کرائی۔ قبر کے لیے ایک بہت بڑا تہہ خانہ تیار کرایا گیا۔ اور اباقہ خان کی خدمت کیلئے خوبصورت لڑکیوں کو فراہم کیا گیا۔ ان لڑکیوں کو زیورات سے آراستہ کر دیا گیا۔

قریب و دور سے آنے والے محل میں آ رہے تھے۔ انہی میں اچانک شہزادہ سونجاق بھی شامل تھا۔ اس کو اباقہ خان کی بیماری اور موت کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی ایما اور حکم پر اباقہ خان کی خیریت معلوم کرنے چلا آیا تھا لیکن محل میں داخل ہوتے ہی جیسے ہی اس کو اباقہ خان کی موت کی خبر ملی وہ ہکا بکا رہ گیا۔

شہزادہ ارغون کو سونجاق کی آمد گراں گزری لیکن نکودار نے اس کو خوش اخلاقی سے خوش آمدید کہا۔

وزیر شمس الدین جوینی آنے والوں کے قیام و طعام کے بندوبست میں لگا ہوا تھا۔ اس نے شہزادہ سونجاق کو کہا۔ "شہزادے! آپ کو یہاں نہیں آنا تھا۔"

شہزادہ سونجاق نے پوچھا۔ "کیوں؟ میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہ گیا۔"

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ "شہزادے سونجاق! اگر آپ نے اپنی سابقہ غلطی کو غلطی ہی نہیں جانا تو آپ سے کچھ کہنا سننا فضول ہے ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا تھا، وہ درست نہیں تھا۔ اگر اس وقت اباقہ خان ہم میں موجود ہوتا اور آپ آئے ہوئے ہوتے تو اباقہ خان آپ کو کبھی بھی معاف نہ کرتا کیونکہ وہ آپ سے بے حد ناراض تھا۔"

شہزادہ سونجاق نے ہنس کر کہا۔ "رشتہ داریوں میں ایسی غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں مگر میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ اس خاندان کو چاہیے کہ یہ بھی سب کچھ بھلا دے۔"

شمس الدین جوینی سونجاق کی جرأت و ہمت کی دل ہی دل میں داد دے رہا تھا، بولا۔ "شہزادہ سونجاق یہ بتلایئے اگر یہاں آپ کے ساتھ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آ جائے تو؟"

سونجاق نے جواب دیا۔ "ایسا نہیں ہوگا وزیر محترم!"

اباقہ خان کی لاش کو نہایت اہتمام اور شان سے اس کی تہہ خانے نما قبر کے پاس لے جایا گیا۔ قبر کے پاس اس کی میت رکھ دی گئی اور جملہ شریک جنازہ اور حاضرین کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے خان کا آخری دیدار کر سکتے ہیں۔

آخری دیدار کیلئے ہجوم ٹوٹ پڑا۔ عورتیں اور لڑکیاں اپنے حکمران کی شکل دیکھتے اور بین کرتے یا روتے ہوئے آگے بڑھ جاتیں۔

اباقہ خان کی لاش کو قبر میں اتار دیا گیا۔ اب ان آراستہ و پیراستہ لڑکیوں کو طلب کیا گیا جنہیں مُردہ خان کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ لڑکیاں زور شور سے رو رہی تھیں مگر انہیں ڈانٹ ڈانٹ کر چپ کرایا جا رہا تھا۔

نکودار کو ان پر رحم آ گیا۔ اس نے وزیر شمس الدین جوینی کو علیحدہ لے جا کر پوچھا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو مُردہ خان کے ساتھ دفن نہ کیا جائے۔"

لیکن شمس الدین جوینی نے اس سے اختلاف کیا، کہا۔ "شہزادے ایسی غلطی نہ کیجئے گا، پورا خاندان آپ کا دشمن ہو جائے گا۔"

نکودار نے کہا۔ "یہ جہالت ہے، اب ہم لوگ متمدن دنیا میں رہتے ہیں جہالت کی رسمیں ترک کر دینی چاہئیں۔"

وزیر نے جواب دیا۔ "یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ کا خاندان اس تبدیلی کو قبول نہیں کرے گا اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ ارغون اٹھا جائے گا۔"

عورتوں اور لڑکیوں کی چیخنے چلانے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ نکودار نے بے بسی سے کہا۔ "مجھ سے ان کی چیخ پکار نہیں سنی جا سکتی۔"

وزیر نے جواب دیا: "آپ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیجیے۔ یا پھر یہاں سے ٹل جائیے۔"

نکودار نے کہا: "لیکن میرے لیے یہ دونوں ہی باتیں ناممکن ہیں۔ میں ولی عہد ہوں اور یہ ساری رسوم میری موجودگی ہی میں انجام دی جائیں گی۔"

وزیر اپنی رائے پر قائم رہا: "تب پھر آپ ان رسوم کو ادا ہونے دیجیے۔"

لیکن نکودار کو کسی پہلو قرار نہیں آ رہا تھا۔ اس نے شہزادہ ارغون کو مردہ خان کی قبر کے سرہانے کھڑے دیکھا۔ یہ بھاگ کر وہاں گیا، اور شہزادہ ارغون کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا، بولا: "ارغون! کیا تجھے یاد ہے کہ ہم دونوں نے پدرِ بزرگوار کی زندگی میں باہمی اتحاد و اتفاق کا وعدہ کیا تھا؟"

ارغون نے جواب دیا: "ہاں مجھے یاد ہے اور میں کوشش کروں گا کہ اس وعدے کو نبھاؤں۔"

نکودار نے کہا: "اب میں پدرِ بزرگوار کا جانشین ہوں۔ میں اگر چاہوں تو اپنی قوم کو کوئی بھی حکم دے سکتا ہوں اور قوم اس کی اطاعت اور تعمیل کی پابند ہوگی۔"

ارغون نکودار کی شکل دیکھ رہا تھا، پوچھا: "اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

نکودار نے جواب دیا: "یہ خوبصورت لڑکیاں جنھیں لباس اور زیورات سے آراستہ کر کے پدرِ بزرگوار کی قبر میں اتار دیا جائے گا۔ میرے خیال میں یہ ہماری ہمدردیوں اور ہمارے رحم کی مستحق ہیں، انھیں زندہ رہنا چاہیے۔ انہیں قبر میں دفن نہ کیا جائے۔"

ارغون نے سر سے پاؤں تک اپنے ولی عہد بھائی کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

نکودار نے پوچھا: "میں نے جو کچھ کہا ہے بالکل صاف صاف اور واضح ہے کیا تم میری بات سن نہیں سکے؟"

ارغون نے کہا: "آپ کیا چاہتے ہیں: ان ساری لڑکیوں کو چھوڑ دیا جائے جو قبر میں پدرِ بزرگوار کی خدمت کے لیے دفن کی جا رہی ہیں۔"

نکودار ارغون کی کوتاہ عقلی سے پریشان ہو رہا تھا: "میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں ارغون کیا تم بھی اس پر یقین رکھتے ہو یہ لڑکیاں دوسری دنیا میں والد کی خدمت کریں گی؟"

ارغون نے جواب دیا: "اس میں یقین یا شک و شبہ کی کیا بات ہے۔ میں اپنی قوم کی طرح اس پر پختہ یقین رکھتا ہوں۔"

نکودار کو ارغون کی باتیں اور زیادہ حیرت زدہ کر رہی تھیں۔ پھر پوچھا: "یعنی تم اس پر یقین رکھتے ہو؟"

ارغون نے جواب دیا: "یہ ہماری آبائی رسمیں ہیں۔ ہم انہیں کیونکر چھوڑ سکتے ہیں آپ کو منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔"

نکودار نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی: "دیکھو ارغون! اب ہم تمدن اختیار کر چکے ہیں۔ متمدن دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ متمدن لوگ ہماری ان رسموں پر ہنستے ہیں ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمیں ان رسموں کو ترک کر دینا چاہیے۔"

ارغون نے جواب دیا: "ناممکن، ہم ان رسموں کو ترک نہیں کر سکتے یہ ہماری آبائی رسمیں ہیں اور ہمارے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کے عہد سے چلی آ رہی ہیں ہم انہیں کیونکر ترک کر سکتے ہیں۔"

نکودار نے کہا: "ارغون! تم میرا ساتھ دو، میں اس رسم کو آج ہی سے اڑا دینا چاہتا ہوں۔"

ارغون نے انکار کر دیا: "میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

نکودار نے اصرار کیا: "میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر اچھی طرح سوچو، غور کرو۔ اس کے بعد انکار یا اقرار کرو۔"

ارغون نے جواب دیا: "میں اس پر غور کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

نکودار نے افسوس کیا: "میری خواہش تو یہی تھی کہ اس بڑے اور غیر معمولی کام میں تمہیں بھی شریک کروں مگر افسوس کہ تم اس میں شامل نہیں ہونا چاہتے بہر حال میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس رسم کو آج ہی سے اڑا دوں۔"

ارغون نے جواب دیا: "اور میں اس کی مخالفت کروں گا آپ ایسا نہ کریں۔"

نکودار نے کہا: "میں ایسا کر کے رہوں گا۔ میں دیکھتا ہوں مجھے ایسا کرنے سے کون روکتا ہے۔"

ارغون نے نہایت تحمل سے کہا: "بھائی نکودار! آپ یہ نہ کریں قوم آپ کی یہ بات نہیں مانے گی۔"

نکودار نے جواب دیا: "قوم یہ بات ضرور مانے گی اور میں اس سے منوا کر رہوں گا۔"

ارغون یہ کہہ کر الگ ہو گیا: "آپ کی مرضی، آپ جو چاہیں کریں میں کیا کر سکتا ہوں۔"

نکودار ابھی کوئی اعلان کر نہیں سکا تھا کہ وزیر شمس الدین جوینی نے اس سے پوچھا: "یہ شہزادہ ارغون سے آپ کی کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

نکودار نے جواب دیا: "میں نے اس سے یہ مشورہ کیا کہ کیوں نہ میں ان جاہلانہ رسوم کو ختم کر دوں۔ ارغون نے اس کی مخالفت کی، شدید مخالفت۔ لیکن میں آج ہی اس وحشیانہ رسم کے خاتمے کا اعلان کیے دیتا ہوں۔"

شمس الدین جوینی نے مایوسی سے کہا: "ارغون نے آپ کو صحیح

مشورہ دیا ہے آپ اپنے سارے کام جلد بازی کی نذر کر دیتے ہیں۔"

لیکن نکودار نے جوینی کی بات نہیں مانی۔"جوینی! اب میں ایل خان ہوں اور میں یہ سب پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں خود ہی فیصلے کر سکتا ہوں سب کو چونکا دینے والے فیصلے۔"

شمس الدین جوینی نے مایوسی سے کہا۔"میں آپ کو مشورہ تو دے سکتا ہوں مگر ان پر عمل کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔ خیر الامور اوسطہا۔ اعتدال میں خیر ہے، آپ جو بھی فیصلہ کریں خوب سوچ سمجھ کر اور اس کے مابعد اثرات پر غور کر کے۔"

شہزادہ ارغون نکودار کو تلاش کرتا ہوا ان دونوں کے پاس پہنچ گیا، بولا۔"ولی عہد بہادر! آپ تشریف لے چلیں تاکہ آخری رسوم اپنے انجام کو پہنچیں۔"

نکودار، شہزادہ ارغون اور شمس الدین جوینی اباقہ خان کی قبر کے پاس پہنچے تو وہاں قبر میں اتاری جانے والی لڑکیوں نے کہرام برپا کر رکھا تھا۔

سعد اللہ یہودی مسکراتا ہوا نکودار کی طرف بڑھا اور مبارکباد پیش کی۔"ولی عہد بہادر! آپ ایل خان ہو جائیں گے آپ کو میری طرف سے یہ بلند مقام مبارک۔ خدا آپ کو اس مقام کا اہل ثابت کرے۔"

نکودار نے سعد اللہ یہودی کا شکریہ بھی نہیں ادا کیا۔ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے خاندانی امرا اور سرداروں کو مخاطب کیا۔

"اہل خاندان اور معزز سردارو! ہم سب کبھی قراقرم کے خاقان کے تابع ہوا کرتے تھے جب کوئی خاقان مرتا تھا تو ہم دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوتے نئے خاقان کے انتخاب کے لیے منعقد ہونے والی قوریلتائی میں شرکت کرنے قراقرم پہنچ جاتے لیکن ادھر دو پشتوں سے ایسا نہیں ہو رہا۔ میرا دادا ہلاکو خان فوت ہوا تو اس کی جگہ میرے باپ اباقہ خان نے سنبھال لی اب میرے باپ کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ میں سنبھال رہا ہوں۔ قراقرم کی رسمیں ختم ہو رہی ہیں جو باقی ہیں وہ بھی جلد یا بہ دیر ختم ہو جائیں گی۔ پہلے ہمیں شہری تمدن کا کوئی علم نہ تھا اب ہم متمدن ہوتے جا رہے ہیں۔ تہذیب یافتہ قومیں ہماری جاہلانہ رسوم پر ہنستی ہیں، ہمارا مذاق اڑاتی ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی بعض جاہلانہ رسمیں اڑا دوں۔ چنانچہ آج تو میرے باپ اباقہ خان کی قبر میں منگول رسم و رواج کے مطابق کنواری لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جائیگا مگر آئندہ یہ رسم اڑا دی جائے گی اور میں اپنے لیے اس رسم کو منسوخ کرتا ہوں۔ آئندہ کسی بھی حکمراں کی قبر میں کنواری جوان لڑکیاں نہیں دفن کی جائیں گی۔"

کچھ دیر اس اعلان کے بعد سناٹا طاری رہا مگر پھر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

سعد اللہ یہودی نے شہزادہ ارغون سے سرگوشی میں کہا۔"شہزادے! نکودار سے غلطی ہو گئی، اب آپ اپنی قوم کو اعتماد میں لے سکتے ہیں۔"

ان دونوں سے ذرا دور ایک سردار نے دوسرے سے کہا۔"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب ہماری شناخت ہی ختم ہو جائے گی۔"

دوسرے نے جواب دیا۔"شاید اب ہم منگول نہیں رہے آہستہ آہستہ ہم اپنی جملہ روایات سے محروم کر دیے جائیں گے۔"

کسی تیسرے نے اپنی رائے پیش کی۔"یہی وجہ ہے کہ اب ہم بزدل ہوتے جا رہے ہیں اور ہم نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے اس سے محروم ہو جائیں گے۔"

ایک سردار نے دخل دیا اور باآواز بلند کہا۔"ولی عہد بہادر! یہ موقع اس اعلان کا نہیں تھا۔"

شہزادہ ارغون چپ چاپ آگے بڑھا اور حکم دیا۔"لڑکیوں کو قبر میں اتار کر آخری رسم ادا کر دی جائے۔"

منگولوں کا ایک دستہ آگے بڑھا اور اس نے نوجوان لڑکیوں کو زبردستی قبر میں اتار دیا اور قبر کا منہ بڑی تیزی سے بند کر دیا گیا۔ لڑکیوں کی چیخ پکار کی آوازیں قبر کا منہ بند ہونے تک آتی رہیں جو آخر میں بند ہو گئیں۔

آخر میں اباقہ خان کے گھوڑے کو ذبح کر دیا گیا اور اس کے خون سے اباقہ خان کی قبر پر چھڑکاؤ کیا گیا۔

اس ہجوم میں شہزادہ ارغون نے سونجاق کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور سونجاق کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔"تجھے یہاں نہیں آنا تھا۔"

سونجاق نے جواب دیا۔"ارغون! اس وقت میں تیرا مہمان ہوں اور تیرے باپ کی آخری رسوم میں شرکت کرنے چلا آیا ہوں۔"

شہزادہ ارغون سونجاق کو ذلیل کرنا چاہتا تھا مگر وہ اپنے مہمان کو کس طرح ذلیل کر سکتا تھا، کہا۔"مگر اب تیرا کام ختم ہو گیا اور تجھ کو یہاں سے فوراً چلا جانا چاہیے۔"

سونجاق نے کہا۔"اگر نکودار بھی مجھے یہی حکم دے گا تو میں فوراً چلا جاؤں گا۔"

شہزادہ ارغون بہت جز بز ہو رہا تھا، اس کے ساتھ سعد اللہ یہودی بھی تھا، اس نے شہزادے کو سمجھایا۔"شہزادے! آپ عجلت میں ویسی ہی غلطی کر رہے ہیں جیسی ولی عہد بہادر کر چکے ہیں۔"

شہزادہ ارغون جیسے ہوش میں آ گیا۔ بولا۔"بیشک تو میرا مہمان ہے جب تک تو رہنا چاہے رہ مگر خبردار جو یہاں ترمہ شیرین کا ذکر کیا۔"

سونجاق نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔"میرے پاس تیری ان فضول اور بے سروپا باتوں کا کوئی جواب نہیں اب میں چلتا ہوں۔"

وہ شہزادہ ارغون کو حیران کر کے چلا گیا۔

سعد اللہ یہودی نے شہزادے کو سمجھایا۔"شہزادے! جذباتی نہ

بیٹھیے کیونکہ مشتعل ہو جانے والا ایک جذباتی انسان ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔"

شہزادہ ارغون نے کہا۔ "میں نے ترمہ شیریں کی خاطر سوبخاق سے جنگ کی ہے چنانچہ جب بھی میں اس کی شکل دیکھوں گا۔ آپے سے باہر ہو جاؤں گا۔ میں کیا کروں مجبور ہوں۔"

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ "اشتعال کی حدت صحیح غور و فکر اور قوت فیصلہ کو جلا دیتی ہے دنیا کے بیشتر بڑے لوگ اپنی اسی خامی کی وجہ سے ناکام ہوئے ہیں۔"

اب شہزادہ ارغون کو ترمہ شیریں کی یاد ستا رہی تھی وہ اسے جلد از جلد اپنے قبضہ میں لانا چاہتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں سعد اللہ یہودی سے مشورہ کیا۔ "آپ مجھے مشورہ دیں کہ ترمہ شیریں کو میں کس طرح اپنے قبضہ میں لاؤں؟"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ "ترمہ شیریں پر پہلا حق نکودار کا ہے، اگر وہ اس سے دستبردار ہو جائے تو پھر آپ کا حق ہو جاتا ہے۔"

شہزادہ ارغون کو سوبخاق کی طرف سے فکر تھی، کہا۔ "سعد اللہ! یہ سوبخاق کی آمد خالی از علت نہیں ہے کہیں اس کی آمد کسی سازش کا نتیجہ نہ ہو۔"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ "شہزادے! آپ کے سامنے ایک بڑا مقصد ہے آپ اپنے اس مقصد کو ترمہ شیریں پر قربان نہ کر دیجیے۔"

شہزادہ خاموش ہو گیا مگر ترمہ شیریں کے لیے اس کا دل تڑپ رہا تھا۔

ولی عہد نکودار اباقہ خان کی جگہ برسر اقتدار آ گیا شمس الدین جوینی کو وزارت کے منصب پر برقرار رکھا گیا شہزادہ ارغون کی جملہ عساکر کی سپہ سالاری بحال رہی۔ ارغون شاہی محل میں گھوم پھر کر ترمہ شیریں کو تلاش کرتا رہا مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ خدمت گار خواتین نے بس اتنی نشاندہی ہی کر دی کہ انھوں نے ترمہ شیریں کو آخری بار اباقہ خان کی میت کے قریب دیکھا تھا۔

بالکل مایوس ہونے کے بعد اس نے نکودار سے ترمہ شیریں کی بابت معلوم کیا۔ نکودار نے لاعلمی ظاہر کی۔

شہزادہ ارغون نے کہا۔ "میں ترمہ شیریں کو تلاش کروں گا۔ وہ کہیں نہیں جا سکتی مگر اس سے پہلے میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

نکودار نے کہا۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ارغون نے کہا۔ "جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ باپ کی موت کے بعد منگول قانون بیٹوں کو یہ حق دیتا ہے کہ اس کی بیویوں کو اپنی بیوی بنا لیں۔"

نکودار نے ناگواری سے کہا۔ "ہاں منگول قانون بیٹوں کو یہ حق دیتا ہے!"

ارغون نے پوچھا۔ "پھر آپ نے اپنے لیے کس کس کو پسند کر لیا ہے؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "کسی کو بھی نہیں۔"

ارغون نے کہا۔ "پھر اگر میں ترمہ شیریں کو اپنی بیوی بنا لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

نکودار کی پیشانی پر بیزاری سے شکنیں پڑ گئیں۔ "ارغون! جیسا کہ میں نے تمہارے باپ کی آخری رسوم کی ادائیگی کے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ اب میں بہت ساری جاہلانہ رسوم کو منسوخ کرنے والا ہوں، ان میں مرنے والوں کی بیواؤں کی رسم سرفہرست ہے۔"

ارغون نے اختلاف کیا وہ پُرزور لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ ایسا نہیں کریں گے۔ ہماری قوم اس تبدیلی کو قبول نہیں کرے گی۔"

نکودار اپنی بات پر اڑا رہا۔ "مگر میں وہی کروں گا جو میری قوم کے لیے مفید ہوگا۔"

ارغون نے باغیانہ روش اختیار کی۔ "میں خود آپ کی اس تبدیلی کو نہیں مانوں گا۔"

نکودار نے صاف صاف اعلان کر دیا۔ "اور ایک بات اور سن لو۔ مسلمانوں کا طاقتور تمدن اور مذہب ہمیں مسخر کرتا جا رہا ہے، ہماری قوم کے لوگ ان کے لباس اور کھانے کھانے لگے ہیں، ان کی زبان بولنے لگے ہیں۔ اسلام کا ایک ضابطۂ اخلاق ہے، ایک نظام زندگی ہے منگولوں سے ارفع و اعلیٰ، ہم جلد یا بدیر اسلام کے ہاتھوں مسخر ہو جائیں گے چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جو کل ہونے والا ہے اسے آج ہی ہو جانا چاہیے۔ اگر ہمیں یہاں حکومت کرنا ہے تو ہمیں انہیں جیسا بن جانا چاہیے۔" پھر نہایت مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا۔ "میں خود کر رہا ہوں اور کل رسمی یہ اعلان کر دوں گا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اب میں مسلمان ہوں اور میرا اسلامی نام احمد خان ہے۔ نکودار احمد خان۔"

ارغون اس اعلان سے تڑپ گیا بولا۔ "یہ آپ نے دوسری غلطی کر دی۔ قوم آپ کے اس فیصلے کو نہیں مانے گی۔"

نکودار احمد خان نے جواب دیا۔ "نہ مانے مگر میں خود مطمئن ہوں کہ میں نے ایک صحیح فیصلہ کیا ہے۔"

ارغون نے پوچھا۔ "آپ اپنے اس فیصلے سے قوم کو کب مطلع کریں گے؟"

نکودار احمد خان نے جواب دیا۔ "کل، کل صبح۔ اور اس وقت میں اپنی قوم کے سامنے اسلام پیش کروں گا۔ میرا خیال ہے میری قوم اس فیصلے سے اتفاق کرے گی، اور بہت زیادہ لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔"

ارغون نے اچانک نئی روش اختیار کی۔ بولا۔ "اگر میری قوم نے آپ کے فیصلے سے اتفاق کیا تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا۔"

نکودار نے ارغون کو بہلانے کی کوشش کی "ارغون! میرے بھائی! پہل ہم ہی کو کرنا ہوگی میرے ساتھ تم بھی مسلمان ہو جاؤ تاکہ ہماری قوم ہماری تقلید میں مسلمان ہو جائے۔"

ارغون نے انکار کر دیا "نہیں میں اتنی جلدی ہی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

نکودار بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر بندھے تھے، بولا "بہرحال کل ہی سہی، میں تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔"

ارغون بڑے بھائی کے پاس سے بہت فکرمند اور اداس نکلا۔

اس نے محل کی خدمت گار خواتین سے ایک بار پھر ترمہ شیریں کی بابت کئی سوال کیے مگر ان کے جوابوں سے ترمہ شیریں کا کوئی سراغ نہ لگ سکا۔ آج نکودار نے جو انکشاف کیا تھا، اس نے ارغون کے دل و دماغ میں ایک انقلاب ایک ہیجان سا برپا کر رکھا تھا۔ وہ محل سے نکل کر سیدھا سعداللہ یہودی کے پاس پہنچا اور ساری باتیں اس کے علم میں لے آیا، اس نے پوچھا "اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

سعداللہ یہودی بہت خوش تھا، بولا "شہزادے! اب منزل زیادہ دور نہیں ہے نکودار نے ایک اور غلطی کی۔"

ارغون اور سعداللہ یہودی آپس میں دیر تک صلاح مشورے کرتے رہے، ان دونوں کے چہروں پر شگفتگی اور تازگی پیدا ہو چکی تھی۔

دوسری طرف نکودار تشویش اور تذبذب لیے شمس الدین جوینی کے پاس پہنچا اور کہا "وزیر محترم! میں نے اپنے اسلام کے لیے کل کا دن لے لیا ہے۔ میں اب زیادہ وقت کا انتظار نہیں کروں گا۔"

شمس الدین جوینی نے کہا "شہزادے! آپ نے اس اعلان میں بھی عجلت سے کام لیا ہے، خدا ہم پر رحم فرمائے۔"

نکودار نے ادھر ادھر دیکھ کر اعلان کیا "میں مسلمان ہو چکا ہوں وزیر محترم!"

شمس الدین جوینی معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا، اس کو نکودار کے قبول اسلام سے خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ فکرمند ہو گیا تھا۔

نکودار نے پوچھا "آپ کیا سوچنے لگے وزیر محترم!"

شمس الدین جوینی نے جواب دیا "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اسلام آپ کو راس آئے گا یا نہیں۔"

نکودار نے جواب دیا "آپ اس طرح نہ سوچیں وزیر محترم۔ اسلام نہ صرف مجھے بلکہ میری پوری قوم کو راس آئے گا میں جانتا ہوں۔"

شمس الدین جوینی نے کہا "اب میں بہت زیادہ بوڑھا ہو چکا ہوں اس لیے اگر آپ مجھ کو سبکدوش کر دیں تو میں بہت زیادہ شکر گزار ہوں گا۔"

نکودار اپنے فیصلے پر سختی سے قائم تھا، "کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے مگر میں اسلام کو ترک نہیں کروں گا۔"

شمس الدین جوینی نے باآواز بلند آمین کہہ کر نکودار کو کسی حد تک خوش کر دیا۔

نکودار کو معلوم تھا کہ اس نے جو خبر شہزادہ ارغون کو دی ہے اس کو بہت جلد ایک ایک فرد کی زبان پر ہونا چاہیے۔

وہ رات کو اپنے محل میں ہر شخص سے ملنے کے لیے چل پڑا۔

سب سے پہلے اس کی ملاقات اباقہ خان کی اس بیوی سے ہوئی جو اباقہ خان سے بڑی مگر حسین تھی، اس نے نکودار کو روک لیا اور سختی سے پوچھا "میں نے سنا ہے تو مسلمان ہو گیا ہے؟"

نکودار نے جواب دیا "ہاں اب میں نکودار احمد خان ہوں۔"

عورت نے ہنس کر کہا "اور تو نے ہی اباقہ خان کی قبر میں لڑکیوں کو بھیجنے سے منع کیا تھا؟"

نکودار نے جواب دیا "ہاں میں نے ہی اس جاہلانہ رسم کی منسوخی کا اعلان کیا تھا۔"

عورت نے کہا "سیدھی سادی حکومت کر۔ یہ تو کن چکروں میں پڑ گیا ہے تو اپنے باپ دادا کی رسموں کو ختم کرنے والا ایک دن خود بھی ختم ہو سکتا ہے۔"

نکودار نے سختی سے کہا "مجھے اس کی پروا نہیں، میں اصلاح کر کے رہوں گا۔"

وہ آگے بڑھ گیا، آگے ایک منگول بڑی بوڑھی نے روک لیا پوچھا "اب تو خان بن گیا ہے، تیرا تو یہ فرض تھا کہ اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتا مگر تو نے غیروں کی راہ اختیار کی، جاودانی نیلا آسمان تجھ پر رحم کرے۔"

نکودار نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گیا۔ خدمتگار اور پہرے دار اس کو دیکھ دیکھ کر سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

یہیں ایک جگہ شہزادہ سونجاق مل گیا، اس نے پُرجوش لہجے میں کہا "محترم ایل خان! اچھا ہوا جو آپ خود یہاں تشریف لے آئے ورنہ صبح میں خود حاضری دیتا۔"

نکودار نے پوچھا "کیوں، کوئی خاص بات؟"

سونجاق نے جواب دیا "پورے محل میں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ آپ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔"

نکودار نے کہا "یہ افواہ نہیں حقیقت ہے، میں نے واقعی اسلام قبول کر لیا ہے۔"

سونجاق نے نکودار کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا "کیا سچ؟"

نکودار نے جواب دیا "ہاں سچ۔ میں متمدن قوموں کے سامنے خود کو کمتر سمجھنے لگا تھا۔"

سونجاق نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں سکا، بولا "بہرحال ان تمدنیوں کو یہاں بڑی اہمیت دی جا رہی ہے اور یہاں کوئی شخص

ایسا ضرور ہے جو انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔"

نکودار نے کہا: "میں اس شخص کو پہچانتا ہوں۔ اب کوئی اور بات کرو۔"

سونجاق نے جواب دیا: "میں تو آپ لوگوں کا مہمان ہوں، آج ہوں کل چلا جاؤں گا مگر یہاں کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ کچھ بھی کسی وقت ہو سکتا ہے آپ کو ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔"

نکودار نے موضوع ہی بدل دیا: "اور شہزادے! تم نے ترمہ شیریں کی بابت کچھ نہیں پوچھا۔"

سونجاق نے جواب دیا: "ترمہ شیریں کی بابت میں کیا پوچھوں وہ تو یہاں ہے ہی نہیں، وہ چلی کہاں گئی؟"

نکودار نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے مگر میں بتاؤں گا نہیں۔"

سونجاق نے پوچھا: "کیا اس کو بیوی بنانے کا ارادہ ہے؟"

نکودار ناراض ہو گیا: "جب میں مسلمان ہو چکا ہوں تو پھر میں اپنی ماں سے شادی کس طرح کروں گا؟"

سونجاق نے خوش ہو کر نکودار کو گلے لگا لیا: "تو بہت عظیم ہے، نکودار تو شاندار انسان ہے۔"

نکودار نے سونجاق کو الگ کیا اور آہستہ سے کہا: "جب تم واپس جانا تو ترمہ شیریں کو اپنے ساتھ لیتے جانا۔"

سونجاق ایک دم اتنی بڑی خبر سن کر اپنے آپ میں نہیں رہا۔ زور سے بے اختیار پوچھا: "ترمہ شیریں ہے کہاں؟"

نکودار نے کہا: "آہستہ آہستہ۔ ذرا نیچی آواز میں بولو، وہ جہاں کہیں بھی ہے تمہیں مل جائے گی۔"

سونجاق نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا: "لیکن شہزادہ ارغون ایسا ہونے کب دے گا؟"

نکودار نے سختی سے کہا: "مگر میں یہ بھی نہیں ہونے دوں گا کہ میری ماں میرے بھائی کی بیوی بنے۔"

سونجاق نے نکودار کے کان کے قریب اپنا منہ لے جا کر کہا: "بھائی نکودار! آپ خطرے میں ہیں۔ اگر میں کبھی بھی آپ کے کسی کام آسکا تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اب میں آپ کا پابند ہو گیا ہوں جب کہیں گے چلا جاؤں گا۔"

نکودار نے آہستہ سے کہا: "تھوڑے صبر کر صبر۔ پہلے میں محل اور اس کے باسیوں کا جائزہ تو لے لوں۔"

نکودار آگے بڑھ گیا۔ وہ محل میں کئی گھنٹے رہا اور ہر جگہ روک کر ہر شخص نے اس سے ایک ہی سوال کیا۔ کہ۔ "وہ مسلمان ہو گیا ہے؟ کیا وہ اپنی قوم کو مسلمان ہونے کی دعوت دے گا؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے اپنے آباؤ اجداد کو کیوں چھوڑ دیا اور اس طرح وہ چاہتا کیا ہے؟"

ان سارے سوالات کے جواب اس کے پاس تھے لیکن وہ خان تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کسی کی بات کا جواب دے یا نہ دے چنانچہ اس نے زیادہ تر سوالات کے جواب دیے ہی نہیں۔

محل کا سب سے آخری شخص ایک بوڑھا چوکیدار تھا جب اس نے نکودار کو دیکھا تو تلملا گیا۔ کئی بار اس کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ اس سے سیدھی طرح بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ نکودار نے اس کی اضطراری حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ بوڑھا چوکیدار اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے چنانچہ اس نے خود ہی پوچھ لیا: "کیوں بڑے صاحب! آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟"

بڑے میاں نے جواب دیا: "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی زبان کھولوں۔"

نکودار نے اس کو بآسانی اجازت دے دی۔

بڑے میاں نے کہا: "میں نے آپ کی بابت ایک خبر سنی ہے۔ اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا ہوں کہ خدا کرے وہ خبر غلط ہو۔"

نکودار نے بات کو الجھانا پسند نہیں کیا، صاف صاف کہہ دیا۔ "حضرت! میں بحمداللہ مسلمان ہو چکا ہوں۔"

بڑے میاں نے بڑے دکھ سے کہا: "مگر ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ خدا آپ کو جملہ آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے۔"

نکودار نے ایک بار پھر زور سے کہا: "آمین۔"

نکودار احمد خان نے محل کی فضا سے یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ اس کے خلاف ورغلانے اور بے سروپا باتیں پھیلانے کی مہم شروع ہو گئی ہے یہ کام کون کر رہا ہے وہ خوب جانتا تھا۔ اس نے محل میں رکنا فضول جانا اور وہ اباقہ خان کے خاص محل میں چلا گیا۔ اب یہ محل نکودار کے تصرف میں تھا۔ یہاں سے آدمی بھیج کر اس نے وزیر شمس الدین جوینی کو طلب کیا کیونکہ اب ان نازک لمحات میں جوینی سے مشورہ ضروری ہو گیا تھا۔

شمس الدین جوینی جہاں رہتا تھا وہ جگہ محل سے دور تھی اور محل اور جوینی کی رہائش گاہ کے درمیان چھاؤنی حائل تھی۔ شمس الدین جوینی اپنے گھوڑے پر سوار محل جا رہا تھا۔ جب وہ چھاؤنی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ تو اس نے چھاؤنی میں شہزادہ ارغون اور سعداللہ یہودی کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا وہ دونوں بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ شمس الدین جوینی کے گھوڑے کی آہٹ نے ان دونوں کو جوینی کی طرف متوجہ کر دیا۔ شہزادہ ارغون نے جوینی کو دیکھا اور سعداللہ یہودی سے کچھ کہا پھر دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کا رخ جوینی کی طرف کر دیا۔ جوینی نے ان دونوں کو اپنی طرف

آتے جو دیکھا تو گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

دونوں وزیر کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔

شہزادہ ارغون نے کھسیائے کھسیائے لہجے میں کہا "وزیر محترم! غالباً آپ خان نکودار خان کے پاس جا رہے ہوں گے۔"

شمس الدین جوینی نے جواب دیا "ہاں مجھے محل میں اسی وقت طلب فرمایا گیا ہے۔"

شہزادہ ارغون نے کہا "اچھا ہوا جو آپ یہاں مل گئے ورنہ ہم دونوں آپ کو مبارکباد دینے کے لیے آنے والے تھے۔"

جوینی نے پوچھا "کس بات کی مبارکباد؟"

شہزادے نے جواب دیا "نکودار نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اب وہ نکودار احمد خان بن چکا ہے۔"

جوینی نے کہا "اگر یہ درست ہے تو نکودار کی یہ دوسری بڑی غلطی ہے ایک صحیح کام غلط وقت پر کیا گیا۔"

سعد اللہ یہودی اور شہزادہ ارغون ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

شہزادے نے کہا "اس وقت آپ نکودار کے پاس جا رہے ہیں شاید۔"

جوینی جھوٹ نہیں بول سکا۔ "میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں محل جا رہا ہوں۔"

شہزادے نے کہا "آپ نکودار احمد خان سے کہہ دیجیے گا کہ اس کا یہ فیصلہ غلط ہے قوم اس کی اس غلطی کو نظر انداز نہیں کرے گی۔"

جوینی نے شہزادے کو یاد دلایا "شہزادے! جس کو تم نکودار احمد خان کہہ رہے ہو، اب وہ ہم سب کا خان ہے، اباقہ خان کا جانشین ایل خان آپ اس کی عزت کریں تاکہ دوسرے بھی عزت کریں۔"

شہزادہ ہنسنے لگا "عزت تو انسان خود کراتا ہے میں صرف نکودار کی عزت تو کر سکتا ہوں مگر احمد خان کی نہیں۔"

جوینی نے اپنے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی مگر شہزادہ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا کر اس کے سامنے آ گیا، بولا "ہاں مجھے ایک اور بات بھی یاد آ گئی، احمد خان سے کہہ دینا کہ ترمہ شیریں کا کہیں پتہ نہیں چل رہا، ہمیں اس کا پتہ معلوم ہونا چاہیے۔ ترمہ شیریں جب مل جائے تو یا تو خود نکودار اسے اپنی بیوی بنا لے ورنہ اسے میرے حوالے کر دے کیونکہ میں اپنے آباؤ اجداد کی رسمیں نہیں بدل سکتا۔"

جوینی نے شہزادے کی اس آخری بات کا جواب نہیں دیا گھوڑے کو آڑا ترچھا کاٹ کر نکال لے گیا۔

نکودار اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، جوینی نے دیکھا نکودار بڑی بے چینی سے کمرے کے اندر ٹہل رہا ہے جوینی کی آہٹ نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا وہ مسکرانے لگا، بولا "وزیر محترم! میں آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔"

جوینی نے جواب دیا "میں نے آپ کے بلاوے کے ساتھ ہی روانگی اختیار کر لی تھی۔"

نکودار نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "وزیر محترم! یہ سب کیا ہو رہا ہے، یہ کون کر رہا ہے؟"

جوینی نے کہا "شہزادے نکودار! آپ کو اسلام مبارک۔"

نکودار نے حیرت سے کہا "آپ کو میرے اسلام کی بابت کس نے بتایا؟"

جوینی نے جواب دیا "شہزادہ ارغون نے۔ لیکن آپ نے یہ دوسری غلطی کی ہے۔ اے کاش آپ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ لے لیتے۔"

نکودار نے پوچھا "کیا میں نے کوئی غلط کام کیا ہے؟"

جوینی نے جواب دیا "کام تو آپ نے صحیح کیا ہے، مگر غلط وقت پر کیا ہے، صحیح کام غلط وقت پر۔"

نکودار نے برہمی اختیار کی "آپ مسلمان ہو کر میرے اسلام پر ملامت کر رہے ہیں، کیا میں دوبارہ اپنے آبائی دین میں واپس چلا جاؤں؟ کیا اسلام کو چھوڑ دوں؟"

جوینی نے جواب دیا "نہیں میری یہ منشا ہرگز نہیں، آپ کی قوم آہستہ آہستہ تو زیر۔۔۔ ہو سکتی ہے مگر ایک دم ایک ہی مرتبہ میں اچانک اس کو نہیں بدلا جا سکتا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی قوم آپ سے ناراض ہوتی جا رہی ہے۔"

نکودار جوانی کے نشے میں تھا، ترنگ میں بولا "میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے کسی کی بھی پروا نہیں، میں ایک ایک کو صحیح کر دوں گا۔ میں سب کو درست کر دوں گا۔ اور اگر ارغون یہ سمجھتا ہے کہ وہ منگول عساکر کا سپہ سالارِ اعلیٰ ہے تو وہ غلطی پر ہے اس کے سارے منصوبے پلک جھپکتے میں خاک میں مل جائیں گے۔"

جوینی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، انہیں آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "نکودار! جذباتی نہ بنیے اب بھی کچھ نہیں گیا، سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن خدا کے لیے اپنی جذباتیت کو قابو میں رکھیے۔"

نکودار نے اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کی، بولا "وہ مجھ سے براہِ راست یا بالواسطہ یہی پوچھتا رہتا ہے کہ ترمہ شیریں کہاں چلی گئی اس کو تلاش کرایا جائے کیونکہ شہزادہ ارغون اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

جوینی نے جواب دیا "شہزادہ ارغون سعد اللہ یہودی کے ہاتھوں میں تماشا بنا ہوا ہے۔"

نکودار نے کہا "مگر میں بھی کوئی معمولی یا عام آدمی نہیں ہوں، میں ان سب کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔"

جوینی نے جواب دیا "شہزادے! اب آپ حکمراں ہیں۔ لیکن جملہ عساکر شہزادہ ارغون کے قبضے میں ہیں اور خالی حکمراں بننا کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

نکودار نے کہا "اور میں ارغون کو اس کے منصب سے ہٹا کر کیخاتو خان کو سپہ سالار اعلیٰ بنا سکتا ہوں۔"

"اس وقت آپ کچھ نہ کریں، اگر آپ نے عجلت میں ایسا کیا تو تیسری خطرناک ترین غلطی کریں گے۔"

نکودار نے جوینی کو قالین پر بٹھا دیا، بولا "وزیر محترم! میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ ترمہ شیرین کو چھپا کر رکھیں، میں اس کو سونجاق کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ اس کا سونجاق سے بہتر امیدوار نہیں مل سکتا۔"

جوینی سوچنے لگا، اس تجویز کے مفید اور مضر پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ پھر بولا "بہتر ہے لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں جتنا سمجھ رہے ہیں جب سونجاق جائے گا تو شہزادہ ارغون کے آدمی تلاشی لیں گے اور اس کے پاس ترمہ شیرین کو تلاش کریں گے۔"

نکودار نے اپنا سر پکڑ لیا "یہ لوگ مجھے پاگل کر دیں گے آخر میں کروں کیا؟ اس سے کس طرح نپٹوں؟"

جوینی نے کسی شکست خوردہ کی طرح بولنا شروع کیا "افسوس کہ میں یہ بازی جیت کر بھی ہارتا جا رہا ہوں، تجویز یا منصوبہ بنانا اتنا مشکل نہیں جتنا اس پر عمل پیرا ہونا۔ سعد اللہ یہودی کامیاب ہے اور میں ناکام۔ میرا خیال ہے اب مجھ کو وزارت عظمیٰ کا منصب چھوڑ دینا چاہیے۔"

نکودار کے ہوش و حواس اڑ گئے، تڑپ کر کھڑا ہو گیا "خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے گا، میں تنہا رہ جاؤں گا۔"

جوینی نے جواب دیا "میں بالکل مجبور اور بے دست و پا ہوتا جا رہا ہوں۔"

وہ دونوں دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور دونوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کا حل کیا نکالا جائے۔ آخر جوینی ہی نے شہزادے نکودار کو مشورہ دیا "شہزادے! اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو دوں، اگر آپ اس میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر کوئی آپ کو آپ کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکے گا۔"

نکودار نے اصرار کیا "تب پھر وہ ترکیب جلد از جلد بتا دیجیے۔"

جوینی نے مشورہ دیا "شہزادے! آپ بالکل غیر جذباتی ہو جائیں اور محل سرا اور اپنے لواحقین میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دیں، اس تبلیغ کا ایک دن اثر ظاہر ہو کر رہے گا اور جب آپ کی قوم کے لوگ مسلمان ہو جائیں گے تو گویا آپ طاقتور ہو جائیں گے۔"

نکودار نے جواب دیا "یہ ترکیب میرے ذہن میں بھی تھی لیکن یہ کام میرے لیے بہت مشکل ہے بہر حال میں کوشش ضرور کروں گا۔"

جوینی کافی دیر نکودار کے پاس خلوت میں رہ کر باہر نکلا، تو منگولوں نے اسے مشتبہ انداز میں دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے "اس مسلمان نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے اگر یہ درمیان میں نہ ہوتا تو ہمارے مزے ہی مزے تھے۔"

یہاں بایدو خان اور الغو خان بھی موجود تھے۔ الغو خان نے وزیر کے چہرے پر پریشانیوں کے سائے جو دیکھے تو پریشانی میں پڑ گیا۔

جوینی اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر بایدو خان نے اس کو آواز دی اور دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور پوچھا "وزیر محترم! آج کئی دن سے نئے ایل خان سے ملاقات نہیں ہو رہی ہے۔ نصیب دشمناں وہ بیمار تو نہیں ہیں؟"

جوینی نے جواب دیا "وہ بالکل ٹھیک ہیں اور عنقریب وہ عوامی رابطہ قائم کریں گے اس وقت شاید آپ سے بھی ملاقات ہو جائے۔"

اس بار الغو خان نے زبان سنبھالی اور جوینی سے کہا "مشکل تو یہ ہے کہ جب خاندان والوں پر وقت پڑتا ہے تو اس کا اپنی زبان سے اقرار بھی کریں لیکن وہ سب تو راشی اور بے غیرت ہیں۔"

جوینی نے ہنس کر جواب دیا "افسوس کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی آپ جیسی عقل نہیں ہے ورنہ سارے مسائل چشم زدن میں حل ہو جاتے۔"

بایدو نے اپنے بھائی کو ڈانٹا "میں اسی لیے تجھ کو اپنے ساتھ نہیں لا رہا تھا۔" پھر جوینی سے کہا "وزیر محترم! آپ اس کی باتوں کا برا نہ مانیے گا۔ ورنہ میں اس وقت نئے ایل خان کے پاس چند پیش کشیں لے کر آیا ہوں۔"

جوینی نے پوچھا "کس قسم کی پیش کشیں۔"

بایدو خان نے جواب دیا "ان دنوں ایک جاہ پرست، اور مطلبی انسان نے نکودار بھائی کے خلاف ایک مہم چلا رکھی ہے۔ میں اپنی قوم اور اپنے خاندان سے اچھی طرح واقف ہوں اور ان سے میں بآسانی نپٹ سکتا ہوں۔"

جوینی نے کہا "شہزادے بایدو خان! میں بہت سی باتوں سے واقف نہیں اور نہ جانے کیوں نکودار بھی مجھ پر اعتبار نہیں کر رہا۔ آپ اگر چاہیں تو مل جل کر اپنا کام نکال سکتے ہیں۔"

بایدو خان نے کہا "میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں شہزادہ ارغون کے خلاف۔ اگر مجھ پر اعتبار کیا جائے تو۔"

جوینی اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس سے بات کرنے پر مجبور ہو گیا "بایدو خان! آپ اگر چاہیں تو واقعی نکودار کی مدد کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے بات

کرنے پر مجبور ہوں۔"

بایدو نے کہا: "میں نکودار کے پاس جا رہا ہوں اور اس کو پیش کش کروں گا، اگر وہ راضی ہو گیا تو میں اس کے لیے کام شروع کر دوں گا۔"

جوینی اپنی راہ چلا گیا اور بایدو نکودار کے پاس۔

بایدو خان نکودار کے پاس چند بُری خبریں لایا تھا لیکن نکودار کو بایدو پر اعتبار نہیں تھا اس لیے اس نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ اور اپنے بھائی کینخاتو خان کو طلب کر لیا۔ اس موقع پر شہزادہ سونجاق بھی اُن دونوں کے پاس تھا۔ سونجاق نے نکودار کو مشورہ دیا کہ اس معاملے میں جوینی کو نظر انداز نہ کریں اور اپنے ہر قسم کے مشوروں میں اس کو شریک رکھیں۔

لیکن نکودار کو اس رائے کی اصابت سے انکار تھا، جواب دیا۔ "میں کچھ دنوں سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ شمس الدین جوینی میرے ہر اقدام کی مخالفت کرنے لگا ہے۔ میں نے خان کی قبر میں زندہ دفن کی جانے والی لڑکیوں والی رسم ختم کرنا چاہی تو جوینی نے کہا یہ میری بدترین غلطی ہے پھر جب میں نے اسلام قبول کیا تو اس نے کہا کہ یہ میری دوسری بدترین غلطی ہے اس نے مزید کہا کہ یہ صحیح کام کا غلط وقت تھا، پھر تم ہی بتاؤ میں اس سے کیا مشورہ کروں اور اس کا مشورہ کہاں تک صائب ہو سکتا ہے؟"

کینخاتو خان نے جوینی کی تائید کی۔ "بھائی نکودار! اس نے آپ کے اقدام کو غلط نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ صحیح کام جو غلط وقت پر کیا گیا۔ آپ جوینی کو چھوڑ کر تنہا رہ جائیں گے۔"

سونجاق نے بھی کینخاتو خان کی تائید کی۔ "آپ نے شہزادہ ارغون کو سپہ سالارِ اعلیٰ بنا کے سخت غلطی کی ہے آپ پہلے اس غلطی کا ازالہ فرمائیں اس کے بعد کچھ اور کریں۔"

کینخاتو خان نے کہا: "اور آپ جو کچھ بھی کریں جوینی سے مشورہ کر کے کریں، اس کو الگ نہ رکھیں۔"

نکودار نے جواب دیا: "تب پھر میں اس کو بلواتا ہوں۔ آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کر لیں۔"

سونجاق نے کہا: "اب تو کام جاری رہنا چاہیے۔ یہ آرام کا وقت نہیں ہے۔"

کینخاتو خان نے ایک خدمت گار خاتون کو حکم دیا کہ وہ جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو وزیر جوینی کو حاضر کیا جائے۔

خدمت گار خاتون اسی وقت چلی گئی۔

جوینی کی آمد سے پہلے بایدو خان کا بھی ذکر چھڑا۔ نکودار نے کہا: "بایدو بھی آیا تھا غالباً اس کے ساتھ اس کا بھائی الغو بھی تھا۔ مگر چونکہ میں اسے شک و شبے کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں اس لیے اس سے ملاقات نہیں کی اور یوں ہی چلتا کر دیا۔"

سونجاق نے کہا: "یہ آپ نے اچھا نہیں کیا اس سے اس کے شوق کی آگ اور بھڑکے گی اور پھر یہی شوق آتش انتقام میں بدل جائے گا۔"

نکودار نے پوچھا: "شوق کیسا؟ کس قسم کا شوق؟"

سونجاق نے جواب دیا: "نئے ایل خان سے ملنے کا شوق۔"

نکودار خاموش ہو گیا، اس پر الجھنوں اور پریشانیوں کی یلغار تھی، کچھ دیر بعد پوچھا: "پھر کیا بایدو کو بلوا لینا چاہیے؟"

سونجاق نے جواب دیا: "ضرور بلوا لیجیے اس کی باتوں سے یہ تو اندازہ ہو ہی جائے گا کہ وہ آپ کے لیے مخلص ہے یا دھوکے باز۔ باتیں سب کچھ بتا دیتی ہیں۔"

نکودار نے بایدو خان کو بھی طلب کر لیا۔

کافی دیر بعد بایدو اور الغو تو پہلے آ گئے مگر جوینی کو آنے میں دیر لگی، لیکن جوینی نے آتے ہی حیرت سے پوچھا: "شہزادے! ابھی تو میں گیا تھا یہاں سے پھر یہ دوبارہ طلبی کیوں؟"

نکودار نے اپنے بھائی کینخاتو خان اور سونجاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "میں چند اہم قدم اٹھانا چاہتا ہوں لیکن آپ کے مشورے اور تائید کے بعد۔ اسی لیے میں نے آپ کو دوبارہ طلب کیا ہے۔"

جوینی نے نکودار کی بات سنی ان سنی کر دی، بولا: "بایدو خان نے کچھ بتایا؟ پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔"

نکودار نے جواب دیا: "بایدو خان تو ابھی آئے ہیں، ابھی ان سے بات نہیں ہوئی۔"

جوینی نے بایدو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا: "لیکن جناب آپ تو کافی دیر کے آئے ہوئے ہیں، جب میں یہاں سے جا رہا تھا تو آپ یہاں داخل ہو رہے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

بایدو نے جواب دیا: "لیکن اس وقت مجھے شرف باریابی حاصل نہیں ہوا تھا اور میں واپس چلا گیا تھا۔"

جوینی نے کہا: "بہت خوب۔ اس وقت آپ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ آپ چند بُری اور اہم خبریں۔۔۔۔"

لیکن بایدو نے بات کاٹ دی، بولا: "اس سے زیادہ بُری خبر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہماری قوم نکودار کی اصلاح قبول نہیں کر رہی اور وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ کیا نکودار احمد خان اب اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو عطا فرمائیں گے؟"

نکودار نے جلدی جلدی جواب دیا: "ہاں، میں اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو تفویض کر دوں گا لیکن اُن مسلمانوں کو جو منگول ہیں اور مسلمان ہو جائیں گے۔"

جوینی دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ اس نے نکودار سے پوچھا: "آپ نے

مجھے کیوں بلایا ہے؟"

نکودار نے جواب دیا "مشورے کرنے۔"

جوینی نے کہا "پھر آپ فیصلے نہ سنائیں پہلے مشورہ کریں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔"

نکودار نے کہا "لیکن میں نے ابھی تک تو کوئی اپنا فیصلہ سنایا نہیں۔"

جوینی نے جواب دیا "ابھی ابھی آپ نے بایدو خان کے سوال کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ آپ اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو دیں گے، اُن مسلمانوں کو جو منگول ہیں اور مسلمان ہو جائیں گے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ آپ ایسا نہیں کریں گے اور اگر ایسا کریں گے تو یہ آپ کی تیسری بڑی غلطی ہوگی۔"

نکودار نے کیغا تو خان اور سونجاق کی طرف دیکھا "میں کیا کہتا تھا۔ جوینی کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ میری غلطیاں پکڑنے لگا ہے۔"

جوینی نے جواب دیا "اگر آپ ایسا سمجھنے لگے ہیں تو یہ میری بدقسمتی ہے ورنہ میں ہمیشہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتا رہا ہوں۔"

نکودار نے پوچھا "اگر میں اعلیٰ مناصب مسلمانوں کو دوں گا تو کیا غلط کام کروں گا؟"

جوینی کو جوش آگیا "شہزادے! عہدے اور مناصب اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر ملتے ہیں یا تعصب کی بنیاد پر، اگر اس کی بنیاد تعصب پر ہوتی تو آپ کے دادا اور والد مجھے وزارت کا منصب نہ دیتے کیونکہ میں مسلمان ہوں اور آپ کے دادا اور والد مسلمان نہیں تھے۔ جب آپ کے اس تعصب سے مستحقین کی حق تلفی ہوگی تو اس سے بے چینی بڑھے گی اور جب بے چینی بڑھے گی تو حکومت کمزور ہونے لگے گی۔"

بایدو خان جوینی کی باتوں سے سب سے زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا اُس نے جوینی سے کہا "وزیر محترم! آپ بلاشبہ انسان اور بلا کے ذہین انسان ہیں۔ خوب۔"

شہزادہ سونجاق نے کہا "جوینی! اگر آپ پسند کریں تو چغتائی خاندان آپ کو وزارت کا منصب پیش کر سکتا ہے۔"

کیغا تو خان نے کہا "نہیں شہزادہ سونجاق! یہ ہماری آبرو ہیں ہم نہیں کس طرح جدا کریں گے۔"

جوینی نے بایدو سے پوچھا "ہاں تو بایدو خان! آپ شہزادہ نکودار کی کس طرح مدد کریں گے؟"

بایدو نے کہا "آپ جس طرح چاہیں گے میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

نکودار نے پوچھا "بایدو خان! آخر تو نے کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔"

بایدو اپنے دل کی بات کرتے ہچکچا رہا تھا، بولا "میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں پھر کسی وقت کہہ دوں گا لیکن اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ خود کو برسرِ اقتدار رکھنا چاہتے ہیں تو عساکر کا سپہ سالارِ اعلیٰ کسی اور کو بنانا ہوگا، کسی ایسے شخص کو جو آپ کا وفادار ہو، جس کی وفاداری اٹل ہو۔"

نکودار اس تجویز پر اچھل پڑا، بولا "یہی تجویز تو میں نے سوچی تھی۔ خوب خوب۔"

لیکن جوینی نے اس کی بھی مخالفت کی، بولا "شہزادے نکودار! میں کہتا ہوں آپ ایسا سوچیں بھی نہیں، آپ یہ غلطی نہیں کریں گے۔ خود اباقہ خان نے شہزادہ ارغون کو سپہ سالار بنایا تھا۔ ہم ارغون کو کس طرح اس کے منصب سے ہٹا سکتے ہیں۔"

کیغا تو خان نے پوچھا "پھر ہم اس آگ کو کس طرح بجھائیں جو اندر ہی اندر کہیں سلگ رہی ہے۔ اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اوپر نمودار ہونے والا دھواں کہاں سے نکل رہا ہے۔"

جوینی نے جواب دیا "آپ سب یکجا ہو جائیں جب تک دور دور رہیں گے، اختلافات بڑھتے رہیں گے۔ آپ دونوں شہزادہ ارغون سے اس کے محل میں جا کر ملاقات کریں اور اس سے پوچھیں کہ وہ آپ سے برگشتہ کیوں ہے؟"

نکودار نے جواب دیا "اگر اس طرح یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو میں شہزادہ ارغون سے مل لوں گا۔"

لیکن بایدو نے سرد مہری سے کہا "لیکن میرا خیال ہے کہ اس طرح معاملہ نہیں بنے گا اور شہزادہ ارغون اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے گا کہ شاید شہزادہ نکودار کمزور پڑ گئے ہیں۔"

جوینی نے کہا "اگر شہزادہ ارغون یہ سمجھے گا تو دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ اس سے بہتر ہے کہ الٹے سیدھے اقدام سے اختلافات کی خلیج کو اور زیادہ بڑھا دیا جائے۔"

بایدو خان نے پوچھا "وہ ترمہ شیریں کا کیا چکر ہے؟"

نکودار نے جواب دیا "ترمہ شیریں کا کوئی چکر نہیں۔ والد کی موت کے بعد سے وہ غائب ہے جب وہ مل جائے گی تو اس کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر دیا جائے گا۔"

بایدو نے کہا "لیکن مشہور تو یہ ہے کہ اس کو آپ ہی لوگوں نے کہیں چھپا دیا ہے۔"

کیغا تو خان نے کہا "اس کو ہم کیوں چھپائیں گے! یہ ہم پر الزام ہے۔"

بایدو نے کہا "یہ الزام نہیں حقیقت معلوم ہوتی ہے چونکہ نکودار نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ منگولوں کی جاہلانہ رسوم کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ترمہ شیریں اباقہ خان کی بیوی یا محبوبہ تھی اور شہزادہ نکودار مسلمان ہو جانے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی قانون

کی رُو سے باپ کی بیوی یا محبوبہ کو بیٹے کی بیوی نہیں بننا چاہیے۔"

جوینی نے کہا: "اس وقت ترمہ شیریں کا ذکر کیوں آ گیا میٹنگ میں؟"

شہزادہ سونجاق نے بایدو پر طنز کیا: "شہزادہ بایدو خان کو ترمہ شیریں سے دلچسپی ہو گئی ہے اس لیے اس کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔"

بایدو خان سونجاق کی طرف مڑ گیا: "شہزادہ سونجاق! کم از کم آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ نے تو ترمہ شیریں کو اغوا کر لیا تھا اور شاید اب بھی آپ اسی کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔"

جوینی نے ان سب کو سمجھانے کی کوشش کی: "صاحبان! آپ سب ایک ہی خانوادے کے چراغ ہیں میرا خیال ہے اب یہ فضول باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ گھر کی باتیں گھر ہی میں رہنا چاہئیں، انھیں باہر نہیں نکلنا چاہیے۔"

لیکن بایدو بہت غصے میں تھا، بولا: "جناب والا! جب تک شہزادہ سونجاق ہم میں موجود ہے شہزادہ ارغون سے مفاہمت نہیں ہو سکتی کیونکہ ارغون شہزادہ سونجاق کو اپنا رقیب سمجھتا ہے میں اس سلسلے میں شہزادہ ارغون سے کافی باتیں کر چکا ہوں۔"

شہزادہ سونجاق نے چڑ کر جواب دیا: "بایدو خان! تم دو غلے ہو، تم شہزادہ ارغون سے بھی ملتے ہو اور شہزادہ نکودار سے بھی۔ غالبًا تم دونوں ہی جگہ اپنی خدمات پیش کرتے رہے ہو اور جب شہزادہ ارغون نے گھاس نہیں ڈالی تو تم یہاں آ گئے۔"

بایدو خان غصے میں کھڑا ہو گیا: "اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھیروں گا، یہاں میری بے عزتی کی گئی ہے۔"

جوینی نے اُن سب کو لعنت ملامت کی: "ہم سب یہاں اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ اپنے اختلافات دُور کر کے بھائی بھائی بن جائیں مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ نفرتوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔"

بایدو خان نے کہا: "میں جا رہا ہوں۔"

جوینی نے کہا: "لیکن بایدو خان! آپ دوبارہ پھر ملیں گے نکودار آپ کا انتظار کرے گا۔"

لیکن بایدو خان نے کوئی جواب نہیں دیا، چلا گیا۔

جوینی نے شہزادہ سونجاق سے کہا: "شہزادے! آپ ہمارے مہمان ہیں آپ کو ہمارے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔"

شہزادہ سونجاق نے کہا: "میں بھی اس گھرانے کا ایک فرد ہوں۔"

جوینی نے کہا: "یہ غلط ہے، تم چغتائی ہو اور یہ سب تولوئی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خاموش رہیں۔"

شہزادہ نکودار نے سونجاق کو آنکھ دکھائی اور شاید دوسروں کو بھی اشاروں میں معلوم نہیں کیا کہا کہ وہ کچھ کہے بغیر اُٹھ کر چلا گیا۔

اب یہاں نکودار اور کینجاتو خان کے سوا کوئی نہیں تھا۔

جوینی نے کہا: "اب جب کہ آپ دونوں کے سوا یہاں کوئی بھی نہیں میں چند کام کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

نکودار اور کینجاتو خان جوینی کی باتیں بڑے انہماک سے سُننے لگے۔

جوینی نے اُن دونوں کو سمجھانا شروع کیا: "میں آپ دونوں میں مثالی اتحاد دیکھ رہا ہوں اس لیے میری نمک خواری کا یہ فرض ہے کہ آپ دونوں کو جو مشورے بھی دوں وہ مخلصانہ اور میری نیک نیتی پر مبنی ہوں۔"

کینجاتو خان نے کہا: "جنابِ والا! میں بھائی نکودار کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا۔"

نکودار نے کہا: "اور اسی لیے تو میں کینجاتو خان کو اپنے جملہ عساکر کا سپہ سالارِ اعلیٰ بنانا چاہتا ہوں۔"

جوینی نے کہا: "شہزادے! آپ جو چاہیں کریں لیکن قدم اٹھانے سے پہلے اس کا چرچا نہ کریں۔ آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے یہ کہا تھا کہ اب آپ حکومت کے خاص خاص کلیدی عہدے مسلمان منگولوں کو دیں گے، آپ نے جو کچھ کہا درست کہا تھا، آپ کو یہی کرنا بھی ہے مگر جس جگہ، جن افراد کے سامنے اور جس وقت کہا یہ سب غلط تھا۔"

نکودار نے بڑی بے چارگی سے کہا: "تو گویا میں غلطیوں پر غلطیاں کیے جا رہا ہوں۔"

جوینی نے جواب دیا: "اس میں کیا شک ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب بایدو کو اس کے شایانِ شان اعزاز نہیں ملا تو وہ آپ کے خلاف باتیں کرنے لگا۔ آپ بایدو خان کے دل کی باتیں جاننے کے لیے اس سے تخلیے میں ایک بار اور ملیں گے۔"

نکودار نے پوچھا: "وزیرِ محترم! اب میں آپ کے مشوروں کے بغیر کوئی قدم بھی نہ اٹھاؤں گا۔"

جوینی نے دونوں کو سمجھایا: "اب کوئی نیا اعلان نہیں ہو گا۔ شہزادہ نکودار اور کینجاتو خان اپنے بھائی ارغون کے پاس جائیں گے اور اس سے صلح صفائی کریں گے۔ آپ ارغون سے کہیں گے کہ وہ تمام رسُوم جو آبائی چلی آ رہی ہیں برقرار رہیں گی اور آپ نے اسلام ذاتی طور پر قبول کیا ہے اور حکومت کے جملہ عہدے اور مناصب اہلیتوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر دیے جائیں گے۔"

نکودار نے کہا: "میں آج رات ہی ارغون سے ملوں گا۔"

جوینی نے مزید سمجھایا: "اور جب آپ یہ دیکھیں کہ شہزادہ ارغون مطمئن ہو گیا ہے تو آپ اُس کو اپنی راہ سے نہایت ہوشیاری سے ہٹا دیں گے، اس کو گرفتار کر کے کینجاتو خان کو سپہ سالارِ اعلیٰ بنا دیجیے۔"

جوینی کی عاقلانہ باتیں دونوں کی سمجھ میں بخوبی آ رہی تھیں۔

کینجاتو خان فرطِ عقیدت سے بولا: "میرے باپ دادا کتنے عقلمند اور مردم شناس تھے کہ انھوں نے آپ کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب

عطا فرمایا۔"

نکودار نے کہا: "جب تک جوینی جیسا عاقل و فرزانہ ہمیں میسّر ہے کوئی ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

٭

رات بہت اندھیری تھی، شہزادہ ارغون کا محل ذرا فاصلے پر تھا۔ منگولوں کے محلاتِ شاہی نصف دائرے میں بنے ہوئے تھے، نکودار کا محل تقریباً بیچ میں تھا اور شہزادہ ارغون کا محل بائیں طرف کے کنارے، بالکل آخری محل۔ شہزادہ نکودار نے ارغون کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ رات کا کھانا اس کے ساتھ کھانا چاہتے ہیں۔ شہزادہ ارغون نے جواب میں کہلا دیا تھا: "یہ میری خوش قسمتی ہے اور میں اس پر فخر کروں گا۔"

جوینی نے شام کو نکودار اور کیخاتو خان سے ملاقات کی اور انہیں خوب اچھی طرح سمجھایا: "دیکھیے، وہاں مشتعل نہ ہو جائیے گا۔ اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھیے گا اور بات بہت ہوشیاری سے کیجیے گا۔"

نکودار نے جواب دیا: "وزیرِ محترم! اللہ نے چاہا تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

جوینی نے کہا: "میں بات چیت کی تفصیلات جاننے کے لیے یہیں موجود رہوں یا اپنے گھر چلا جاؤں؟"

نکودار نے پوچھا: "آپ کی اپنی کیا رائے ہے اس بارے میں؟"

جوینی نے جواب دیا: "میں گھر چلا جاؤں گا کیونکہ سعد الدولہ یہودی بہت چالاک ہے ممکن ہے میری محل میں موجودگی کا علم شہزادہ ارغون کو بھی ہو جائے۔"

جوینی اپنے گھر چلا گیا اور شہزادہ نکودار اور کیخاتو خان شہزادہ ارغون کے پاس چلے گئے۔ رات کی تاریکی میں مشعل بردار دونوں شہزادوں کے آگے پیچھے مشعلیں لیے چل رہے تھے۔ درمیان میں گھنے درختوں کا باغ تھا۔ دونوں اس باغ کو عبور کر کے ارغون کے محل کے سامنے پہنچے تو انہیں دور ہی سے محل کی کھڑکیوں سے اندر کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ شہزادہ ارغون ان دونوں کا دیر سے انتظار کر رہا تھا۔

جب بھائیوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ نکودار نے ارغون کی پیٹھ تھپتھپائی۔ اس کا سر ارغون کے کاندھے پر ٹکا ہوا تھا۔

نکودار نے کہا: "بھائیوں کو دور دور نہیں رہنا چاہیے ورنہ حاسد سازشیں شروع کر دیتے ہیں۔"

کیخاتو خان نے کہا: "میں کتنا خوش قسمت انسان ہوں کہ میرا ایک بھائی ایل خان ہے اور دوسرا سپہ سالارِ اعلیٰ۔"

شہزادہ ارغون نے کہا: "میں بھی اپنے بھائی کی ایل خانی پر ناز کرتا ہوں۔"

نکودار کی نظر اچانک بایدو خان پر پڑ گئی، اس نے حیرت سے پوچھا: "بایدو خان! تم یہاں کہاں؟"

بایدو خان ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں شرارت پائی جاتی تھی۔ بولا: "آخر میں بھی تو آپ سب کا بھائی ہوں، وہ تایا زاد چچا زاد ہی سہی، بھائی تو بھائی ہوتا ہے۔"

کیخاتو خان بھی بایدو کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

شہزادہ ارغون نکودار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھا: "آئیے ہم سب اندر چلیں، وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

وہ محل کے اندر چلے گئے۔ یہاں نئے ایل خان اور اس کے چھوٹے بھائی کی آمد کی خوشی میں ضیافت کا شاندار انتظام کیا گیا تھا۔

شہزادہ ارغون نے کہا: "میرا خیال ہے پہلے تو ہم سب ضروری باتیں کر لیں اس کے بعد کھانا کھائیں۔"

نکودار نے جواب دیا: "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

بایدو کسی اور سے مصروفِ گفتگو تھا۔ نکودار نے شہزادے ارغون سے پوچھا: "یہ بایدو یہاں کیا لینے آ گیا؟ اس کو کس نے بلالیا؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا: "اپنی مرضی سے چلا آیا، یہ مجھے اپنی خدمات پیش کر رہا تھا لیکن میں نے اس کو منع کر دیا۔"

نکودار نے گھبرا کر پوچھا: "اور بھی کچھ کہہ رہا تھا یا بس اتنا ہی؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا: "یہ اور کیا کہے گا؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

نکودار نے کہا: "مجھے بایدو خان ذرا بھی پسند نہیں، کیا ہماری گفتگو اس کے سامنے ہوگی؟"

شہزادے ارغون نے جواب دیا: "یہ ضروری تو نہیں۔ اگر آپ اس کی موجودگی کو ناپسند فرماتے ہیں تو میں اسے کسی بہانے چلتا کر دیتا ہوں۔"

نکودار نے کہا: "میں یہی چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف بایدو خان کیخاتو خان سے کہہ رہا تھا: "میں نے اپنی اور آپ لوگوں کی ملاقات کا ذکر یہاں نہیں کیا، براہِ کرم آپ لوگ بھی چپ رہیے گا۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "میں یا بھائی نکودار کیوں ذکر کرنے لگے۔"

بایدو خان نے نکودار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بھائی نکودار اگر چاہتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی اور میں وہ حل پیش کرتا کہ بس مزہ ہی آ جاتا لیکن وہ میری بات سننے پر آمادہ ہی نہ ہوئے۔"

کیخاتو خان نے کہا: "تم دوبارہ مل لینا بھائی نکودار سے اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھ دینا۔ اگر وہ مفید اور کارآمد نکلی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تم سے فائدہ نہ اٹھائیں۔"

بایدو خان باتیں تو کیخاتو خان سے کر رہا تھا لیکن اس کے کان نکودار اور شہزادہ ارغون کی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ کیخاتو خان خطرے کی بو سونگھ کر فوراً ان دونوں کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ "یعنی کمال ہے آپ دونوں مجھے دور بٹھا کے اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔"

نکودار نے خاصا نرم رویہ اختیار کر رکھا تھا، بولا۔ "کیخاتو خان میں ارغون سے کہہ رہا تھا کہ میں نے نادانی اور ناتجربہ کاری میں جن اصلاحات کا اعلان کر دیا تھا، اب اس پر شرمندہ ہو رہا ہوں۔ میں نے اسلام قبول کر لیا، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ شاہی مناصب اور عہدے مذہب و ملت کی تفریق اور امتیاز کے بغیر صرف اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے شخص کو دیے جائیں گے۔"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا، ورنہ یہاں کی صورت حال بگڑتی جا رہی تھی۔ میری قوم کے لوگ ان اصلاحات اور تبدیلیوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔"

نکودار نے کنکھیوں سے بایدو خان کی طرف دیکھا اور شہزادہ ارغون سے کہا۔ "شہزادہ بایدو خان کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے؟"

شہزادہ ارغون نے اس اشارے کا مطلب سمجھ لیا، بولا۔ "وہ تو بجا فرمایا آپ نے لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وزیر شمس الدین جوینی کو بھی یہاں بلوا لیا جائے۔"

نکودار نے اپنے دل و دماغ میں ہنگامہ سا محسوس کیا، بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہے یہاں وزیر جوینی کا کیا کام؟"

لیکن شہزادہ ارغون نہیں مانا اور اس نے بایدو خان کو جوینی کے پاس بھیج دیا۔

نکودار نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ "بھائی ارغون ہم دونوں کا باپ اور ماں ایک ہیں۔۔۔"

کیخاتو خان بیچ میں بول پڑا۔ "اور میں۔ مجھے کیوں الگ کر دیا؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "تو بھی ہم دونوں کا حقیقی بھائی ہے ہم تینوں کی ماں بھی ایک ہے اور باپ بھی ایک۔"

نکودار نے کہا۔ "یہ فضول باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، اس وقت تو وہ باتیں ہونی چاہئیں جن کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

کیخاتو خان نے نکودار کی طرف سے بولنا شروع کر دیا۔ "بھائی نکودار کو معلوم نہیں کیوں یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ہم بھائیوں میں ایکا نہیں رہا اور ہم تینوں حاسدوں کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔"

شہزادہ ارغون نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔

کیخاتو خان کہتا رہا۔ "مجھے یاد ہے میرے باپ نے جھاڑو کی مثال دے کر اتحاد اور اتفاق کی افادیت پر روشنی ڈالی تھی۔۔۔"

نکودار نے بات کاٹ دی، بولا۔ "بات مختصر ہونی چاہیے، اس وقت میں تمہیں یہ یقین دلانے آیا ہوں کہ اب میں کوئی بھی قدم تمہارے مشورے اور اجازت کے بغیر نہیں اٹھاؤں گا اور تم بھی مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ تم کوئی ایسا ویسا کام نہیں کرو گے اور حاسدوں کی باتیں سن کر انہیں میرے علم میں لاؤ گے کیوں کہ اسی طرح ہم دونوں اپنے اتحاد اور حکومت کو برقرار رکھ سکیں گے۔"

شہزادہ ارغون اپنے بھائیوں کی باتیں بہت غور سے سنتا رہا اس کے بعد پوچھا۔ "میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنی باتوں میں جن حاسدوں اور سازشیوں کا ذکر کیا ہے، آخر وہ ہیں کون؟ میرے آس پاس تو ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے۔ آپ دونوں کے پاس موجود ہو تو بات الگ ہے اور پھر ہمارا اتحاد و اتفاق ختم ہی کب ہوا ہے؟ وہ باقی ہے، موجود ہے اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں جو قدم بھی اٹھاؤں گا آپ کی رضا اور اجازت سے اٹھاؤں گا۔ آپ بڑے ہیں اور خدا نے آپ کو ایل خان بنا دیا ہے میں اس کا ہمیشہ احترام کروں گا۔"

دونوں بھائی شہزادہ ارغون کی باتیں سن کر حیران رہ گئے۔

نکودار نے پوچھا۔ "تو یہ سچ ہے کہ تمہیں کسی نے بھی ہمارے خلاف نہیں بھڑکایا؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "میں اس کی قسم کھا سکتا ہوں۔"

نکودار حیرت سے کیخاتو خان کی شکل دیکھنے لگا، پھر شہزادہ ارغون سے کہا۔ "تب پھر اب بات ہی کون سی رہ گئی؟ بس یہی بات کرنا تھی۔"

کیخاتو خان بالکل خاموش تھا وہ ان دونوں سے لاتعلق سا ہو گیا تھا۔

کافی دیر بعد جب بایدو خان شمس الدین جوینی کو لے کر آ گیا تو شہزادہ نکودار نے جوینی سے کہا۔ "جوینی، محترم وزیر! میں حیران ہوں کہ آخر میں اتنے دنوں سے غلط فہمیوں میں کیوں مبتلا ہوں، یہاں تو کوئی بات ہی نہیں۔"

کیخاتو خان نے بایدو خان سے کہا۔ "ہم نے آپ دونوں کی وجہ سے کھانا نہیں شروع کیا۔"

جوینی کو نکودار کی بات سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اس نے بات بنائی۔ "میں نے تو ہمیشہ یہی کہا کہ آپ تینوں بھائی ہیں کسی اور کو آپ کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے۔"

اس کے بعد کھانے کا دور چلا اور سب کھانے پر پل پڑے۔

٥

بایدو خان نکودار سے ایک بار پھر ملا اور بالکل تخلیے میں ملا۔

اس نے بایدو خان سے پوچھا "ہاں اب بتا تو مجھے کون سا مشورہ دینے والا تھا؟"

بایدو خان نے کہا "نکودار! آپ ہم سب کے لیے محترم اور قابل تعظیم ہیں، آپ شہزادہ ارغون کی باتوں میں نہ آئیں اور اُس کو معزول کر کے کسی اور کو سپہ سالارِ اعلیٰ بنا دیں۔"

نکودار نے پوچھا "کسی اور کو، کون؟ کوئی نام ہے تیرے ذہن میں؟"

بایدو خان نے جواب دیا "وہ میں خود ہوں، اگر آپ مجھے سپہ سالارِ اعلیٰ بنا دیں گے تو میں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا اور آپ پر کسی سمت سے بھی آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

نکودار نے چونک کر بایدو خان کو سر سے پاؤں تک دیکھا "لیکن ارغون سے میرا جھگڑا ہی کیا۔ اس سے کوئی اختلاف بھی نہیں پھر میں اس کو معزول کیوں کروں؟"

لیکن بایدو خان اپنی رائے پر ڈٹا ہوا تھا، بولا "شہزادہ نکودار آپ تاریکی میں ہیں، شہزادہ ارغون پر آپ کا اعتماد آپ کی زندگی کی بدترین غلطی ہوگی۔"

نکودار نے جواب دیا "میں اس بدترین غلطی کو قبول کرتا ہوں لیکن میں اس کو معزول نہیں کروں گا۔"

اس کے بعد اس نے تالی بجا کے خدمت گاروں کو طلب کیا اور بایدو خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کو قید کر دیا جائے کیونکہ اس کی سازش حکومت اور شاہی خاندان کے لیے سخت خطرہ بن گئی ہے۔"

بایدو خان اس غیر متوقع حکم سے گھبرا گیا، بولا "نکودار! تم مجھے قید کر سکتے ہو لیکن میری باتوں کی سچائی کو بدل نہیں سکتے میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے تم ارغون پر اعتبار نہیں کر سکتے۔"

نکودار نے ہنستے ہوئے جواب دیا "میں نہ تو تجھ پر اعتبار کرتا ہوں نہ اپنے بھائی ارغون پر، میں نے اس کا بھی انتظام کر لیا ہے۔" اس کے بعد نکودار نے باآوازِ بلند کہا "اب آپ لوگ بھی باہر آجائیں۔"

بایدو خان نے دیکھا اس حکم کے بعد پردے کے پیچھے سے شمس الدین جوینی، شہزادہ کینجاتو خان اور سونجاق مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ نکودار نے ان تینوں سے کہا "آپ لوگوں کا خیال درست تھا، یہ ساری سازشیں اسی ایک شخص کی تھیں۔"

جوینی نے یہاں بھی حکمت عملی سے کام لیا، نکودار کو مشورہ دیا کہ "شہزادے حالات پر قابو پاتے ہی بایدو خان کو اپنی پہلی فرصت میں قتل کر دیجیے گا کیونکہ میں نے اس سے زیادہ ناقابلِ اعتبار آدمی نہیں دیکھا۔"

نکودار نے سونجاق سے کہا "اور سونجاق! تم کل ہی یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہیں ترمہ شیریں آگے مل جائے گی۔"

سونجاق نے پوچھا "لیکن وہ کہاں ملے گی مجھے؟"

نکودار نے جواب دیا "مراغہ کے باہر، تمہیں تلاش نہیں کرنا پڑے گا، لوگ تمہیں تلاش کر کے ترمہ شیریں کو پہنچا دیں گے۔"

شمس الدین نے اجازت چاہی "اچھا شہزادے! میں تو چلا اب جب آپ مجھے طلب فرمائیں گے، حاضر ہو جاؤں گا۔"

شمس الدین جوینی اسی وقت وہاں سے چلا گیا۔

اب وہاں صرف دو بھائی رہ گئے تھے۔ شہزادہ نکودار اور کینجاتو خان۔ نکودار نے کہا "ارغون ہمیں بے وقوف سمجھتا ہے، اس نے حاسدوں اور سازشیوں کے وجود ہی سے انکار کر دیا، لیکن میں بھی کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔ کل رات کو ارغون میرا مہمان ہوگا۔ میں اس کی دعوت کر رہا ہوں، اس کے ساتھ بدبخت سعد الدولہ یہودی بھی آئے گا۔ میں اسی وقت انہیں گرفتار کر کے تجھے اپنی جملہ افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ مقرر کر دوں گا۔ تو اس منصب کے لیے تیار رہ۔"

دوسرے دن ترمہ شیریں کو مراغہ کے باہر شہزادہ سونجاق کے حوالے کر دیا گیا وہ اسے لے کر تیزی سے خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔

نکودار نے اپنے سپہ سالارِ اعلیٰ کی ضیافت کا شاندار اہتمام کیا تھا۔ محل کے پیچھے میدان میں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان کے چولھوں سے دھواں سہ پہر ہی سے اٹھنے لگا تھا۔ نکودار نے محل کی چھت سے اس اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھا تو پھولے نہ سمایا، اس نے آہستہ سے کہا "اللہ نے چاہا تو اس دھوئیں کی طرح رات شہزادہ ارغون تو بھی فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔"

شام ہو گئی کینجاتو خان ابھی تک نکودار کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ نکودار کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ وہ اسی وقت شہزادہ کینجاتو خان کو اس کے سامنے پیش کرے۔

مغرب سے ذرا پہلے نکودار نماز کے لیے وضو کر رہا تھا۔ اسی حال میں ایک خدمت گار نے نکودار کو مطلع کیا "خان محترم! خبر ملی ہے کہ شہزادہ ارغون تشریف لا رہے ہیں۔"

نکودار مسکرایا، بولا "میں مغرب کی نماز ادا کر لوں، تو ارغون کو میرے کمرے میں بٹھا دے۔"

خدمت گار نے کہا "ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔"

نکودار نے جھنجھلا کر جواب دیا "میں نے کہہ جو دیا کہ ان سب کو ہال نما کمرے میں بٹھایا جائے۔"

نکودار وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھنے لگا، اسی دوران

خدمت گار چلایا "حضور والا! شہزادہ ارغون کے ساتھ دو چار نہیں کئی ہزار آدمی ہیں اور ان کی نیت اچھی نہیں لگتی۔"

لیکن اب نکودار کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا، وہ رکوع سے سجدے میں چلا گیا۔

خدمت گار برابر کہہ رہا تھا "حضور والا! وہ بغیر اجازت کے محل میں داخل ہو چکے ہیں اور اسی طرف چلے آ رہے ہیں۔"

نکودار خاموش تھا نماز پڑھنے میں مشغول۔ خدمت گار بہت زیادہ فکر مند تھا کہ آخر یہ نکودار خاموش کیوں ہے؟ اس کے بعد خدمتگار کی آواز سنائی نہیں دی ایسا لگا جیسے کسی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔

تین رکعت فرض ادا کرنے کے بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا تو شہزادہ ارغون اور سعد اللہ یہودی اس کے پیچھے کھڑے اس کو گھور رہے تھے۔

نکودار نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا "کوئی بات نہیں، ہم آپ کو یہ بتلانے آئے ہیں کہ جس طرح آسمان پر ایک سورج ہے اسی طرح اس محل میں ایک ہی حکمران رہے گا۔"

نکودار نے کچھ کچھ یہودی کا مطلب سمجھ لیا تھا، پھر بھی تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا "میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا "میرا مطلب صاف ہے ہم تجھے معزول اور شہزادے ارغون کو اپنا خان بناتے ہیں۔"

نکودار نے کہا "لیکن تجھ کو یہ حق کس نے دیا ہے؟"

جواب میں شہزادہ ارغون نے میان سے تلوار نکال کر نکودار کی گردن پر وار کیا "یہ حق اس نے، اس تلوار نے ہمیں دیا ہے۔"

تلوار نہتے نکودار کا سر اڑاتی دوسری طرف نکل گئی۔ نکودار کا سر الگ جا گرا اور جسم فرش پر تڑپنے لگا۔ نکودار کا خون بہہ بہہ کر سعد اللہ یہودی کے جوتے تر کرنے لگا۔

نکودار کے قتل کے بعد شہزادہ ارغون کے آدمی محل کے اندر اور باہر یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے "وہ خان جس نے اپنا مذہب ترک کر دیا تھا اور جو ہمارے آباؤ اجداد کی رسوم مٹا دینا چاہتا تھا قتل کر دیا گیا ہے اور قوم ایک بہت بڑے فتنے سے نجات پا گئی۔ اب شہزادہ ارغون ہمارا خان ہے ایل خان۔ اور دیکھو خبردار جو کسی نے شہزادہ ارغون کے خلاف کچھ کہا یا زبان کھولی۔ نیلا جاودانی آسمان ہمارے موجودہ ایل خان کو صدیوں قائم اور برقرار رکھے۔"

شہزادہ ارغون نے محل کے چپے چپے میں ترمہ شیریں کو تلاش کیا مگر وہ نہیں ملی۔ اس کے بعد اس نے شہزادہ سونجاق کو ڈھونڈا مگر وہ بھی نہیں ملا۔ دونوں طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے ان دونوں کی تلاش کا سلسلہ ختم کر دیا۔

اس نے کینجاتو خان سے کچھ نہیں کہا کیونکہ کینجاتو خان اپنے آبائی دین پر قائم تھا۔ اس نے کینجاتو خان سے کہا "شہزادے! نکودار میرا بھی بھائی تھا مگر گم کردہ راہ بھائی۔ میں نے اس کو قتل کر کے ہزاروں لاکھوں منگولوں کی خواہش پوری کر دی اور ان ہزاروں لاکھوں میں تو خود بھی شامل ہے۔"

بایدو خان کو آزاد کر دیا گیا۔ اس نے بایدو خان سے معذرت کی۔

"بایدو خان! تیرے ساتھ جو کچھ ہوا میں اس پر نادم اور شرمسار ہوں بہر حال اب ایسا نہیں ہوگا۔"

شمس الدین جوینی کو اس انقلاب کی خبر مل چکی تھی اور یہ جو کچھ ہوا تھا وہ جوینی کے لیے خلافِ توقع نہیں تھا۔ لیکن وہ مایوس بھی نہیں ہوا تھا۔ جوینی کو معلوم تھا کہ اسلام منگول شہزادوں کے دل و دماغ میں جگہ بنا چکا ہے ایک نکودار کی موت اسلام کے اس اثر و نفوذ کو نہیں روک سکے گی جو کئی شہزادوں کے دلوں میں رچ بس چکا تھا۔

شہزادہ ارغون نے جوینی کو طلب کیا۔ اس وقت بایدو خان بھی ارغون کے پاس موجود تھا۔ شہزادہ ارغون نے کہا "جوینی! میں تیری عزت کرتا ہوں کیونکہ تیرا کردار بے داغ رہا ہے، تو نے مسلمان ہونے کے باوجود نکودار کے ہر اس اقدام کی مذمت کی جو اسلام کی تائید میں تھا میرے دادا اور باپ بھی تیری بڑی عزت کرتے تھے۔ اگر تو چاہے تو دربار میں آتا جاتا رہ، ورنہ گوشہ نشینی کی صورت میں تیرا مشاہرہ تجھے پہنچتا رہے گا۔"

بایدو خان نے بھی جوینی کی بڑی تعریف کی۔ جوینی نے شہزادہ ارغون سے درخواست کی کہ اب وہ آرام کرنا چاہتا ہے، اس لیے کوئی خدمت قبول کرنے کو تیار نہیں۔

شہزادہ ارغون نے اسے سبکدوش کر دیا۔

اب شہزادہ ارغون کے سامنے ایک عظیم الشان منصوبہ تھا اپنے باپ اباقہ خان کی سرحدوں کو وسعت دینے کا منصوبہ، مصر کے مملوک خاندان کی گوشمالی کرنا۔ برقائی اور چغتائی خانوادوں کو مزہ چکھانا۔ اور منگولوں میں پھیلتے ہوئے اسلامی اثرات کو سختی سے روک دینا۔ شام کے بعد رات اور رات کے بعد طلوع ہونے والی صبح پر پہرے بٹھا دینا، ارتقاء کی طرف بڑھتے ہوئے وقت کے دھارے کا رخ موڑ کر پیچھے آباؤ اجداد کے رسم و رواج کی طرف لے جانا، یہ وہ عظیم مقاصد تھے جنہیں شہزادہ ارغون حاصل کرنا چاہتا تھا مگر

من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال



تاریخ

الیاس سیتاپوری

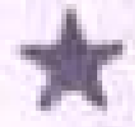
قبلائی خان نے جنوبی چین پر جو فتح حاصل کی اس نے چین کو ایک ملک کی صورت دے دی۔ یوں قبلائی خان متحدہ چین کا واحد شہنشاہ بن کر ابھرا تھا۔ قبلائی خان نے عوام کو خوشحالی دے کر اپنا مرید بنا لیا۔ چنانچہ اگر چینیوں نے اُسے اظہارِ وفاداری کے طور پر تی ین تسو (آسمان کا بیٹا) کا لقب دے دیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ قبلائی خان فرزندِ آسمان اور شہنشاہِ چین ہی نہیں بلکہ وہ خود کو فاتحِ عالم بھی کہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوچی کے زریں اردو، ہلاکو کے ایل خانی سردار اُسے اپنا آقا تسلیم کرتے تھے۔ ہلاکو کا بیٹا اباقا خان تو اپنی دربار کی نشست کے پہلو میں ہمیشہ ایک



طلائی تخت رکھتا جس کے پائے اس کی اپنی نشست سے دو بالشت اونچے تھے۔ وہ اپنے درباریوں سے برملا کہتا کہ میں خاقان قبلائی خان کے حکم کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا اور پھر خالی تخت کی طرف اشارہ کرکے بتاتا کہ یہ تخت قبلائی خان کے لیے محفوظ ہے۔

قبلائی خان کے سر پر عظمت کے دو تاج تھے ایک طرف تو وہ مغل خاقان کی حیثیت سے چین کا شہنشاہ تھا' دوسری طرف چنگیز خان کا پوتا اور جانشین ہونے کی وجہ سے وہ چنگیزی سلطنت کے تقریباً ایک چوتھائی حصے پر قابض تھا پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ قبلائی خان کا اختراع پسند دماغ' جو محلوں کی تعمیر کے بہانے

تاتاریوں کی خانہ جنگی کے
پس منظر میں مُغل شہزادے
اور تبتی حسینہ
کی
رومانی پُر درد
اور دلگداز کہانی



ہندوستانی صحرا وارد۔ ابنِ صفی کے ایک دیرینہ مداح
جناب الماس سیتاپوری کی تازہ ترین تحریر

ڈھونڈتا تھا نچلا بیٹھ جاتا۔ شنگ تو کا پرانا محل جسے بانسوں سے تعمیر کیا گیا تھا اُس کی نظروں میں اپنی افادیت کھونے لگا۔ چنانچہ قبلائی خان نے بڑے غور و فکر سے ایک نئے قصر کا خاکہ تیار کیا۔ وہ اس قصر کی بنیاد اپنی آرزوؤں پر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نیا قصر نہ صرف حکومت کا دارالخلافہ ہو بلکہ گردش کے ایام میں (جس کا ابھی کوئی امکان نہ تھا) اُس کے لیے پناہ گاہ کا کام بھی دے سکے۔ اُس کی خواہش تھی کہ اس شہر نگاراں میں سبزہ اور اشجار کی اس طرح پیوند کاری کی جائے کہ جب اس کی نظر باغات اور سرسبز قطعات پر پڑے تو اُسے اپنے وطن کے سبزہ زاروں کی جھلکیاں دکھائی دیں۔

قصر کی تعمیر شروع ہوئی۔ قبلائی خان نے مٹی کی دیواروں کا ایک وسیع و عریض احاطہ تیار کرایا۔ اِس کا نام اس نے ٹائی تو (دربار عظیم) رکھا۔ مغل اِسے بالیغ یعنی خان کا شہر اور مغربی سیاح مباوک کے نام سے پکارتے۔ یہ قصر پرانے تباہ شدہ شہر ین کنگ کے کھنڈرات کے برابر تھا جسے مغلوں نے قبلائی خان کے حکم کے باوجود تباہ کر دیا تھا۔ نئے شہر کی تعمیر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ چینی پرانے شہر ین کنگ کی تباہی کو فراموش کر دیں۔ اس احاطہ قصر میں ایک جھیل تھی۔ ایک اندرونی محل تھا جس پر ہر دم شمشیر بردار مغل پہرہ دیتے۔ منجموں کے لیے ایک رصدگاہ اور خاقان کی ذاتی فوج کی بیرکیں بھی اس میں تھیں۔ غیر ملکی سیاحوں اور مقامی چینیوں کے لیے احاطے کے باہر مکانات بنائے گئے جس کا انتظام کوتوال کے سپرد تھا۔ بیرونی آبادی کی تفریح طبع کے لیے اس احاطے کے باہر بیس ہزار طوائفوں کی رہائش کا بھی انتظام تھا۔ محل کی دیواروں اور چھتوں پر سونے چاندی کے پتر جڑے تھے۔ باہر قرمزی رنگ آئینے کی طرح جگمگاتا تھا۔

قبلائی خان نے انتظامِ سلطنت کے لیے چینیوں کے علاوہ بعض غیر ملکیوں کو بھی اہم عہدوں پر فائز کیا۔ مغل شہزادوں کو اُن کا اقتدار پسند نہ تھا۔ چینی بھی اُن عہدوں پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ بیرونی خطرہ ہو تو مختلف الخیال لوگوں میں بھی ہم آہنگی رہتی ہے لیکن یہ خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اس لیے رقابتیں اور ریشہ دوانیاں کھل کر سامنے آنے لگیں۔

چینی عہدے دار سفید پہاڑوں والے سُرخ لاما فاگس سے خار کھاتے تھے۔ قبلائی خان نے اُسے "شاہ قانون" اور "خلاق شہنشاہ" جیسے بڑے بڑے خطاب دیے تھے۔ لاما سے ان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لاما فاگس اور وزیر مالیات احمد میں گہرے تعلقات تھے۔ احمد نے زر و جواہر سے قبلائی خان کے خزانے بھر دیے اور اس کی شخصیت اب قبلائی خان کی نظروں میں سب سے زیادہ اونچی تھی۔ درباری عہدے داروں کے اختلافات سے قبلائی خان خود بھی واقف تھا لیکن وہ ان کے معاملات میں قطعی دخل نہ دیتا۔ بلکہ اپنی حکمت عملی کو فروغ دینے کے لیے چینیوں اور مسلمانوں کو آمنے سامنے کھڑا کر دیتا تھا لیکن نئے قصر کی تعمیر کے سلسلے میں کچھ عرصہ بعد جو جشن منعقد کیا گیا اُس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سلطنتِ چین کی بُنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اِس جشن میں دُور دُور سے ناچ اور گانے والیوں کے طائفے آئے تھے۔ انہی میں تبت کے سفید پہاڑوں سے آنے والا ایک طائفہ بھی تھا جس میں ایک سُرخ رنگت والی رقاصہ "فیفی" تو تھی لیکن اُس کی لال رنگت اور گول چہرے کی وجہ سے لوگ اُسے "لالہ رُخ" کے نام سے پکارتے تھے۔ لالہ رُخ کا تعلق تبت کے ایک پیشہ ور رقاص گھرانے سے تھا۔ مغلوں کو اپنے رقص سے وہ کئی بار محظوظ کر چکی تھی لیکن وہ لالہ رُخ کی کمسنی کا دور تھا۔ اس دفعہ وہ رقص کے فن کے علاوہ حُسن و جوانی کے زیور سے بھی آراستہ تھی۔

لالہ رُخ اِس جشن میں خود نہیں آئی تھی بلکہ اُسے خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ تبت کا عالم لاما فاگس جو ایک عرصے سے مغلوں کے افعال و کردار کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ ... نے یہ محسوس کیا کہ اگر اُس نے یاؤ چاؤ اور سانگا کی طرح خاقان کے مزاج میں دخل حاصل نہ کیا تو چینی اُسے ایک نہ ایک دن اُکھاڑ پھینکیں گے اور پھر اُس کا ملک تبت مغلوں کی دست بُرد سے بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ مغلوں کی وہ بیگمات جن کا تعلق یورپ سے تھا، وہ عیسائیت کے فروغ کے لیے درپردہ اور کھلے عام کوششیں کر کے کس طرح مسلمانوں کو ہٹا کر عیسائیوں کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد اُس نے شاہ تبت کو ایک خط لکھا جس میں اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس جشن کے لیے تبت سے ایسی لڑکیوں کو بھیجا جائے جو اپنی دلکشی اور فراست سے خاقان یا اُس کے کسی شہزادے کا دل جیت لے تاکہ تبتی لڑکی شاہی حرم میں داخل ہو کر تبت کے عوام کے لیے مراعات حاصل کرے اور خاقان کا رُخ سفید پہاڑوں کی طرف ہونے سے روک دے۔

خود لاما فاگس کو شاہ تبت نے اِسی غرض سے خاقان کے دربار میں بھیجا تھا۔ لاما فاگس نے اپنی علمیت کے زور پر ایک اعلیٰ عہدہ تو حاصل کر لیا لیکن تبت کے لیے مراعات حاصل کرنے

کی اُس میں جرأت نہ پیدا ہو سکی۔ چونکہ لالہ رُخ تبت کے کونے کونے میں اپنے رقص اور حسن کے طفیل مشہور ہو چکی تھی۔ اُس کی مرمریں پنڈلیوں کے ساتھ تبت کے نوجوانوں کے دل دھڑکتے تھے۔ وہ تبت کا چراغ نہیں بلکہ خورشیدِ تاباں تھی اس لیے شاہِ تبت کو لالہ رُخ کے سوا کوئی اور لڑکی ایسی نظر نہ آئی جسے وہ لاما فاگس کی ہدایت کے مطابق خان بالیغ بھیج سکے۔ اُس نے لالہ رُخ کو دربار میں بلا کر ضروری ہدایات دیں اور جشن میں شرکت کے لیے بھیجا۔ شاہِ تبت نے اس راز کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا اور لالہ رُخ کو حکم دیا کہ وہ بالکل عام انداز میں خان بالیغ جا کر جشن میں شرکت کرے تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔

سُرخ رنگت والی لالہ رُخ جب محفل میں آئی تو ایک کوندا سا لپکا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ سُرخ رنگ میں سفیدی کی چمک نے اُس کے چہرے کو شہابی بنا دیا تھا۔ آنکھوں کے گول گول کٹورے جیسے شراب کے پیالے چھلک رہے ہوں۔ جس طرف نظر اٹھتی لوگ مست ہو کر جھومنے لگتے۔ کمر کو بل دے کر چلتی تو سرگم کے تار جھنجھنا اُٹھتے۔ اُس پر اٹھتی جوانی۔ وہ جوانی جو سینے پر بندھی ہوئی چوڑی پٹی سے رُوکے نہ رُکتی اور اس طرح جھانکتی کہ نظریں بالا بنا لیتیں۔ بوٹا قد اور چاندنی میں دُھلی ہوئی پنڈلیوں سے پھوٹتی بجلیاں، وہ محفل میں کیا آئی، گویا بہار آ گئی۔ دوسری حسیناؤں کا رنگ اُڑ گیا۔ سب کے چراغ گُل ہو گئے اور جب اُس نے خم ہو کر خاقان کو مسکرا کر سلام کیا تو قیامت برپا ہو گئی۔ ایک سُرخ شعلہ سا لہرایا۔ حُسن نے کمانیں کھینچیں۔ ناز و ادا سمٹ کر جسم کے خم میں سمو گئے۔ انگڑائی کی تمام قوسیں لالہ رُخ کے جھکاؤ پر قربان ہو گئیں۔ اہلِ دربار تو الگ رہے خود خاقان قبلائی خان نے حیران ہو کر اُسے کچھ اس طرح دیکھا کہ اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی بیگم کے چہرے پر کرب کی ایک لکیر اُبھر آئی۔ لالہ رُخ شعلہ جوالا تھی۔ مہ جبینوں اور مہ لقاؤں کا تاج تھی۔ رقص کا ریاض کرتے کرتے لالہ رُخ کے سینے میں وہ کشش پیدا ہو گئی تھی کہ دیکھنے والوں کی نظریں چہرے سے ہٹ کر جسم کی جوان وادیوں میں اُلجھ کر رہ جاتیں۔ اِن عقابی نظروں میں سب سے تیز نظر چنگ کم کی تھی۔ چنگ کم قبلائی خان کا بڑا بیٹا اور مستقبل کا خاقان تھا۔ وہ شادی شدہ ایک بچے کا باپ، کئی بیویوں کا شوہر اور بے شمار داشتاؤں کا مالک تھا۔

شہنشاہِ چین، خاقان قبلائی خان ایک مرصع تخت پر بیٹھا تھا۔ اُس کے پہلو میں اس کی چہیتی بیگم جاموئی خاتون براجمان تھی۔ جاموئی، چنگ کم کی ماں تھی۔ سوائے اِس بیگم کے رقص کی محفل میں کسی اور بیگم کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جاموئی خاتون قبلائی خان کی بیگم کے علاوہ مشیرِ خاص بھی تھی۔ جاموئی خاتون اگرچہ جوانی کی منزلیں عمر کے لحاظ سے طے کر چکی تھی لیکن اب بھی وہ ہزاروں دوشیزاؤں پر بھاری تھی۔ اس ڈھلتی جوانی میں بھی جاموئی خاتون کی پتلی کمر اور سینے کے اُبھار میں ایک ایسا تناسب تھا کہ دیکھنے والوں پر نشہ طاری ہو جاتا۔ اُس کی آنکھیں الف لیلیٰ کی شہزادیوں اور پریوں جیسی تھیں۔ ولیعہد کی ماں ہونے کے علاوہ وہ جس قبیلے سے تعلق رکھتی تھی، اُس کی بہادری کا سکہ قبلائی خان اور دوسرے مغل سرداروں پر بیٹھا ہوا تھا۔ جاموئی خاتون کے قبیلے کنگرات کے دستے مغل اُردو (لشکر) میں ایک خاص اہمیت کے حامل تھے۔ اُس کا ہر جوان کوہِ گراں اور سرعت میں برقِ تپاں کے مانند تھا۔ یہی وہ تمام خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے قبلائی خان کو جاموئی خاتون اپنی تمام بیگمات میں ممتاز نظر آتی اور جب وہ خاقان کے ساتھ تخت پر بیٹھتی تو خاقان اُس کے سامنے بوڑھا نظر آتا

تخت کے دائیں طرف قبلائی خان کی چار بیگمات کے بائیس بیٹے اور داشتاؤں کے پچیس بیٹے عمروں کی ترتیب سے اپنی اپنی جگہ سنبھالے ہوئے تھے۔ بائیں طرف امیروں کے امیر وزیرِ مالیات احمد ایرانی طلائی چوکی پر بڑی آن بان سے بیٹھا اس رنگین محفل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ساتھ کئی قطاروں میں مغل سردار اور چینی اور دیگر عمائدینِ سلطنت تھے۔ تبتی لاما فاگس کچھ بیمار تھا اس لیے وہ اس محفل میں شریک نہ ہو سکا۔

خاقان نے رقص شروع ہونے کا اعلان کیا۔ لالہ رُخ اُٹھی اور چھم چھم کرتی خاقان کے سامنے پہنچی۔ اُس نے چینیوں کے سے انداز میں پہلے تو زمین چوم کر خاقان کو سجدہ کیا پھر رقص پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ خاقان نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے اجازت دے دی تو لالہ رُخ نے زمین کو چھوتے ہوئے جامے کو اُٹھا کر کمر کے گرد لپیٹ لیا اور اس پر ایک پٹی کس لی۔ سازوں کی آواز فضا میں بلند ہوئی۔ لالہ رُخ نے اس محفل کے لیے خاص طور سے دو تین وحشیانہ انداز کے رقص تیار کیے تھے۔ ایسے رقص مغلوں میں بے حد مقبول تھے۔ اس لیے لالہ رُخ خاقان کو خوش کر کے زیادہ سے زیادہ انعام حاصل کرنا چاہتی تھی۔

لالہ رُخ نے پہلا رقص شروع کیا۔ مغلوں نے وحشیانہ انداز میں داد و تحسین کے نعرے بلند کیے۔ اُن کے گمان میں بھی نہ

تھا کہ کوئی تبتی لڑکی مغلوں کا رقص پیش کر سکتی ہے... پھر جس مہارت سے لالہ رُخ نے ہاتھ پیر اور جسم کے تمام اعضا کو حرکت دے کر رقص کیا اُس نے مغلوں کو حیران اور بے خود کر دیا۔ خاقان نے خوش ہو کر لالہ رُخ کی طرف ایک جڑاؤ ہار پھینکا۔ جاموئی خاتون نے طلائی کنگن دیے... پھر تو مغل سرداروں نے اُس پر سونے چاندی کی بارش کر دی۔ چینیوں کو تبتیوں سے نفرت تھی اس لیے انہوں نے ہاتھ کھینچ رکھا۔ لالہ رُخ نے ولی عہد کو اُس کی نشست سے پہچان لیا تھا اور وہ محسوس کر چکی تھی کہ شہزادہ چنگ کم اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اُس کی نظریں لالہ رُخ کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھیں۔ ایک بار لالہ رُخ ناچتے ناچتے بالکل شہزادے کے قریب آ گئی۔ شہزادے نے ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑ لیا اور پھر اس زور سے کھینچا کہ لالہ رُخ پھول کی مانند اُس کی آغوش میں گر گئی۔ لالہ رُخ کا شہزادے کی آغوش میں گرنا تھا کہ محفل میں سناٹا چھا گیا۔ کیونکہ شہزادے کی یہ حرکت خاقان کی توہین تھی۔ جاموئی نے گھبرا کر خاقان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ قبلائی خان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے بجلی سی چمکی... مگر فوراً ہی اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اُس کے قہقہے کے ساتھ ہی تمام حاضرین ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے۔ لالہ رُخ اب تک شہزادے کی آغوش میں پڑی تھی۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ لالہ رُخ کی نظریں کچھ اتنی تیز تھیں کہ وہ شہزادے کا آہنی سینہ چیرتی ہوئی دل میں اُتر گئیں۔ اگلے ہی لمحے وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر شہزادے کی گرفت سے نکلی اور پھر رقص کرنے لگی۔ اُس کے رقص میں فن کے ساتھ ساتھ کیف بھی شامل ہو گیا۔ شہزادے کی آغوش کا کیف۔ شہزادے کے ہاتھوں کا لمس کیف بن کر اس کی رگوں میں دوڑنے لگا اور وہ مست و بے خود ناچتی رہی۔

اُس نے یکے بعد دیگرے تین رقص پیش کیے اور ناچتے ناچتے بے خودی کے عالم میں شہزادے سے آگے بڑھ کر تختِ خاقان کے پاس پہنچ گئی۔ خاقان نے ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے لالہ رُخ کو اپنے بھاری پنجوں میں دبوچ لیا۔ لالہ رُخ کی آنکھیں بڑی بے بسی سے شہزادے کی طرف اٹھیں۔ محفل پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ تمام مغل سردار شہزادے کو دیکھنے لگے۔ یہ شہزادے کی توہین تھی۔ خاقان نے کھینچ کر لالہ رُخ کو اپنی آغوش میں ڈال لیا تھا۔

جاموئی خاتون کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ شہزادے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اُسے شہزادے کی آنکھوں سے شعلے نکلتے محسوس ہوئے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ قبلائی خان نے ایک اور قہقہہ لگا کر لالہ رُخ کو چھوڑ دیا۔ لالہ رُخ مضمحل قدموں سے پھر رقص کرنے لگی مگر وہ زیادہ دیر رقص نہ کر سکی۔ اُس کا دل جیسے ٹوٹ گیا تھا۔ لالہ رُخ کے بعد بھی رقص ہوتا رہا۔ مگر کسی کا چراغ نہ جلا۔ محفل کا حُسن لالہ رُخ کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

رات گئے محفل برخاست ہوئی تو شہنشاہ نے اپنے محل کا رُخ کیا۔ جاموئی خاتون شہنشاہ کے ساتھ ساتھ چلی۔ یہ بات خلافِ معمول تھی۔ شہنشاہ کی حرم سرا میں کسی بیگم کو رات گزارنے کی اجازت نہیں تھی۔ اُس نے چاروں بیگمات کے لیے الگ الگ محل بنوائے تھے جن کے الگ الگ احاطے تھے اور ہر بیگم کا اپنا الگ دربار تھا۔ خدمت کے لیے ہر ایک کو تین تین سو کنیزیں دی گئی تھیں۔ ہر محل میں غلاموں اور خواجہ سراؤں کی تعداد دس دس ہزار تھی۔ جب شہنشاہ کو کسی بیگم کے ہاں رات گزارنا ہوتی تو وہ اُس کے محل میں چلا جاتا۔ کبھی کبھی وہ کسی بیگم کو اپنی حرم سرا میں بھی بلوا لیتا۔ مگر خاص حالوں میں، قبلائی خان کے محل میں صرف داشتائیں ہی رہتی تھیں۔ اُس نے داشتاؤں کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا تھا۔ اس محکمے کے غلام اور کنیزیں حسین اور خوبصورت لڑکیوں کو تلاش کرتے اور جہاں کوئی ملتی اُسے اُٹھا لاتے۔ بوڑھی مشاطائیں ان دوشیزاؤں کو حرمِ شاہی میں داخلے کی تربیت دیتیں۔ مشاطائیں ان لڑکیوں کو پہلے خود اپنے ساتھ سلاتیں اور جب اُنہیں اطمینان ہو جاتا کہ لڑکیاں خاقان کے قابل ہیں تو چھ لڑکیاں روزانہ خاقان کے محل میں بھیجی جاتیں۔ تین لڑکیاں دن بھر کے لیے اور تین رات کے واسطے... اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا۔ جاموئی خاتون، خاقان کے ساتھ چلتے چلتے جب اس کے محل میں داخل ہونے لگی تو خاقان خاموش نہ رہ سکا۔ اُس نے پوچھا "جاموئی کیا بات ہے آج تو ہمارے محل میں کیوں آ رہی ہے؟"

جاموئی خاتون نے اُسی طرح چلتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے خاقان سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنی ہے۔ اُمید ہے کہ خاقان کو ناگوار نہ ہوگا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن..." خاقان بولا "کون سا اہم معاملہ ہے جس کے لیے اس وقت گفتگو ضروری ہے۔ بات تو صبح بھی ہو سکتی ہے۔ ہمیں پریشان کرنے کی کوشش نہ کرو جاموئی۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے قبلائی خان کے حرمِ خاص میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں خاقان کی شبینہ خدمت گزاری کے لیے تین دوشیزائیں موجود تھیں۔ انہوں نے جاموئی خاتون کو آتے

دیکھا تو وہ دُوسرے کمرے میں چلی گئیں۔



خواب گاہ کے برابر کا کمرہ جس میں تینوں لڑکیاں گئی تھیں، وہ آرائش میں خواب گاہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ وہی دیواروں پر چڑھے ہوئے سونے چاندی کے پتّر، جگمگاتی چھت میں روشن ہیروں کے ٹکڑے۔ دیومالائی قسم کی چینی مصوری کی نادر تصویریں جس میں دشت، پہاڑ اور ندیوں کی منظر کشی کی گئی تھی۔ ہر تصویر میں ایک بے لباس عورت مختلف زاویوں سے تصویری مناظر پر نظر ڈالتے دکھائی گئی تھی۔ بعض تصاویر میں مرد اور عورت کے ملاپ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا لیکن دیکھنے والے تصویر کے حُسن کے بجائے ملاپ کے اُن طریقوں کو دیکھتے رہ جاتے جو جذبات کو اُبھارنے اور جوانی کی وحشتوں کو ہوا دینے کے لیے پیش کیے گئے تھے۔

لیکن اس کمرے میں آکر لڑکیوں کو سکون نہ ملا۔ یہاں وہ سب کچھ تھا جو ایک لڑکی ایک عورت کو چاہیے لیکن یہاں خاقان نہ تھا۔ خاقان ادھیڑ عمر کا ہونے کے باوجود طاقت کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ خاقان کے ہاتھوں کے لمس سے لڑکیاں بے قرار ہو جاتی تھیں اور خاقان کی مضبوط گرفت اُنہیں اُس کی آغوش میں زخمی پرندے کی طرح گرا دیتی تھی۔ یہ لڑکیاں جو خاقان کے پاس لانے اہتمام سے یہ کوشش کی جاتی تھیں کہ ان کے جسم کسی مرد کی نگاہ اور اس کی آنچ سے واقف نہیں ہیں حالانکہ بوڑھی داشتاؤں کی مشاطگی کے دوران وہ بھاری رقم کے بدلے شہزادوں کے محلوں میں بھیجی جاتیں اور جب وہ خاقان کے پاس آتیں تو اُس لذت سے پوری طرح آگاہ ہوتیں… پھر بھی خاقان کے ساتھ انہیں ایسا لطف ملتا جو انہیں پہلے کبھی میسر نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر لڑکی داشتاؤں کی خوشامد کر کے دوسری اور تیسری بار خاقان کی خواب گاہ میں آنے کی کوشش کرتی۔

لڑکیوں کو اس وقت جاموئی کا محل میں آنا سخت ناگوار گزرا۔ جاموئی خاتون کو دوسری بیگمات پر اس لیے بھی فوقیت حاصل تھی کہ خاقان اُسے مہینے میں دو تین بار ضرور بلواتا یا خود اس کے محل میں رات بسر کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان لڑکیوں کا غصہ اپنی جگہ بجا تھا۔

جاموئی خاتون نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”خاقان میری بات سُن لیجیے۔ میں جلد واپس چلی جاؤں گی۔“

قبلائی خان بے دلی سے بولا۔ ”کہو… لیکن میرا زیادہ وقت خراب نہ کرنا۔ میں آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔“

”آج جو کچھ ہوا۔“ جاموئی خاتون نے خاقان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنا شروع کیا۔ ”وہ بہت بُرا ہوا۔“

خاقان نے کوئی جواب نہ دیا۔ جاموئی بھی خاموش رہی خاقان کو شدید غصہ آگیا تھا۔ اُس نے تیز آواز میں کہا۔ ”مجھے طفیلیوں جیسی باتیں پسند نہیں۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔“

جاموئی کی سمجھ میں نہ آیا کہ خاقان بات ٹال رہا ہے یا وہ واقعی اُس کی بات نہیں سمجھا۔ آخر اُس نے جرأت سے کہا۔ ”خاقان میں اُس ذلیل رقاصہ اور شہزادے کی حرکت کا تذکرہ کر رہی ہوں۔ سرِ دربار یہ بات نہیں ہونی چاہیے تھی۔“

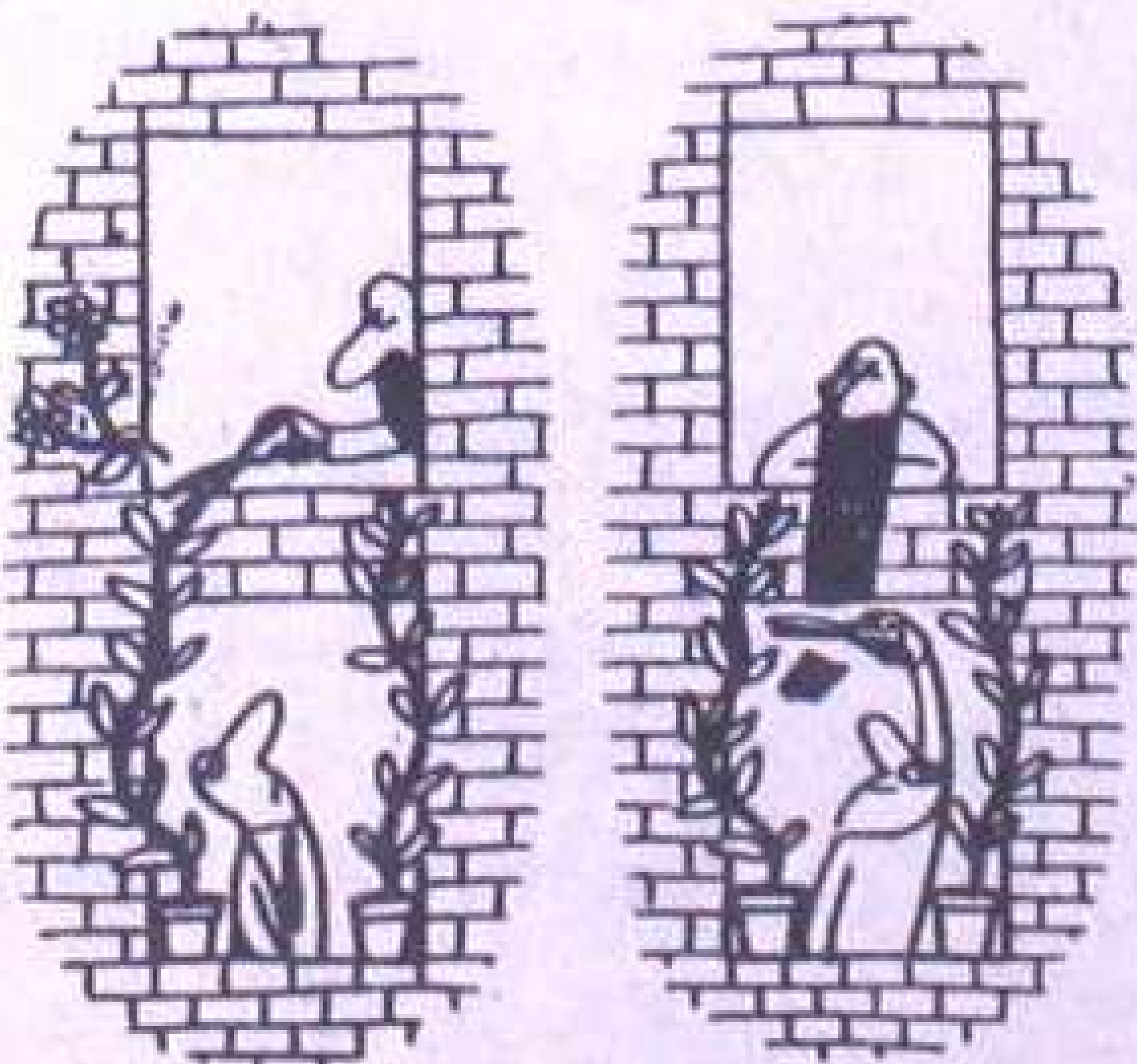
”کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ شہزادے نے دربار میں ہماری توہین کی ہے؟“

”نہیں خاقان۔“ جاموئی خاتون کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”اس کے علاوہ کچھ کہنا ہے تو کل کہنا۔ ہم اور کچھ سننا نہیں چاہتے۔“ خاقان بیٹھے سے اُکھڑ گیا۔ خاقان نے شاہانہ انداز اختیار کر لیا لیکن جاموئی بھلا دبنے والی تھی آخر وہ ولیعہد کی ماں بھی تو تھی۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ شہزادے چنگ کم نے آپ کی توہین نہیں کی بلکہ شہنشاہ قبلائی خان نے اپنے ولیعہد کی توہین کی ہے۔“

خاقان تعجب سے جاموئی خاتون کا مُنہ دیکھنے لگا۔ جاموئی سمجھدار اور خاموش طبیعت کی عورت تھی۔ آج اس میں اتنی جرأت کیسے پیدا ہو گئی۔ ”جاموئی تم پاگل ہو گئی ہو۔ ہم خاقان ہیں۔ ہم دنیا کے بادشاہ ہیں۔ ہماری رگوں میں چنگیزی خون ہے۔ ہم اپنی توہین کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ ہم نے تمہاری خاطر اپنا غصہ



قہقہے میں سمو دیا۔ ورنہ قسم ہے نیلے آسمان کی تمہارے بیٹے کا سر فرش کی سجاوٹ بن گیا ہوتا۔"

خاقان کی بات سُن کر جاموئی کا خون کھولنے لگا۔ وہ بستر سے کھڑی ہوگئی اور خاقان کے سامنے سینہ تان کر بولی: "خاقان میں بھی نیلے آسمان اور خانِ اعظم کی رُوح کی قسم کھاتی ہوں کہ اگر تم شہزادے پر تلوار بلند کرتے تو میں اُس پر وار کرنے سے پہلے ہی اپنا خنجر تمہارے پہلو میں پیوست کر دیتی۔"

قبلائی خان، دُنیا کا خاقان، جاموئی خاتون کی زبان سے یہ بات سُن کر سُن پڑ گیا۔ جاموئی جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔ خاقان نے کچھ سوچ کر اُسے آواز دی۔ "جاموئی بیٹھ جا۔" خاقان کا لہجہ نرم تھا۔ جاموئی سمجھی خاقان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ واپس آ کر بیٹھ گئی۔ خاقان نے جاموئی کی ٹھوڑی انگلی سے اُوپر اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا: "جاموئی ذرا یہ تو بتا اگر میں شہزادے پر تلوار اُٹھاتا تو وہ کیا کرتا؟"

جاموئی نے اُس کے سوال کا مطلب شاید سمجھ لیا تھا۔ مگر وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ اُس نے ٹالنے کے لیے کہا۔ "میں کیا جانوں۔"

خاقان کی تسلی نہ ہوئی اُس نے پھر پوچھا: "جاموئی تو شہزادے کی ماں ہے۔ تُو نے اُسے دُودھ پلایا ہے۔ تو میری بہ نسبت شہزادے کی فطرت کو زیادہ سمجھتی ہے۔ ذرا سوچ کے بتا وہ کیا کرتا؟"

"میں جادُوگرنی نہیں جو آنے والے حالات بتاؤں۔" جاموئی نے کہا: "صرف اندازہ لگا سکتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے جاموئی پھر کھڑی ہوگئی۔ وہ جلد سے جلد اپنے محل پہنچنا چاہتی تھی۔ "اور میرا اندازہ ہے... " جاموئی کہتے کہتے رُکی مگر زبان پر آئی ہوئی بات کب رُکتی ہے۔ "میرا اندازہ ہے کہ اگر خاقان شہزادے پر تلوار اُٹھاتے تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا۔ خاقان کو اپنے ولی عہد سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ ایک ماں کا پیار اُجڑ جاتا... لیکن..."

"لیکن کیا۔ جاموئی... اپنی بات پوری کر۔"

جاموئی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور اُس نے کہا "لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ چین اپنے شہنشاہ اور دُنیا اپنے خاقان سے محروم ہو جاتی۔ جاموئی کا سہاگ لُٹ جاتا۔"

"جاموئی..." خاقان شیر کی طرح گرجا لیکن جاموئی پیر پٹختی ہوئی دروازے سے نکل چکی تھی۔ خاقان کہہ رہا تھا۔ "خاقان ایسے دشمنوں کا سر کچلنا جانتا ہے۔"

قبلائی خان بے چین تھا۔ اُس نے میدانِ جنگ میں شکست نہ کھائی تھی لیکن گھر کے محاذ پر اُس کی بیوی اور بیٹا اُسے شکست دینے پر کمربستہ نظر آ رہے تھے۔ وہ کمرے سے نکل کر باغ میں آ گیا۔ اس باغ میں اُس نے پھلوں اور پھولوں کے درختوں کے علاوہ دشت کی لمبی لمبی گھاس بھی ایک قطعے میں لگوائی تھی۔ اِس گھاس کو دیکھ کر اُسے وہ دشت و جبل یاد آ گئے جنہیں عبور کر کے وہ قراقرم سے تاتائی تو پہنچا تھا۔ لمبی لہراتی گھاس اندھیرے میں سبز کے بجائے سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا کہ قراقرم کو چھوڑ کر ہم نے کیا پایا لیکن اُس کے دل نے کوئی معقول جواب نہ دیا۔ قراقرم کا خیال آتے ہی اُس نے اپنے جسم میں ایک نئی توانائی محسوس کی۔ اُس نے سیاہی مائل سبزے پر نگاہ گاڑ دی... پھر اس سیاہی سے ایک کرن پھوٹی اور اس کرن کے دوش پر خاقان اعظم چنگیز خان کا ہیولا اُبھر آیا۔ وہی خون میں ڈوبی ہوئی آنکھیں۔ وہی ٹیڑھی تلوار کی نوک سے ٹپکتے ہوئے لہو کے قطرے۔ اِن قطروں کے پس منظر میں گول انسانی کھوپڑیوں کے مخروطی اہرام۔ خاقان قبلائی خان، چنگیز کے ہیولے کو دیکھ کر ذرا دیر کے لیے کانپ گیا پھر سنبھلا اور ایک قدم اُس ہیولے کی طرف بڑھا۔ ہیولا متحرک ہوا اور اُس کے لب ہلے۔ فضاؤں میں ارتعاش پیدا ہوا اور آواز قبلائی خان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"قبلائی خاقانی کرنا ہے تو چنگیز کا جگر پیدا کر۔ منگول آگ ہے۔ شعلہ ہے۔ وہ طغیانی ہے جو اپنے راستے میں آنے والے پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ منگول کے عزائم کے آگے نہ کوئی بیوی ہے، نہ کوئی بیٹا۔ ضرورت پڑے تو اِن لاشوں سے گزر کر اپنا راستہ بنا۔"

آواز ختم ہوگئی۔ ہیولا غائب ہوگیا۔ خاقان نے اس طرح انگڑائی لی جیسے تھکن اور درد کو جھٹک کر دُور پھینک رہا ہو۔ اب اس کی نظروں میں جلالِ چنگیزی تھا۔ شکوہ خاندان نزدیں تھا ہے ہر چیز بے حقیقت اور اپنے سے کمتر نظر آنے لگی۔ اُس نے پلٹ کر ایک تنومند درخت کو دیکھا اور تلوار نکال کر ایک ایسا ہاتھ مارا کہ درخت کا تنا لہرا کر زمین پر آ گرا۔

خاقان تیز قدموں سے خواب گاہ میں آیا اس نے دیوار پر چڑھے ہوئے سونے چاندی کے پتروں کو اکھاڑ ڈالا تصویروں کو دیوار سے کھینچ کر پیروں سے روندا میزیں اور بستر اُلٹ دیے اُس کا غصہ اب بھی کم نہ ہوا۔ اُس نے شراب اور دودھ کے بھاری

شگوں کو ٹھوکریں مار کر توڑ ڈالا اور پھر ننگی تلوار لے کر باہر آ گیا۔

تینوں لڑکیاں سہمی ہوئی دروازوں کے پیچھے چھپ گئیں۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا جنون ہے۔ کہیں خاقان پاگل تو نہیں ہو گیا، خاقان کو باہر جاتے دیکھ کر وہ لرز اٹھیں ننگی تلوار اُس کے ہاتھ میں تھی۔ دیکھو آج کس کس کی قضا آتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔

.... لیکن کسی کی قضا نہ آئی۔ اُس کی تلوار کسی کے سر پر نہ لہرائی۔ خاقان خوابگاہ سے نکل کر پھر باغ میں آ گیا۔ اُسی سبزے کے کنارے وہ خاقان اعظم سے یہ کہنے آیا تھا کہ قبلائی خان اب چنگیز ہے۔ وہ چنگیز جیسا بہادر اور نڈر ہے۔ وہ راستے میں آنے والوں کو روند سکتا ہے۔ ان پر ہر چیز قربان کر سکتا ہے۔

رات جب شہزادے چنگ کم کو جاموئی خاتون نے اپنے وفادار غلام کے ذریعے خاقان کے خطرناک ارادوں کی اطلاع پہنچائی تو شہزادہ سو رہا تھا۔ اُس کے پہلو میں لالہ رُخ موجود تھی۔ شہزادے نے جشن ختم ہوتے ہی لالہ رُخ کو اپنے محل میں بلوا لیا تھا۔ لالہ رُخ جیسے منتظر ہی بیٹھی تھی۔ وہ بغیر حیل و حجت شہزادے کے محل میں آ گئی۔ شہزادہ اُسے پہلی ہی نظر میں بھا گیا تھا پھر بھی وہ اپنے اطمینان کے لیے شہزادے سے کچھ تحفظات چاہتی تھی۔ شہزادے نے اُسے اپنی آغوش میں کھینچنا چاہا تو لالہ رُخ ہاتھ جوڑ کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ شہزادے نے پیار سے کہا۔

"لالہ رُخ ہمارے قریب آؤ۔ ہم تمہیں پسند کرتے ہیں۔ تم جیسی ماہ پاروں کو شہر شہر بھٹکنے کی بجائے محل میں رہنا چاہیے۔ ہم نے تمہیں اپنے محل کے لیے پسند کیا ہے۔"

لالہ رُخ نے نظر بھر کر شہزادے کو دیکھا اور بولی: "اس عزت افزائی کا شکریہ، شہزادے.... لیکن کیا یہ ظلم نہیں کہ ہوا میں تیرتی چڑیا کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا جائے اور اس کے پر ہمیشہ کے لیے کاٹ دیے جائیں۔ آخر شہزادے کو اپنی داشتاؤں میں ایک اور اضافہ کرنے سے کیا حاصل ہو گا؟"

"لالہ رُخ جاودان کی قسم تُو تو لاما فاگس کی طرح عقل کی باتیں کرتی ہے۔ کیا تبت کے تمام لوگ ایسے ہی عقل مند ہوتے ہیں؟"

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ قابلِ احترام لاما فاگس تبت کے سب سے زیادہ عقلمند انسان ہیں۔ خاقان نے اس کی عقل سے فائدہ اٹھانے کی بجائے کسی اور کام میں لگا دیا ہے۔" لالہ رُخ نے فخر سے کہا۔

"لالہ رُخ مجھ پر اعتبار کر۔ میں تجھے داشتہ کی بجائے اپنی بیوی بنا کر رکھوں گا اور جب میں خاقان بنوں گا تو میرے ساتھ تو تخت پر اسی طرح بیٹھے گی جس طرح ماں جاموئی خاتون، خاقان قبلائی خان کے پاس بیٹھتی ہے۔"

"لیکن میرا خیال شہزادے سے مختلف ہے۔"

"وہ کیا۔ جلدی بیان کر۔ میں تجھے ہر طرح مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔" لالہ رُخ کی محبت شاید شہزادے کے رگ و پے میں سما گئی تھی۔

"آج جشن میں جو واقعہ پیش آیا۔ اُس کے بعد مجھے یہ اُمید نہیں کہ خاقان، شہزادے کو مجھے اپنی بیوی بنانے کی اجازت دے۔ اِس کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

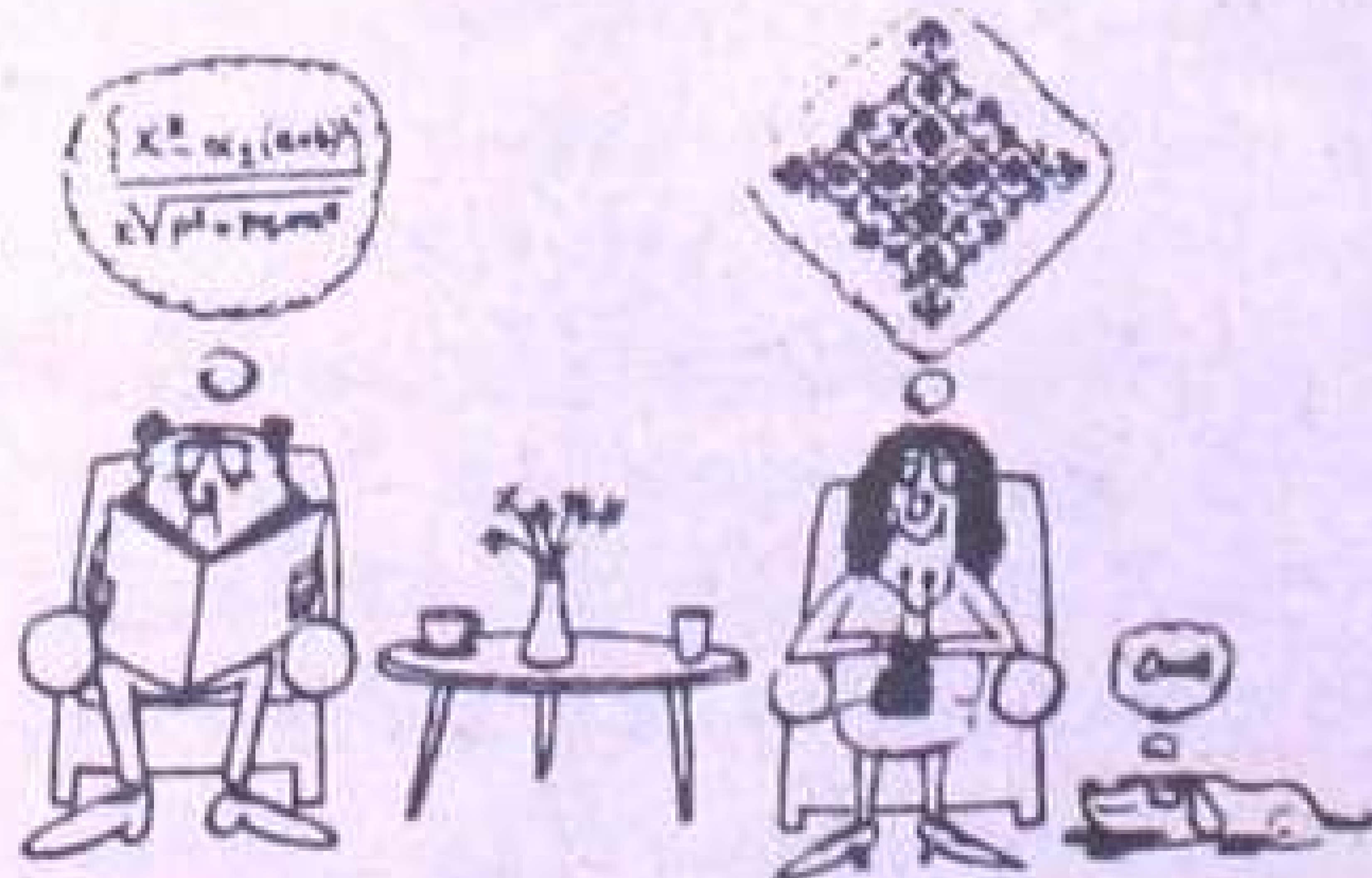
"مجھے بتا۔ تجھے کس بات کا خطرہ ہے۔ بیوی بنانے کے معاملے میں میں آزاد ہوں۔"

"شہزادے یہ بھی ممکن ہے کہ خاقان مجھے قتل کرا دے یا تم سے چھین کر اپنی داشتہ بنا لے۔"

"ہرگز نہیں۔" شہزادہ چنگ کم چیخا۔ "میری زندگی میں یہ نہیں ہو سکتا۔ لالہ رُخ اطمینان رکھ۔ میری رگوں میں بھی مغل خون دوڑ رہا ہے۔ اگر کبھی ایسا وقت آیا تو خاقان کو ایک پہاڑ سے ٹکرانا ہو گا۔ میری ماں کے قبیلے کنگرات کے جوان خون کی ندیاں بہا دیں گے اور میں تیرے لیے جان پر کھیل جاؤں گا۔"

لالہ رُخ کو اطمینان سا ہونے لگا پھر بھی اُس نے ایک اور سوال کیا۔ "شہزادے اگر ایسا ہے تو جس وقت خاقان نے مجھے اپنی آغوش میں کھینچا تھا تو تیرے مغل خون نے جوش کیوں نہ مارا۔"

"لالہ رُخ میں اس وقت خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا کہ غلطی میری تھی۔ میں نے سرِ محفل تیرا ہاتھ پکڑ کر خاقان کی توہین کی تھی۔"



... اس نے میری غلطی بخشتے ہیں آزادی لیکن مجھے اپنی آغوش میں لے کر خاقان نے اپنا بدلہ لے لیا۔ میری غلطی کی سزا مجھے مل گئی۔ وہ بات ختم ہوگئی۔ اگر خاقان نے اب کوئی قدم اٹھایا تو یہ خاقان کی غلطی ہوگی۔ وہ اپنی طاقت کا غلط استعمال کرے گا:

لالہ رُخ خاموش رہی۔ شہزادے نے اُسے کھینچ کر اپنے پہلو میں گرا لیا۔

شہزادے کو بیدار کرنے کی کسی کو ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آخر یہ کام بھی جاسوس کے غلام ہی نے کیا۔ اُس نے شہزادے کی خواب گاہ پہ دستک دے کر اُسے جگایا اور جب اُسے جاسوس کا پیغام دیا گیا تو وہ پریشان ہوگیا۔ وہ ابھی ولیعہد تھا۔ جب کہ اُس کا باپ شہنشاہِ چین تھا۔ غلام کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اپنے محل میں ٹھہرنا اس کے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ اُس نے کسی محفوظ جائے پناہ کے لیے اپنا ذہن دوڑایا۔ اُس نے لاما فاگس کے بارے میں سوچا۔ اُس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا ن اُس کے استوپ نما مکان میں محراب نما صرف چار کمرے تھے اں وہ اکیلا رہتا تھا۔ ایک کمرہ اُس کی خواب گاہ۔ دوسرا کمرہ دفتر تھا اور باقی دو کمروں میں اُس کے کاغذات پھیلے رہتے تھے۔ لاما فاگس، خاقان کے حکم کے مطابق آج کل ایسے حروفِ تہجی کی ترتیب میں مشغول تھا جو دُنیا کی تمام زبانوں کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ اُس کے مختصر مکان میں ایک دن بھی چھپنا ممکن نہیں تھا۔ چینی اُسے پناہ دے سکتے تھے وہ طاقتور بھی تھے لیکن وہ قبلائی خان کی دیوتاؤں کی طرح پرستش کرتے تھے اُن پر اعتماد کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لے دے کے اب مسلمان بچتے تھے۔ رصدگاہوں، چھاپہ خانوں اور کتب خانوں میں بہت سے ایسے مسلمان تھے جن سے شہزادے کے مراسم تھے چینیوں نے مسلمانوں کے خلاف اُس کے بہت کان بھرے تھے لیکن اُسے مسلمان پسند تھے۔ شہزادہ مسلمانوں کو قابلِ اعتماد اور وفادار سمجھتا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعاون کیسے حاصل کیا جائے ان کا لیڈر اور قائد احمد ایرانی تھا۔ جس سے شہزادہ کا اختلاف تھا۔ یہ اختلاف بالکل یک طرفہ تھا۔ احمد کو شہزادے سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ جب کہ شہزادہ اُس سے نفرت کرتا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ شہزادے کو احمد ایرانی سے جتنی نفرت تھی، وہ اتنی ہی احمد کے بیٹے احمدون سے محبت کرتا تھا۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ ان کی دوستی کا علم احمد کو بھی تھا۔ احمدون کو یہ بھی معلوم تھا کہ شہزادہ اس کے باپ کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے باوجود اُن میں دوستی اور خلوص کا رشتہ قائم تھا۔ وہ ایک دوسرے کے راز دار تھے۔

آخر شہزادے نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ لالہ رُخ اب تک سو رہی تھی۔ اُسے خبر نہ تھی کہ اُس کے خان بالیغ میں قدم رکھتے ہی ایک طوفانِ عظیم کھڑا ہوگیا ہے۔ شہزادے نے اُسے آہستہ سے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ شہزادے نے اُسے خطرے سے آگاہ کیا۔ لالہ رُخ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہ اپنی وجہ سے شہزادے کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اُس نے شہزادے سے خواہش کی کہ اُسے سرحد پار پہنچا دیا جائے۔ شہزادہ کیسے قبول کر لیتا۔ لالہ رُخ اُس کے دل میں سما چکی تھی۔

شہزادے نے غلام سے دو جوڑے کپڑے منگوائے ایک جوڑا مغل غلام کا دوسرا چینی غلام کا جو لالہ رُخ کے جسم پر پورا آ گئے۔



لالہ رُخ اور شہزادہ، غلام کے ساتھ شہر کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ تینوں غلام ہی نظر آتے تھے۔ انہیں کسی نے نہیں پہچانا اور نہ کسی نے توجہ دی۔ وہ اُس راستے پر چلنے لگے جو احمد کے محل کو جاتا تھا۔ شہزادے نے غلام کو واپس کر دیا۔ احمد نے اپنا محل نہ جانے کس خیال سے شہر کے باہر ایک ویران علاقے میں بنوایا تھا۔ اُس نے شاید اپنے طور پر کوئی پیش بندی کی تھی۔ شہزادے نے لالہ رُخ کو راستے میں بتایا کہ وہ پناہ لینے کے لیے اپنے دشمن کے گھر جا رہا ہے۔ لالہ رُخ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، وہ شہزادے کا مُنہ دیکھتی رہ گئی۔ اُس کی مثال تو ایک گائے جیسی تھی جس کی رسّی شہزادے کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ دیر میں دونوں وزیر مالیات احمد ایرانی کے محل تک پہنچ گئے۔ شہزادہ اس محل کے قریب سے اپنے دوست احمدون کے ساتھ ایک بار گزرا تھا لیکن محل کے اندر آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس محل کی تعمیر احمد نے ایرانی طرز پر کرائی تھی۔ شہزادے نے احمدون کو اپنی آمد کی اطلاع کرائی، احمدون اپنے باپ احمد ہی کے محل میں رہا کرتا تھا۔

اتنی رات گئے شہزادے کی آمد سے احمدون پریشان ہو گیا۔ لالہ رُخ شہزادے کے ساتھ تھی۔ احمدون سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ رات جشن میں وہ بھی موجود تھا اور دور بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ لالہ رُخ کو بحفاظت شہزادے کے محل تک پہنچانے کا فرض بھی احمدون نے ادا کیا تھا۔ احمدون انہیں ایک کمرے میں لے گیا۔ شہزادے نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"احمدون ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ہمیں اُس وقت تک پناہ چاہیے جب تک ہم چین کی سرحد سے نکلنے کے انتظامات نہیں کر لیتے۔"

احمدون کو پہلے ہی خطرہ محسوس ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔ "شہزادے میری جان تمہارے لیے حاضر ہے لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ جگہ محفوظ ہے؟"

"احمدون یہ محل محفوظ ہی نہیں بلکہ محفوظ ترین ہے۔" شہزادہ بولا۔ "بشرطیکہ تمہارے والد ہمیں پناہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔"

احمدون کو معلوم تھا کہ شہزادہ اُس کے باپ کو پسند نہیں کرتا لیکن وہ اس وقت جس مصیبت میں تھا، اُس کا تقاضا تھا کہ اُس کی مدد کی جائے۔ احمدون نے کہا: "شہزادے! آپ اُن سے گفتگو کر کے تو دیکھیں۔ میرا خیال ہے، وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔"

شہزادہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ یہاں تک خطرہ مول لے کر آیا تھا اس لیے آگے بھی خطرہ مول لینا تھا۔ وزیرِ مالیات احمد ایرانی ملکِ چین کا مردِ آہن تھا اُسے صرف اِسی جگہ پناہ مل سکتی تھی۔

"احمدون کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا باپ حالات سے آگاہ ہو کر ہم دونوں کو گرفتار کرا دے۔"

احمدون کو یوں محسوس ہوا جیسے شہزادے نے اُسے گالی دے دی ہو۔ اُس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "شہزادے چنگ کم، ہم مسلمان ہیں۔ گھر آئے ہوئے مہمان کی حفاظت یوں بھی ہم پر فرض ہو جاتی ہے۔ یقین کرو کہ اگر میرے باپ نے حفاظت کا وعدہ کر لیا تو اُن کی زندگی میں خاقان کا ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

شہزادہ، احمد سے ملنے پر رضامند ہو گیا۔ احمد اُس کا آخری سہارا تھا۔ وزیرِ مالیات کو بیدار کیا گیا۔ شہزادے کی آمد کی خبر پا کر وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اُسے تو رات ہی ہنگامہ ہونے کا خطرہ تھا۔ احمد شہزادے سے بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آیا۔

شہزادہ اس سے نادم تھا اس لیے دھیمی آواز میں بولا۔ "مجھے معلوم ہے، تمہارا دل میری طرف سے صاف نہیں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سلطنتِ چین میں صرف تمہارا ہی محل ہے، جہاں خاقان کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔"

احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میں ولیعہد شہزادے کو یقین دلاتا ہوں کہ شہزادے کو میری طرف سے غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا اور شہزادے نے مجھے کبھی اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ولی عہد شہزادہ مجھے اپنے بیٹے احمدون سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

شہزادے کے دل میں احمد کا وقار بڑھ گیا۔ اُس کا دِل بڑی حد تک صاف ہو گیا۔ "احمد کیا آپ مجھے واقعی احمدون سے زیادہ چاہتے ہیں؟"

"شہزادے کو یقین کرنا چاہیے۔" احمد نے متانت سے کہا۔

"پھر آپ اپنے بیٹے کی قسم کھا کر کہیے کہ آپ ہمیں دھوکا نہیں دیں گے۔ میں نے سُنا ہے کہ مُسلمان اپنی قسم نہیں توڑتے۔"

"بے شک۔" احمد بولا۔ "مسلمان قسم کھانے سے پرہیز کرتے ہیں لیکن اگر قسم کھا لیں تو اسے کبھی نہیں توڑتے۔ میں احمدون کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ ولیعہد پر احمدون جیسے ہزاروں بیٹے قربان کر سکتا ہوں۔"

لالہ رُخ تمام گفتگو کے دوران پردے کے پیچھے کھڑی رہی۔ وہ وزیرِ مالیات اور اس کے بیٹے کی شرافت و دیانت کی قائل ہو گئی۔ شہزادے کو احمد کی باتوں پر اعتبار کرنا پڑا۔ اس نے خود کو اور لالہ رُخ کو احمد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ احمد نے شہزادے اور لالہ رُخ کو اپنے محل کے ایک پوشیدہ حصّے میں منتقل کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کی حفاظت کے لیے بھی احکام دے دیے۔

سویرا ہُوا تو خان بالیغ (ٹائی تو) میں یہ خبر پھیل گئی کہ خاقان قبلائی خان تن تنہا رات کے آخری حصّے میں اپنے محل سے نکل کر سبز پہاڑی پر چلا گیا ہے۔ احمد نے سُنا تو اُسے اطمینان ہو گیا کہ شہزادے اور لالہ رُخ کی گرفتاری کا خطرہ تھوڑے دِنوں کے لیے ٹل گیا۔ اب جو کچھ ہونا تھا، وہ خاقان کی واپسی پر ہی ہوگا۔ احمد نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اگر ممکن ہوا تو وہ ان دونوں کو کچھ دنوں کے لیے تبت بھیج دے گا تاکہ یہ خاقان کی نظروں سے دور رہیں اور بات آہستہ آہستہ دب جائے۔

سبز پہاڑی، شاہی محل سے ایک تیر کی مسافت پر تھی یہ پہاڑی مصنوعی تھی جسے خاقان کے حُکم سے اس کے آدمیوں نے بنایا تھا۔ اس کی اونچائی ڈیڑھ سو فٹ تھی۔ سبز پہاڑی کے قطر کا اندازہ ایک میل ہے۔ یہ پہاڑی ایسے درختوں سے ہمیشہ ہری بھری رہتی جن کے پتے موسم خزاں میں بھی نہ جھڑتے تھے۔ خان قبلائی خان کو شجرکاری کا اتنا شوق تھا کہ جب کسی جگہ کسی نادر درخت کا ذکر سُنتا تو فوراً اس کو منگوا بھیجتا اور سبز پہاڑی پر لگا دیا جاتا۔ پہاڑی کی چوٹی پر خاقان نے اپنے لیے ایک مکان

بنوایا تھا۔ یہ مکان اندر اور باہر دونوں طرف سے سبز رنگ کا تھا۔ اس گھر کو قبلائی خان نے "تسکین گھر" کا نام دیا تھا۔

احمد حسبِ معمول خاقان کے دربار میں پہنچا۔ اُسے خاقان کے سبز پہاڑی پر جانے کا علم تھا لیکن اس نے تمام اُمرا اور وزرا پر یہی ظاہر کیا کہ یہ بات اُسے دربار میں آ کر معلوم ہوئی ہے۔ وزیروں نے اپنے اپنے انداز میں خاقان کے سبز پہاڑی پر جانے پر رائے زنی کی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اصل حقیقت کا علم محل میں جاموئی خاتون اور دربار میں احمد اور لاما فاگس کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ لاما فاگس کو خود احمد نے اپنے اعتماد میں لے کر اصل حالات سے آگاہ کیا تھا۔ لاما فاگس کی اور احمد کی دوستی خالص سیاسی نوعیت کی اور بغضِ معاویہ کے مصداق تھی۔ چینی ان دونوں کے زیادہ دشمن تھے اس لیے یہ دونوں آپس میں دوست بن گئے اور ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے۔ احمد نے لاما فاگس پر شہزادے کے سلسلے میں اس لیے بھی اعتبار اور اعتماد کیا تھا کہ لالہ رُخ ایک تبتی لڑکی تھی۔ لاما نے احمد کو اپنے پُورے تعاون کا یقین دلایا تھا۔

درباری اُمرا اور شہزادے، خاقان کے بغیر بتائے اور بغیر کسی پیشگی اعلان کے سبز پہاڑی پر جانے سے حیران بھی تھے اور پریشان بھی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ خاقان سے ملاقات کی جائے کیوں کہ ممکن ہے کہ خاقان بیمار ہو اور اپنی کسی خاص بیماری کو چھُپانے کے لیے اُس نے سبز پہاڑی میں پناہ لی ہو۔ باتیں سب کر رہے تھے لیکن سبز پہاڑی پر جانے کی کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی آخر تمام اُمراء اور شہزادوں نے ایک زبان ہو کر احمد کو منتخب کیا کہ وہ دربار کا نمایندہ بن کر سبز پہاڑی پر جائے اور سلطان سے مل کر اصل حالات معلوم کرے۔ احمد خود بھی اپنا دامن صاف رکھنے کے لیے خاقان سے ملنے جانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ سپہ سالار بایاں کے بعد احمد ہی خاقان کو سب سے زیادہ عزیز تھا۔ احمد تھوڑی حیل و حجت کرنے کے بعد سبز پہاڑی پر جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

یہ پہاڑی شہر سے زیادہ دُور نہ تھی۔ احمد پیدل ہی پہاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ سبز پہاڑی کے چاروں طرف آہنی جنگلہ تھا۔ اوپر جانے کے لیے صرف ایک طرف زینہ تھا۔ سیڑھیوں پر جانے کے لیے ایک پھاٹک سے گزرنا پڑتا تھا۔ احمد نے دیکھا کہ گیٹ پر خاقان کے محافظ دستے کے سپاہی موجود ہیں۔ احمد اُن کے پاس پہنچا تو سپاہیوں نے ادب سے معلوم کیا۔ وہ احمد کی عظمت اور مرتبے سے خوب واقف تھے۔ پہریداروں نے احمد کو بتایا کہ خاقان سے ملاقات ممکن نہیں۔ خاقان نے سختی سے اس کی ممانعت کی ہے۔ احمد نے خاقان کو زبانی پیغام بھجوایا اور ملنے کی درخواست کی۔ خاقان نے درخواست نامنظور کر دی اور ملنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس نے احمد کو یہ بھی حکم بھیجا کہ دربار میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ کوئی امیر یا شہزادہ ہم سے اس وقت تک ملنے کی کوشش نہ کرے جب تک اُسے خاقان خود طلب نہ کرے۔ احمد نے ایک بار اور کوشش کی اُس نے خاقان کو پیغام بھیجا کہ اگر خاقان اُسے ملاقات کی اجازت نہ دے گا تو احمد اس وقت تک گیٹ کے سامنے بھُوکا پیاسا کھڑا رہے گا جب تک خاقان پہاڑی سے اُتر کر واپس نہیں آتا۔ اس پیغام میں ضد تھی مگر وفاداری کا اظہار بھی تھا۔ خاقان نے احمد کو اُوپر آنے کی اجازت تو نہ دی مگر یہ کہلوایا کہ احمد واپس جائے، خاقان تین دن بعد خان بالیغ واپس آجائے گا۔ یہ احمد کی زبردست کامیابی تھی۔ وہ خوشی خوشی واپس ہُوا۔ دربار میں سب احمد کا انتظار کر رہے تھے۔ جب انہیں معلوم ہُوا کہ خاقان تین روز بعد خان بالیغ واپس آ رہا ہے تو سب مطمئن ہو گئے۔

تیسرے روز درباری دن بھر خاقان کا انتظار کرتے رہے۔ اُن کی نظریں سبز پہاڑی سے آنے والے راستے پر لگی رہیں۔ صبح سے دوپہر، سہ پہر اور پھر اندھیرا چھا گیا لیکن خاقان نے سبز پہاڑی سے قدم نہ اُتارا۔ سب کو فکر دامن گیر ہُوئی۔ سب سے زیادہ فکرمند خاقان کی بیوی جاموئی خاتون تھی۔ خاقان اور اُس کے درمیان تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود اُسے خاقان کی فکر تھی کیوں کہ وہ خاقان سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ اس نے احمد کو اپنے محل میں طلب کیا لیکن احمد کے پاس کوئی نئی خبر نہ تھی وہ کیا بتاتا۔ رسمی گفتگو کے بعد احمد واپس آ گیا۔ جاموئی نے احمد کو اپنی اور خاقان کی سخت گفتگو کی بابت کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی احمد نے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

رات کو احمد نے ایک خصوصی اجلاس منعقد کرنے کے لیے تمام عمائدین کو مطلع کیا۔ اس نے جاموئی خاتون سے بھی اس اجلاس میں شرکت کی درخواست کی۔ نصف رات کے قریب تمام لوگ دربار کے بڑے ہال میں اکٹھے ہو گئے۔ جاموئی خاتون نے آتے ہی شہزادہ چنگ کم کے بارے میں دریافت کیا۔ کسی کو علم نہ تھا کہ شہزادہ اس وقت کہاں ہے اور جنہیں علم تھا وہ کیوں بتانے لگے۔ شہزادے کی گمشدگی سے درباریوں کے شبہات کو تقویت ہُوئی

اور انہیں یقین ہو گیا کہ شہزادے کی گمشدگی اور خاقان کا سبز پہاڑی پر جانا ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں لیکن جاموئی خاتون کو نہ تو شہزادے کے غائب ہونے کا غم تھا اور نہ حیرت۔ وہ تو خوش تھی کہ شہزادے نے خطرے کی خبر پا کر خود کو کسی محفوظ مقام پر پوشیدہ کر لیا ہے۔ اس خصوصی اجلاس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے ہر شخص بے چین تھا۔ ان کے خیال میں احمد نے اجلاس طلب کر کے اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز کیا ہے کیوں کہ اجلاس طلب کرنے کا اختیار صرف خاقان کو تھا۔

احمد نے خاقان کے تخت کے برابر اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے ہو کر پُروقار انداز میں کہا: "شہنشاہِ چین اور دُنیا کے خاقان قبلائی خان کے جاں نثارو! میں نے آپ کی اتفاق رائے اور حکم کے مطابق تین روز قبل خاقانِ اعظم سے سبز پہاڑی پر ملاقات کی کوشش کی لیکن خاقان نے مجھے اذنِ باریابی نہ دیا۔ صرف یہ حکم ملا کہ خاقان تین روز بعد یعنی آج خان بالیغ واپس آئیں گے لیکن ہماری آنکھوں نے اُن کی راہ دیکھتے دیکھتے صبح سے شام اور پھر رات کر دی۔ خاقان اب تک واپس نہیں آئے اور کسی کو نہیں معلوم کہ خاقان سبز پہاڑی پر مزید کتنے دن قیام کریں گے۔"

ایک چینی سردار سانگا جس کا عہدہ احمد سے بہت نیچا تھا لیکن احمد سے دُشمنی کی راہ میں اُس کے قدم سب سے آگے تھے، وہ اس تمہید سے ناراض ہوا اور بڑے غیر مہذب لہجے میں احمد سے کہا: "اے اَن دیکھے خُدا کو ماننے والے احمد۔ یہ باتیں تو ہمیں معلوم ہیں۔ تُو نے اس کے لیے خاص اجلاس کیوں طلب کیا؟ تجھے اجلاس بُلانے کا حق کس نے دیا؟"

تمام چینی عہدے دار اور احمد کے مخالف مغل شہزادے سانگا کی ہاں میں ہاں ملانے لگے اور اتنا شور و غل ہوا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ صرف جاموئی خاتون اپنی جگہ بیٹھی مسکراتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ سب احمق ہیں۔ احمد نے اجلاس کسی خاص وجہ سے بلایا ہو گا۔ جبھی وہ اتنی لمبی تمہید باندھ رہا ہے۔ احمد بھی اس حماقت انگیز شور و غوغا پر مُسکرا رہا تھا۔ بالآخر شور سے اُکتا کر جاموئی اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔ اسے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ جاموئی نے رُعب دار آواز میں کہا: "خاقان کے وفادارو۔ اجلاس احمد نے بلایا ہے۔ احمد اس کی وجہ بھی بتلائے گا۔ آپ لوگ اُسے بولنے کا موقع دیں اور خاموش رہیں۔"

چینی سرداروں نے احمد کو نفرت سے دیکھا۔ احمد جو ہنگامے کے دوران اپنی جگہ بیٹھ گیا تھا پھر کھڑے ہو کر درباریوں سے مخاطب ہوا: "میرے دوستو! میرا خیال تھا کہ میں تفصیل سے حالات بتلاتا لیکن آپ بہت بے چین نظر آ رہے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو خبر دیتا ہوں کہ شمالی چین میں گوبی کے مقدس ریگ زاروں کو باغی قائدو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ناپاک کر رہا ہے۔ یہ وہی پاک سرزمین ہے جہاں مغلوں کے بزرگ بورجی گون، بے سوکائی یتو جین (چنگیز) اور تولائی کی رُوحیں چاندنی رات میں سیر کرنے آتی ہیں۔ ہمارے بہادر سرحدی دستے قائدو کے سامنے سینہ سپر ہیں لیکن انہوں نے خاقان کو آواز دی ہے۔ اُنہیں فوری کمک کی ضرورت ہے تاکہ قائدو کو سزا دی جائے۔ قائدو نے پھر خاقان کو للکارا ہے لیکن افسوس کہ ہم قائدو کی للکار خاقان تک نہیں پہنچا سکتے۔ ہم اپنے دوستوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ ہم خاقان کو سبز پہاڑی سے نہیں اُتار سکتے۔"

احمد کی تقریر سے درباریوں میں سناٹا چھا گیا۔ دشمنوں کو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ کیا کرے۔ مغل شہزادے گھور گھور کر سانگا کو دیکھ رہے تھے جس نے احمد کی توہین کی تھی۔ ندامت سے سانگا کی نظریں نہ اُٹھتی تھیں۔

سانگا نے دیکھا، وہ لعنت کا نشانہ بن گیا ہے تو اس نے فوراً پینترا بدلا اور بولا: "احمد تُو اور لاما فاگس عقل میں سب سے بلند ہیں۔ تُو ہی اس کا کوئی حل نکال۔ ہم سب تیرے ساتھ ہیں۔"

احمد نے دل ہی دل میں خُدا کا شکر ادا کیا۔ کہاں تو سانگا اُسے ذلیل کرنے پر تُلا ہُوا تھا اور کہاں اب اس کی خوشامد کر رہا ہے۔ جاموئی نے محسوس کیا کہ احمد کی سرِ دربار توہین ہُوئی ہے اس لیے وہ ہچکچا رہا ہے ورنہ احمد نے اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور سوچا ہو گا۔ جاموئی نے احمد سے کہا: "احمد تُو عقل مند ہے۔ انہیں مطمئن کر اور بتا کہ تیرا اعلا دماغ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟"

"اے سلطنتِ چین اور خاندانِ یوآن (بیرونی خاندان) کے رکھوالو۔ اگر تمھیں یہ اُمید ہے کہ احمد پھر خاقان کے پاس جائے تو تمھارا خیال غلط ہے۔ میں خاقان کا ایک ادنیٰ خادم ہُوں اور خاقان کے جلال کو للکارنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن...؟"

احمد نے ٹھہر کر سب کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کی... پھر بولا۔ "لیکن خاقان کو واپس لانے کی ایک تدبیر میرے ذہن میں ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو خاقان واپس آنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"جلد بتا احمد۔ جلد بتا احمد۔" کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں۔

احمد نے دیکھا کہ سب کے دماغ درست ہو گئے ہیں اور

اب وہ پوری طرح اُس پر انحصار کر رہے ہیں تو اس نے کہا۔ اگر آپ تیار ہوں تو احمد سلطنتِ چین کے لیے ایثار کرنے پر آمادہ ہے۔ اگر خاقان کو واپس لانا ہے تو آپ سب لوگ اسی وقت میرے ساتھ سبز پہاڑی پر چلیے۔ ہم پہاڑی کے پاس پہنچ کر دو نعرے بلند کریں گے۔ ہمارا پہلا نعرہ ہوگا "چین اور یوآن خطرے میں ہے"۔ ۔ ۔ اور دوسرا نعرہ۔ ۔ ۔ "خاقان واپس آؤ" ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ خاقان اِن دو نعروں سے ضرور متاثر ہوگا۔ سلطنتِ چین کی خوشحالی کے لیے خاقان نے اپنے دماغ کی بہترین صلاحیتوں کی قربانی دی ہے اور خاندانِ یوآن کی عظمت کی خاطر اُس نے اپنا خون بہایا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ خاقان سبز پہاڑی پر خاموش بیٹھا رہے۔ اس کا دِل پگھل جائے گا اور ہم کامیاب ہوں گے۔"



احمد کی ترکیب کامیاب ہُوئی۔ پہلے ہی نعرے پر خاقان بے چین ہو کر سبز پہاڑی کی سیڑھیوں پر آ گیا۔ ۔ ۔ پھر باہر آ گیا۔ وہ چین اور خاندانِ یوآن کو خطرے میں گھرا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خاقان اپنے درباریوں اور خصوصاً احمد کے جذبہ حُب الوطنی سے بہت خوش ہُوا۔ جاموئی خاتون جان بُوجھ کر ان کے ساتھ نہ آئی تھی کہ مبادا خاقان اُسے دیکھ کر ناراض ہو جائے پھر جس طرح تاروں کی چھاؤں میں دُلہن کی رُخصتی ایک نیک شگون خیال کیا جاتا ہے، اسی طرح خاقان بھی تاروں کی چھاؤں میں سبز پہاڑی کو الوداع کہہ کر درباریوں کے ساتھ خان بالیغ واپس آ گیا۔
اُس رات خاقان قبلائی خان نے کسی لڑکی کو اپنی خواب گاہ میں نہ آنے دیا۔ اُن کی بجائے احمد، لاما فاگس اور دوسرے عہدیدار اُس کے پاس رہے اور قائدو کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔

احمد نے خاقان کی رات والی گفتگو سے اندازہ کیا کہ صبح ہوتے ہی لشکر کو کوچ کا حکم دیا جائے گا لیکن اس کے برعکس اس کے غلام نے اُسے سب سے پہلے یہ خبر سُنائی کہ ان تمام مغل سرداروں کے محل اور مکانات کو شاہی لشکر نے گھیرے میں لے لیا ہے جن پر شہزادہ چنگ کِم سے وفاداری کا شبہ تھا۔ اس لپیٹ میں لاما فاگس کا مکان یا استوپ بھی آ گیا۔ خاقان نے صبح کو قائدو سے مقابلے کی تیاری کے بجائے شہزادے اور لالہ رُخ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ گھر گھر تلاشی شروع ہو گئی۔ سرحدیں بند کر دی گئیں۔ شہزادہ اور لالہ رُخ کو "باغی اور غدّار" قرار دے کر ان کی گرفتاری پر انعام کا بھی اعلان ہُوا۔

شہزادہ چنگ کِم اور لالہ رُخ، احمد کے محل میں روپوش تھے۔ احمد کو اس خبر سے کوئی پریشانی نہ ہُوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے محل کی یا تو تلاشی نہ ہوگی یا پھر سب سے آخر میں تلاشی لی جائے گی۔ اس نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ وہ ان دونوں کو ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا۔ اس میں احمد کا مفاد بھی تھا۔ شہزادہ چنگ کِم کسی وقت خاقان بن سکتا تھا لیکن اس وقت احمد کو یہ دکھانا بھی مقصود تھا کہ مسلمان اپنی قسم کا کس درجہ پاس کرتا ہے۔ احمد نے دن چڑھے تک اپنے محل میں ٹھہر کر حالات کا اندازہ کیا اور جب اس کے غلام نے اُسے بتایا کہ لاما فاگس کے مکان کی تلاشی ہو چکی ہے تو وہ غلام کو کچھ دیر آہستہ آہستہ سمجھاتا رہا پھر دربار کی طرف روانہ ہو گیا۔

دربار میں خاقان قبلائی خان کسی زخمی شیر کی طرح ٹہل رہا تھا۔ خاقان کو گٹھیا کی خاندانی بیماری تھی اور تیز چلنے سے گریز کرتا تھا اس وقت وہ لمبے لمبے ڈگ اُٹھاتا دربار میں گشت کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ انگارا بلی سی تھیں۔ سانس اتنا تیز جیسے سانپ پھُنکار رہا ہو۔ مغل اور چینی عہدے دار سر جھکائے اور منہ لٹکائے ایک ایک کر کے دربار میں آ رہے تھے۔ اُن کی خانہ تلاشی لے کر خاقان نے اُن کی نیت اور وفاداری پر شک کیا تھا۔ شہزادہ چنگ کِم اور لالہ رُخ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ احمد دربار میں پہنچا اور تعظیم بجا لایا لیکن خاقان نے کوئی توجہ نہ دی۔ اُس کا غصّہ تیز ہوتا جا رہا تھا اسی دوران لاما فاگس بھی آ گیا۔ احمد اور لاما فاگس میں اشاروں ہی اشاروں میں کچھ باتیں ہُوئیں۔ دوپہر تک تمام عہدے دار اور اُن کی تلاشی لینے والے ناکام ہو کر دربار پہنچ چکے تھے۔ اس ناکامی نے خاقان کے غصّے کو اور بھڑکا دیا۔

خاقان صبح سے اب تک بے تکان ٹہل رہا تھا۔ تمام درباری بھی اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے پھر خاقان نے ایک دم قدم روکے اور اپنے محافظ دستوں کو حکم دیا کہ تمام بیگمات کے محلات کا محاصرہ کر لیا جائے اور دستوں کے بڑھنے سے پہلے وہ خود جاموئی خاتون کے محل کی طرف ایسی تیزی سے چلا جیسے دوڑ رہا ہو۔ خاقان، جاموئی کے محل میں داخل ہُوا تو وہ باہر آ رہی تھی۔ خاقان نے شیر کی طرح دھاڑ کر پوچھا "جاموئی بتا۔ تُو نے شہزادے کو کہاں چھپا رکھا ہے؟" خاقان جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ جاموئی کی زبان ایک بار پہلے بھی کھُل چکی تھی۔ وہ بالکل ہی خوف زدہ نہیں تھی۔

"میں نہیں جانتی شہزادہ کہاں ہے اور اگر جانتی بھی ہوتی

تو نہ بتاتی۔ میں اپنے بیٹے کو موت کے حوالے ہرگز نہ کرتی۔"

"تو جھوٹ بول رہی ہے۔ میں تیرے محل میں آگ لگا دوں گا۔ خاک کر دوں گا۔" خاقان غراتے لگا۔

جاموئی کو دھمکی بہت ناگوار گزری۔ اس نے بھی اکھڑ لہجہ اختیار کیا اور تیز آواز میں کہا: "خاقان اب یہ محل میرا نہیں، تیرا ہے۔ مجھے تو اس جگہ سے اُسی وقت نفرت ہو گئی جب تو میرے بیٹے کے خون کا پیاسا ہوا اور وہ بھی ایک معمولی لڑکی کی خاطر۔ تو جوں جوں بوڑھا ہو رہا ہے، تیری عیاشیاں اور ہوس بڑھتی . . ." وہ شاید کچھ اور کہتی لیکن خاقان نے تلملا کر جاموئی کے منہ پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ لڑھکیاں کھاتی دُور جا پڑی۔ اس کے دو دانت ٹیڑھے ہو گئے اور منہ خون سے بھر گیا۔ جاموئی کی شادی ہوئے، بائیس سال ہو چکے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ خاقان نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔ خاقان نے زمین پر گری ہوئی جاموئی پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے بڑھ گیا۔

جاموئی کے محل کی تلاشی بڑی احتیاط سے ہوئی لیکن خاقان کو شہزادے کا کوئی سراغ نہ ملا۔ شہزادے کی تلاش میں خاقان کو جو ناکامی ہو رہی تھی، اس سے اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔ شہر خان بالیغ اور اس کی بیرونی آبادی میں ایک ایک جگہ اور ایک ایک گھر کی اچھی طرح تلاشی لی گئی مگر خاقان کے محافظ دستے کو ہر جگہ ناکامی ہوئی۔



خاقان اپنے دربار میں سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ دربار میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ احمد اپنی جگہ خاقان پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ یکایک خاقان نے سر اٹھایا اور پژمردہ آواز میں پوچھا: "کچھ پتہ لگا، کہاں چلا گیا چنگ؟"

"نہیں خاقانِ معظم۔ ہم نے چپہ چپہ چھان مارا مگر کامیابی نہ ہوئی۔" دستے کے سردار نے کہا۔

"میرا خیال ہے، وہ دونوں سرحد پار کر گئے ہیں۔" ایک چینی عہدے دار نے خیال ظاہر کیا۔

"اور میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک کسی ایسی جگہ چھپے ہوئے ہیں جہاں ہمارے سپاہی نہیں پہنچ سکے۔" سانگا نے کہا۔

محافظ دستے کے سردار کو سانگا کی بات پر غصہ آ گیا۔ اس نے کہا: "یہ غلط ہے۔ ہم نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ ہماری نظروں نے شہزادے کو محلوں سے جھونپڑیوں تک ہر جگہ ڈھونڈا ہے۔"

سانگا نے محافظ سردار کو پھر جھٹلایا۔ اس نے کہا: "ہو سکتا ہے کہ کوئی جگہ ایسی ہو جہاں تمھارا خیال ہی نہ گیا ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے احمد کی طرف دیکھا۔ سانگا نے احمد کی طرف دیکھ کر سردار کو ایک واضح اشارہ کیا تھا۔ سردار اس اشارے پر چونک پڑا۔ احمد کے محل کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر اُسے خیال آتا بھی تو وہ خاقان کی اجازت کے بغیر تلاشی لینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ سردار سانگا کو جواب نہ دے سکا۔ سانگا نے سردار کی خاموشی سے یہ اندازہ کر لیا کہ اس کا خیال درست ہے اور احمد کے محل کی اب تک تلاشی نہیں ہو سکی ہے۔

❁ سچائی کو دبایا جا سکتا ہے، مٹایا نہیں جا سکتا۔
❁ خود پر قابو پا لو، تم پر کوئی قابو نہیں پا سکے گا۔
❁ تم چاند اور سورج کیوں نہیں بنتے کہ تمھاری وجہ سے نور پھیلے۔
❁ دوسروں کو معاف کر دو لیکن خود کو معاف نہ کرو۔

"ہاں سردار، ٹھیک سے یاد کرو کوئی ایسی جگہ تو باقی نہیں رہ گئی جہاں تمھارے سپاہی نہ پہنچے ہوں۔"

سردار عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔ اُسے خاقان کے سامنے جھوٹ بولنے کا حوصلہ نہ ہوا اور اس صورت میں کہ سانگا، احمد کے نام کو بے نقاب کرنے پر تلا ہوا تھا۔ آخر سردار کو کہنا پڑا: "سانگا کا خیال درست ہے۔"

خاقان جو اب تک درباریوں کی گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا ایک دم چونک پڑا۔ اس نے تیز آواز میں کہا: "کیا کہا تو نے؟ تمھیں ہماری حکم عدولی کی ہمت کیسے ہوئی۔ ہم نے تو بیگمات کے محلات کی تلاشی کا بھی حکم دیا تھا۔ پھر تم نے کون سا گھر چھوڑا ہے؟"

سردار سہم کر بولا: "ہم نے عالی مقام وزیرِ مالیات احمد کے محل کا رُخ نہیں کیا۔ میری غلطی معاف فرمائی جائے خاقان۔ میرا خیال تھا کہ شاید خاقان ہمیں اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔"

احمد کے نام میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ خاقان فوراً نرم پڑ گیا۔

سانگا، خاقان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر خاقان نے احمد کے محل کی تلاشی کا حکم نہ دیا تو وہ خاقان سے درخواست کرے گا کہ احمد کے محل کی تلاشی لی جائے لیکن اس کا موقع نہ آیا۔ احمد نے پہلے سانگا کی طرف

دیکھا پھر خاقان سے مخاطب ہُوا: "احمد، شہنشاہِ چین و خاقانِ عالم کا نمک خوار غلام ہے اس لیے احمد، خاقان سے درخواست کرتا ہے کہ محافظ دستے کے سردار کی اس غلطی کو معاف کیا جائے اور اُسے حکم دیا جائے کہ وہ میرے مکان کی تلاشی لے کر خاقان کو آگاہ کرے۔"

خاقان نے احمد کا نام سُن کر سر جھکا لیا تھا۔ اس نے سر اُٹھا کر احمد کو دیکھا اور سردار کو تلاشی کا حکم دے دیا۔



احمد جس وقت اپنے محل سے دربار کی طرف چلا تھا، اُس وقت شہزادہ چنگ کِم احمد کے خفیہ کمرے میں لیٹا ہُوا تھا اور اُس کے چوڑے چکلے سینے پر لالہ رُخ کا پھول جیسا چہرہ تھا۔ لالہ رُخ نے اپنا اُداس چہرہ چنگ کِم کے سینے سے ہٹایا اور بولی: "شہزادے تم نے ناحق مجھ جیسی ایک حقیر رقاصہ کے لیے دُنیا کے خاقان سے لڑائی مول لی۔ تمھیں لڑکیوں کی کیا کمی۔ ایک سے ایک دوشیزہ بڑے فخر سے تمھاری خدمت پر آمادہ ہو سکتی تھی۔"

"لالہ رُخ ایسی بات پھر کبھی نہ کہنا۔ اب ہم صحرائے گوبی کے وحشی منگول نہیں ہیں۔ ہم نے فتوحات حاصل کر کے دولت بھی کمائی ہے اور عقل بھی۔ میرا باپ اگر تموجین (چنگیز) کے نقشِ قدم پر چلتا تو آج خان بالیغ میں سرسبز اور شاداب باغات کے بجائے انسانی سروں کے مینار نظر آتے۔ اب ہم وحشی نہیں رہے۔" شہزادہ اُٹھ بیٹھا۔

"اس لیے تو کہتی ہوں کہ ایسے رحم دل خاقان کی مخالفت چھوڑ دو، وہ تمھارا باپ ہے۔ اُس کے پاس جاؤ گے تو وہ تمھیں معاف کر دے گا۔ تم اس کے ولیعہد بھی تو ہو۔"

"اور تمھارا کیا بنے گا لالہ رُخ؟" شہزادے نے اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"میرا کیا بنے گا۔ میں گرفتار ہو جاؤں گی اور تمھاری محبت کے بدلے قتل کر دی جاؤں گی۔ مجھے یہ سودا مہنگا نہ پڑے گا۔"

"ایسا نہ کہو، لالہ رُخ!" شہزادے نے کہا: "اب میری اور تمھاری زندگی الگ الگ نہیں۔ میری بیویوں اور داشتاؤں نے مجھے برسوں میں وہ کچھ نہ دیا جو تم نے مجھے چند روز کی رفاقت میں دیا ہے۔" لالہ رُخ کو رونا آگیا۔ وہ شہزادے کے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ شہزادے نے اُسے تسلّی دی اور کہا: "دل چھوٹا نہ کرو لالہ رُخ، احمد اگر ہمارا وفادار رہا تو ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے گا۔"

لالہ رُخ کے آنسو نہ رُک رہے تھے۔ وہ بھرائی آواز میں بولی: "مجھے تو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ احمد ہمیں کب تک بچائیں گے۔ ایک نہ ایک روز خاقان کے آدمی ہمیں ڈھونڈھ نکالیں گے۔"

"لالہ رُخ، اگر ایسا وقت آگیا تو تم دیکھو گی کہ چنگ کِم نے بہادری سے لڑتے ہُوئے جان دے دی۔ میں قید ہو کر خاقان کے سامنے ہرگز نہ جاؤں گا۔"

لالہ رُخ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ حسرت سے شہزادے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شہزادے کو شرارت سُوجھی۔ اس نے کہا: "اور اگر خاقان نے میرے بعد تمھیں پکڑ کر اپنے حرم میں ڈال لیا تو تم کیا کرو گی؟"

لالہ رُخ نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے اور شہزادے پر نظر جما کر جواب دیا: "شہزادے اگر ایسا ہُوا تو دُنیا دیکھے گی کہ ایک ناچنے والی لڑکی کس طرح محبت پر قربان ہو گئی۔ میں خنجر سے اپنا خاتمہ کر لوں گی جس نے لالہ رُخ کا ہاتھ پکڑا ہے، وہ اس کے اعتماد اور وقار کو اپنی جان دے کر برقرار رکھے گی۔"

اس وقت بڑی تیزی سے احمد اندر آیا۔ اس نے شہزادے کو بتایا کہ لاما فاگس کے مکان کی تلاشی ہو چکی ہے اور اُن کی روانگی کا وقت قریب ہے پھر وہ جس تیزی سے آیا تھا اُسی تیزی سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد لوگوں نے دیکھا کہ ایک غریب اندھا سر پر ایک رومال ڈالے آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہے۔ اندھے کے ہاتھ میں لاٹھی ہے جس کا دوسرا سِرا بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا پکڑے ہوئے ہے۔ کچھ دیر بعد یہی اندھا لاما فاگس کے مکان کا چکر لگاتا دکھائی دیا اور پھر احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ راستہ دکھانے والا لڑکا بھی اس کے ساتھ تھا۔ لاما فاگس ایک کمرے میں کاغذوں کے اونچے ڈھیر کے پاس بیٹھا تھا۔ اِن کاغذوں کو مکان کی تلاشی کے دوران سپاہیوں نے اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ لاما فاگس ایک ایک کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا اور پھر بڑبڑانے لگتا۔ شاید وہ ان کاغذات کو ڈھونڈ رہا تھا جس پر اُس نے عالمی حروفِ تہجی کا ایک خاکہ بنایا تھا۔ اندھا اور اُس کا رہبر لڑکا جب کمرے میں پہنچے تو لاما فاگس نے ایک نظر باہر ڈالی پھر جلدی سے دونوں کو کاغذ کے اونچے ڈھیر کے پیچھے چھپا دیا اور پھر وہ کاغذ کے چند ٹکڑے لے کر دروازے پر آیا۔ اس نے کاغذ کے ٹکڑوں کو ہوا میں لہرایا اور پاگلوں کی طرح چلا چلا کر کہنا شروع کیا: "لوگو! آؤ دیکھو۔ تلاشی لینے والوں نے میرے قیمتی کاغذات کا کیا حشر کیا ہے۔" راہ چلتے مغل سپاہی اُسے دیکھ کر ہنستے، قہقہے لگاتے

وہ اس فلسفی کو پہلے ہی پاگل سمجھتے تھے۔ کسی کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کے گھر میں آتا اور کاغذوں کے ڈھیر کو دیکھتا مگر دیوانہ بڑا فرزانہ تھا۔

محافظ دستے کا سردار احمد کے محل کی تلاشی لے کر واپس آ گیا اسے دیکھ کر احمد کو ذرا پریشانی ہوئی۔ اُس کا دِل دھڑکنے لگا لیکن جب سردار نے مُردہ آواز میں بتایا کہ شہزادہ، احمد کے محل میں بھی نہیں ہے تو احمد کا دل خوشی سے کھِل اُٹھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہِل رہے تھے پھر اس نے آنکھیں کھول کر سانگا کو تیز نظروں سے دیکھا۔ سانگا نے ندامت سے نظریں نیچی کر لیں۔ احمد نے خاقان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ خاقان سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا پھر احمد سے آنکھیں چُرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاقان دِل برداشتہ تھا۔ اس نے سکونِ قلب کے لیے سبز پہاڑی میں پناہ لی لیکن درباریوں نے اُسے چین سے نہ رہنے دیا۔ محل واپس آ کر اس کی بے چینیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس کا خون اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ شاید اس میں خود اس کی بھی غلطی ہے۔ ایک معمولی لڑکی کے لیے اپنے پیارے بیٹے کی دل آزاری کرنا کوئی مناسب بات نہیں لیکن شہزادہ زیادہ خطاوار ہے۔ اس نے چین کے شہنشاہ کی توہین کی میں دُنیا کا خاقان ہوں۔ میں تمام دُنیا کی لڑکیوں کو حاصل کر سکتا ہوں۔ یہ حق مجھے آسمانی طاقتوں نے دیا ہے۔ خاقان آپ ہی آپ اُلجھ رہا تھا۔ اسے مشورے کی ضرورت تھی۔ اُسے اپنا پُرانا رفیق چینی فلسفی یاؤ چاؤ بہت یاد آ رہا تھا لیکن وہ تو عرصہ ہوا نیلے آسمان میں گم ہو کر دیوتاؤں کی محفل میں پہنچ چکا تھا پھر اسے کون سمجھاتا اور وہ کس سے مشورہ لیتا؟

اپنے محل واپس جاتے وقت خاقان کو ایک خیال آیا اور وہ اپنے محل میں جانے کے بجائے جاموئی خاتون کے پاس پہنچا۔ جاموئی بستر پر لیٹی تھی، چینی طبیب اور دندان ساز اُس کے پاس موجود تھے۔ خاقان بستر کے قریب پہنچا تو سب لوگ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن جاموئی خاتون نے مُنہ پھیر لیا۔ خاقان کے چہرے پر تغیر پیدا ہوا۔ ایسا تغیر جس میں غصے اور صدمے کے ملے جُلے اثرات موجود تھے۔ جاموئی نے مُنہ پھیر کر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ خاقان سے گفتگو نہیں کرنا چاہتی لیکن خاقان تو بات ہی کرنے آیا تھا۔

خاقان کے لیے سونے کی ایک چوکی جاموئی کے بستر کے پاس بچھا دی گئی۔ خاقان بیٹھ گیا اور بولا "جاموئی جو ہوا اُسے بھول جا۔ ہم نے تجھے معاف کیا۔" خاقان کو اس وقت بھی اپنے وقار کا خیال تھا۔ وہ جاموئی سے گِر کر بات نہ کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے سلوک پر افسوس تھا لیکن اظہارِ افسوس کے لیے بھی اُس نے شاہانہ انداز اختیار کیا۔ جاموئی کو اس طرح کی مزاج پُرسی سے تسلی کے بجائے اور صدمہ ہوا۔ خاقان اُس کا قصور معاف کر رہا تھا۔ اُسے مار گیا۔ دھتکار گیا پھر بھی قصور اُسی کا تھا۔ جاموئی نے کوئی جواب نہ دیا حالانکہ وہ اب گفتگو کرنے کے قابل ہو چکی تھی۔

خاقان نے پھر کہا "جاموئی تو بولتی نہیں۔ کیا تجھے بہت چوٹ آئی ہے۔ تو میری طرف مُنہ کیوں نہیں کرتی؟" خاقان کا لہجہ نرم پڑتا گیا لیکن اُس نے اپنا وقار برقرار رکھا۔ افسوس کا ایک لفظ بھی اس کے مُنہ سے نہ نکلا۔ جاموئی کو شاید یہ محسوس ہوا کہ خاقان کو اپنے کیے پر افسوس ہے یا پھر اُس نے دیرینہ رفاقت سے مجبور ہو کر بے رُخی ختم کی اور بستر پر اُٹھ بیٹھی۔

"جاموئی آج تو ہمارے محل میں سوئے گی" خاقان نے کہا۔ بیگمات کے لیے یہ سب سے بڑی رشوت تھی۔ سینکڑوں اور ہزاروں نت نئی لڑکیوں کی موجودگی میں اُن کی باری تو برسوں میں نہ آتی تھی۔ جاموئی کا دِل پگھل گیا۔ وہ حامی بھرنے ہی والی تھی کہ شہزادہ چینگ یم کا نقشہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔

جاموئی نے انکار کر دیا۔ خاقان کو بڑی حیرت ہوئی جس رات کے انتظار میں بیگمات کو کئی کئی سال گزر جاتے تھے، اس رات کا پیغام خود خاقان جاموئی کو دے رہا تھا۔ جاموئی کا انکار اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اُس کے خیال میں یہ کفرانِ نعمت تھی۔ خاقان اپنی چوکی سے اُٹھ کر جاموئی کے بستر پر بیٹھ گیا پھر جاموئی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "جاموئی تو شہزادے کی طرف سے پریشان ہے لیکن یہ کیوں بھولتی ہے کہ وہ میرا ولیعہد ہے۔ تو چاہے تو ہم اُسے معاف بھی کر سکتے ہیں۔"



جاموئی کو اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ خاقان میں اُسے شفقت پدری کی جھلک نظر آئی۔ اُس نے پوچھا۔ "مگر کس شرط پر خاقان؟"

"کوئی شرط نہیں۔ شہزادہ، لالہ رُخ کو لے کر دربار میں آ جائے۔ وہ ہم سے لالہ رُخ کو مانگے۔ ہم اُسے وہ تبتی لڑکی بخش دیں گے۔"

جاموئی کی اُمید ڈوب گئی۔ اس کے دل کو ایک دھچکا لگا۔ اس نے بگڑ کر کہا۔ "خاقان تُو صرف خاقان ہے، تُو باپ کبھی نہیں بن سکتا۔ تُو جو چاہتا ہے، وہ ہرگز نہ ہوگا۔"

"اس میں تجھے کیا اعتراض ہے۔ ہم تو لوگوں کو سلطنتیں بخش دیا کرتے ہیں۔ لالہ رُخ تو محض ایک معمولی لڑکی ہے۔"

جاموئی کا غصہ اور بڑھ گیا۔ "خاقان چاہتا ہے کہ اس کا ولیعہد سرِ دربار ایک لڑکی کی بھیک مانگے۔ یہ کبھی نہ ہوگا۔ خاقان اگر چنگ کِم کبھی بھکاری بن کر لالہ رُخ کو مانگنے تیرے پاس آیا تو اپنا خنجر اس کے سینے میں گھونپ دوں گی۔ میں اتنے کم ظرف اور بزدل بیٹے کی ماں نہیں کہلوانا چاہتی۔"

"اچھا تو اُسے ایک بار میرے سامنے بُلوا۔" خاقان نے دوسرا رُخ اختیار کیا۔

"مجھے فریب دینے کی کوشش نہ کر خاقان۔ میں دُعا کرتی ہوں کہ وہ خاقان کے شر سے دُور ہی رہے۔"

قبلائی خان اس کے بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "جاموئی یاد رکھ، اگر شہزادہ یہاں سے نکل گیا تو میں دُنیا کے آخری سرے تک اس کا پیچھا کروں گا۔ وہ جس ملک میں پناہ لے گا میں اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ میں تموجین بن جاؤں گا۔ میں ہلاکو بن کر آبادیوں کو تہ و بالا کر دوں گا۔" یہ کہہ کر قبلائی خان چلا گیا اور جاموئی خاتون آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بیٹے کی سلامتی کے لیے دُعائیں مانگنے لگی۔



احمد نے شہزادے اور لالہ رُخ کو بچانے کا منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر تیار کیا تھا۔ اُسے علم تھا کہ لاما فاگس کے گھر کی تلاشی ہوگی۔ فاگس تبتی تھا اور لالہ رُخ بھی اُسی علاقے سے تعلق رکھتی تھی۔ احمد کو اپنے گھر کی تلاشی کا بھی خدشہ تھا۔ خاقان کو اس پر شبہ نہ ہوتا لیکن دربار میں اس کے بہت سے دُشمن تھے۔ قبلائی خان کے دربار میں جرمن، فرانسیسی، رومی اور انگریز بھی تھے لیکن رصد گاہوں، تراجم خانوں اور چھاپہ خانوں پر مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ قبلائی کا وزیر مالیات احمد اور سپہ سالار لشکر بایان دونوں ہی مسلمان تھے۔ مسلمانوں کا پلّہ سب سے بھاری تھا۔ میدانِ جنگ میں بایان کا سکّہ چلتا اور دربار میں احمد کا طوطی بولتا۔ جس کو چاہے نکالے، جس کو چاہے مرتبہ دے۔ احمد کے بنائے ہوئے منصوبے پر عمل درآمد کے فرائض اس کے بیٹے احمدون کے سپرد تھے چنانچہ جب لاما فاگس کے مکان کی تلاشی ہو چکی تو شہزادے اور لالہ رُخ کو لاما فاگس کے گھر میں منتقل کر دیا گیا اور جب احمد کے مکان کی تلاشی لے کر محافظ دستہ واپس چلا گیا تو ان دونوں کو پھر احمد کے مکان میں واپس لایا گیا۔ اس ساری کارروائی کے دوران، احمدون اپنے اور اپنے باپ کے چیدہ چیدہ جاں نثاروں کے ساتھ شہزادے اور لالہ رُخ کے آس پاس رہا تاکہ اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو تو اس سے نمٹا جا سکے۔

شہزادہ چنگ کِم اور لالہ رُخ، احمد کے محل میں بڑے آرام سے رہ رہے تھے مگر اس کے باوجود اُنہیں سکون نہ تھا۔ گرفتاری کا خیال اُنہیں ہر دم ستاتا رہتا۔ احمد نے خاقان سے شمال میں قائدو کے دستوں کے حملوں اور لوٹ مار کا تذکرہ اپنی طرف سے بہت بڑھا چڑھا کر کیا تاکہ خاقان شمال کا رُخ کرے تو شہزادے اور لالہ رُخ کو چین سے نکالنے کا کوئی انتظام کیا جائے۔ خاقان شمال میں جا کر قائدو کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم خان بالیغ سے نہ نکلتے تھے۔ وہ لشکر کو تیاری کا حکم دے چکا تھا لیکن خود تیار نہیں تھا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کے دل میں کیا ہے اور وہ کیوں اتنی تاخیر کر رہا ہے۔ ممکن ہے، اُسے یہ خدشہ ہو کہ اس کی عدم موجودگی میں کہیں شہزادہ چنگ کِم خاقان ہونے کا اعلان نہ کر دے۔ شہزادہ چنگ کِم منتخب ولیعہد تھا اور وہ مغلوں کے علاوہ چینیوں میں بھی مقبول تھا۔

اسی دوران سلطنت چین کا نیا ولیعہد پیدا ہوا۔ یہ تھا شہزادہ چنگ کِم کا پہلا لڑکا جسے اُس کی ایک جائز بیوی نے جنم دیا تھا۔ قبلائی خان اس بچے کی پیدائش پر بہت خوش ہوا۔ اُسے شہزادہ چنگ کِم یا ولیعہد کی زیادہ فکر نہ رہی۔ مغلوں کو نیا ولیعہد اور خاقان مل گیا تھا۔ خاقان نے خود اس کا نام تیمور رکھا۔

شہزادہ چنگ کِم کو اپنے گھر بچہ پیدا ہونے کی خبر اپنے دوست احمدون کے ذریعے ملی۔ احمد نے احمدون کو منع کر دیا تھا کہ شہزادے کو یہ خبر نہ پہنچائی جائے کیوں کہ اس سے شہزادے کو افسوس ہوگا۔ شہزادے نے یہ خبر بڑے تحمل سے سُنی۔ لالہ رُخ نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور شہزادے چنگ کِم کو بیٹے اور ولیعہد کی پیدائش پر مُبارک

بادو ی۔ شہزادے نے خود کو بہت سنبھالا مگر اپنی افسردگی نہ چھپا سکا۔ وہ قیدیوں جیسی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اگر آج وہ باہر ہوتا تو خوشی کے اس موقع پر کیا کچھ نہ کرتا۔ شہزادے کو افسردہ دیکھ کر لالہ رُخ بھی غمگین ہو گئی۔ وہ نادم تھی کیوں کہ وہ خود کو ان واقعات کی ذمّے دار سمجھتی تھی۔

"شہزادے! یہ سب مصیبت تم پر میری وجہ سے آئی ہے۔ میری بات مانو تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم خاقان کے پاس چلے جاؤ اس خوشی کے موقعے پر وہ تمھیں ضرور معاف کر دے گا۔"

مگر شہزادہ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل تھا۔ "لالہ رُخ یہ ٹھیک ہے مجھے اپنے بچے کو دیکھنے کی خواہش ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں خاقان کے خوف سے اِدھر اُدھر چھپتا پھر رہا ہوں لیکن میرے خیال میں یہ مصائب اور پریشانیاں ایک ایسے جابر حاکم کی غلامی سے زیادہ بہتر ہیں جسے اپنی اولاد کے جذبات کا ذرا بھی احساس نہ ہو۔"

لالہ رُخ رونے لگی وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ شہزادے نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تُو کیوں روتی ہے لالہ رُخ، میرا دل کہتا ہے کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب ہم یہاں سے نکل کر آزاد ہواؤں میں سانس لیں گے۔"

اتنے میں احمدون اندر آیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ شہزادے اور لالہ رُخ کے دل شدت سے دھڑکنے لگے۔ شہزادے نے پوچھا۔ "میرا بچہ کیسا ہے؟"

"بچہ تو خیریت سے ہے لیکن..." احمدون کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"احمدون، میرے دوست، جو خبر بھی لائے ہو، سنا دو۔ ہم نے اپنا دل پتھر کا بنا لیا ہے۔"

"شہزادے، آپ کو افسوس تو ضرور ہو گا لیکن میں آپ سے شاہی محل کی کوئی خبر نہیں چھپاتا۔ بچے کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ کوئی طبیب اُسے نہ بچا سکا۔"

شہزادے کو واقعی افسوس ہوا۔ بچے کی یہ کتنی بدقسمتی تھی کہ باپ لاپتہ، ماں نے پیدا کرتے ہی اپنی ممتا کا دامن ہمیشہ کے لیے سمیٹ لیا۔ اس خبر سے لالہ رُخ کو بھی بہت دکھ ہوا۔ بظاہر ننھا شہزادہ یتیم و یسیر ہو گیا۔

"احمدون تم نے میرے بچے کو دیکھا ہے؟"

"شہزادے، اُس بچے کو تو ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی۔ اسے سات پردوں میں رکھا گیا ہے۔"

"کیوں، ایسا کیوں کیا گیا؟" شہزادے نے بڑے اشتیاق سے دریافت کیا۔

"خاقان نے منجموں سے پوچھا تھا تو انہوں نے بتایا کہ اس شہزادے کی زندگی بڑی کٹھن گزرے گی۔ یہ سنتے ہی خاقان نے محل پر سخت پہرہ لگا دیا۔ انہیں آپ کی طرف سے بھی خطرہ ہے۔"

"میری طرف سے؟" شہزادے نے پوچھا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"چینیوں نے بادشاہ کے کان میں یہ پھونکا ہے کہ اس بچے پر اپنے باپ کی رُوح کا سایہ ہے۔"

شہزادے اور لالہ رُخ کو ہنسی آ گئی۔

"تو اُن کے خیال میں ہم مر چکے ہیں اور ہماری رُوح بھٹکتی پھر رہی ہے۔" شہزادے نے کہا۔

"جی ہاں۔ چینیوں نے تو انہیں یہی باور کرانے کی کوشش کی ہے۔"

شہزادہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "کچھ پتہ چلا کہ خاقان شمال کی طرف کب روانہ ہو گا؟"

"لاما فاگس اور میرے باپ میں آج جو گفتگو ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاقان جشنِ نوروز سے پہلے کہیں نہیں جائے گا۔ اس کا یہ بھی ارادہ معلوم ہوتا ہے کہ جشنِ نوروز کے ساتھ ہی ننھے شہزادے کا جشنِ ولادت بھی منایا جائے۔"

احمدون تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ شام کو جب اس کا باپ احمد، شہزادے کے پاس آیا تو اس نے احمدون کی باتوں کی تصدیق کی اور یہ بھی بتایا کہ جشن کے موقع پر وہ شہزادے اور لالہ رُخ کو ان طاقتوں کے ساتھ سفید پہاڑوں پر بھیجنے کی کوشش کرے گا۔ لاما فاگس

نے تبت سے ایک خاص طائفہ بلوانے کا انتظام کر لیا ہے۔ وہ طائفہ اس کام کو انجام دے گا۔



قبلائی خان نے جشنِ نوروز اور جشنِ ولادتِ ولیعہد کا اعلان کرا دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی جشن میں شریک ہونے کے لیے دُور و نزدیک کے مقامات سے شعبدہ باز، بازی گر اور ناچ دکھانے کے طائفے جوق در جوق خان بالیغ آنا شروع ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد شہر کے باہر ایک میلہ سا لگ گیا۔ حدِ نظر تک خیموں کا ایک نیا شہر آباد ہو گیا۔ لاما فاگس نے حسبِ وعدہ تبت کے شمال مشرقی ڈھلوانوں سے ایک طائفہ بلوایا جس میں شعبدہ باز اور گانے والے شامل تھے۔ اس طائفے کا سربراہ لاما فاگس کا ایک قریبی عزیز تھا جسے تمام باتوں سے آگاہ کر دیا گیا۔

اِدھر جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور اُدھر جاموئی خاتون کے محل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جاموئی کی طبیعت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ خاقان کی سخت مزاجی اور ولیعہد چنگ کم کی معزولی اور گمشدگی نے اُسے بستر سے لگا دیا تھا۔

ایک دن خاقان کو جاموئی خاتون کا پیغام ملا جس میں اس نے مرنے سے پہلے ایک بار خاقان سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ وہ خود بستر سے نہ ہل سکتی تھی اس لیے اُس نے خاقان کو اپنے محل میں بلوایا تھا۔ خاقان نے پہلے پیغام لانے والی کنیز سے جاموئی خاتون کی بیماری کی اچھی طرح تصدیق کی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ جاموئی واقعی لبِ گور ہے تو وہ اس سے ملنے پر آمادہ ہو گیا۔

خاقان، جاموئی کے محل میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی چہیتی بیوی جاموئی بستر سے اُٹھنے کے قابل بھی نہیں۔ وہ بہت متاثر ہوا۔ خاقان کو اپنے اس سلوک پر بھی افسوس ہوا جو اس نے جاموئی خاتون سے کیا تھا۔ خاقان نے جاموئی کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ جاموئی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس وقت خاقان کی آنکھیں بھی سُرخ تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ کیفیت آنسوؤں کو روکنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔ خاقان نے آج تک آنسو نہیں بہائے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ رونا صرف عورتوں اور بزدلوں کا کام ہے۔

"جاموئی بتا، تیری کیا خواہش ہے۔ دُنیا میں مجھے صرف دو چیزوں سے محبت ہے۔ ان میں ایک چیز بے جان ہے اور دوسری جاندار۔ ایک چیز سفید گھوڑی کا دودھ ہے جسے پی کر میرا دماغ روشن ہو جاتا ہے اور دوسری تُو ہے جس کی باتیں سُن کر میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں تُو خاقان پرست نہیں بلکہ شوہر پرست ہے۔"

جاموئی نے ہاتھ کے اشارے سے چُپ رہنے کو کہا۔ خاقان خاموش ہُوا تو جاموئی نے نہایت نحیف آواز میں کہا "خاقان! میں نے تیرے ساتھ جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اچھے بُرے دن گزارے ہیں۔ تُو کسی سے محبت نہیں کرتا۔ تجھے صرف اپنے آپ سے محبت ہے۔ تُو خود پرست ہے۔" خاقان کو جاموئی کی بات ناگوار گزری۔ یہ اس کی اَنا کی توہین تھی لیکن جاموئی نے جو کچھ کہا تھا، وہ ایسی تلخ حقیقت تھی کہ جب خاقان نے اپنا دل ٹٹولا تو اسے حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔ خاقان نے کچھ کہنا چاہا لیکن جاموئی نے اُسے روک کر کہا "خاقان میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ نیلا جاوداں مجھے بلا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ میری بات غور سے سُن۔ اس وقت میں نہیں میری رُوح بول رہی ہے۔ تُو نے مجھے جو تکلیف دی، اُسے میں معاف کرتی ہوں لیکن تُو نے شہزادے چنگ کم کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس کے لیے نہ تو جاوداں اور نہ ہی ہمارے بزرگوں کی رُوحیں تجھے معاف کریں گی۔ اگر چنگ کم اس تخت پر نہ بیٹھا تو یہ برقرار نہیں رہے گا۔ جن شہروں کو تُو نے آباد کیا ہے، وہ اُجڑ جائیں گے جن لوگوں پر تُو نے مہربانی کی ہے، وہ بڑے خاندان کے دُشمن ہو جائیں گے اور پھر وہ دن آئے گا کہ قراقرم سے آنے والے مغل قراقرم واپس جائیں گے۔ انہیں قراقرم میں بھی جگہ نہ ملے گی اور ..." ضعف کی وجہ سے اس کی آواز ڈوب گئی اور غشی سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

خاقان نے طبیبوں کو بُلوایا۔ اُنہوں نے سر توڑ کوشش کی لیکن جاموئی خاتون نے نصف شب کے بعد جان دے دی۔ اس وقت جاموئی کا سر خاقان کی گود میں تھا۔ خاقان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ٹپاٹپ جاموئی خاتون کے مُردہ رخساروں پر گرنے لگے۔ اُس کی اَنا کو شکست ہُوئی تھی۔ اس وقت وہ خاقان نہ تھا۔ وہ مرنے والی بیوی کا شوہر تھا۔ جاموئی خاتون کے مرنے کی خبر پُورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سوائے جاموئی کے سرہانے جلنے والی شمع کے اور تمام شمعیں گل کر دی گئیں۔ تمام شہر اور اردگرد کی آبادیاں جہاں تک خبر پہنچ چکی تھی، تاریکی میں ڈوب گئیں۔ عبادت خانوں میں عود و عنبر کی تیز خوشبو پھیل گئی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ لوگ سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے۔

صبح ہوتے ہوتے نئے قصر کے سامنے کئی لاکھ مرد اور عورتوں کا مجمع ہوگیا۔ جاموئی خاتون، خاقان کی محبوب ترین ملکہ تھی۔ اس کا جتنا بھی سوگ منایا جاتا وہ کم تھا۔ کہتے ہیں چین کی تسخیر کی دوران خاقان قبلائی خان نے طاقت کا کم از کم استعمال کیا اور رعایا کے قتل عام کی قطعی ممانعت کر دی۔ اس کے پس منظر میں چینی فلسفی یاؤ چاؤ کے علاوہ جاموئی خاتون کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ جاموئی خاتون انسان دوست اور غریب پرور تھی۔ چینی اور غیر ملکی سبھی اس سے محبت کرتے تھے۔

احمد کو معلوم تھا کہ شہزادہ چنگ کم کو اپنی ماں سے بے حد محبت ہے اور اس خبر سے اس پر شدید ردِ عمل ہوگا۔ اس لیے احمد رات بھر اسی اُدھیڑ بُن میں رہا کہ وہ شہزادے کو اس کی ماں کی خبر کس انداز سے پہنچائے۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزادہ اس خبر کو تحمل سے سُنے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے وہ کسی مشکل میں پھنس جائے۔ صبح کو احمد، شہزادے کے پاس گیا۔ شہزادہ حسبِ معمول خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے احمد کو دیکھتے ہی کہا: "آؤ احمد، میں تمھیں بلوانے ہی والا تھا۔"

"خیریت تو ہے، فرمایئے، میں آپ کا نمک خوار ہوں۔"

"احمد تم میری ایک خواہش پوری کر دو۔ اس کا صلہ تمھیں نیلا جادواں دے گا۔" شہزادے نے پُر اُمید نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

احمد کی سمجھ میں نہ آیا کہ شہزادہ کیا چاہتا ہے اور اپنی شان سے گر کر کیوں درخواست کر رہا ہے۔ "شہزادے! آپ حکم دیجیے۔ ہم آپ کی خواہش پوری کرنے میں جان کی پروا بھی نہیں کریں گے۔"

"آپ کسی طرح میری ماں کی لاش کا دیدار کرا دیجیے۔ مجھے صبر آجائے گا اور ماں کی روح کو سکون ملے گا۔"

احمد بھونچکا رہ گیا۔ جس خبر کو وہ سُنانے آیا تھا، شہزادہ اُسے پہلے ہی سُن چکا تھا۔ اس نے سوچا یہ اچھا ہی ہوا لیکن اس نے جس خواہش کا اظہار کیا تھا اسے پورا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ "شہزادے! پہلے تو آپ فرمایئے کہ یہ خبر آپ تک کس نے پہنچائی؟"

شہزادے نے جواب دینے کے بجائے لالہ رُخ کو دیکھا۔ لالہ رُخ کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات بھر روتی رہی ہو۔ احمد اُٹھ کر لالہ رُخ کے پاس گیا اور کہا۔ "لالہ رُخ میری کوئی بیٹی نہیں، میں تمھیں اپنی بیٹی سمجھتا ہوں اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میرا مذہب کہتا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ تم جتنا صبر کرو گی، خُدا اتنی ہی تمھاری مدد کرے گا۔"

لالہ رُخ کو احمد کی مشفقانہ گفتگو سے بڑی تسلی ہوئی۔

"میرے مہربان باپ۔ میں شہزادے کو سمجھاتی ہوں کہ وہ ضد چھوڑ دے اور خاقان سے معافی مانگ لے۔ سارا جھگڑا میرا ہے۔ میں خاقان کے پاس چلی جاؤں گی اگر اس نے معاف نہ کیا تو دربار ہی میں خنجر مار کر اپنا خاتمہ کر لوں گی۔"

"یہ بچوں والی باتیں ہیں لالہ رُخ۔ اس وقت تو کوئی ایسی صورت نہیں کہ خاقان تم دونوں میں سے ایک کو بھی معاف کرے میں خاقان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"لیکن ہم دونوں آپ پر کب تک اس طرح بوجھ بنے رہیں گے اور اگر بات کھُل گئی تو پتہ نہیں کیا غضب ہوگا۔"

"بیٹی، باپ پر کبھی بوجھ نہیں ہوتی۔" احمد نے اُسے سمجھایا۔ "میں نے طے کیا تھا کہ جشنِ نوروز کے دوران یا اس کے بعد میں تم دونوں کو یہاں سے باہر بھیج دوں گا لیکن اب جاموئی خاتون کے انتقال کی وجہ سے جشن ملتوی ہو جائے گا۔ تم گھبراؤ نہیں، میں کوئی نہ کوئی ترکیب نکال لوں گا۔"

شہزادے نے ایک بار پھر ماں کی لاش کے دیدار کی خواہش کی۔ احمد جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ "میں جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔ میری انتہائی کوشش ہوگی کہ آپ کی خواہش پوری ہو جائے۔" احمد دروازے کی جانب چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً احمدون نے یہ اطلاع شہزادے کو دی ہوگی کہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔

★ جاموئی خاتون کی لاش عام دیدار کے لیے دربار میں رکھ دی گئی۔ مرگ انبوہ جشن دارد، لوگوں کا میلہ لگ گیا۔ اندرونِ شہر اور بیرونِ شہر کے تمام لوگ اُمڈ آئے۔ سر ہی سر نظر آنے لگے۔ ان لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو دُور دراز سے جشنِ نوروز کا نام سُن کر خان بالیغ میں پہنچے تھے۔ چین کے کونے کونے سے انعام و اکرام کے لالچ میں طائفے بھی آ رہے تھے اور آتے چلے جا رہے تھے۔ منگولیا، ایران اور تبت کے علاقوں سے بھی شعبدہ باز اور رقاص و مغنی آ گئے تھے۔ تمام دن دربار میں ایک ہنگامہ سا برپا رہا۔ شام کو کچھ سکون ہوا تو عمائدینِ سلطنت اور اشراف خاقان سے رسمی تعزیت کے لیے دربار میں آئے۔ جاموئی کی لاش دربار سے اُٹھا دی گئی اور اُسے انتہائی خاموشی سے باغ کے ایک کونے میں دفن کر دیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ خاقان اب تک اپنے محل سے برآمد نہ ہوا تھا۔ درباری اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر خاقان کی بجائے اُس کے محافظ دستے کا سردار اعلا خاقان کا ایک پیغام درباریوں کے لیے لایا۔ یہ پیغام زبانی تھا۔ اس پیغام کی جو خاص باتیں تھیں وہ درباریوں کی سمجھ میں کچھ اس طرح آئیں کہ جشنِ نوروز ملتوی کیا گیا۔ خاقان اور عوام کو جاموئی خاتون کے مرنے سے ناقابلِ تلافی نقصان اور صدمہ ہوا۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اس غم کو دُور کرنے کے لیے عوام و خواص ایک ہفتے تک تفریحِ طبع کے جو بھی طریقے اختیار کرنا چاہیں، انہیں اُس کی پوری آزادی ہے۔ جاموئی خاتون کے مرنے کا غم دُور کرنے کا خاقان نے جو طریقہ بتایا یہ اُس کی اپنی جدت تھی۔ اُس نے جشنِ نوروز کی تقریبات کو ختم کر کے اجتماعی تفریح کا دروازہ بند کر دیا لیکن عوام کو انفرادی تفریح کی اجازت دے دی۔ اس طرح بات جہاں تھی، وہیں رہی۔

اس اہم اعلان اور حکم نامے کے جاری ہوتے ہی وہ عوام و خواص جو دن بھر جاموئی خاتون کی لاش کو دیکھ کر روتے اور دھاڑیں مارتے رہے تھے انہوں نے غم غلط کرنے کے لیے شراب خانوں اور قحبہ خانوں کا رُخ کیا۔ تفریحِ طبع کے لیے ان مقامات سے زیادہ اہم اور کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔ بیرونِ شہر بیس ہزار تو سرکاری طوائفیں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ جشن کا نام سُن کر اُن سے دو گنی طوائفیں قرب و جوار اور دُور دُور سے آ گئی تھیں۔ شراب خانے اتنے بھر گئے کہ اُن میں بیٹھنے کی جگہ نہ رہی۔ بردہ فروشی کے وقت گاہک کو غلام یا لڑکی کا جسم ٹٹول کر دیکھنے کی اجازت تھی لیکن جسم فروشی میں دیکھ بھال کی اس بک بک سے بچنے کے لیے طوائفوں نے خود کو لباس کے تکلف سے آزاد کر لیا تھا۔ وہ خیمے کے اندر بے لباس رہتیں۔ گاہک آتا اور انہیں اچھی طرح دیکھ بھال کر سودا کرتا۔ اسلام میں حرام کاری کی سخت ممانعت ہے اس لیے مسلمان ان بازاروں کا رُخ نہیں کرتے تھے۔

خاقان قبلائی خان کو بظاہر جاموئی خاتون کے مرنے کا بہت غم تھا لیکن اُس نے بھی غم سے نجات پانے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ باہر کے ہنگاموں سے بھی زیادہ پُرعیش تھا۔ عام دنوں میں اس میں خاقان کے چار بستر لگائے جاتے۔ تین بستر لڑکیوں کے لیے اور ایک اُس کا خاص بستر جسے ایک مصری کاریگر نے تیار کیا تھا۔ اسے نرم رکھنے کے لیے روئی یا سمور کی بجائے پارے کا استعمال کیا گیا تھا۔ پہلے چمڑے کے اُوپر نیچے دونوں ابروں کو سی کر مستطیل گدا تیار کیا گیا۔ اس کے درمیان تین فٹ کا خلا تھا جس میں ایک سوراخ کے ذریعے پارہ بھر کر بند کر کے اس کی نرماہٹ اور گداز کو لاجواب بنایا گیا تھا۔ چونکہ خاقان کو غم زیادہ تھا۔ اس لیے خوابگاہ میں لڑکیوں کی تعداد بڑھا دی گئی اور بستروں کے علاوہ جو جگہ بچی اُس میں لڑکیوں کے لیے بستر لگا دیے گئے۔ دودھ اور شراب کی کئی بالٹیاں چڑھانے کے بعد خاقان بہکنے لگا۔ چھ درجن بے لباس لڑکیاں خاقان کا حلقہ کیے ہوئے تھیں۔ جاموئی خاتون چیلہ کنکرائٹ کی تھی شاید اسی وجہ سے کنکرائٹ کی مہ جبینوں کی تعداد اس وقت بھی زیادہ تھی۔ خاقان مستی کے عالم . . . میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا جیسے اندھا اپنا راستہ تلاش کرے۔ جو لڑکی اُس کے ہاتھ آ جاتی، وہ اُسے دبوچ لیتا۔ دوسری لڑکیاں کھوکھلے قہقہے بلند کر کے اُس کی قسمت پر رشک کرتیں اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہا۔

اس طربناک اور پُرکیف، ہفتۂ غم سے دو روز پہلے احمد کو ایک شاہی حکم ملا جس میں کہا گیا کہ دُور دراز سے آنے والے طائفوں کو انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا جائے اور جو تاجر اس جشن میں شریک ہونے کے لیے سامان لائے ہیں اُن کا تمام مال نفع دے کر خرید لیا جائے۔ احمد مصروفیت کے باوجود دن میں دو تین بار لالہ رُخ سے کسی نہ کسی بہانے ملاقات کرتا اور شہزادے اور لالہ رُخ کو یہاں سے نکالنے کے بارے میں گفتگو ہوتی۔ خاقان کے تازہ حکم سے احمد کی مشکل آسان ہو گئی۔ احمد نے کوشش کر کے شہزادے کو اُس کی ماں کا آخری دیدار بھی کرا دیا تھا۔ شہزادہ اور لالہ رُخ، جاموئی خاتون کی لاش کو قیمتی لباس میں دیکھنے گئے تھے لیکن اس قدر بھیڑ تھی کہ ان کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ یوں بھی لالہ رُخ کو درباریوں نے صرف ایک بار ہی دیکھا تھا۔ احمد نے سب سے پہلے جس طائفے کو رخصت کیا۔

وہ تبت کے رقاصاؤں پر مشتمل تھا۔ اس میں سات لڑکیاں اور اٹھارہ مرد تھے۔ کل جب شہزادہ لاما فاکس سے ملاقات کرنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا اُس وقت اس طائفے کا سردار لاما فاکس کے پاس بیٹھا تھا۔ لاما فاکس نے شہزادے کا تعارف سردار سے کرا دیا تھا۔

احمد اور اُس کے بیٹے احمدون نے شہزادے اور لالہ رُخ کی روانگی سے پہلے ایک شاندار ضیافت دی۔ دعوت کے دوران پہلے تو خاموشی رہی پھر احمد نے شہزادے سے کہا: "شہزادے ہم معافی کے خواستگار ہیں کہ ہم آپ کے شایانِ شان یہاں انتظام نہ کر سکے۔"

شہزادہ مستقبل کے خیال میں گم تھا۔ چونک کر بولا: "احمد میں جانتا ہوں کہ تم میری مدد نہ کرتے تو خاقان نے اب تک میرا خاتمہ کر دیا ہوتا۔" پھر وہ احمدون سے مخاطب ہو کر بولا: "احمدون تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ میں نے اکثر تمہارے سامنے تمہارے باپ کو بُرا بھلا بھی کہا لیکن تم نے ایک وفادار دوست کی طرح میرا اب تک ساتھ دیا۔ میں تمہارا اور احمد کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

احمدون جس کی آنکھیں پہلے ہی ڈبڈبائی ہوئی تھیں رونے لگا۔ اُس نے کہا: "صورتِ حال اجازت نہیں دیتی ورنہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا۔"

لالہ رُخ نے احمدون کو سمجھایا: "احمدون بھائی آپ نے اب تک جو کچھ مہربانیاں کی ہیں اُس کا بدلہ ہم زندگی بھر نہیں اتار سکتے۔ آپ ہمارے ساتھ نہ جایئے اگر ہم بچ کر نکل گئے تو پھر ملیں گے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ جھگڑے ختم ہو جائیں گے اور ہم جلد ہی خان بالیغ واپس آئیں گے۔"

شہزادے کو یہاں سے جانے کی بے حد خوشی تھی۔ دراصل بند کمرے میں رہتے رہتے اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اُس نے پوچھا "ہم کس وقت روانہ ہوں گے؟"

"آدھی رات کے بعد۔" احمد نے بتایا: "طائفے کے چھکڑے بالکل تیار کھڑے ہیں۔ لیکن میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ نصف شب سے پہلے روانہ نہ ہوں۔ میں اس معاملے میں ذرا سا بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا ورنہ اتنے دن کی تیاریاں بیکار ہو جائیں گی۔"

اتنے میں خفیہ کمرے کی دیوار پر کسی نے دستک دی۔ سب کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ احمد نے بیٹے کو دیکھا۔ احمدون نے فوراً کمر... سے خنجر نکال لیا اور باہر کی طرف چلا۔

احمد نے شہزادے اور لالہ رُخ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں احمد کے ساتھ اُس راستے پر آ گئے جدھر سے خطرے کے وقت نکلا جا سکتا تھا۔ اِس راستے کا اختتام احمد کے محل سے دو سو گز کے فاصلے پر ایک پہاڑی چٹان کے پاس ہوتا تھا جو چاروں طرف سے جھاڑیوں میں گھری ہوئی تھی لیکن انہیں یہ راستہ استعمال نہ کرنا پڑا۔ احمدون واپس آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لاما فاکس کا خادم یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ محل کی بائیں جانب کچھ مُغل سپاہی طوائفوں کو لے کر آ گئے ہیں اور ایک پیڑ کے نیچے خوش فعلیاں کر رہے ہیں اس لیے چھکڑے محل کی بائیں سمت کی بجائے دائیں سمت سے روانہ ہوں گے۔

"ابھی کتنی دیر باقی ہے؟" احمد نے پوچھا۔

"کوئی دیر نہیں ہے۔ لاما فاکس طائفے میں پہنچ چکے ہیں اُن کا آدمی جیسے ہی اطلاع دے گا۔ ہم چل پڑیں گے۔"

"لیکن احمدون سمت تو بدل گئی ہے۔ ہمارے آدمیوں کو کیسے خبر ہوگی؟" احمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ابا جی میں نے اطلاع ملتے ہی اپنے آدمیوں کو دائیں طرف بھیج دیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔" احمدون نے مسکرا کر کہا۔

"شاباش بیٹے۔" احمد بولا: "آخری مرحلے پر بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔"

احمدون نگرانی کے لیے باہر چلا گیا۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں واپس آ کر بتایا کہ طائفہ روانہ ہو چکا ہے اور دائیں طرف پہنچ کر انتظار کرے گا۔ شہزادہ، احمد اور احمدون سے بغل گیر ہوا۔ احمد نے لالہ رُخ کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُسے دُعا دی۔ احمدون نے اپنی مُنہ بولی بہن کے ہاتھ چوم لیے اور سب کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

طائفے کے چھکڑوں کی چھتیں لچکدار لکڑی کے قوس نما کمانوں کی بنائی گئی تھیں۔ ان پر چمڑہ چڑھایا گیا تھا تاکہ اندر بیٹھنے والے موسم کے سرد و گرم سے محفوظ رہیں۔ اس قسم کی گاڑیاں اور چھکڑے اُس زمانے میں عام تھے۔ یہ چھکڑے فوجی ساز و سامان کی نقل و حمل کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ طائفے کے سردار نے شہزادے اور لالہ رُخ کو، جن کے کپڑے بالکل اُن کی طرح کے تھے، ایک چھکڑے میں سوار کر دیا اور یہ چھوٹا سا قافلہ ایک لمحہ رُکے بغیر احمد کے محل کی دائیں جانب سے گزر گیا۔

احمد اور احمدون محل کی ایک اونچی بُرجی پر کھڑے قافلے کو دیکھ رہے تھے۔ احمد کے حفاظتی دستے کے سپاہی عام شہری

کے ابکل میں اس قافلے کی حفاظت کے لیے دُور دُور چل رہے تھے۔ ان سپاہیوں کو حکم تھا کہ وہ رات بھر قافلے کی حفاظت کرتے رہیں اور صبح ہوتے ہی واپس آجائیں۔

★

تموچین (چنگیز خان) کے چار بیٹے جوچی، چغتائی، اوغدائی اور تولوئی تھے۔ جوچی کو سب بھائی حرامی اولاد کہتے تھے، اس لیے اُس نے قراقرم سے دُور روسی علاقے میں جاکر اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ یہ خاندان آگے چل کر تاتاران زرّیں خیل کے نام سے مشہور ہوا۔ خاقانیت تولوئی خاندان میں چلی۔ اُس کا بیٹا منگو خان، خاقان ہوا۔ اُس کے مرنے پر دوسرے بیٹے اریق بُوغا نے خاقانیت کا دعوا کیا لیکن تیسرا بھائی قبلائی خان جس نے چین میں فتوحات کرکے زبردست طاقت حاصل کی تھی اُس نے اریق بوغا کو شکست دے دی اور خاقان بن گیا۔

قبلائی خان کو سب نے خاقان تسلیم کرلیا لیکن چنگیز کے ایک اور پوتے جو اوغدائی کی اولاد تھا اُس نے قبلائی خان کی سیادت دل سے تسلیم نہ کی۔ بظاہر اُس نے اپنی اطاعت کا اعلان کردیا لیکن موقع پاتے ہی باغی ہوگیا۔ قائدو گوبی کے ریگ زاروں کے اُس پار اپنے مویشیوں کے گلّوں، شہنائیوں اور مغنیّوں کے ساتھ شہسواری کرتا پھرتا۔ قائدو خان بھی جنگ کا ایسا ماہر تھا جیساکہ قبلائی خان۔ اس کے علاوہ وہ تولوئی کے خاندان سے اس کا خونی جھگڑا تھا۔ بوڑھے مغلوں کو اس میں چنگیز خاں کی شبیہ نظر آتی تھی۔ سخت جان اور سخت کوش، مذہب سے بے نیاز دشت کے ساکنوں کو لڑائی پہ لے جانے کے لیے تیار... قائدو خان کے پاس شروع میں صرف چند سو سوار تھے لیکن یہ مغل، چالاک، مکّار اور بڑا چلتا پُرزہ تھا۔ اُس نے جوچی کے خاندان سے دوستی گانٹھ لی۔ خانوادہ او غدائی کے شکست خوردہ شہزادے بھی اُس کے ساتھ ہوگئے۔ اُس نے چغتائیوں کی ہمدردیاں بھی حاصل کرلیں اور اب وہ التائی کے درختوں سے گھرے ہوئے کہساروں سے افغانستان کے پہاڑوں تک ہر جگہ منڈلاتا پھرتا اُس نے پانچوں مشہور شہروں پر خراج عاید کردیا اور ان شاہراہوں کے اتصال پر بسنے والے شہریوں پر حکومت کرنے کے لیے محمد یلواچ ترک کے بیٹے کو افسر مقرر کیا تھا۔ چغتائیوں نے اُسے بھائی بنالیا تھا اور بوڑھے مغلوں نے اُسے 'خاقانِ دشت' کا خطاب دیا تھا۔

قبلائی خان اُس کی دیدہ دلیریوں سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اس نے کئی بار اُس کے مقابلے اور گرفتاری کو فوج بھیجی مگر قائدو ایک چھلاوہ تھا وہ ہاتھ نہ آیا۔

چاموئی خاتون کی مرگ کے سلسلے میں قبلائی خاں نے شراب نوشی اور عیاشی کا جو بازار گرم کیا تھا اس سے شاہی طبیب بہت پریشان تھے۔ آخر انہوں نے خاقان سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اُس نے یہ سلسلہ بند نہ کیا تو اس کی جان کو سخت خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ وہ گٹھیا کے موروثی مرض میں مبتلا تھا۔ طبیبوں کے سمجھانے بجھانے سے آخر خاقان کو عقل آگئی۔ اُس نے دربار لگایا اور پہلے ہی روز فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ اس جنگ میں وہ احمد کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ احمد کب انکار کرسکتا تھا وہ خود بھی کچھ دنوں کے لیے دارالخلافے سے باہر رہنے کا خواہش مند تھا تاکہ اگر شہزادہ اور الالغ راستہ میں پکڑے جائیں تو الزام اس کے سر نہ آئے۔ پھر خاقان نے فوراً دربارِ خاص منعقد کیا جس میں صرف چیدہ چیدہ سرداروں اور عہدے داروں نے شرکت کی۔ احمد، لاما فاگس اور سانگا انہی خاص لوگوں میں سے تھے۔ خاقان نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"ہم قائدو خان کی سرکوبی کے لیے شمال میں جارہے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اپنی عدم موجودگی میں حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے اپنا ایک نائب مقرر کریں۔" اتنا کہہ کر خاقان نے درباریوں کے چہروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

لاما فاگس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا۔ اُسے نہ تو اس عہدے سے دلچسپی تھی اور نہ ہی اُس نے کبھی اس کی خواہش کی۔ احمد کا چہرہ بھی سپاٹ تھا۔ اُس کو نائب السلطنت سے کہیں زیادہ اختیارات پہلے ہی حاصل تھے۔ سانگا کے دل میں اس کی ہمیشہ سے آرزو تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر خاقان مجھے نائب بناکر شمال میں چلا جائے تو وہ اُس کی واپسی سے پہلے پہلے احمد کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکال دے گا۔

"ہماری نظر میں اس عظیم عہدے کے لیے تین ہستیاں بہت موزوں ہیں۔ سانگا، احمد اور لاما فاگس" خاقان نے کہا۔

سانگا خاقان کے مُنہ سے اپنا نام سُن کر اچھل پڑا۔ اُس کا نام خاقان نے سب سے پہلے لیا تھا جس سے اُس نے یہی نتیجہ نکالا کہ قسمت اُس کی یاوری کررہی ہے اور اُسی کا انتخاب ہوگا۔

"احمد مسلمان ہے۔ یہ مالیات کا ماہر ہے اور اس میں جنگی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ لاما فاگس ہماری سلطنت کا شاید عقل مند ترین انسان ہے۔ تیسری شخصیت سانگا بھی اس عہدے کا جائز حقدار ہے۔" خاقان خاموش ہوگیا۔ سانگا کے دل میں لڈو پھوٹنے

گمان اسے اپنے منتخب ہونے کا یقین ہو گیا۔ خاقان نے سانگلے سے پوچھا: "سانگا تمہارا کیا خیال ہے اگر تمہیں ہم اپنا نائب مقرر کریں تو تم کیا کرو گے؟"

سانگا نے بہت سوچ سمجھ کے جواب دیا: "خاقان نے اگر مجھے اس عہدے کے قابل سمجھا تو میں ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"اور تم لاما فاگس؟" خاقان نے بوڑھے تبتی عالم سے سوال کیا۔

لاما فاگس نے سر جھکا کر کہا: "خاقان میری معذرت قبول فرمائیں تو اُن کی نوازش ہو گی۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایک بادشاہ عالم بھی ہو لیکن ایک عالم کا حکومت کی ذمے داریاں قبول کرنا کچھ مناسب نہیں۔"

تیسرا آدمی احمد تھا۔ خاقان نے اس سے پوچھا: "احمد تم بھی اپنے خیال کا اظہار کرو۔"

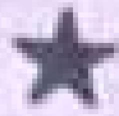
احمد نے ادب سے جواب دیا: "احمد خاقان کا وفادار ہے۔ خاقان جس کو بھی نائب مقرر کرے، احمد اس کی فرمانبرداری کو اپنا فرض سمجھے گا۔"

خاقان نے نائب کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا: "ہم نے لاما فاگس کی معذرت قبول کر لی۔ سانگا بدھ مذہب کا پیروکار ہے۔ اسے جنگ سے نفرت ہے اگر سانگا قبول کرے تو ہم اسے مغل اور چینی فوجوں کا سپہ سالار بنا کر اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہیں تاکہ بہتے خون اور تڑپتی لاشوں کو دیکھ کر اس کا دل اتنا سخت ہو جائے کہ یہ قتل کا حکم دے سکے اور اُسے معلوم ہو جائے کہ امن قائم کرنے کے لیے کبھی کبھی جنگ بھی کرنا پڑتی ہے۔"

سانگا کے لیے یہ ایک بہترین عہدہ تھا لیکن اُس نے سوچا کہ اس طرح وہ نائب نہیں بن سکے گا۔ اُس نے کہا: "میں خاقان کا شکرگزار ہوں کہ وہ مجھے اتنا بڑا مرتبہ دے رہے ہیں لیکن میں بدھ بھکشو اور اہنسا کا پجاری ہوں۔ مجھے خان بالیغ میں رہنے کی اجازت دی جائے۔"

"ہم سانگا کو دارالحکومت میں رہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ان دونوں کی معذرت کے بعد ہم احمد کو اپنا نائب مقرر کرتے ہیں۔" خاقان نے فوراً کہا۔

سانگا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے سپہ سالاری کا عہدہ بھی گنوا دیا اور نائب بھی نہ بن سکا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ خاقان نے تو فیصلہ کر دیا تھا۔ لاما فاگس اور تمام درباریوں نے احمد کو اس اہم عہدے پر تقرری کی مبارکباد دی۔ سانگا کو مجبوراً اُن کا ساتھ دینا پڑا، کہنے سننے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی۔



تبتی طائفے کے چاروں چھکڑے گرد اڑاتے، اونچے نیچے راستوں پر بل کھاتے جنوب کی طرف سفید پہاڑوں کی طرف چلے جا رہے تھے۔ لالہ رُخ رات دن چنگ کم کے پہلو سے چمٹی رہتی۔ شہزادے نے جس محبت کا عملی ثبوت دیا تھا لالہ رُخ کو اس پر سخت حیرانی تھی۔ پہلے وہ بھی مغلوں کو عام لوگوں کی طرح ظالم، جابر اور درندہ صفت سمجھتی تھی لیکن شہزادے نے بے مثال قربانی دے کر لالہ رُخ کو اپنا ہمیشہ کے لیے غلام بنا لیا تھا۔

طائفے کے سردار اور دوسرے ساتھیوں نے لاما فاگس کے وقار کو مجروح کرنے کی قطعی کوشش نہ کی اور مہمانوں کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ شہزادہ ان کا بڑا احسان مند تھا۔ قبلائی خان نے تمام چین میں اہم راستوں پر سرکاری چوکیاں قائم کر دی تھیں۔ جہاں ڈاک کے گھوڑے بدلنے کے علاوہ مشتبہ لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی جاتی۔ ان چوکیوں سے گزرتے وقت سردار جاموئی خاتون کی موت کی خبر کا سہارا لیتا کیونکہ دور دراز علاقوں تک ابھی اُس کے مرنے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ وہ چوکی پر پہنچتے ہی جاموئی خاتون کی مرگ کے حالات اتنے دردناک انداز میں بیان کرتا کہ سننے والوں کے آنسو نکل جاتے۔ وہ خود بھی اُن کے ساتھ رونے لگتا اور روتا ہوا چھکڑوں کو ہنکا کر چوکی پار کر جاتا۔

مغلوں سے تو یہ طائفہ بچتا ہوا جا رہا تھا لیکن دستِ قدرت سے کون بچ سکتا ہے۔ پندرہ روز کا سفر کر کے شہزادہ چنگ کم اچانک بیمار پڑ گیا۔ پہلے روز تو اسے معمولی بخار ہوا لیکن اس بخار نے آہستہ آہستہ خطرناک صورت اختیار کر لی۔ اب اُسے ہر وقت اتنا تیز بخار رہنے لگا کہ اس کے جسم پر ہاتھ رکھنا مشکل ہو گیا۔ لالہ رُخ اس نئی افتاد سے گھبرا گئی۔ ابھی اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ طائفے کے جو لوگ علاج معالجے سے واقف تھے، انہوں نے جڑی بوٹیاں کوٹ پیس کر شہزادے کو پلائیں لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ چند روز بعد شہزادے پر غشی کے دورے پڑنا شروع ہوئے۔ وہ رات دن آنکھیں بند کیے ساکت پڑا رہتا۔ لالہ رُخ کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ وہ سردار کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتی کہ کسی طرح شہزادے کو بچا لو۔ سردار اور دوسرے لوگ پوری کوشش کر رہے تھے لیکن شہزادے کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔

آخر کار یہ طائفہ بیمار شہزادے کو لیے کسی نہ کسی طرح تبت

کے برف پوش پہاڑوں کے دامن میں پہنچ گیا۔ چھکڑے دامنِ کوہ کی آبادی میں چھوڑ دیے گئے کیونکہ یہاں سے اُوپر جانے کے لیے پُرپیچ اور خطرناک راستے شروع ہوتے تھے۔ سردار کے پاس لاما فاگس کا دیا ہوا شاہِ تبت کے نام ایک خط تھا۔ اُس کا ارادہ پہلے تو یہ تھا کہ شہزادے اور لالہ رُخ کو اُس کے گاؤں میں چھوڑ کر اس خط کو شاہی دربار میں لے جائے گا لیکن شہزادے کی شدید بیماری کے پیشِ نظر اُس نے ارادہ بدل دیا۔ لاما فاگس نے سردار کو بتایا تھا کہ یہ خط شہزادے کے بارے میں ہے اور شاہِ تبت یہ خط پا کر شہزادے کی پوری پوری حفاظت کرے گا۔ اس خط کی خبر لالہ رُخ کو نہ تھی۔ سردار نے شہزادے کے لیے ایک ڈولی بنائی پھر لالہ رُخ اور شہزادے کو لے کر شاہی دربار کی طرف روانہ ہوا۔ لالہ رُخ ان راستوں سے واقف تھی۔ اُس نے احتجاج کیا۔ اُس کو خیال ہوا کہ سردار شاید کسی قسم کی غداری یا بددیانتی پر آمادہ ہے لیکن جب سردار نے تفصیل سے اُسے خط کے بارے بتایا تو وہ مطمئن ہو گئی۔ سردار نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اگر شہزادہ سلامت دربار تک پہنچ گیا تو شاہی طبیب ضرور اُسے بچا لے گے۔

طائفے کا سردار، لاما فاگس کا خط لے کر شاہِ تبت کے دربار میں پہنچا۔ اُس نے شہزادے کو تو باہر چھوڑا اور خود خط لیے ہوئے شاہ کے سامنے جا کر سلامی دی۔ شاہِ تبت، عالم لاما فاگس سے اچھی طرح واقف تھا۔ چین جانے سے پہلے لاما نے وہاں جانے کی شاہ سے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی۔ خط پڑھنے کے دوران شاہ کے چہرے پر عجیب تاثرات پیدا ہو رہے تھے۔ طائفے کا سردار اُس کا چہرہ غور سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں شہزادے اور لالہ رُخ کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد شاہ نے شہزادے کے بارے میں پُوچھا۔ سردار نے بتایا کہ شہزادہ باہر ڈولی میں لیٹا ہے اور بیماری کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی شاہِ تبت بدحواس ہو کر باہر کی طرف بھاگا۔ اُس کے درباریوں نے جب شاہ کو باہر جاتے دیکھا تو وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ سردار کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے اور شاہ خط پڑھ کر اس قدر بدحواس کیوں ہو گیا ہے۔ درباریوں کے پیچھے پیچھے وہ بھی باہر آ گیا۔ سردار نے دیکھا کہ شاہ، شہزادے کی ڈولی کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ سردار اور آگے بڑھا۔ اُس نے سُنا شاہِ تبت کہہ رہا ہے: "اے شہنشاہ چین اور خاقانِ عالم کے ولیعہد شہزادے چنگ کم، شاہِ تبت تمہارے حضور اپنا عاجزانہ سلام پیش کرتا ہے۔"

شہزادے پر غشی طاری تھی۔ لالہ رُخ، شہزادے کے تپتے ہوئے گالوں پر اپنے رخسار رکھے آنسو بہا رہی تھی۔ جب اُس نے دیکھا اور سُنا کہ شاہِ تبت ڈولی کے پاس کھڑا شہزادے کو سلام کر رہا ہے تو اُسے حوصلہ ہوا۔ وہ گاڑی سے نیچے اُتری اور چاہا کہ شاہ کے قدموں میں گر کر حسبِ دستور سجدہ بجا لائے لیکن شاہِ تبت نے اُسے روک دیا اور کہا کہ مستقبل کے خاقان کی محبوبہ پر ہمارا سجدہ فرض نہیں۔ شہزادے اور لالہ رُخ کے لیے شاہی سواری آگئی اور انہیں اُسی وقت شاہی محل میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں شہزادے کے علاج کے لیے بہترین ویدوں اور طبیبوں کو مقرر کیا گیا۔ شاہ نے طائفے کے سردار کو انعام و اکرام سے نوازا۔

لالہ رُخ کے قریبی عزیزوں میں صرف اُس کا ایک بھائی تھا۔ لالہ رُخ کی خواہش پر اُسے گاؤں سے بلوایا گیا۔ بھائی بہن کی ملاقات کا منظر بھی دیدنی تھا۔ اُس کے بھائی کو اُس طائفے کے کچھ لوگوں نے جو لالہ رُخ کو لے کر جشن میں گئے تھے، یہ بتایا تھا کہ لالہ رُخ کو مغلوں نے پکڑ لیا ہے اور اُس کا کچھ پتہ نہیں۔ بھائی تو اُسے رو دھو بھی چکا تھا لیکن اس وقت بہن کو زندہ و سلامت پا کر اُسے جس قدر خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔

شاہی طبیبوں کی دن رات کی کوشش سے شہزادے کی طبیعت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ اُس کی غشی دُور ہوئی تو جلد ہی وہ اُٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ لالہ رُخ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شاہِ تبت بلا ناغہ اُسے دیکھنے آتا تھا۔

ایک روز شہزادہ تکیوں کے سہارے بیٹھا تھا۔ لالہ رُخ اُس پر پروانوں کی طرح نچھاور ہوئی جا رہی تھی۔ شہزادے کے خشک ہونٹ، لالہ رُخ کے ہونٹوں کی شرابِ جوانی سے لطف اندوز ہونے میں مصروف تھے۔ لالہ رُخ کا نیم عریاں جسم شہزادے کی آغوش میں تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ شہزادے کی پیاس جسے بیماری کے سرد پانی نے بجھا دیا تھا، وہ بھڑک اٹھی اور شہزادے کے شریر ہاتھ لالہ رُخ کے ساتھ گستاخیوں پر اتر آئے۔ لالہ رُخ نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور سنبھل کر بستر کے قریب پڑے ہوئے ایک اسٹول پر جا بیٹھی۔ شہزادہ کچھ غمگین سا ہو گیا تو لالہ رُخ نے کہا: "شہزادے میں تمہاری ہوں، سب کچھ تمہارا ہے۔ پہلے تم پوری طرح اچھے ہو جاؤ۔ تمہارے علاج کرنے والوں نے مجھے تم سے دُور رہنے کی ہدایت کی ہے۔"

شہزادے نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "لالہ رُخ پتہ نہیں میں کب اچھا ہوں گا۔"

"طبیب کہتے ہیں کہ تم کچھ دنوں میں بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔" لالہ رُخ نے اُسے تسلی دی۔ لیکن شہزادے کو اطمینان نہ ہوا۔ لالہ رُخ مجبور ہو کر پھر اس کی آغوش میں جا سمائی۔

شہزادے نے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے کہا: "لالہ رُخ ہمیں خان بالیغ سے چلے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟"

لالہ رُخ نے شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دھڑکتے سینے پر رکھ لیا اور بولی: "میں حساب تو نہیں جانتی۔ صرف اتنا پتہ ہے کہ جب ہم پہاڑوں پر آئے تھے تو برف پگھل رہی تھی اور اب برف پھر سے جمنا شروع ہو گئی ہے۔"

شہزادے نے گھبرا کر پوچھا: "اس کا مطلب ہے کہ ہمیں چھ ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

"اتنے دن تو نہیں ہوئے۔ ہاں دو تین مہینے ضرور ہو چکے ہیں۔"

"اور اتنے دن سے ہم تم الگ رہے ہیں۔"

لالہ رُخ شرما گئی۔ شہزادے نے لالہ رُخ کو کھینچ کر سینے سے لگا کر اتنی زور سے بھینچا کہ لالہ رُخ کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ اسی لمحے شہزادے کی نظر سامنے کے دروازے پر پڑی تو اُس نے فوراً گرفت ڈھیلی کر دی۔ شاہِ تبت، شہزادے کی مزاج پرسی کے لیے آ رہا تھا۔ شاہ نے شہزادے اور لالہ رُخ کو ایسی بے تکلف حالت میں دیکھا تو اُس نے قدم روک لیے۔ شہزادہ نادم ہو گیا اور لالہ رُخ سر جھکا کر دُور جا کھڑی ہوئی۔ شہزادے نے شاہ کو دروازے پر رُکتے ہوئے دیکھا تو کہا: "تشریف لایئے شاہِ تبت۔"

شہزادے نے چاہا کہ بستر سے اٹھ کر شاہ کا استقبال کرے لیکن شاہ نے دُور سے ہی کہا: "شہزادے اِس کا تکلف نہ کیجئے۔ بے تکلف محفل میں یہ تکلف اچھا نہیں لگتا۔"

شہزادہ اور زیادہ شرمندہ ہو گیا۔ لالہ رُخ کے چہرے پر حیا کی سرخی بکھر گئی۔ شاہِ تبت ہنستا ہوا شہزادے کے پاس آیا۔ شاہ کا خادم خاص ایک آبنوسی کرسی جس پر جواہرات لگے ہوئے تھے اٹھائے ہوئے شاہ کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ شاہِ تبت جب کسی سے ملنے جاتا تو یہ خاص کرسی اُس کا خادم لے کر اُس کے ساتھ ساتھ چلتا۔ شاہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا: "ہمیں شہزادے کو تندرست دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ طبیبوں نے ہمیں بتایا ہے کہ شہزادہ سفر کے قابل ہو چکا ہے۔ اب شہزادہ ہمیں اجازت دے تاکہ . . . اُسے خان بالیغ واپس بھیجنے کے انتظامات کیے جائیں۔"

شہزادے اور لالہ رُخ پر یہ الفاظ بجلی بن کر گرے۔ اُن کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ شہزادے نے مایوس لہجے میں کہا: "شاہ کو ہمیں خان بالیغ بھیج کر کیا حاصل ہوگا؟" اس کی آواز ڈوبنے لگی تو لالہ رُخ نے حوصلہ کیا اور بولی: "شاہِ معظم کو شاید پورے حالات کا علم نہیں۔ قابلِ احترام لاما فاگس نے تو ہمیں بتایا تھا کہ ہمیں شاہ کی پناہ میں بھیجا جا رہا ہے اور اب خود شاہ ہمیں "خاقان" کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

شاہِ تبت ہنس پڑا: "شہزادی لالہ رُخ ہمیں خان بالیغ کا تم سے زیادہ علم ہے۔ آپ لوگ شاید اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خاقانِ عالم آپ کے خلاف ہے۔"

"خلاف ہی نہیں بلکہ وہ ہمیں دیکھتے ہی قتل کرا دے گا۔" لالہ رُخ نے جلدی سے کہا۔

"شہزادی آپ اطمینان رکھیے۔ خاقان نے آپ دونوں کو معاف کرنے کا اعلان کیا ہے۔" شاہِ تبت نے وضاحت کر دی۔

"ہو سکتا ہے کہ خاقان نے ہمیں گرفتار کرنے کے لیے ایسا کیا ہو۔" شہزادے نے خیال آرائی کی۔

"ایسا نہیں ہے شہزادے آپ لوگ سست رفتار چھکڑوں سے یہاں آئے تھے لیکن خاقان نے تیز رفتار سواروں کے ذریعے یہ اعلان شمال نے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہر جگہ پہنچوا دیا تھا۔ آپ کی معافی کی خبر ہمیں آپ کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مل گئی تھی۔ ہم تو آپ کے تندرست ہونے کے منتظر تھے۔"

شہزادے کا پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ اُس نے مُردہ آواز میں کہا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ خاقان ہمیں معاف بھی کر سکتا ہے۔"

شاہِ تبت نے ایک خط نکال کر شہزادے کی طرف بڑھایا اور کہا: "یہ خط وزیر مالیات اور نائب السلطنت احمد ایرانی نے آپ کو بھیجا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو میری بات پر یقین آ جائے گا۔"

شہزادے نے خط لے کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ جوں جوں خط پڑھتا جا رہا تھا، اُس کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ احمد کے خط سے شہزادے کو تسلی ہو گئی۔ اس خط کے آخر میں احمد کے علاوہ لاما فاگس کے بھی دستخط تھے۔ خاقان نے جنگ پر جانے سے پہلے نہ صرف اُسے معاف کیا تھا بلکہ اپنا ولیعہد بھی مقرر کر دیا تھا۔ اُس کے اعلان میں یہ بھی درج تھا کہ جب شہزادہ خان بالیغ واپس آئے تو اُس کا شاہانہ استقبال کیا جائے۔ اُس نے لالہ رُخ کو شہزادے کی بیوی تسلیم کر کے اُسے دخترِ تبت کا خطاب دیا تھا۔ شہزادے نے جب یہ باتیں لالہ رُخ کو بتائیں تو وہ خوشی سے ایسی پاگل ہوئی کہ شاہِ تبت کی موجودگی

ہی میں دوڑ کر شہزادے سے لپٹ گئی۔

★ قائدو خان کی تاخت و تاراج کی وجہ سے مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا سلسلہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ خاص کر پرانا ریشم والا راستہ مخدوش ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس کی زرّیں خیل اور... ہلاکو خان کی ایل خانی سلطنتوں اور چین کی نئی حکومت، جس کا نام قبلائی خان نے ین کنگ رکھا تھا۔ ان کے درمیان رسل و رسائل کا سلسلہ تقریباً منقطع ہو کر رہ گیا۔ قائدو خان نے قبلائی خان کے خلاف مغلوں کے انداز میں لڑائی شروع کی تھی۔ جب اس کے گھوڑے خوب کھا پی کر ترو تازہ ہو جاتے تو وہ اچانک چھاپے مارتا قبلائی خان کو مجبوراً مدافعت کا پہلو اختیار کرنا پڑتا۔ تنگ آکر قبلائی خان نے اپنی نئی سرحد پر تیز رفتار گھڑ سواروں کا ایک پرا پھیلا دیا۔ یہ فوج گوبی کے کنارے کنارے اور شمالی چراگاہوں کے درمیانی علاقوں کی حفاظت کرتی۔ ضرورت پڑنے پر خاقان کی جنگی فوج سامنے آکر قائدو کے حملہ کو پسپا کرتی لیکن نہ تو خاقان ان باغیوں کا گوبی کے ریگ زاروں میں تعاقب کر سکتا تھا اور نہ ہی شمالی چین میں اپنی سرحد کو حملوں سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔

اس بار قائدو خان نے شمالی چین پر بے حد خطرناک حملہ کیا تھا۔ قبلائی خان کا بہادر سپہ سالار اور بایان جنوب کے استوائی خطوں میں کشور کشائی کر رہا تھا۔ قبلائی خان نے اُسے واپس بلانا بہتر خیال نہیں کیا۔ قبلائی خان نے اپنے بھائی اریق بوغا کی اطاعت کے بعد سے اب تک میدانِ جنگ میں خود قدم نہ رکھا تھا لیکن اس دفعہ قائدو کے ساتھ دشت کے مغلوں کے اور بھی حلیف تھے۔ کچھ تاتاری قبیلے جن کا تعلق دریائے آمور کے علاقے سے تھا، وہ قراقرم کی طرف بڑھ رہے تھے اور اُن سے جا ملنے کے لیے قائدو خان آلتائی کی چراگاہوں سے مشرق کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس کا بہت امکان تھا کہ دونوں فوجیں دیوارِ چین کے اندر گھس کر حملہ کریں گی۔ قائدو کا قبضہ اس وادی پر ہو چکا تھا جہاں چنگیز خان اور دوسرے خاقانوں کی قبریں تھیں۔ قبلائی خان کو اس کا سخت صدمہ تھا۔

تائی تو (خان بالیغ) میں قبلائی خان کو جتنی فوج میسر آئی اس کو ساتھ لے کر قبلائی خان نے شمال کی طرف بڑی تیزی سے بہ نفس نفیس پیش قدمی شروع کی تاکہ مانچو فوج کو قائدو کی فوج سے نہ ملنے دے۔ قبلائی خان کے پاس منگولوں عزیزوں اور شاہی محفوظ دستوں کی برائے نام فوج تھی۔ اس نے اپنی چار ہاتھیوں والی عماری پر سفر شروع کیا۔ اس نے تیر اندازوں کو سواروں کے پیچھے پیچھے چلنے کا حکم دیا۔ اس نے اپنے ساتھ شعلہ پھینکنے والی ایک منجنیق بھی لے لی تھی۔

قبلائی خان، بیس منزلوں کے بعد، اپنی شکار گاہوں سے گزرتا ہوا لیاؤ ندی کے قریب باغی فوج کے پاس جا پہنچا۔ قبلائی خود ہراول دستے کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ تاریکی میں آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھی، مانچو فوج کے سواروں میں گھر گئے... مگر قبلائی نے پروا نہ کی اور پیچھے نہیں ہٹا۔

باغی سپہ سالار یہ سمجھے کہ قبلائی خان کا اس طرح خلافِ توقع نمودار ہونا ایک جنگی چال ہے۔ اس لیے انہوں نے حملے سے گریز کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ صبح سے پہلے پہلے قبلائی خان کی فوج اُس سے آملی۔ قبلائی خان نے جنگی طبل بجوائے اور حملے کا حکم دیا۔ قبلائی کی فوجیں، باغیوں کے پڑاؤ میں گھس گئیں۔ قبلائی کے حملے میں آتشیں منجنیق کی وجہ سے اور شدت پیدا ہو گئی۔

مانچو فوج سراسیمہ ہو گئی۔ قبلائی خان، ہاتھیوں کی عماری میں لیٹا تھا۔ اُسے گٹھیا کے مرض نے بے کار کر دیا تھا لیکن اس نے مکمل فتح حاصل کی۔ باغیوں کا سردار گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

قبلائی خان نے فیصلہ کیا کہ وہ، قائدو کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر کے ہی خان بالیغ واپس جائے گا۔

★ خاقان قبلائی خان کے جنگ پر روانہ ہوتے ہی خان بالیغ میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی۔ سانگا کو اپنے نائب سلطنت ہونے کا پورا یقین تھا لیکن جب احمد کو اس عہدے پر سرفراز کیا گیا تو سانگا کھلی دشمنی پر اتر آیا۔

سانگا، چینی فلسفی یاؤ چاؤ کی طرح چینیوں کا ہمدرد تھا لیکن ذاتی مفاد نے اس کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر رکھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد احمد جیسا اقتدار حاصل کرے خواہ اس کے لیے اُسے چند ہم وطنوں کی قربانی بھی دینا پڑے... لیکن احمد کو ٹھکانے لگانے کے لیے اُسے ایک طرف تو چینی عوام کی ہمدردی حاصل کرنا ضروری تھا۔ دوسری طرف اُسے اُن شہزادوں کو اپنے اعتماد میں لینا تھا جو احمد کے خلاف تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ شہزادے اس پر اعتماد نہ کرتے تھے۔

... لیکن اس سلسلے میں سانگا کی قسمت نے یاوری کی...

خاقان قبلائی نے شہر کے باہر جو قحبہ خانہ قائم کیا تھا، وہاں شاہی خاندان کے جائز اور ناجائز شہزادوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے خیال میں شہزادوں کے وہاں عام مغلوں کی طرح جانے سے اس کا وقار مجروح ہوتا تھا۔

لیکن شہزادے جو اپنی بیویوں اور محل کی داشتاؤں کے

ساتھ دل و عیش دیتے دیتے بیزار ہو گئے تھے اور اب وہ کسی تبدیلی یا طوائفوں سے لطف اندوز ہونے کی فکر میں تھے۔ قبلائی خان کے جانے سے انہیں کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ انہیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے محل سے قدم نکالے اور شہر کے باہر کی نئی دنیا کی رنگینیوں کا لطف اٹھانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

جب یہ محل کی چار دیواری میں قید شہزادے، طوائف خانوں میں پہنچے تو وہاں کے طلسماتی ماحول نے انہیں اپنی طرف ایسا کھینچا کر وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ محل کی چند داشتائیں، انہیں پالتو جانور معلوم ہونے لگیں۔ وہ سرِ شام اور کبھی بھری دوپہر میں طوائفوں کے پاس پہنچ جاتے۔ وہاں حسن و جوانی کا سیلاب انہیں خوش آمدید کہتا۔ برق پاش نظریں اور گداز سینے انہیں دعوت دیتے۔ حسن کا ایک موجیں مارتا سمندر تھا۔ جوانیاں ہر طرف کمر لچکاتی، سانسوں کے زیر و بم سے چھاتیاں اچھالتی، قدم قدم پر فتنے جگاتی نظر آتیں۔ شراب کے شیدائی، جب ان نازنینوں اور مہ جبینوں کے ساتھ جام پر جام لنڈھاتے تو خود کو ہوا میں پرواز کرتے محسوس کرتے۔۔۔ انہیں نیلا جادو دال اپنے قدموں کے نیچے دکھائی دیتا۔

شہزادے آہستہ آہستہ یہ نئی دنیا اپنانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طوائف خانوں میں روز جھگڑے ہونے لگے۔ مغل شہزادے، طوائفوں کے لیے، ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ کبھی تو بات، بات سے بڑھ کر تلوار تک پہنچ جاتی۔

احمد کو ہر بات کی خبر مل رہی تھی۔ اسے اس معاملے میں بڑی تشویش ہوئی۔ نائب کی حیثیت سے خان بالیغ اور بیرونِ شہر میں امن و امان برقرار رکھنا، اس کا فرض تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے خاقان کے اختیارات کو کام میں لانا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ جھگڑے کسی خونی تصادم کی صورت اختیار کر گئے تو وہ خاقان کو کیا جواب دے گا۔ اس نے اس سلسلے میں لاماقاگس سے بھی مشورہ کیا اور پھر ایک سخت قدم اٹھایا۔

احمد نے تمام محلات میں اعلان کرادیا کہ آج سے کوئی شہزادہ بغیر کسی ضرورت کے شہر سے باہر نہیں جائے گا۔۔۔ اور اگر کسی شہزادے کو بیرونِ شہر کے قحبہ خانے میں دیکھا گیا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس اعلان سے شہزادے بگڑ اٹھے۔ ان کے خیال میں یہ شہزادوں کی شخصی آزادی میں دخل اندازی تھی اور کسی غیر مغل کو ایسے احکامات جاری کرنے کا اختیار نہ تھا۔

شہزادوں کو معلوم تھا کہ اگر انہوں نے احمد کے احکامات کی مخالفت کی تو احمد، انہیں معاف نہ کرے گا کیونکہ احمد انتظامی معاملات میں اپنے بیٹے کو بھی معاف کرنے کے لیے کبھی آمادہ نہ ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادوں کی راتیں پھر پہلے کی طرح سونی اور بے کیف گزرنے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھاتے مگر ان میں احمد کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہ تھی۔

اور یہی موقع تھا جس سے سانگا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے شہزادوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے بیرونی طوائفوں کو محلات میں بھیجنے کا انتظام کیا۔ اس کے آدمی، رات ہوتے ہی حسین سے حسین طوائفوں کے قافلے لے کر محلات میں پوشیدہ طریقے سے داخل ہوتے اور پھر ہر شہزادے کے محل میں پندرہ پندرہ، بیس بیس عورتیں بھیج دیتے۔ شہزادوں کو سانگا کی یہ ہمدردی بہت پسند آئی۔ ان کی راتیں پھر رنگین ہونے لگیں۔

یہ بات احمد کے جاسوسوں سے زیادہ عرصے تک چھپی نہ رہ سکی۔ احمد کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے پس پردہ سانگا کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اس نے علی الاعلان سانگا کو تنبیہ کی اور محلات کے گرد سخت پہرہ لگا کر طوائفوں کا اندر جانا بند کر دیا۔ سانگا کو اس وقت تک شہزادوں کی ہمدردیاں حاصل ہو چکی تھیں پھر اس نے اس میں تقویت اور تعاون حاصل کرنے کے لیے خان بالیغ کے پھاٹک کے چند محافظوں کو زبردست رشوت دے کر اپنا رازدار بنا لیا اور ان کے ذریعے ہر شہزادے کو کم از کم دو عورتیں بھیجنے کا انتظام کر دیا۔

احمد کو اس کا پہلے سے خدشہ تھا۔ اس نے ایک رات مغل دستوں کے ساتھ محلات کا محاصرہ کر لیا پھر اس نے ہر محل۔۔۔ میں عورتوں کو بھیج کر تلاشی لینا شروع کرائی۔ شہزادے بہت گھبرائے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔۔۔ وہ، احمد کے سامنے اقبال کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ آخر کافی تعداد میں طوائفیں، محلات سے گرفتار ہوئیں لیکن احمد کو جو تعداد بتائی گئی تھی، یہ ان کے نصف برابر تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض شہزادوں نے اپنے محل کی طوائفوں کو قبلائی کی چہیتی بیٹی شہزادی کوکاچین کے محل میں منتقل کر دیا۔۔۔ شہزادی کو یہ بات ناگوار گزری مگر شہزادوں کی محبت نے اسے خاموش کر دیا۔۔۔

احمد کو تمام عورتیں بہر صورت برآمد کرنا تھیں۔ جب تمام محلات کی تلاشی ہو چکی اور عورتوں کی تعداد پوری نہ ہوئی تو اسے بڑی فکر ہوئی اب سوائے کوکاچین کے محل کے اور کوئی جگہ باقی نہ رہی تھی۔۔۔ احمد کو کاچین کے محل کی تلاشی لیتے ہوئے گھبرا رہا تھا لیکن اس نے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی اور شہزادی کے محل کی تلاشی کا حکم دے دیا۔ شہزادی کوکاچین نے تلاشی دینے سے انکار کیا تو احمد کو

اور شبہ ہُوا۔ اُس نے شہزادی کے غصّے کی پروا نہ کرتے ہُوئے تلاشی لینے والی عورتوں کو زبردستی محل میں بھجوا دیا۔ بقیہ طوائفیں وہاں سے پکڑی گئیں مگر شہزادی کوکاچین، احمد کے خون کی پیاسی ہو گئی... اُس نے اسے اپنی سخت توہین سمجھا اور احمد کو دھمکی دی کہ وہ اُس سے خوفناک انتقام لے گی۔ چنانچہ اب احمد کے مقابلے پر سانگا کے علاوہ تمام عیاش شہزادے اور کوکاچین بھی آگئی

... پھر سانگانے احمد کے قتل کی ایک اسکیم تیار کی...

اس سازش کا سرغنہ بظاہر چنگ لی نامی ایک شخص تھا۔ مغرب کے ایک وینیسی مؤرخ نے چنگ لی اور احمد کے درمیان مخاصمت کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ احمد نے چنگ لی کی ماں، بہن اور بیٹی کی عزّت لوٹی تھی۔ یہ الزام سراسر بہتان ہے۔ مغربی مؤرخ جب بھی کسی مسلمان کا ذکر کرتے ہیں تو مذہبی عصبیّت اُن کے سر پر سوار ہو جاتی ہے۔ احمد مسلمان تھا اور صوم وصلوٰۃ کا پابند...

چالاک سانگانے سازش کو کامیاب کرنے کے لیے ایک غیر فوجی سردار وانگ چو اور جادوگر (بقول مؤرخین) کو چنگ لی کے ساتھ کر دیا۔ سانگا کی اس خطرناک سازش کا مقصد صرف احمد ہی کا خاتمہ نہ تھا بلکہ وہ خان بالیغ کے بقیہ تمام مغل دستوں کو تہ تیغ کر کے چین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ سانگانے یہ طے کیا کہ آدھی رات کے وقت محل میں بہت سی مشعلیں روشن کی جائیں۔ اس روشنی کو دیکھتے ہی شہر کے تمام چینی سڑکوں پر نکل آئیں... اور ہر ڈاڑھی والے کو قتل کر دیں۔ ڈاڑھی صرف مسلمان رکھتے تھے یا پھر غیر ملکی۔ سانگا کا ارادہ، مسلمانوں کے اس قتلِ عام کے بعد تخت پر قبضہ کرنا تھا... لیکن اس کی اسکیم پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔

سانگا کے اشارے پر وانگ چو اور چنگ لی شاہی محل میں داخل ہوئے۔ وانگ چو بڑے ہال میں بیٹھ گیا... اور اس نے بہت سی قندیلیں روشن کرنے کا حکم دیا... پھر اُس نے احمد کے پاس جو پُرانے شہر میں رہتا تھا، ایک قاصد یہ پیغام دے کر بھیجا کہ خاقان کا ولی عہد چنگ کم اچانک واپس آگیا ہے اور احمد سے فوراً گفتگو کرنا چاہتا ہے۔

احمد کو لاما فاگس کے ذریعے صرف اتنا معلوم ہُوا تھا کہ شاہِ تبّت نے شہزادے کو بحفاظت واپس پہنچنے کے انتظامات کر لیے ہیں۔ شہزادے کے خان بالیغ میں اس قدر جلد پہنچنے کی اُسے امید نہ تھی۔ اُسے اس بات پر تعجب ہُوا۔ اس نے چاہا کہ احمد دن کو جگا کر اپنے ساتھ لے لے لیکن یہ سوچ کر کہ اس طرح دیر ہو جائے گی وہ قاصد کے ساتھ تنہا روانہ ہو گیا۔

احمد جس وقت شاہی محل کے پھاٹک پر پہنچا تو اُس نے کوغتائی خان کو پہرے پر موجود پایا۔ کوغتائی خان، قبلائی خان کے شہر کے محافظ دستے کا سردار تھا... یہ سردار احمد کی قابلیت کا بڑا قدر دان تھا اور اس کی عزّت کرتا تھا۔

سردار نے احمد کو اتنی رات گئے پھاٹک میں داخل ہوتے دیکھا تو اُسے بڑا تعجب ہُوا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر احمد کے پاس آیا اور سلام کے بعد اُس نے پُوچھا۔ "نائبِ سلطنت اتنی رات گئے آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

احمد نے قدرے جھجک کر جواب دیا۔ "خان کیا تمہیں کچھ بھی خبر نہیں؟"

سردار نے کہا۔ "کس بات کی خبر؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

احمد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں یہ بھی خبر نہیں کہ ولی عہد چنگ کم واپس آگئے ہیں اور انہوں نے مجھے طلب کیا ہے۔"

سردار کی سمجھ میں احمد کی بات نہ آئی۔ اُس نے کہا۔ "نائب صاحب یہ کیسے ممکن ہے؟ میرے علم کے بغیر وہ خفیہ طور پر محل میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں؟"

احمد کو بہت ہی جلدی تھی۔ اُس نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں اندر جا کر ابھی تصدیق کرتا ہوں۔"

احمد گیٹ سے گزر کر محل میں داخل ہو گیا۔ سردار کوغتائی خان کو کچھ شبہ ہُوا۔ اس لیے وہ بھی احمد کے پیچھے محل میں پہنچا۔ اس نے احتیاط کے طور پر سپاہیوں کا ایک دستہ اپنے ساتھ لے لیا۔

ہال کے اندر سینکڑوں قندیلوں کی اتنی تیز روشنی تھی کہ جب احمد اندر داخل ہُوا تو اُس کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اس نے وانگ چو کو ولی عہد چنگ کم سمجھتے ہوئے، اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا...

چنگ لی جو گھات لگائے کھڑا تھا، اس نے احمد پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ احمد کی گردن سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ کوغتائی خان نے جیسے ہی یہ ماجرا دیکھا تو دروازے ہی پر ٹھہر گیا اور زور سے چلایا۔ "غداری... غداری..."

پھر کوغتائی خان نے کمان میں تیر جوڑا اور وانگ چو کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر، اُس کے کندھے پر لگا اور اُس نے دوسرے کمرے میں بھاگ کر جان بچالی۔ کوغتائی اُسے پکڑنے دوسرے کمرے میں گیا مگر وانگ چو، اس کے ہاتھ نہ آیا۔ البتہ چنگ لی کو کوغتائی کے سپاہیوں نے گرفتار کر لیا۔

کوغتائی نے اپنے آدمیوں کے ذریعے شہر میں منادی کرا

دی کہ کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہ آئے۔ جو بھی سڑک پر دکھائی دیا، اُسے بے دریغ قتل کر دیا جائے گا۔ چینیوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ سازش کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ وہ اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے رہے۔ کسی نے باہر آنے کی جرأت نہیں کی۔

کوغتائی خان نے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے... خاقان کو بھی اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ اس سے ایک روز قبل احمد نے خاقان کو ولی عہد چنگ کم کی تبت سے خان بالیغ کو روانگی کی خبر بھجوائی تھی۔ ان دو خبروں نے خاقان کو میدانِ جنگ سے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے جنوب بعید میں اپنے سپہ سالار بایان کو حکم بھیجا کہ وہ، قائدو خان کے مقابلے پر جائے اور قبلائی خان خود محاذ چھوڑ کر دارالحکومت واپس آ گیا۔

قبلائی خان کی واپسی پر، کوغتائی خان نے احمد کے قتل کا مقدمہ اس کے سامنے پیش کیا۔ کوغتائی خان کو اُمید تھی کہ احمد کے درخشاں کارناموں کے تحت قبلائی خان، احمد کے قتل میں ملوث، تمام ختائیوں (چینیوں) کو قتل کرا دے گا لیکن شہزادی کوکاچین نے اپنے محل کی تلاشی کا رونا کچھ اس انداز سے رویا کہ قبلائی خان کو اس کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ شہزادی نے باپ کے سامنے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ اگر احمد سے اس توہین کا بدلہ نہ لیا تو وہ اپنی جان دے دے گی۔

شہزادوں نے گھما پھرا کر قبلائی خان کو یہ باور کرا دیا... کہ احمد نے ایک کنواری مُغل شہزادی کے محل میں داخل ہو کر تمام مُغلوں کی بے عزتی کی ہے اور اگر قبلائی خان نے احمد کو معاف کر دیا تو شہزادی مُغلوں کی عزت پر قربان ہو جائے گی...

سانگا نے بھی اپنا پورا کردار ادا کیا۔ اُس نے احمد کے خلاف صدہا جھوٹی شہادتیں دربار میں پیش کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبلائی خان نے اس مقدمے کا فیصلہ، کوغتائی خان کی اُمید کے بالکل خلاف کیا۔

قبلائی خان نے احمد کا محل مسمار کرا دیا۔ اس کی جائداد اور تمام دولت ضبط کر لی۔ اس کے بیشتر لڑکوں کو قتل کرا دیا... قبلائی خان نے احمد کی وفاداریوں کا صلہ دینے کی بجائے، اس کی لاش قبر سے نکلوا کر کُتوں کے آگے ڈال دی۔ احمد کو مرنے کے بعد ذلیل کرنے والوں میں چینیوں کے علاوہ یورپ کا وہ عیسائی سفیر بھی تھا جس نے سب سے پہلے اِن ظالم مُغلوں کی تاریخ مرتب کی۔ احمد کی آڑ میں اور قبلائی خان کی شہ پا کر مُغلوں اور چینیوں نے جی بھر کر مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ احمد دن

کی جان، ایک مُغل شہزادے نے۔

★ شہزادے چنگ کی واپسی کا سفر بڑا شاندار تھا۔ اس کی رتھ نما گاڑی میں سمور بھرے نرم گدّے بچھائے گئے تھے۔ چاروں طرف رنگین پردے ڈالے گئے تھے۔ اُس کے خاص رتھ کے علاوہ چار اور چھکڑوں پر شاہِ تبت نے سامان خورد و نوش اور سفری ضروریات کی دوسری چیزیں بار کرائی تھیں۔ آگے پیچھے تبتی فوجی حفاظت کے لیے موجود تھے۔

لالہ رُخ نے اپنے بھائی کو بھی ساتھ لانا چاہا تھا لیکن اُسے اپنا وطن بہت عزیز تھا۔ اس نے لالہ رُخ کو اپنی دُعاؤں کے ساتھ رُخصت کیا۔

لالہ رُخ کو شہزادے کی محبت میسر تھی۔ وہ خود کو دُنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب عورت سمجھ رہی تھی۔ شہزادے کی صحبت نے اُس کے حسن کو اور نکھار دیا تھا۔ اُس کی مخمور آنکھوں کے سُرخ ڈورے جب شراب چھلکاتے تو شہزادہ بن پئے مست ہو جاتا... اُس کی جوانی نس نس سے پھوٹ رہی تھی۔ حسن کی پوشیدہ سرمستیوں نے اُس کے اعضا کو سڈول سے سڈول تر بنا دیا تھا۔ دن اور رات کے بیشتر اوقات میں لالہ رُخ کا بدن شہزادے کے لمس سے جلتا اور پگھلتا رہتا۔ برف پوش پہاڑیوں کی وادیوں میں لالہ رُخ کا یہ سفر اُس کی زندگی کے حسین ترین لمحات تھے۔

پہاڑوں کے نشیب و فراز سے گزر کر جب ولی عہد کا مختصر قافلہ میدانی علاقے میں آیا تو قبلائی خان کے دستوں نے شہزادے کا شاندار استقبال کیا۔ شہزادے کی واپسی کی اطلاع دُور و نزدیک تمام چوکیوں کو پہنچ چکی تھی۔ شہزادے کی سواری جدھر سے گزرتی لوگ اسے دیکھنے کے لیے بھاگے چلے آتے۔ شہزادے چنگ کم کو، اپنے مستقبل کے خاقان کو... لالہ رُخ اس تصور سے کھل اُٹھتی۔

... لیکن شہزادے یا لالہ رُخ کی قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا۔ میدانی علاقے کی آب و ہوا نے شہزادے کی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ پہلے اُسے ہلکا پھر تیز بخار چڑھا۔ شاہِ تبت نے دو طبیب، شہزادے کے ساتھ کر دیے تھے۔ اُنہوں نے لالہ رُخ کو تسلی دی۔ لیکن تمام تر کوشش کے باوجود شہزادے کا بخار نہ اُترا۔ اُسے پھر پہلے کی طرح بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ اس دفعہ اُس کے ہاتھ پیروں میں درد پیدا ہو گیا۔ کچھ روز بعد شہزادے کے پیروں نے حرکت کرنا چھوڑ دیا۔

لالہ رُخ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک مشکل سے چھٹکارا ملا تھا کہ دوسری نے آن گھیرا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

وہ شہزادے سے لگی آنسو بہاتی رہتی مگر اُس کے آنسو شہزادے کی دوا نہ بن سکے اور شہزادے کی حالت بگڑتی گئی۔

خاقان قبلائی خان کو شہزادے کے اچانک بیمار ہو جانے کی اطلاع بھجوادی گئی تھی۔ اُس نے حکم دیا کہ چھکڑوں کی رفتار تیز کر کے شہزادے کو جلد از جلد خان بالیغ پہنچایا جائے۔ خان بالیغ جس قدر تیزی سے نزدیک آرہا تھا۔ شہزادے کی حالت اسی تیزی سے بگڑتی جارہی تھی۔

قبلائی خان نے شہزادے کے استقبال کے لیے شہر کو سجانے کا حکم دیا تھا۔ اندرون اور بیرون شہر دُلہن کی طرح آراستہ تھا۔ قبلائی خان تمام سرداروں اور معززین کے ساتھ شہر کے پھاٹک پر شہزادے کے استقبال کے لیے آیا تھا۔ اُس کے عقب میں عوام کا اژدہام تھا مگر ہر زبان خاموش اور ہر آنکھ حیران اور نمناک تھی۔ شہزادے کی بیماری نے اُن کی خوشیوں کو غم میں بدل دیا تھا۔

شہزادے کا رتھ خان بالیغ کے پھاٹک پر آگیا۔ قبلائی خان نے آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ ہٹایا۔ شہزادہ چنگ کم خاموش لیٹا تھا اُس کی آنکھیں بند تھیں۔

خاقان نے آواز دی۔ "پیارے کم! آنکھیں کھولو۔ تمھارے سامنے خاقان..."

قبلائی خان کچھ سوچ کر رُکا پھر جلدی سے بولا۔ "تمھارا باپ، تم سے ملنے آیا ہے بیٹے!"

شہزادے نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ آنکھیں کھولیں...

لالہ رُخ رتھ سے اُتر کر نیچے آگئی۔ اُس نے خاقان کی تعظیم کا کوئی خیال نہ کیا۔ اُس کی آنکھوں کے بادل برابر برس رہے تھے۔ وہ پیکرِ غم بنی کھڑی تھی۔

خاقان نے شہزادے کو پھر آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔

خاقان کا رنگ اُڑنے لگا۔

تبتی طبیب نے کوئی رقیق شے چمچے میں ڈال کر شہزادے کے مُنہ میں زبردستی اُنڈیلی۔ شہزادے کے جبڑے بند ہو رہے تھے... پھر دوا نے اثر دکھایا اور شہزادے نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ خاقان کے چہرے پر بحالی آگئی۔ لالہ رُخ جلدی جلدی آنسو پونچھنے لگی۔

شہزادے کا جسم بے حرکت تھا۔ صرف آنکھیں کھلی تھیں۔

خاقان نے کہا۔ "بیٹے! ہمیں معاف کردو۔ ہم ظالم ہیں، ہم قاتل ہیں۔ ہم نے تمھاری ماں کو قتل کیا۔ ہم نے تمھاری... یہ حالت بنادی۔"

شہزادے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کی زبان بھی بند ہو گئی تھی... پھر شہزادے نے آنکھ کی پتلیوں کو چاروں طرف اس طرح گھمایا جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

خاقان نے فوراً آیا کو اشارہ کیا۔

آیا، شہزادے کے بچّے کو گود میں لیے کھڑی تھی۔

بچّہ شہزادے کے قریب لایا گیا۔ خاقان نے بچّے... کو ہاتھوں میں لے کر اُس کا چہرہ، شہزادے کے مُنہ کے قریب کر دیا۔ شہزادے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اُس کے ہونٹوں نے ذرا سی حرکت کی۔ شاید وہ، بچّے کو پیار کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ناکام رہا۔ خاقان نے بچّہ آیا کو واپس کر دیا۔

خاقان کی آنکھیں بھرتی جارہی تھیں۔ شاید وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہزادے کی پتلیاں پھر گھومیں، لالہ رُخ تھوڑا سا آگے بڑھ آئی... شہزادے نے اس پر نظریں جمادیں۔

خاقان نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پیارے چنگ! یہ وفادار لڑکی خوش قسمت ہے۔ اس نے تیری خدمت کی اور تیرا پیار پایا... لیکن مجھے تیرا پیار نہ مل سکا۔ لالہ رُخ، میری بہو ہے... میری بیٹی ہے۔"

شہزادے کی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک پیدا ہوئی پھر وہ آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہمیشہ کے لیے۔

خاقان نے اپنا سر پیٹ لیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

لالہ رُخ دوڑ کر شہزادے کے قدموں سے لپٹ گئی اور اس کے تلوؤں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

ہر طرف سسکیاں، چیخیں اور واویلا تھا۔ ہر دل فگار ہو گیا۔ ہر آنکھ نے آنسوؤں کے دریا بہادیے۔

لالہ رُخ روتے روتے بیہوش ہو گئی۔ خاقان سے یہ غم برداشت نہ ہو سکا اور وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔

قُدرت کا یہ خاموش انتقام تھا۔ بے گناہوں بے کسوں اور مقتولوں کی آنکھیں موت بن کر شہزادے پر گریں اور خاقان کے غرور کو توڑ کر رکھ دیا۔

لالہ رُخ کی خواہش پر خاقان نے چنگ کم کے بیٹے کی تربیت، لالہ رُخ کے سپرد کر دی۔ اُسے ننھے شہزادے میں اپنے محبوب کی شبیہہ نظر آتی۔ شہزادے کی تربیت میں مگن ہو کر... لالہ رُخ چنگ کم کے غم کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی۔





عمرِ جاوداں کی تلاش

الیاس سیتاپوری

دو سال بعد منگولوں کی داستان ختم ہو گئی۔ وہ قوم جو طوفان کی طرح قصرِ اسلام پر چھا گئی تھی، جب تک وحشی اور خانہ بدوش رہی دنیا کو زیر کرتی چلی گئی لیکن پھر اسے اپنے مفتوحہ اور مقبوضہ ملکوں پر حکومت کرنے کے لیے اپنے گھوڑوں کی پشت سے اترنا پڑا۔ یہ ان کا ٹھہراؤ تھا، ایک طوفان کا ٹھہراؤ، ہر قسم کا ٹھہراؤ۔ ان کی وحشی جبلت تمدن کے ہاتھوں مسخر ہوتی چلی گئی جس اسلام کی بیخ کنی ان کا منشاء اور مقصود تھا اسی اسلام نے انہیں فتح کر لیا۔ چغتائی، جوجی اور ہولاکو کے خانوادے مسلمان ہو گئے۔ قبلائی خان اور اس کے خاندان کو چینی تہذیب نے زیر کر لیا اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ جب ان وحشیوں کو بدھ مذہب اور اسلام نے زیر کر لیا تو یہ تاریخ میں کچھ زیادہ قابلِ ذکر نہیں رہ گئے۔

میں نے اپنی تمام کہانیوں میں یہی کوشش کی ہے کہ میں بے جا طرفداری نہ کروں۔ مسلمانوں کی ہزیمتیں، شکستیں اور ان کی بربادیاں اسی طرح بیان کی گئی ہیں جس طرح فی الواقع ہوئی تھیں۔ مسلم زعما کی کمزوریوں اور خامیوں سے بھی اغماض نہیں کیا گیا۔ دنیا میں ایک قانون اٹل ہے، طاقتور غالب اور کمزور مغلوب ہوتا ہے۔ جب مسلمان کمزور تھے طاقتور اور ذہین وحشی ان پر غالب آ گئے اور جب وحشی کمزور اور کم عقل ہو گئے تو طاقتور اسلام اور مسلمانوں نے انہیں زیر کر لیا۔

زیرِ نظر کہانی کے مرکزی کردار کیخاتو خان کے بعد کیا ہوا؟ یہ بھی تاریخ کے دلچسپ ابواب ہیں۔ کیخاتو خان کو بھی اس کے مسلمان ہو جانے کے جرم میں قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد کیخاتو خان کے چچازاد بھائی بایدو خان کو ارغون خان کے بیٹے غازان خان نے قتل کر دیا اور یہ حکومت ایک بار پھر اپنے سابقہ خاندان میں واپس چلی گئی۔ تاریخ کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ جس ارغون خان نے مسلمان ہونے کے جرم میں اپنے بھائی تگودار احمد کو قتل کر دیا تھا اور سعد اللہ یہودی کے مشورے اور اپنے غیر اسلامی عناد پر مسلمانوں کا قتلِ عام کرایا تھا اور جو مرتے دم تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کرتا رہا۔ بعد میں اس کا بیٹا غازان خان مسلمان ہو گیا اور تاریخ میں سلطان محمود غازان کے نام سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس نے اپنے سکوں پر کلمہ طیبہ نقش کرایا تھا اور شاہی مہر اور شاہی فرامین کی پیشانیوں پر "اللہ اعلیٰ" لکھنے کا حکم دیا تھا۔

سلطان محمود غازان کے عہد میں منگولوں کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد وحشی منگولوں کا ذکر نہیں ملتا ———— الیاس سیتاپوری

منگول امرا، شاہی افراد اور منگول عساکر نے متفقہ طور پر ارغون کو ایل خان بنا دیا۔ ارغون نے سعد اللہ یہودی کو اپنا وزیر بنا لیا۔ ارغون اور سعد اللہ یہودی نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سر جوڑ کر مشورے کیے۔ ارغون نرمی اور مروت سے کام لینا چاہتا تھا مگر سعد اللہ یہودی انتہا پسند تھا۔ آس پاس کی مسجدوں سے ہونے والی اذان سعد اللہ یہودی کے دل و دماغ پر ضربیں لگاتی تھی وہ اس فرسودہ آواز کو بند کر دینے کی فکر میں تھا لیکن کسی طرح بس نہیں چل رہا تھا لیکن ارغون خان کے برسرِ اقتدار آتے ہی اس کے انتقامی خواب پورے ہونے لگے۔ مسلمانوں کو غدار اور ملک دشمن قرار دیا گیا اور یہی جواز ان کے قتل کا سبب بن گیا۔ ارغون کے حکم سے مسلم کشی عام ہو گئی۔ مسلمان علماء کو بطورِ خاص ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا گیا۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور بیماروں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ بستیوں کے گلی کوچے مسلمانوں کی لاشوں سے پٹ گئے۔ ان میں کے بعض مسلمان جیالے بھی تھے اور ہوشیار اور چالاک بھی۔ انہوں نے اپنا دین تو نہیں بدلا مگر ارغون کی تلوار سے بچنے کے لیے جنگلوں اور غاروں



میں روپوش ہو گئے — یہ منگولوں سے محفوظ ہو کر ہر وقت کی نمازوں میں یہی دعا مانگتے رہتے کہ خدایا! کافروں سے نجات دلا اور ارغون کے دل میں اسلام ڈال دے۔

سعد اللہ یہودی شمس الدین جوینی کو بھی قتل کر دینا چاہتا تھا مگر ارغون نے ایسا نہیں ہونے دیا، اس نے کہا: "میں نے جوینی کو پناہ دی ہے اس لیے میں اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

ارغون کا بھائی کیخاتو خان مقتولوں کی بستیوں میں گیا۔ وہاں لاشیں سڑ رہی تھیں اور ہر طرف تعفن پھیلا ہوا تھا۔ کیخاتو خان افسردہ اور مضمحل کچھ دیر کھڑا اس مرقع عبرت کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ ان لاشوں کو گڑھے کھود کھود کر دفن کر دیا جائے۔

مخبروں نے یہ خبر ارغون اور سعد اللہ یہودی تک پہنچا دی۔ غاصب ایل خان اور سعد اللہ یہودی نے عطر اور خوشبویات میں بڑے بڑے رومال بسا کر اپنے منہ پر چڑھا لیے اور مسلمان مقتولوں کی بستی میں پہنچ گئے۔ ارغون نے اپنے بھائی کیخاتو خان سے پوچھا: "یہ تو کیا کر رہا ہے؟"

کیخاتو خان ذرا بھی نہیں گھبرایا۔ جواب دیا: "میں متعفن لاشوں کو گڑھوں میں ڈلوا کر انہیں بند کروا رہا ہوں۔"

[illegible] اللہ یہودی نے کہا: "لیکن اس طرح ہمارا مقصد تو....."

[illegible] اس کی بات کاٹ دی، بولا: "حالانکہ ہمارا تو یہ مقصد تھا! لاشیں [illegible] کے حوالے کر دی جائیں۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "خان محترم! کتے بلیاں جتنی لاشیں کھا سکتے تھے کھا چکے۔ اب جو لاشیں سڑ رہی ہیں ان سے بیماریاں پھیل جائیں گی۔ میں نے اسی خیال سے انہیں دفن کرانے کا کام شروع کیا۔"

ارغون اور سعد اللہ یہودی مُردوں کی بستی میں گھومنے لگے۔ ان کے ساتھ ساتھ مغول سپاہ کا دستہ بھی حرکت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بایدو خان بھی وہیں پہنچ گیا۔ سعد اللہ یہودی نے ایک پانچ چھ سالہ بچے کو اوندھے منہ پڑے دیکھا۔ اس کے شانے میں ترکش پھنسا ہوا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے تیر قرینے سے لگے تھے اور چھوٹی سی کمان سینے کے نیچے دبی تھی۔ سعد اللہ یہودی نے ارغون خان کو یہ لاش بطور خاص دکھائی۔ بولا۔ "محترم ایل خان! آپ نے اس پانچ چھ سالہ بچے کی لاش ملاحظہ فرمائی؟ یہ بچہ مرنے سے پہلے ہمارے کسی آدمی کو تیر کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے پیچھے سے کسی نے اس کا کام تمام کر دیا۔"

ارغون خان نے بچے کی لاش کو غور سے دیکھا اور منہ پھیر کر سعد اللہ یہودی کو جواب دیا: "لیکن بچہ تھا بہت بہادر۔ اس نے سینے کے بجائے پشت پر مار کھائی ہے۔"

کیخاتو خان بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ خوشبویات میں ڈوبا ہوا ایک رومال کیخاتو خان کے چہرے پر باندھ دیا گیا۔ وہ لاشوں کو پھلانگتے اور جمے ہوئے خون سے گزرتے ہوئے ایک ایسی عورت کی لاش کے پاس جا کھڑے ہوئے جس کے سینے پر ایک بچہ چمٹا ہوا تھا اور کسی شقی القلب

منگول کا نیزہ ان دونوں کے سینوں کے باہر نکل گیا تھا گویا دونوں سیخ کے کباب کی طرح سیخ میں پرو دیے گئے تھے۔

کیخاتو خان نے کہا: "محترم ارل خان! اتنی سفاکی بھی مناسب نہیں جب کہ مسلمان فاتح دوسری قوموں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے۔"

ارغون نے جواب دیا: "شہزادہ کیخاتو خان! ہم ان دو پر اپنے دو نیزے کیوں ضائع کرتے؟"

اس پر دونوں کو ہنسی آ گئی اور فضا قہقہوں سے گونج اٹھی۔

سعداللہ یہودی ایک نوجوان کی لاش کو بغور دیکھنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے تھے۔ اس نے ارغون کو بطور خاص مخاطب کیا۔ "خانِ محترم اس نوجوان کو ملاحظہ فرمائیں اس کے دونوں ہاتھ غائب ہیں غالباً کوئی کتا کھا گیا ہوگا۔"

کیخاتو خان کو یہ چہرہ کچھ شناسا سا لگا، بولا: "میرا خیال ہے بھائی نکودار اس پر بہت مہربان تھے کیونکہ میں نے اس نوجوان کو ان کے پاس کئی بار دیکھا تھا۔"

ارغون نے ازراہِ مذاق کہا: "تب پھر جاودانی نیلے آسمان کے اس پار نکودار اور یہ نوجوان دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ رہے ہوں گے۔"

ایک بار پھر لوگوں کے قہقہوں سے فضا گونج گئی۔

ارغون اور سعداللہ یہودی کچھ دیر مقتولوں کے عبرت ناک مال اور آثار سے لطف اندوز ہوتے رہے بایدو خان خلافِ معمول چپ تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ اتفاقاً کسی لاش سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا، مگر گرا نہیں سنبھل کے رہ گیا۔ وہ ٹھوکر لگنے والی لاش سے مخاطب ہوا: "کیوں بھائی! میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم درپے آزار ہو؟"

کیخاتو خان کو یہ ساری باتیں گراں گزر رہی تھیں۔

خوشبو میں بسے ہوئے رومال بھی کئی دن کی سڑی لاشوں کے تعفن پر قابو نہ پا سکے اور ان سب کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ارغون کو اپنے بھائی کیخاتو خان پر رحم آ رہا تھا جو بہت کم بولتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیخاتو خان! تو خوش کیوں نہیں ہے؟"

کیخاتو خان نے افسردگی سے جواب دیا: "میں سوچتا ہوں اگر بھائی نکودار اپنے آباؤ اجداد کے دین اور رسوم سے منحرف نہ ہوتے تو ان کا یہ حشر کیوں ہوتا اور اس کے علاوہ میں کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں۔"

ارغون نے بے چینی سے پوچھا: "اور کیا؟ مثلاً؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "چنگیز خان سے لے کر والد اباقا خان تک ہر ایک نے آپس میں اتحاد اور یک جہتی کی تلقین کی اپنی اولاد سے اتفاق اور پیار محبت کے وعدے لیے لیکن افسوس کہ ہم نے ان کا خیال نہیں کیا۔"

ارغون کو کیخاتو خان پر کچھ شبہ سا گزرا۔ پوچھا: "کیا بات ہے: اس طرح تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

کیخاتو خان نے سعداللہ یہودی کی طرف دیکھا جو بظاہر دونوں بھائیوں کی باتوں سے بے نیاز اپنے حال میں مگن ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مگر حقیقتاً اس کے دونوں کان ان کی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔

کیخاتو خان نے جواب دیا: "برادرِ محترم! میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اپنے بھائی نکودار کو قتل کر کے اور اپنی مسلمان رعایا کو ذبح کر کے آپ نے حاصل کیا کیا؟ اب ہم لوگ قراقرم بھی واپس نہیں جا سکتے، کیونکہ ہمارا خاقان قراقرم کے بجائے چین کے شہر شانگ تو میں آرام کر رہا ہے۔ اب ہم سب کو یہیں، انہی زمینوں میں رہنا ہے، پھر کیوں نہ ہم سب مل جل کر رہیں، اتحاد و یگانگت اختیار کریں۔ جوجی خان کا خانوادہ مسلمان ہو چکا۔ ہمارے اس پاس مسلمانوں کی حکومت ہے، ہمیں ان سے بھی رواداری اور محبت سے پیش آنا چاہیے۔ اگر ہم اپنوں کو ماریں گے تو ہمارا ساتھ کون دے گا؟"

ارغون کا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اس کو کچھ سوچتے دیکھا، تو سعداللہ یہودی کو فکر لاحق ہو گئی وہ اپنے گھوڑے کو ارغون کے قریب لے آیا۔

ارغون نے ازراہِ مذاق مسکراتے ہوئے کہا: "تو کیوں پریشان ہو رہا ہے سعداللہ؟"

سعداللہ نے جواب دیا: "جب تک ولی نعمت حکمراں ہیں سعداللہ یہودی کسی سے کیوں ڈرے گا؟"

محل میں پہنچنے کے بعد ارغون کیخاتو خان کو تخلیہ میں لے گیا اور اس کو اجازت دی کہ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہے فی الفور کہہ دے۔

کیخاتو خان نے جھجکتے ہوئے پوچھا: "میں جو چاہوں کہہ دوں؟ کیا سچ؟"

ارغون نے جواب دیا: "میں نے تجھ کو اجازت جو دی۔"

کیخاتو خان نے پوچھا: "کیا آپ یہ گوارا کریں گے کہ حکومت بایدو خان کے خاندان میں چلی جائے؟"

ارغون نے جواب دیا: "نہیں، اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تو نے یہ سوال کیوں کیا؟"

کیخاتو خان نے کہا: "بایدو خان سپہ سالارِ اعلیٰ بننا چاہتا ہے اور اب آپ خود یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حکومت کدھر جا رہی ہے؟"

ارغون نے کہا: "بایدو خان نے سپہ سالاری کی خواہش تو کی تھی مگر میں نے انکار کر دیا کہ اس پر میرے بھائی کیخاتو خان کا حق ہے۔"

کیخاتو خان ارغون کی زبان سے یہی سننا چاہتا تھا، خوشامدانہ عرض کیا: "برادرِ محترم! آپ تو خود سمجھ دار ہیں، شاید اسی لیے ...."

ارغون نے خشک میووں سے اپنے بھائی کی خاطر مدارات کی اور اس کو بتاتا رہا کہ اس نے نکودار کو کیوں قتل کیا۔ اور اس نے اس قتل کے

جواز میں بڑی مؤثر تقریر کر ڈالی لیکن کیخاتو خان غیر جذباتی بنا بیٹھا سنتا رہا۔

ارغون جب بولتے بولتے اچانک چپ ہو گیا تو کیخاتو خان کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے سر اوپر جو اٹھایا تو دیکھا ارغون ہانپ رہا ہے اور اس کا چہرہ سرخ ہو چکا ہے۔

ارغون نے تالی بجا کر دو خدمت گار خواتین بلالیں اور انہیں حکم دیا کہ سانس کی دوا لائی جائے۔ جب وہ دونوں چلی گئیں تو ارغون نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی صحت کے بارے بہت فکرمند رہتا ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں بہت دنوں بہت سالوں تک لیکن صحت جواب دے رہی ہے۔" پھر اچانک سوال کیا۔ "کیخاتو خان! میں نے سنا ہے کہ تو بھی بہت عقلمند ہے!"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "اگر میں عقلمند ہوتا تو دونوں بھائیوں میں صلح کرا دیتا۔ نکودار کے قتل کے بعد میں عقلمندی کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں عقلمند ہوتا تو کسی بھی طرح بھائی نکودار مرحوم کو بچا لیتا۔"

ارغون نے برا سا منہ بنایا۔ "کیخاتو خان! میرے بھائی! تو نکودار کا نام نہ لیا کر۔ مجھے اس نام سے چڑ ہے۔"

کیخاتو خان نے اجازت چاہی مگر نہیں ملی۔ ارغون خان ایک بار پھر اپنے مرض کا ذکر کرنے بیٹھا، بولا۔ "کیخاتو خان! میں اپنی زندگی کی طرف سے بہت اداس رہتا ہوں۔ تو مجھے مشورہ دے کہ میں کس طبیب کو پکڑوں، کس حکیم سے رجوع کروں؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "میں نے سنا ہے یونان کے لوگ بہت عقلمند اور طبیب ہوتے ہیں۔ ان کے بعد مصر کا نام لیا جاتا ہے۔"

ارغون خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ مضطربانہ بولا۔ "ہاں ہاں، چند نام اور۔"

کیخاتو خان نے آہستہ سے کہا۔ "ایک ملک اور ہے آپ کہیں تو اس کا نام بھی بتا دوں؟"

ارغون کھڑا ہو گیا اور اس نے جلدی جلدی ٹہلنا شروع کر دیا۔ بولا۔ "ہاں ہاں بولتا کیوں نہیں، وہ تیسرا ملک؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "وہ تیسرا ملک ہندوستان ہے۔ اس ملک کے بارے میں میں نے یہ سن رکھا ہے کہ وہاں عقل و دانش کی کوئی کمی نہیں۔ ان کے حکیم جو وید کہلاتے ہیں ایسے ایسے نسخے رکھتے ہیں کہ چاہیں تو بوڑھے کو جوان بنا دیں اور مرے ہوئے میں جان ڈال دیں۔"

ارغون اپنے بھائی سے لپٹ گیا۔ "تو بس پھر ہندوستان ہی رہا۔ کیخاتو! میرے بھائی! میں تجھ کو اپنی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ بنا دینا چاہتا ہوں۔ تو ہندوستان کے کسی نامی گرامی طبیب کو بلوالے۔ یہ مت سوچ کہ وہ اپنے آنے کی قیمت کیا لے گا۔ قیمت اس کو اس کی امید اور توقع سے زیادہ دوں گا۔"

کیخاتو خان نے کہا۔ "شاید اس وید کی جستجو میں مجھے ہندوستان کا سفر خود کرنا پڑے۔"

ارغون نے خوشی سے جواب دیا۔ "اس سے بہتر کیا ہو گا۔ خوب! خوب!"

کیخاتو خان محل سے نکل کر اپنے قصر میں چلا گیا۔ اسے مسلمانوں کی بربادی کا بڑا دکھ تھا۔ ارغون پر سعد اللہ یہودی کا اثر تھا اور یہ یہودی مسلمانوں سے بہت چڑتا تھا۔ سعد اللہ یہودی جو چاہتا تھا، وہی کر گزرتا تھا۔ مسلمانوں کے اثرات بالکل زائل ہو چکے تھے اور اب ان کی جگہ عیسائیوں کے چہرے نظر آنے لگے تھے۔ ارغون کا بیٹا جون ہر وقت عیسائیوں میں گھرا رہتا تھا۔ وہ جون کو بتلاتے تھے کہ منگولوں کا اصل مذہب آسمان پرستی ہے مگر انہیں اپنے آبائی دین کے علاوہ اگر کوئی مذہب پسند آیا ہے تو وہ دین مسیحی ہے خود ہلاکو خان جو جون کا دادا تھا ہمیشہ عیسائیوں کا احترام کرتا رہا۔ اور جون کی دادی دوقوز خاتون نے تو مرتے دم تک مسیحی دین کو اپنائے رکھا۔ وہ جب تک زندہ رہی اس کا سرخ چلیپا اس کے خیمے سے ملحق رہتا۔ لکڑی کی اس عبادت گاہ میں وہ بڑے خلوص اور انہماک سے اپنے آسمانی باپ کی عبادت کیا کرتی تھی۔

کیخاتو خان کی ان سب پر نظریں تھیں اور چونکہ وہ خود اپنے مرحوم بھائی نکودار کی طرح اسلام پر مائل تھا، اس لیے یہودیوں اور عیسائیوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ کبھی کبھی جوینی کے پاس چلا جاتا اور سازشی یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف باتیں کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا۔ جوینی کو کیخاتو خان کی آمد اور اس کی اس قسم کی باتوں سے پریشانی ہوتی تھی۔ لیکن وہ منع بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ نکودار کے بعد کیخاتو خان ہی کے دم سے امید کی شمع روشن تھی۔ اس نے کیخاتو خان کو بہلانے کی کوشش کی۔ "کیخاتو خان! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں خاموش رہو اور حالات پر گہری نظر رکھو۔ پھر جب مناسب وقت آ جائے تو جو چاہنا کر گزرنا۔"

کیخاتو خان نے کہا۔ "جوینی محترم! آپ کچھ کیجیے۔ خدا کے لیے کچھ کیجیے ورنہ ارغون کے ہاتھوں ایک اور بغداد تباہ ہو گا۔"

جوینی نے جواب دیا۔ "وقت آنے دو کیخاتو خان! لوہے کو گرم ہو جانے دو۔ جب یہ گرم ہو جائے گا تو میں خود تمہیں مطلع کر دوں گا لیکن خدا کے لیے تم یہاں مت آؤ جاؤ۔"

کیخاتو خان نے اکڑ کر جواب دیا۔ "مجھے یہاں آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔"

جوینی نے پوچھا۔ "سپہ سالار اعلیٰ کون بنا؟"

کیخاتو خان مسکرانے لگا۔ "شاید میں بنا دیا جاؤں۔"

جوینی کی باچھیں سی کھل گئیں، بولا۔ "اگر خوش قسمتی سے یہ سچ

مل گیا تو سمجھو کہ سب کچھ دوبارہ مل گیا۔ اور دیکھو خبردار جو کسی کو تمہاری بابت یہ شبہ بھی گزرے کہ تم مسلمان ہو یا مسلمانوں کی طرف مائل ہو۔"

کیخاتو خان بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ بولا۔ "کبھی کبھی تو میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ارغون کو قتل کر دوں لیکن ارغون کے قتل سے بات وہیں کی وہیں رہے گی اور کوئی دوسرا ارغون برسر اقتدار آ جائے گا۔"

جوہنی نے کھڑکی سے باہر دیکھا وہاں بالکل سناٹا تھا۔ مگر دو ڈھائی سو قدم دور بکائن کے چند درختوں کے سائے میں کچھ لوگ کھڑے دکھائی دیئے۔ بظاہر یہ مسافر معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے گھوڑے بکائن کی شاخوں سے بندھے کھڑے تھے ان کی دمیں گھڑی گھڑی ہل رہی تھیں۔

کیخاتو خان نے بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی، مگر جوہنی نے اسے روک دیا۔ "دور رہو۔ کھڑکی سے دور رہو اور بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "میں یہاں سے چلا تو جاؤں گا مگر آپ نے کھڑکی کے باہر کیا دیکھا، کچھ مجھے بھی تو بتایئے۔"

جوہنی نے کھڑکی کو بند کر دیا۔ بولا۔ "بکائن کے درختوں تلے چند مسافر ستا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ مسافر نہ ہوں، سعد اللہ یہودی کے آدمی ہوں اور ہم دونوں کی نگرانی کر رہے ہوں۔"

کیخاتو خان جوہنی کے گھر سے نکلا اور سیدھا بکائن کے درختوں کی طرف چل دیا۔ درختوں کے نیچے پہنچنے پر کیخاتو خان نے ان سب کو پہچان لیا۔ یہ کل تین تھے۔ دو یہودی جو سعد اللہ کے ملازم تھے اور ایک مسیحی جو جون کا دوست تھا۔ کیخاتو خان نے ان سے پوچھا۔ "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ایک یہودی نوجوان نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہم یہاں سیر کر رہے ہیں۔ کیوں جناب! آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

کیخاتو خان جز بز ہو کر رہ گیا۔ جون کے دوست نے ہنس کر پوچھا۔ "ہم تو یہاں سیر کر رہے ہیں اور آپ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "میں تمہارے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔"

وہ ان تینوں کو ہنستا مسکراتا چھوڑ کر اپنے قصر کی طرف چلا گیا۔ اس نے اپنے قصر کے دروازے کے سامنے سے مہوشوں کی ایک جماعت جاتے دیکھی۔ اس کو ارغون کے محل کا داروغہ جانوروں کے ریوڑ کی طرح لیے جا رہا تھا۔ کیخاتو خان کو ارغون خان پر رحم آ رہا تھا۔ جو اپنی صحت اور زندگی کی طرف سے بہت فکر مند تھا مگر عورتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ یہ ساری عورتیں ارغون خان کے شبستان میں جا رہی تھیں۔

رات کے پچھلے پہر کیخاتو خان کو شاہی محل میں طلب کر لیا گیا۔ جب وہ میدان سے گزر کر محل کی طرف جا رہا تھا تو اس نے منگول سپاہ کو الاؤ کے آس پاس چہلیں کرتے دیکھا۔ یہ آگ تاپ رہے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ الاؤ کے پاس دوڑتے بھاگتے منگولوں کے سائے متحرک تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں کیونکہ ان کے مترنم قہقہے کانوں میں رس گھول رہے تھے، اور دلوں میں طوفان اٹھا رہے تھے جذبات میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

وہاں سے گزرنے کے بعد ہر چیز سوئی سوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ محل میں داخل ہونے کے بعد دربانوں نے کیخاتو خان کے احترام میں کھڑے ہونا اور سر جھکانا شروع کر دیا۔ وہ شہزادے کیخاتو خان کو اس لیے عزت و احترام دے رہے تھے کہ انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کل کیخاتو خان ہی برسر اقتدار آ جائے۔

ارغون کیخاتو خان سے سرد مہری سے پیش آیا۔ اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "تیرا جوہنی سے کیا رشتہ ہے؟"

کیخاتو خان سمجھ گیا کہ مخبروں نے اس کی تفصیلی خبر ارغون تک پہنچا دی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "میں کبھی کبھی جوہنی کے پاس اس لیے چلا جاتا ہوں کہ اس کی حرکات و سکنات سے باخبر رہوں۔"

ارغون نے پوچھا۔ "تو وہاں سے کیا خبر لائے ہو؟"

کیخاتو خان ارغون کے سوالوں سے پریشان ہو رہا تھا۔ جواب دیا۔ "وہ بڑی مایوسی کے دن گزار رہا ہے۔"

ارغون نے پوچھا۔ "شراب پیو گے؟"

کیخاتو خان ذہنی طور پر مسلمان ہو چکا تھا اور شراب کو برا سمجھتا تھا مگر ارغون سے مصلحتاً انکار نہیں کر سکا بولا۔ "ضرور پیوں گا۔"

ارغون نے دور کھڑی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی کو پاس بلایا اور حکم دیا۔ "شہزادہ کیخاتو خان کو شراب پلائی جائے۔"

شراب بلوری جاروں میں بھری ہوئی میز پر رکھی تھی۔ اس کے پاس ہی آلات میکشی رکھے ہوئے تھے۔ کنیز نے بلوری جام میں شراب انڈیلی اور اسے بڑے انداز سے کیخاتو خان کی خدمت میں پیش کر دیا جام کو پیش کرتے ہوئے وہ دوزانو ہو گئی تھی۔ دونوں ہاتھوں کے جھکاؤ سے اس کی ٹھوڑی کے نیچے سینے والا حصہ لباس کے اندر سے جھلکنے لگا۔ پورے جسم میں کیف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ کیخاتو خان نے ہوش میں آتے ہوئے خوبصورت کنیز کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

ارغون کی نظریں کیخاتو خان کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے شہزادے کو جام ہاتھ میں لیتے خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر مسکراتے

اور جام کو ہونٹوں سے لگاتے دیکھا تو کسی قدر مطمئن ہو گیا۔

کیختاتو خان نے عام منگولوں کے انداز میں شراب پی اور کنیز کو کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا، بولا۔ "برادر محترم! گستاخی معاف! اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر اجازت ہو تو ملحقہ کمرے میں چلا جاؤں۔"

ارغون مسکرایا لیکن پھر سنجیدگی سے تنبیہہ کی۔ "کیختاتو خان! ہوش میں آ۔ میں نے تجھے یہاں کسی مقصد سے بلایا ہے!"

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کنیز کو بزور کیختاتو خان کی آغوش سے جدا کیا اور کنیز کے رخسار پر ایک ہلکی سی چپت لگا کر رخصت کر دیا۔

کیختاتو خان نشے میں رونے لگا۔ "بھائی ارغون! یہ آپ نے کیسا کیا؟"

ارغون نے کہا۔ "اس وقت میں بھائی ارغون نہیں، ایل خان ہوں۔ میں نے کل تک یہ فیصلہ کیا تھا کہ تجھ کو منگول عساکر کا سپہ سالار اعلیٰ بنا دوں گا۔ مگر آج میں تذبذب میں ہوں۔ میں جوجی خاندان سے تعلق رکھنے والے کو اتنا عظیم منصب نہیں دے سکتا۔"

کیختاتو خان نے ایک بار پھر تردید کی۔ "میرا جوجی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ارغون نے کیختاتو خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "شہزادے! تو میرا چھوٹا بھائی ہے میرے بعد تو ہی ایل خان ہو گا۔ اگر میں کسی وجہ سے تجھے قتل کر دوں گا تو حکومت میرے خاندان سے نکل کر بلیدو خان کے خاندان میں چلی جائے گی لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

کیختاتو خان احمق بنا ہوا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت بجھا ہوا دیوانہ، وہ پاگلوں کی طرح اپنے بڑے بھائی ارغون کی صورت دیکھ رہا تھا

ارغون اسے سمجھائے چلا جا رہا تھا۔ "اگر تو اپنا آبائی دین چھوڑنا ہی چاہتا ہے تو عیسائی بن جا کیونکہ میری ماں بھی مسیحی تھی۔ مسیحی بے ضرر ہیں۔ ان سے ہمیں کبھی بھی نقصان نہیں پہنچا مگر مسلمان، اسلام، اصل خطرہ یہی لوگ ہیں۔ یہ سخت جان لوگ جب بھی موقع پاتے ہیں ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ مصر میں ہمارا مشہور جرنیل قطلو غلا گیا ہمیں اس کا انتقام لینا ہے۔"

لیکن کیختاتو خان کو گویا کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا اس نے ارغون کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔

ارغون نے سوچا۔ اس کا ہوش میں آنا ضروری ہے ورنہ ہر بات فضول ہے۔ کیختاتو خان کسی کی بات گویا سنتا ہی نہیں۔ ارغون نے کیختاتو خان کو خوش کرنے کے لیے خوبصورت کنیز اس کے حوالے کر دی۔ اور کہا۔ "جا شہزادے عیش کر، تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

لیکن شہزادہ کیختاتو خان اتنا بدمست ہو رہا تھا کہ دوسرے

مس جینیس نے اپنے ایک طالب علم کی تعلیم کے بارے میں اس کی ماں کو لکھا۔ "محترمہ، آپ کے بیٹے کا ہینڈ رائٹنگ اتنا خراب ہے کہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس کے جملے درست ہیں یا نہیں۔"

کمرے تک خود نہیں جا سکتا تھا اس لیے ارغون نے ایک دوسری کنیز کو حکم دیا کہ شہزادے کو ملحقہ کمرے میں پہنچا دیا جائے۔

کنیز نے شہزادے کیختاتو خان کو ملحقہ کمرے میں پہنچا دیا مگر اس کمرے میں وہ کنیز نہیں تھی، جس کی تلاش میں وہ یہاں اس کمرے میں آیا تھا، اس سے وہ محروم رہا۔

کیختاتو خان اس کمرے میں بچھی ہوئی قالین پر لیٹ کر سو گیا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو خود کو اس کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک خدمت گار خاتون کیختاتو خان کے چاروں طرف پھر کے اس کا جائزہ لیتی رہی اور آخر میں اس نے کیختاتو خان کو ارغون کے روبرو پہنچا دیا۔ رات والی خوبصورت کنیز ارغون کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ارغون نے کیختاتو خان کو رات کی باتیں یاد دلائیں اور کہا۔ "رات تو اتنی پی گیا تھا کہ تجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا اور نشے میں ہی تو نے میری اس کنیز کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اسی وجہ سے میں تجھ سے بات بھی نہیں کر سکا۔"

کیختاتو خان بظاہر شرمندہ تھا مگر اندر ہی اندر اپنی کامیاب شرارت پر خوش ہو رہا تھا۔

ارغون نے کہا۔ "شہزادے کیختاتو خان! رات میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ تو ہمیشہ میرے قریب ہی رہے گا فی الحال ایل خان اور جملہ افواج کا سپہ سالار میں خود رہوں گا۔ بعد میں کسی مناسب موقع پر سپہ سالاری کا منصب تیرے حوالے کر دیا جائے گا۔"

کیختاتو خان نے پوچھا۔ "برادر محترم! کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟"

ارغون نے جواب دیا۔ "میں تجھ پر اعتبار نہ کرتا تو اتنی باتیں کیوں کرتا۔ سپہ سالاری کی پیشکش کیوں کرتا۔ تو میرا ولی عہد بھی تو ہے اور میری خواہش ہے کہ تو اپنی زندگی کروفر سے گزارے۔" اس کے بعد خوبصورت کنیز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں نے اپنی یہ خوبصورت کنیز تیرے حوالے کر دی اب تو اس کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ دو غلام بھی تجھے دیے گئے۔ جو تیری خدمت بھی کریں گے اور ہر وقت سائے کی طرح تیرے ساتھ رہیں گے تاکہ تجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔"

کیختاتو خان نے بظاہر تو خوشی کا اظہار کیا اور ارغون کا شکریہ بھی ادا کیا مگر اندر سے اس کا سکھ چین برباد ہو چکا تھا۔

کنیز اسی وقت شہزادے کے حوالے کر دی گئی۔ اور دونوں غلاموں کی بابت یہ کہا گیا کہ وہ محل کے باہر حوالے کر دیے جائیں گے۔

کیختاتو خان اپنے بھائی ارغون کے سامنے کم سے کم بول رہا تھا۔

محض اس لیے کہ کہیں اس کی کوئی بات پکڑی نہ جائے۔ اور اس کی اُلٹی سیدھی وضاحتوں میں خواہ مخواہ اُلجھ کر رہ جائے۔

ارغون نے اُسے ایک تلوار بھی مرحمت کی۔ جس وقت وہ اپنے ہاتھ سے تلوار کیخاتو خان کو دے رہا تھا تو اس کے دونوں ہاتھ رعشے سے کپکپا رہے تھے۔ کیخاتو خان کی نظریں اسی ہاتھ پر جم کر رہ گئیں۔ ارغون بھی اس بات کو محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے کہا: "شہزادے کیخاتو خان اپنی اس پیشکش کو بھلا نہ دینا جو ہندوستانی ویدوں سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی ایسے وید کو ہندوستان سے ضرور تلاش کروا کے لانا ہے جس کے پاس انسانی زندگی کو طویل العمری بخشنے کا نسخہ پایا جاتا ہے اور جو بڑھاپے کو جوانی میں بدل سکتا ہو؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "آپ کا یہ کام سعد اللہ یہودی سے بہتر کوئی بھی نہیں کر سکے گا۔ یہاں تک کہ جب میں اس اہم کام کے پیشِ نظر خود کو ٹٹولتا ہوں تو اپنے آپ کو بیکارِ محض پاتا ہوں لیکن سعد اللہ یہودی یہ کام خوب اچھی طرح کر سکتا ہے۔"

ارغون نے فکرمند لہجے میں کہا: "لیکن سعد اللہ تو میرا مشیر، میرا وزیر ہے۔ میں صلاح مشورے کس سے کیا کروں گا؟ میں سعد اللہ کو جدا نہیں کر سکتا۔"

کیخاتو خان نے منہ بنایا اور سیدھا سادا مشورہ دے دیا: "میں ایک بار پھر اس کام کے لیے سعد اللہ یہودی کا نام لوں گا۔"

ارغون خان چلتے چلاتے کیخاتو خان سے ادب و احترام سے پیش آیا۔

محل کے باہر دونوں غلام گویا اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کنیز اور دونوں غلاموں کے ساتھ اپنے قصر میں پہنچا تو کنیز نے پوچھا: "شہزادے کیا واقعی ہندوستان کے طبیب انسان کی عمر میں اضافہ کر سکتے ہیں، اور بوڑھوں کو جوان کر سکتے ہیں؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "بی بی! اس دُنیا میں سب کچھ ممکن ہے اور میں ایسے لوگوں کو تلاش کر کے کم از کم ایک بار اپنے بھائی ارغون کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔ میں ارغون بھائی کو خوش خرم اور بڑھاپے کی دہلیز سے بہت دُور دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کنیز نے منہ بنایا اور ارغون کی مخالفت کرنے لگی۔ بولی: "خان! آپ شاید یقین نہیں کریں گے کہ میں نے ارغون سے زیادہ بڑا آدمی نہیں دیکھا۔ وہ خان ہے مگر کم عقل، وہ ہمیشہ سعد اللہ ہی کی بات مانتا ہے۔ حالانکہ آپ اس کے بھائی بھی ہیں اور تحمل پسند سردار بھی۔"

کیخاتو خان نے جیسے اس کی بات سُنی ہی نہیں تھی۔ موضوع کو بدلتے ہوئے پوچھا: "تیرا نام کیا ہے؟ میں نے تیرا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

کنیز نے جواب دیا: "بندی کو زرافشاں کہتے ہیں۔"

کیخاتو خان نے اُسے اپنے قصر کے تمام حصے دکھلا دیے اور کہا۔ "یہاں تو آرام سے پڑی رہ۔ یہاں تجھے کوئی تنگ کرنے والا نہیں ملے گا۔"

کنیز زرافشاں نے جواب دیا: "محترم شہزادے! میں یہاں کونے میں پڑی رہنے کے لیے نہیں آئی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں آپ پر عاشق ہو چکی ہوں اور اب میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

کیخاتو خان کو ہنسی آ گئی۔ بولا: "لیکن زرافشاں میں تجھ سے عشق نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرے ننھے سے دل نے کسی اور ہی کو پسند کر لیا ہے۔"

زرافشاں کے دل میں آرا سا چل گیا۔

اُدھر سے فرصت پا کے وہ دونوں غلاموں کے پاس پہنچا، اور کہا: "ہاں جناب! تو اب تعارف ہو جانا چاہیے۔"

ایک غلام نے کہا: "آقائے من! ہم غلاموں کا تعارف ہی کیا۔ ہمارا بس اتنا ہی تعارف کافی ہے کہ ہم اپنے آقا کے غلام ہیں۔"

کیخاتو خان نے کہا: "نہیں۔ یہ تعارف کافی نہیں ہے۔۔۔ تم دونوں کا نام؟"

ایک نے جواب دیا: "بندے کو فرامرز کہتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا: "اور غلام کو اینال کہتے ہیں۔"

کیخاتو خان نے دونوں سے اپنا تعارف کرایا: "اور مجھے کیخاتو خان کہتے ہیں۔ میں ایل خان ارغون کا چھوٹا بھائی اور ہلاکو کا پوتا ہوں۔ سننے میں آیا ہے کہ میں منگول افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ بننے والا ہوں لیکن ابھی صرف شہزادہ ہوں۔"

فرامرز نے کہا: "لیکن آپ کے تعارف کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کو تو سبھی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

اینال نے عرض کیا: "آپ اپنا تعارف کرا کے ہمیں خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہیں۔"

کیخاتو خان نے کہا: "میں اپنے سارے کام خود کرتا ہوں۔ غلام اپنے کام کرتے ہیں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ۔۔۔ تم دونوں کو میرے قصر میں کیا کام کرنا ہوں گے۔"

دونوں نے یکے بعد دیگرے جواب دیا: "امارت کے جو چند لوازم تسلیم کیے جاتے ہیں اُن میں ایک غلام اور کنیزیں بھی ہیں۔"

کیخاتو خان نے کہا: "میں جانتا ہوں اور خوب جانتا ہوں مگر میں امارت سے گھبرایا ہوا انسان ہوں۔"

اسی دوران کیخاتو خان نے ایک برقعہ پوش خاتون کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ نقاب سیاہ تھی مگر اس پر زرد پھول بنے ہوئے تھے، جو انتہائی بدمذاقی کی دلیل تھی۔ دربانوں نے اُن خاتون کو روکنا چاہا، مگر وہ نہیں رُکیں، دَرانہ گھستی چلی آئیں۔

اُس کی آواز میں کرختگی تھی۔ کیخاتو خان نے جب یہ دیکھا کہ یہ خاتون کسی کے روکے نہیں رُکیں گی تو اُس نے دربانوں کو مزاحمت سے

روک دیا اور کہا: "دوستوں کو مت روکو۔ مجبوروں اور فریادیوں کو بھی میرے پاس تک آنے دو۔"

جب دربانوں نے اس عورت کو قصر کے اندر چلا جانے دیا، تو فرامرزاور اینال ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

کیختاتو خان نے ان نقاب پوش خاتون کو قصر کے اندر لے جاکر پوچھا: "ہاں خاتون اب آپ فرمائیں کہ آپ میرے پاس کیوں تشریف لائیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

اس عورت نے اپنے چہرے پر سے آہستہ آہستہ نقاب سرکائی کیختاتو خان کو ایسا لگا گویا چاند بدلی سے نکل رہا ہے۔ بے داغ نورانی چہرہ۔ کیختاتو خان لڑکھڑا گیا۔ اس نے اتنا حسین چہرہ اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہنا کچھ چاہتا تھا اور الفاظ کچھ نکل رہے تھے۔

عورت نے کہنا شروع کیا: "شہزادے! میں ایک مسلمان خاتون ہوں اور مجھ پر اور میرے خاندان پر تیرے بھائی ارغون نے بڑا ظلم ڈھا رکھا ہے۔ میں نے تیری بابت یہ سن رکھا ہے کہ تو مسلمانوں کا ہمدرد ہے بہی خواہ ہے اب میں اسی ہمدردی اور بہی خواہی کا امتحان لینے آئی ہوں۔"

کیختاتو خان نے پوچھا: "تو کہاں رہتی ہے اور تیرے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے؟"

"میں بحیرہ خزر کے جنوب مغربی ساحل کے شہر موغان سے آئی ہوں۔ میں نے یہ سفر کتنی مصیبتوں اور دشواریوں سے کیا ہے کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ میرا خاندان برباد کر دیا گیا میرے مرد ہلاک اور بچے ذبح کر دیئے گئے۔ جوان عورتوں کو اغوا اور بوڑھیوں کو قتل کر دیا گیا میری ایک چھوٹی بہن تھی تہمینہ۔ یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی۔ اس کو موذیوں نے اٹھا لیا اور اتفاق سے اس کی بابت یہ معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ایل خان کے وزیر سعدالدولہ یہودی کے قبضے میں ہے۔"

کیختاتو خان نے ایک سرد آہ بھری، بولا: "خاتون! شاید آپ نہیں جانتیں کہ میں شہزادہ ہونے کے باوجود سعدالدولہ یہودی سے کمزور انسان ہوں۔"

عورت نے کہا: "مجھ کو لوگوں نے یہ بتایا تھا کہ شہزادہ کیختاتو خان اسلام کی طرف مائل اور مسلمانوں کی مدد کر دیتا ہے بس یہی امید اور یہی توقع اور امید کے سہارے یہاں تک آئی ہوں۔" عورت رو رہی تھی اور اس کی آواز میں گلوگیر شکستگی پائی جاتی تھی۔

کیختاتو خان سوچ میں پڑ گیا۔ بولا: "تو نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے خاتون! سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تیری کس طرح مدد کروں؟"

عورت نے اپنے دونوں پاؤں کیختاتو خان کے سامنے کر دیئے۔ اس کے دونوں تلووں میں چھالے پڑے ہوئے تھے اور جو چھالے پھوٹ گئے تھے ان میں سے پانی رس رہا تھا، وہ بولی: "یہاں تک پہنچنے میں میں نے جو مصیبتیں جھیلی ہیں ان کا خیال ضرور کرنا۔"

کیختاتو خان نے پوچھا: "تو ٹھہری کہاں ہے؟"

عورت نے جواب دیا: "کہیں بھی نہیں، سیدھی تیرے پاس چلی آ رہی ہوں۔"

کیختاتو خان نے کہا: "اچھا پہلے میں تیری رہائش کا بندوبست کر دوں، اس کے بعد کچھ سوچوں گا، کچھ کروں گا۔"

کیختاتو خان اس عورت کو قصر کے آخری کنارے والے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے کے باہر ایک پر فضا باغ تھا۔ کیختاتو خان یہاں کھڑکیوں کے پاس کھڑے ہو کر باغ کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اس کمرے میں ضروریات اور آرائش کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ آبنوسی منقش سنگھار میز جس میں ایک بڑا شیشہ جڑا ہوا تھا۔ دو کھڑکیوں کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے کئی گلدانوں میں موسمی پھول سجے ہوئے تھے۔ سنگھار میز کے پاس چھوٹی چھوٹی چوکیاں رکھی تھیں۔ ان چوکیوں کے چاروں کنارے منقش تھے اور ہنر مندوں نے چھوٹے چھوٹے پتوں میں چھپے ہوئے پھول بنا کر اپنے فنی کمال کا زبردست مظاہرہ کیا تھا۔ بالکل آخری کونے میں ایک ریشمی ڈوری تھی جس پر نہایت قیمتی شالیں، چادریں اور دوسرے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔

کیختاتو خان نے اس اجنبی عورت کو اس کمرے میں پہنچا دیا اور کہا: "تو یہاں رہ سکتی ہے جب تک چاہے۔ یہاں ضروریات زندگی کی ہر چیز مہیا کر دی جائے گی۔"

عورت نے اپنی نقاب اچانک اتار دی اور وہ کیختاتو خان کی طرف مڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کیختاتو خان اسے دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ اتنی حسین عورت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ لمحوں کے لیے یہ تشویش بھی پیدا ہوئی کہ اگر اس کو ارغون نے کسی طرح دیکھ لیا تو وہ زبردستی حاصل کرے گا۔

کیختاتو خان نے پوچھا: "تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟"

لڑکی نے کہا: "مار دیئے گئے۔"

کیختاتو خان نے افسوس کیا، بولا: "افسوس کہ مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں میں شامل نہیں تھا۔"

لڑکی آزردہ ہو رہی تھی وہ کمرے کے سامان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر کیختاتو خان کو دیکھنے لگی، پوچھا: "کیا تو شہزادہ ہے؟"

کیختاتو خان نے جواب دیا: "ہاں میں شہزادہ ہوں اور میرا نام کیختاتو خان ہے۔"

لڑکی نے پیشانی پر غصے اور نفرت کی سلوٹیں ڈالیں اور منہ پھیر کر کہنے لگی: "جب تو شہزادہ ہے تو مسلمانوں کے قتل عام میں تو کیوں نہیں شامل تھا۔ یہ بہیمانہ کام تیرے خاندان ہی کی ایما سے ہوا ہے تم حکمرانوں کی خواہش، ایما اور حکم پر۔"

کیختاتو خان نے ایک بار پھر صفائی پیش کی: "جیسا کہ شاید تو بھی جانتی ہے کہ میرا دل اسلام پر مائل ہے اور یہ بات ایک تو ہی کیا، سارا

زمانہ جانتا ہے، تو میرے پاس کیوں آئی ہے! محض اس لیے کہ میں سعداللہ یہودی کے خلاف تیری مدد کر سکوں گا۔ تیری بن تہینہ کو اس سے آزادی دلا سکوں گا۔ پھر میں مسلمانوں کے قتلِ عام کرنے والوں میں کیسے شامل کیا جاؤں؟"

کیختاتو خان نے محسوس کیا کہ لڑکی رو رہی ہے وہ اس کے قریب چلا گیا، پوچھا۔ "کیا تو رو رہی ہے؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کیختاتو خان کچھ دیر خاموش رہا اور لڑکی کے رونے یا نہ رونے کا اندازہ لگاتا رہا، وہ بدستور منہ پھیرے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر پوچھا۔ "کیا تو رو رہی ہے؟"

لڑکی نے جواب تو نہیں دیا، اپنا چہرہ کیختاتو خان کے سامنے کر دیا۔ اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے اور پلکوں کی جڑوں میں آنسو یوں جمع تھے جیسے ننھے منے پودوں کی روشوں میں پانی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے خاندان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کے نتیجے میں میں زندگی بھر روتی رہوں گی۔"

کیختاتو خان نے الگنی پر سے ایک باریک کپڑا کھینچ لیا، اور اسے لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لڑکی! آنسو پونچھ لے۔ جو کچھ ہوا اس کو اپنی قسمت سمجھ کر برداشت کر لے۔"

لڑکی برہم ہو گئی اور کپڑا نہیں لیا، بولی۔ "یہ میری قسمت نہیں تھی۔ تیرے خاندان نے ہم مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں اس میں ہماری بدقسمتی سے زیادہ تیرے خاندان کے مستقبل کی بدقسمتی پنہاں ہے، خدا تیرے خاندان کو معاف نہیں کرے گا۔"

کیختاتو خان بے بس ہو رہا تھا، پژمردگی سے بولا۔ "لڑکی! تو خوب بددعا دیتی رہ لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے ظلم اور بربریت میں کسی طرح بھی شامل نہیں تھا۔"

کیختاتو خان نے سوچا اس لڑکی کے پاس مزید رکنا اس کے زخمی دل پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہو گا۔ بولا۔ "خاتون! میں جا رہا ہوں۔ میں نے تجھے پناہ دی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ تیری بن تہینہ بھی تجھے مل جائے مگر میں اس سلسلے میں وقت اور مدت کا تعین نہیں کر سکتا۔"

لڑکی نے کہا۔ "مجھے یہاں کتنے دن رہنا ہو گا؟"

کیختاتو خان نے جواب دیا۔ "کچھ پتہ نہیں لیکن تو یہاں جتنے دن بھی رہے گی آزادی سے رہے گی۔ ادھر تیرے پاس چند کنیزیں تو ضرور آتی جاتی رہیں گی لیکن ادھر کسی مرد کو نہیں آنے دیا جائے گا۔ اگر تجھ کو میری آمد و رفت بھی گوارا نہ ہو تو میں بھی ادھر نہیں آؤں گا۔"

وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ کچھ ٹھہر کر دوبارہ کہنے لگا۔ "میں یہ بھی نہیں جانتا ہوں کہ میرا خاندان تیرے بارے میں بہت متجسس رہے گا اور وہ لوگ تیرے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہیں گے لیکن میں ان سب کی پروا کیے بغیر تیری مدد کروں گا۔"

لڑکی بھی بڑی دلیر اور بے باک تھی، بولی۔ "تیری یہ نیکیاں تیری اور تیرے خاندان کی بخشش کا سبب بن جائیں گی۔"

کیختاتو خان نے جاتے جاتے پوچھا۔ "کیا تجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ تیری بن تہینہ سعداللہ یہودی کے پاس ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "خوب اچھی طرح۔ میری بن تہینہ کو جن لوگوں نے سعداللہ یہودی کے گھر میں دیکھا ہے وہ سچے لوگ ہیں۔"

کیختاتو خان نے کہا۔ "ان لوگوں کے نام؟ وہ تجھے کہاں ملے تھے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں ان کے نام نہیں جانتی۔ میری بن تہینہ تقریباً میری ہم شکل ہے جو عورتیں سعداللہ یہودی کے گھر آتی جاتی ہیں وہ یہی کہتی ہیں کہ انہوں نے بالکل میری ہم شکل لڑکی سعداللہ یہودی کے محل میں بھی دیکھی ہے۔"

کیختاتو خان بہت دل برداشتہ ہوتا جا رہا تھا۔ تکان اور مایوسی اس کے چہرے سے عیاں تھی، بولا۔ "خاتون! میں وعدہ تو نہیں کرتا کہ تیری بن تہینہ کو میں سعداللہ یہودی سے دلوا دوں گا کیونکہ وہ یہودی مجھ سے زیادہ طاقتور ہے اور با اثر بھی۔ لیکن میں یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ اس جنگ میں میں اپنا سب کچھ گنوا کر بھی تجھ کو مایوس نہیں ہونے دوں گا۔"

کیختاتو خان جانے سے پہلے لڑکی کا نام ضرور جان لینا چاہتا تھا وہ نام پوچھنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ لڑکی نے کہا۔ "شاید تو میرا نام جاننا چاہتا ہے؟"

کیختاتو خان نے کہا۔ "ہاں جس کو اپنا مہمان بنایا ہے اس کا نام تو معلوم ہی ہونا چاہیے۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میرا نام رفیعہ ہے۔"

کیختاتو خان نے ابھی تک تو صرف اتنا ہی سوچا تھا کہ وہ اپنے دین دار مرحوم بھائی نکودار کا ارغون سے انتقام کس طرح لے، لیکن اس لڑکی رفیعہ نے اچانک آکر کچھ اور بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ جس کمرے میں رفیعہ رہ رہی تھی، بقیہ قصر اور اس کے کمرے کے درمیان ایک مضبوط حد قائم کر دی۔ رفیعہ کی خدمت کے لیے وعدے کے مطابق دو کنیزیں مقرر کر دیں اور انہیں یہ تاکید کر دی کہ وہ ایک معینہ مدت کے لیے اسی کمرے کی ہو رہیں۔ کیختاتو خان یہ نہیں چاہتا تھا کہ رفیعہ کو خاندان کے لوگ دیکھیں اور اس کا ذکر ارغون تک پہنچ جائے۔

ایک دن وہ علی الصبح اس پڑاؤ کی طرف چلا گیا جہاں دنیا بھر کے تاجروں کے قافلے آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ یہاں سے ایک طرف تو ترکی کا راستہ کھلا ہوا تھا اور تجار دوسرے ملکوں کا مال تبریز اور

مراغہ میں فروخت کر کے یہاں سے نیا مال خرید کر ترکی روانہ ہو جاتے تھے۔ پڑاؤ سے دوسرا راستہ خراسان کو جاتا تھا۔ اس شاہراہ کے تجار خراسان اور ہرات کے راستے کابل میں داخل ہو جاتے تھے اور کابل سے ہندوستان چلے جاتے تھے۔ کچھ کاشغر کی طرف مڑ جاتے تھے اور وہاں سے چین چلے جاتے تھے۔ دوسرے کئی راستے اصفہان، موصل اور بغداد کو چلے جاتے تھے۔ انہی میں ایک شاہراہ درۂ بولان تک چلی گئی تھی اور تاجر درۂ بولان کو عبور کر کے بلوچستان میں داخل ہو جاتے تھے۔ یہ شاہراہ بڑی دشوار گزار تھی۔ یہیں سے بعض تاجر اصفہان اور اہواز کو پیچھے چھوڑتے ہوئے خلیج فارس کے ساحل پر جا نکلتے تھے اور پھر دخانی جہازوں میں بیٹھ کر سندھ کی بندرگاہ لہاری بندر۔ ٹھٹھہ (دیبل) اور اس سے آگے بھڑوچ۔ کھمبے، کاٹھیاواڑ، گوا اور بھٹکل تک پہنچ جاتے تھے۔

کیخاتو خان کو انہی تاجروں کی تلاش تھی۔ جو اپنی تجارت کے سلسلے میں ہندوستان تک دھاوے مارتے تھے۔ اسے پڑاؤ پر وہ قافلہ مل گیا جس کے چند تاجر ہندوستان جا رہے تھے۔ اس نے ان سے الگ الگ فرداً فرداً ملاقات کی اور کہا: "تم ملکوں ملکوں سے انواع و اقسام کا سامان تو لاتے ہی ہو لیکن مجھے ہندوستان کی ایک ایسی چیز درکار ہے جس کی بابت تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا اگر تم وہ فرمائشی چیز میرے لیے لے آئے تو میں اس کی منہ مانگی قیمت ادا کروں گا۔"

تاجروں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایل خانی شہزادہ ہندوستان کی کس چیز کی فرمائش کر رہا تھا اور اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ سارے تاجر اس فرمائش کو جاننے کے لیے بے قرار تھے۔ ایک یونانی تاجر نے کہا: "گو کہ میں تجارت کے سلسلے میں کبھی ہندوستان نہیں گیا لیکن اگر منافع کا سودا ہے تو ضرور چلا جاؤں گا۔"

ترکی تاجر نے کہا: "میں کئی بار دیبل جا چکا ہوں آپ اس چیز کا نام بتائیں میں معمولی منافع پر بھی فراہم کر سکتا ہوں۔"

ان میں ایک ہندوستانی تاجر بھی تھا۔ اس نے کہا: "محترم خان میں تو بذاتِ خود ہندوستانی ہوں۔ اور دیبل سے گوا اور بھٹکل تک آتا جاتا ہوں۔ آپ چیز کا نام بتائیں میں ضرور فراہم کر دوں گا ہاں اس کے نفع کا تعین اسی وقت ہو جانا چاہیے۔"

کیخاتو خان کی نظرِ انتخاب اسی ہندوستانی تاجر پر پڑی۔ وہ اس تاجر کو اپنے ساتھ قصر تک لے آیا اور اس کی بڑی خاطر مدارات کی بعد میں کہا: "ہندی تاجر! مجھے ایک ایسا ہندو عالم درکار ہے جو اپنے دور کا بے مثل عالم اور باکمال طبیب بھی ہو۔ ہندوستانی طبیب کو غالباً وید کہتے ہیں مجھے ایسا وید درکار ہے جو انسانی عمر کو حسبِ منشا طول دینے کا راز جانتا ہو اور اس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بوڑھے کو دوبارہ جوان کس طرح کیا جائے۔"

ہندوستانی تاجر بوکھلا سا گیا۔ اسے کیخاتو خان کچھ پاگل سا

عورت پیاز کی طرح ہے۔
خوبصورت، دلکش اور دلفریب
لیکن جب پیاز کو چھیلا جاتا ہے، تو اس میں سے
گودا نکلتا ہے نہ گٹھلی، اور وہ رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

لگا۔ پوچھا: "کیا ہمارے ہندوستان میں ایسے ودوان اور ایسے وید پائے جاتے ہیں؟ کیا ہمارا ہندوستانی وید انسان کی طبعی عمر میں اضافہ اور بڑھاپے کو جوانی بخش سکتا ہے؟"

کیخاتو خان کو اس ہندوستانی تاجر پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔ ڈپٹ کر بولا: "تو کیا ہندوستانی تاجر ہے کہ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہندوستان میں کیسی کیسی نادر و نایاب کتابیں، اعلیٰ سے اعلیٰ نسخے اور معجز اثر جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں اور وہاں کے عالم اور وید قدرت کے ان سربستہ رازوں سے اچھی طرح واقف ہیں کہ زندگی کے ماہ و سال میں اضافہ کس طرح کیا جائے اور۔۔۔ ضعیف العمری کو جوانسالی میں کس طرح تبدیل کر دیا جائے۔"

ہندوستانی تاجر سہما ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس وحشی منگول کو مایوس کر دیا گیا تو شاید جان ہی لے لے۔ اس لیے اس نے کیخاتو خان کو تسلی دی۔ بولا: "خانِ محترم! میں نے ہندوستان کے باکمال حضرات کا نام تو ضرور سنا ہے لیکن کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، اب آپ فرماتے ہیں تو میں انہیں دیکھ بھی لوں گا اور ان کی نادرۂ روزگار شخصیت کو اپنے ساتھ بھی لے آؤں گا۔"

کیخاتو خان خوش ہو گیا، کہا: "لیکن یہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے میرا بھائی ارغون جو ہم سب کا ایل خان ہے اس عظیم اور بے مثل عالم اور وید کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اتفاق کی بات کہ میں نے اپنے بڑے بھائی سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ میں اس کی یہ مشکل حل کر دوں گا۔"

ہندوستانی تاجر نے پوچھا: "اور اس عظیم انسانی کارنامے کا انعام کیا ملے گا مجھے؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "میں تیرا دامن اور تیرا منہ اشرفیوں سے بھر دوں گا۔ جتنی اشرفیاں تیرے دامن اور منہ میں آ جائیں گی وہ ساری کی ساری تیری ہوں گی۔"

ہندوستانی تاجر بہت خوش تھا، اس کا انگ انگ اس کا رواں رواں خوش تھا، انتہائی تکلف سے پوچھا: "اور خانِ محترم! اس عظیم الشان خدمت کا صلہ کیا ملے گا ہمیں؟"

کیخاتو خان نے کہا: "ہندی تاجر! کیا تو بدحواس ہو گیا ہے؟ یہ تیرا حال کیا ہو رہا ہے؟ تو اس کی اجرت ابھی ابھی مجھ سے پوچھ چکا ہے اور میں بتا چکا ہوں پھر یہ بار بار اجرت اور محنتانہ کی بات کیوں کرتا ہے؟"

ہندوستانی تاجر نے ڈرتے ڈرتے کہا "خان محترم! کچھ نہ کچھ بیعانہ تو آپ نے دے ہی دیا ہوتا۔ آخر جانے آنے میں خرچا تو کافی آ جائے گا۔"

کینخا تو خان نے پوچھا "تو رقم، یہ رقم تجھے میں دوں گا اور یہ بیعانہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

ہندوستانی تاجر نے عرض کیا "قبلہ و کعبہ! چیز کے دام تو اس کی حیثیت اور افادی حیثیت کے ہوا کرتے ہیں۔ ہم تاجر لوگ جب کسی چیز کو خریدتے یا بیچتے ہیں تو پہلے بھاؤ طے کرتے ہیں اور اگر بھاؤ طے پا جاتا ہے اور اس چیز کی پوری قیمت فوراً نہیں دینی ہوتی ہے تو کچھ رقم دے کر سودے کو پکا کر لیتے ہیں بس یہی جزوی رقم کاروباری اصطلاح میں بیعانہ کہلاتی ہے۔"

کینخا تو خان نے پوچھا "تب پھر میں بیعانہ میں کتنی رقم دے دوں؟"

ہندوستانی تاجر نے جواب دیا "سو پچاس سونے کی اشرفیاں"

کینخا تو خان نے پچاس اشرفیاں اسی وقت دے دیں اور پوچھا "اب یہ بات تجھے بھی بتانا ہوگی کہ میرا یہ کام کتنی مدت میں ہو جائے گا؟"

ہندوستانی تاجر نے جواب دیا "زیادہ سے زیادہ ایک سال میں ہو سکتا ہے صرف چھ ماہ میں یہ کام ہو جائے۔"

جب ہندوستانی تاجر پڑاؤ پر واپس آیا تو دوسرے تاجر اس سے اس چیز کا نام دریافت کرنے لگے جو کینخا تو خان اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کر کے بھی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن ہندوستانی تاجر بھی ایک ہی کائیاں تھا وہ ہر ایک کی بات ٹال گیا، اور چپ چاپ اپنے خیمے میں منہ چھپا کے پڑا رہا۔



کینخا تو خان ادھر سے فارغ ہو کر اپنے بھائی ارغون کے پاس پہنچ گیا۔ وہ تہمینہ کو حاصل کر کے رفیعہ کے حوالے کر دینا چاہتا تھا اور تہمینہ کس طرح حاصل کی جائے گی۔ یہ ترکیب سمجھ میں آ چکی تھی جب وہ ارغون کے پاس پہنچا اس وقت ارغون کھیل تماشوں سے دل بہلا رہا تھا۔ اس کے سامنے خاصا طویل اور عریض اکھاڑا تھا۔ اس اکھاڑے کو موٹے موٹے رسوں سے گھیر دیا گیا تھا۔ ارغون نے اپنے چھوٹے بھائی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

کینخا تو خان نے رک کر کہا "برادر محترم! آج میں آپ کے لیے ایک اہم خبر لایا ہوں۔"

ارغون کی بے چینی بڑھنے لگی، پوچھا "ہاں تو وہ اہم اور خوشیوں سے بھری خبر کیا ہے ذرا میں بھی تو سنوں۔"

کینخا تو خان نے جواب دیا "برادر محترم! آپ [illegible]

عمر اور بڑھاپے سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ میں نے آپ کے ان دونوں دکھوں کا حل تلاش کر لیا ہے۔"

ارغون کو غصہ آ گیا۔ بولا "او احمق! اب تمہید ختم کر اور کام کی باتیں کر کے میرا تجسس دور کر۔"

کینخا تو خان نے جواب دیا "میں نے ایک ایسا شخص پالیا ہے جو ہندوستان سے اس عالم اور محقق کو اپنے ساتھ لے آئے گا جس کے پاس ہر قسم کی جڑی بوٹیاں اس کے سامنے خود اپنے خواص بتاتی ہیں۔ یہ عالم یہ دید عنقریب آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔"

ارغون بے ساختہ اٹھا اور کینخا تو خان کو سینے سے لگا لیا، بولا "کینخا تو! تو میرا بھائی ہے۔ میری فکر تجھے نہیں تو اور کس کو ہوگی۔"

اتنے میں اکھاڑا آباد ہو گیا اور ایک برہنہ شخص کو اکھاڑے کے بیچوں بیچ میں کھڑا کر دیا گیا۔

اکھاڑے کے باہر چاروں طرف شاہی خاندانوں کے لوگوں نے جگہیں گھیر رکھی تھیں۔ ان شاہی خانوادوں میں ان کے آس پاس امراء اور فوجی سرداروں کے خاندان تھے۔ وہ ان میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تہمینہ کو تلاش کرنے لگا مگر وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سعداللہ یہودی ذرا دور سے یہ نظارہ کر رہا تھا جب وہ برداشت نہیں کر سکا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر کینخا تو خان کے پاس پہنچ گیا۔ پھر سعداللہ یہودی نے اس طرح بات کی کہ کینخا تو خان ذرا سی دیر کے لیے پریشان ہو گیا۔ وہ بات تو کینخا تو خان سے کر رہا تھا مگر سنا رہا تھا ارغون کو، اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا "شہزادہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اکھاڑے کے بعد ہم سب اپنی اپنی بیویوں اور عورتوں کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے آپ ان کا جی بھر کر دیدار کر لیجئے گا۔ پھر اس کے بعد آپ کو یہ زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی کہ بھری محفل میں انہیں دیکھنے میں زحمت ہو جیسی کہ اس وقت پیش آ رہی ہے۔"

ارغون سعداللہ یہودی سے ناراض ہو گیا۔ بولا "او یہودی! کینخا تو خان میرا چھوٹا بھائی ہے میرے بعد یہی اس حکومت کا مالک و مختار ہوگا، تو اس طرح اپنے آقاؤں سے بات کرتا ہے۔"

سعداللہ یہودی لاجواب ہو گیا تھا۔ ارغون کی باتوں کا جواب تو نہیں دے سکا بس خوشامد پر اتر آیا، آہستہ آہستہ کینخا تو خان کی تعریفوں پر اتر آیا، بولا "حضور والا! میں شہزادہ کینخا تو خان کی دل و جان سے عزت کرتا ہوں اور میری یہ خواہش ہے کہ انہیں جو لڑکی یا عورت پسند آ جائے بخوشی اپنے ساتھ لے جائیں اور جس سے لطف حاصل کریں۔"

کینخا تو خان نے دل میں سوچا کہ اس شخص کو کون شکست دے سکتا ہے۔

اکھاڑے میں کھڑے ہوئے آدمی کے سامنے ایک چیتا چھوڑ دیا گیا۔ چیتے نے اکھاڑے میں داخل ہوتے ہی آدمی پر حملہ کر دیا۔ آدمی نے پھرتی سے جھک کر چیتے کا داؤں خالی جانے دیا تماشائیوں نے تالیاں بجائیں۔

چیتا ایک بار پھر سنبھلا اور کچھ دیر کھڑا اس آدمی کی شکل دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ آدمی چیتے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے گھورے جا رہا تھا۔ پھر چیتا اچانک اپنی جگہ سے جست لگا کے آدمی کے سر پر پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں آدمی اپنے ہوش و حواس مجتمع کر چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھری تھی، چیتا جیسے ہی اس آدمی کے سر پر پہنچا، آدمی نے جھک کر چیتے کا پیٹ چاک کر دیا۔

ہر طرف سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ارغون اپنی جگہ سے اچھل اچھل کر اس جیالے کو داد دے رہا تھا۔ اس نے ازراہِ مذاق کیخاتو خان سے پوچھا: ”کیا تو اس جیسی بہادری دکھا سکتا ہے؟“

کیخاتو خان نے جواب دیا: ”برادرِ محترم! یہ آدمی اگر چیتے کے ہاتھوں مارا جاتا تو اس کے خاندان کو تو شاید کچھ تکلیف پہنچ جاتی لیکن اس کی موت سے ملک اور قوم کو کوئی نقصان نہ پہنچتا برخلاف اس کے اگر اس کی جگہ میں ہوتا اور چیتے کا شکار ہو جاتا تو کیخاتو خان کی موت سے شاہی خاندان کا چراغ ہی گل ہو جاتا۔“

ارغون کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ اسی دوران کیخاتو خان کو غافل دیکھ کر سعد اللہ یہودی نے ارغون سے پوچھا: ”محترم ایل خان! میں شہزادے کی باتوں کا مفہوم نہیں پا سکا۔ شہزادے کی موت سے شاہی خاندان کا چراغ کیوں کر گل ہو جاتا؟“

ارغون نے جواب دیا: ”کیخاتو خان میرا بھائی بھی ہے اور ولی عہد بھی، اگر یہ مر جائے تو میرے بعد بارِ حکومت کون اٹھائے گا؟ میرے بیٹے؟ میرے بیٹوں سے چالاک اور بہادر بایدو خان ہے اس طرح یہ حکومت بایدو خان کے خاندان میں چلی جاتی اور اس طرح شاہی خاندان سے ہمارا خاندان اور ہمارا نام نکل جاتا۔“

سعد اللہ یہودی کیخاتو خان کے معاملے میں ایک دم محتاط ہو گیا، اب وہ کیخاتو خان کا ہمدرد اور بہی خواہ بن گیا۔

ارغون نے حکم دیا کہ اکھاڑے میں پہلوانوں کو اتارا جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ کئی کئی پہلوان اکھاڑے میں اتار دیے گئے اور ان پہلوانوں نے آپس میں ایک ایسا مقابلہ شروع کر دیا جو کہیں ختم نہیں ہوتا تھا۔ انہیں مقابلے میں ہر قسم کے داؤ اور ہتھیار استعمال کرنے کی اجازت تھی لیکن اکھاڑے میں انہیں نہتا اتارا گیا تھا۔ اس مقابلے میں کوئی کسی کا حریف نہیں تھا بلکہ ہر پہلوان کسی بھی پہلوان

سے لڑ سکتا تھا۔ ایسی بے قاعدہ کشتیاں اور وحشیانہ مقابلے جو پہلے کہیں نہیں منعقد ہوتے ہوں گے۔ پہلوانوں میں ایرانی، ترکی، اور منگول پہلوان تھے۔ ایک گنجا پہلوان تھا جو سب پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں، سر اور جسم کے مختلف اعضا یکساں کام کر رہے تھے۔ وہ ہر ایک کی پٹائی کر رہا تھا۔ اس نے جس پہلوان کو اوپر اٹھا کر دور پھینکنے یا وہ دوبارہ نہیں اُٹھ سکا اور اُن بے حال اور بے دم پہلوانوں کے سروں پر مُکّوں کی ضربیں لگا لگا کر بے ہوش کر دیا گیا۔

ان مقابلوں سے ارغون کو بڑی خوشی ہوئی۔ بے اختیار بول اُٹھا: "ہم منگول آج بھی ناقابلِ فتح ہیں۔ ہمیں شکست نہیں دی جا سکتی۔"

کیخاتو خان نے تائید کی: "بیشک ہم بہادر ہونے کے باوجود بزدلی کے کام کرتے پھر رہے ہیں۔"

ارغون نے پوچھا: "وہ کس طرح؟"

کیخاتو خان نے اپنے بھائی کو بھلانے کی کوشش کی: "ایک طاقتور ترین آدمی اگر کسی بچّے سے زور آزمائی کرے یا اُسے ہلاک کر دے تو اس طاقتور کو دُنیا کیا کہے گی؟"

ارغون نے جواب دیا: "بزدل، پاگل، احمق۔"

کیخاتو خان نے کہا: "مسلم رعایا اور اُن کے کمزور بیوی بچوں کو ہماری طاقتور فوجوں نے نہایت سفاکی سے ہلاک کر دیا۔ اُسے کیا کہا جائے گا؟"

ارغون نے جواب دیا: "کیخاتو خان! افسوس کہ نکودار کی طرح تو بھی مسلمانوں کی حمایت کرتا رہتا ہے۔ میری محبت اور خلوص کو حاصل کرنے کے لیے تجھے اُس سے دستبردار ہونا پڑے گا۔"

کیخاتو خان دلیلیں دینے لگا: "ہم مسلمانوں کو قتل کر کے انہیں دُنیا سے نیست و نابود نہیں کر سکتے۔ جب یہ طے ہے کہ ہمیں اُن کے ساتھ رہنا ہے، اُن پر حکومت کرنا ہے، اُن کی ہنرمندی اور کاریگری سے فائدہ اٹھانا ہے تو اُن کے خلاف یہ انتقامی اور ظالمانہ کارروائی کیوں؟"

ارغون کچھ کچھ قائل ہو چکا تھا، بولا: "ٹھیک ہے۔ مسلمانوں کا جتنا قتلِ عام ہو چکا ہے اس کے بعد اب نہیں ہو گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

کیخاتو خان اس کے بعد جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اُس کے لیے مُناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

سعد الدولہ یہودی اُن دونوں کی محبت اور یگانگت سے پریشان ہو رہا تھا۔ اُن دونوں کے سامنے دست بستہ ہو کے عرض کیا: "کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس وقت آپ دونوں اکھاڑے کی تفریحات سے لُطف اندوز ہوں اور ادھر سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کام کی باتیں کریں۔"

ارغون نے اس تجویز کو پسند کیا اور حکم دیا کہ اکھاڑے کی تفریحات کا دوبارہ آغاز کیا جائے۔

○

کیخاتو خان رات کے پچھلے پہر اپنے قصر میں داخل ہوا تو اُس کی ایک کنیز نے اُسے سرگوشی میں بتایا: "رفیعہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

کیخاتو خان بہت تھکا ہوا تھا۔ بولا: "میں صبح اس سے مِل لُوں گا۔"

کنیز نے ملاقات پر اصرار کیا: "لیکن وہ اسی وقت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

کیخاتو خان اُسی وقت رفیعہ کے پاس چلا گیا۔ اُس کے دروازے کی آڑ سے رفیعہ کو گنگناتے سُن لیا۔ وہ اپنی بدقسمتی اور دشمنوں کی سفاکی کو بڑے درد سے اشعار میں بیان کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ خاموش ہو گئی تو کیخاتو خان نے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دی۔ اس دستک کا فوری جواب تو نہیں مِلا۔ بس دروازہ کھُل گیا۔ رفیعہ اُسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔

کیخاتو خان نے کہا: "اگر مجھے تیری طرف سے یہ پیغام نہ مِلا ہوتا کہ میں تجھ سے فوراً ہی ملاقات کروں تو شاید میں اس وقت تیرے پاس نہ آتا۔"

رفیعہ نے اُسے اندر بُلا لیا۔

کیخاتو خان نے ہنس کر پُوچھا: "رفیعہ ایک بات تو بتا۔"

رفیعہ نے کہا: "پوچھو۔"

کیخاتو خان نے کہا: "تو نے رات کے پچھلے پہر مجھے اپنی خواب گاہ میں بُلا لیا ہے کیا تو مجھ سے خوفزدہ نہیں ہو گئی؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "میں آگ کے جس سمندر کو عبور کر کے یہاں تک پہنچی ہوں اُس نے میرے اعصاب کو فولادی کر دیا ہے اب میں کسی بات سے بھی نہیں ڈرتی۔"

کیخاتو خان نے دیکھا، رفیعہ نے جو لباس پہن رکھا تھا، وہ بہت زیادہ عُریاں تھا۔ اُس کی دونوں رانیں کھُلی ہوئی تھیں اور سینے پر کُرتے کے بٹن ندارد تھے۔ سیاہ بالوں کو دونوں شانوں پر بکھیر رکھا تھا۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ کمرے کی اندرونی کھڑکی پر ٹکا دیا تھا۔ جس سے اُس کی کھُلی ہوئی بغل بالوں سمیت صاف نظر آ رہی تھی۔

کیخاتو خان کو اپنی طبیعت پر قابو پانا مشکل ہو گیا اور رفیعہ مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

کیخاتو خان نے ایک بار پھر پوچھا: "مجھے تو نے کیوں بلایا تھا؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "یہ جاننے کے لیے کہ میری بہن کا پچھ

پتہ چلا؟ میں کب تک تیری مہمان رہوں گی اور حرام کے کھانے کھاتی رہوں گی؟"

کیتاتو خان ہنس دیا۔ "بس اتنی سی بات جاننے کے لیے مجھے اتنی رات کو زحمت دی؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "یہ اتنی سی بات نہیں ہے میرے سینے میں اک آگ سی لگی ہوئی ہے اگر یہ کام تیرے بس کا نہیں تو مجھ کو یہاں سے رخصت کر دے میں خود تلاش کر لوں گی اُسے۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔"

اب کیتاتو خان بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "خاتون! یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا تو سمجھ رہی ہے سعد اللہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ تہمینہ کو اس کے محل سے برآمد کرنا بڑا دشوار ہے اور یہ کام میرا بڑا بھائی ارغون ہی کر سکتا ہے۔"

رفیعہ نے ضد کی۔ "تب پھر میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"کہاں چلی جاؤ گی؟"

"جہاں جی چاہے گا۔ میں جس کام سے یہاں آئی ہوں اگر وہی پورا نہ ہو تو پھر خواہ مخواہ مہمان بنے رہنے کا فائدہ؟"

کیتاتو خان نے اُسے ایک بار پھر سمجھانا چاہا۔ "خاتون! تو میری بات کیوں نہیں سمجھ رہی۔ یہ بھیڑیوں کی بستی ہے تو جیسے ہی اس قصر سے نکلے گی بھیڑیے تیری تکا بوٹی کر دیں گے۔"

رفیعہ نے کہا۔ "اس زندگی سے بہتر ہے میرا تکا بوٹی کر دیا جائے۔"

کیتاتو خان کو بھی غصہ آنے لگا۔ "خاتون! میری بات سمجھنے کی کوشش کر یہاں بھیڑیے آباد ہیں۔"

رفیعہ نے کہا۔ "تب پھر تو مجھ پر یہ احسان کر تو مجھے یہاں کے سب سے بڑے بھیڑیے تک پہنچا دے۔"

کیتاتو خان نے حیرت سے پوچھا۔ "یعنی میں تجھے اپنے بڑے بھائی ارغون تک پہنچا دوں؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "ہاں میں یہی چاہتی ہوں کیونکہ میں اس جابر اور ظالم انسان کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اُس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

کیتاتو خان ٹکٹکی باندھے رفیعہ کو دیکھ رہا تھا۔ "تجھے اس کا انجام معلوم ہے؟"

رفیعہ نے پوچھا۔ "کس کا انجام؟"

کیتاتو خان نے جواب دیا۔ "ارغون سے ملاقات کا انجام، اس کو قریب سے دیکھنے کا انجام۔"

رفیعہ نے سر جھکا لیا۔ بولی۔ "جانتی ہوں یہاں کے سب سے بڑے بھیڑیے سے ملاقات کا جو نتیجہ نکلے گا اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

کہا

ایک بیوی نے اپنے شوہر سے "شادی کے وقت تم نے کہا تھا کہ میں تصویر کی طرح خوبصورت ہوں۔"

جواب دیا شوہر نے اپنی بیوی کو "میں سمجھتا تھا کہ تصویر ہمیشہ خاموش رہتی ہے۔"

کیتاتو خان رفیعہ سے خفا ہو چکا تھا، تیوریوں پر بل پڑ گئے وہ کہہ رہا تھا۔ "نہیں واقف ہے۔ تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ تو بھائی ارغون سے ذرا بھی واقف نہیں۔ وہ تجھے دیکھتے ہی اپنے محل میں ڈال لے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا تو نہیں جانتی۔"

"میں خوب جانتی ہوں میں اس سے نہیں ڈرتی۔"

کیتاتو خان کو غصہ آ رہا تھا کہ یہ لڑکی اس کی باتیں کیوں نہیں سمجھ رہی، بولا۔ "جب تو ارغون کے محل میں داخل ہو جائے گی تو اس کے بعد نہ تو تو اپنی بہن تہمینہ کو سعد اللہ سے آزادی دلا سکے گی اور نہ تو جیتے جی رہائی پا سکے گی۔"

لیکن رفیعہ شاہی محل میں جانے کے لیے بہت بے چین ہو رہی تھی زچ ہو کر بولی۔ "تو میری بات نہیں سمجھ سکے گا منگول عساکر کے سپہ سالار اعلیٰ اور عصر حاضر کے خان!" رفیعہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ "اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہر قیمت میں تیرے ارغون خان سے مل کر رہوں گی اور جو کام تو نہیں کر سکا وہ میں کر کے دکھاؤں گی۔"

کیتاتو خان ... رفیعہ کی ضد کے آگے سپر انداز ہوتا جا رہا تھا۔

"رفیعہ! شاید میں تجھ کو نہیں سمجھ سکا۔ سچ بتا کیا تو وہی ہے جو بتایا تھا؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "میں وہی ہوں لیکن غصے اور اشتعال نے مجھے اپنے حواس میں نہیں رکھا۔ میں پاگل ہو رہی ہوں۔"

کیتاتو خان کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، پھر بولا۔ "بہتر ہے اگر تیری یہی خواہش ہے کہ تو ارغون تک پہنچ جائے تو تیرا یہ کام ہو جائے گا۔"

وہ جانے لگا مگر رفیعہ نے اُسے روک لیا۔ بولی۔ "کہاں چلے؟ مجھے کچھ اور باتیں بھی معلوم کرنی ہیں تجھ سے۔"

کیتاتو خان بہت زیادہ دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ اس کو رفیعہ حد سے زیادہ لالچی اور خود غرض نظر آ رہی تھی۔

رفیعہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کچھ دیکھنے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کیتاتو خان نے کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ تو نے ارغون کے پاس جانے کا فیصلہ غلط کیا ہے تو شاید تو یہ کہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن میں بار بار یہی کہوں گا کہ تو اب جو کچھ کرنے والی ہے غلط ہے۔"

رفیعہ نے مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا۔ "میں نے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا ہمیشہ بروقت اور صحیح فیصلے کیے ہیں۔ اسی طرح یہ

فیصلہ بھی درست ہوگا کیونکہ مجھے اپنے فیصلے کی درستی اور صداقت پر یقین ہے۔"

کینخاتو خان نے اجنبیانہ انداز میں مختصر جواب دیا۔ "بہر حال میں کل سے پرسوں تک تجھے ارغون کے محل میں پہنچا دوں گا۔ آگے جو کچھ ہوگا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں بہر حال۔"

کینخاتو خان کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ رفیعہ اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ شاید اس کو کینخاتو خان پر رحم آرہا تھا۔

جب کینخاتو خان جانے لگا تو رفیعہ نے اسے روک لیا۔ "ذرا سُننا تو!"

کینخاتو خان نے جواب دیا۔ "خاتون! اب کل بات ہوگی۔"

رفیعہ نے شوخی سے کہا۔ "کل نہیں۔ میں تو آج ہی اور اسی وقت بات کروں گی۔"

کینخاتو خان رُک گیا، مگر مڑا نہیں۔ دور ہی سے پوچھا۔ "تجھ کو مجھ سے کیا بات کرنا ہے جلدی کر۔"

رفیعہ نے شوخی سے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "کیا تو ناراض ہو گیا ہے مجھ سے؟"

کینخاتو خان قہقہے کی آواز پر گھوم گیا۔ رفیعہ کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب وہ پہلی جیسی یا پہلی والی رفیعہ نہیں نظر آرہی تھی۔ رفیعہ نے ہنس کر پوچھا۔ "شہزادے! تجھ سے ایک بات پوچھوں تو جواب دے گا؟"

کینخاتو خان نے جواب دیا۔ "ضرور پوچھ۔ میں جواب بھی دوں گا۔"

رفیعہ نے اس کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی۔ "کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی؟"

کینخاتو خان نے جواب دیا۔ "خاتون! مجھے کیا! تو یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جا یا دو چار دن کے لیے جا۔ میرا تجھ سے کیا رشتہ؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "شہزادے! ایسی بات نہ کیا کر۔ اگر ہم میں کوئی رشتہ نہ تھا تو تُو نے اپنے قصر کا یہ حصہ مجھے رہنے کو کیوں دیا۔ میری جلی کٹی باتیں تو کیوں سن اور برداشت کر رہا ہے۔ اور تجھے اس بات سے تکلیف کیوں پہنچ رہی ہے کہ میں ارغون کے پاس جانا اور اس کے پاس رہنا چاہتی ہوں؟"

کینخاتو خان اچانک برس پڑا۔ "لڑکی! میں تجھے نہیں سمجھ سکا۔ میں تجھ کو ارغون کے پاس کیوں پہنچا دوں! وہ بھیڑیا ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا بھیڑیا۔ اپنے نفس اور ہوس کا غلام۔ وہ اپنی ملکہ تربہ شیریں تک کو بخشنے پر تیار نہ تھا۔ میں تجھ کو اس درندے کے پاس پہنچا دوں؟"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "میں تیرے بڑے بھائی ارغون کے پاس جاؤں گی ضرور مگر تجھ کو ناراض کر کے نہیں اور یہ بھی وعدہ کرتی ہوں کہ تیرے پاس واپس بھی آجاؤں گی۔"

کینخاتو خان نے حسرت اور افسوس سے کہا۔ "تو اپنی مرضی سے جا تو سکتی ہے مگر اپنی مرضی سے واپس نہیں آسکتی۔"

رفیعہ نے اس کی سُنی اَن سُنی کر دی، پوچھا۔ "تو تو کب تک ملائے گا اپنے بڑے بھائی ارغون سے؟"

کینخاتو خان نے جواب دیا۔ "کل سے پرسوں تک۔"

رفیعہ نے کہا۔ "میں تیرا انتظار کروں گی۔"

کینخاتو خان نے کہا۔ "اور جب تو یہاں سے چلی جائے گی تو میں تیرا انتظار بالکل نہیں کروں گا۔"

رفیعہ بجھ سی گئی، بولی۔ "اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔"

کینخاتو خان وہاں سے چلا گیا۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا لیکن اگر وہ مڑ کر دیکھتا تو اُسے ایک ایسا منظر دکھائی دیتا جس کا وہ اپنے دل میں متمنی رہا ہوگا۔ رفیعہ حسرت و یاس سے اسے ٹکٹکی باندھے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظر آتا رہا۔

❋

کینخاتو خان اپنے بھائی ارغون سے الجھ رہا تھا کہ آخر وہ اب تک اس کو سپہ سالارِ اعلیٰ کیوں نہیں بنا سکا اور ارغون ہنس ہنس کر جواب دے رہا تھا کہ اس کے لیے ابھی کچھ دن اور صبر کرنا ہوگا کینخاتو! صبر کر، بس چند دن صبر کر۔"

کینخاتو خان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی زبان کھولی۔ "برادرِ محترم! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں یہ انکشاف کروں گا کہ آپ کے سعد اللہ یہودی نے بڑی گڑبڑ پھیلا رکھی ہے وہ نہ تو حکومت کے وقار کو دیکھتا ہے نہ اپنی عزت و آبرو کو۔ پچھلے دنوں موخان کی ایک بستی کو لوٹ کر سعد اللہ نے انہیں ویران کر دیا۔ بہتوں کو قتل اور ہلاک کرنے کے بعد وہاں کی ایک حسین ترین تہمینہ نامی لڑکی کو اپنے گھر لے چلا گیا۔۔۔"

ارغون کا نشہ ہرن ہو گیا، بولا۔ "تو نے کیا کہا؟ اس نے ایک حسین ترین لڑکی کو اپنے گھر میں ڈال لیا؟ کیوں؟ کس کی اجازت سے؟"

کینخاتو خان نے جواب دیا۔ "اس کے سارے کام ایسے ہی ہوتے ہیں، برادرِ محترم! سعد اللہ آپ کے نام پر حکومت کر رہا ہے آپ جس چیز سے اس کو۔۔۔"

ارغون نے اسی وقت حکم دیا۔ "سعد اللہ یہودی کو اسی وقت حاضر کیا جائے۔"

کینخاتو خان وہیں بیٹھا رہا، اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ وہ سعد اللہ یہودی کو ذلیل ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔

ارغون نے نہایت لطف آمیز لب و لہجہ میں کہنا شروع کر دیا: "میرے بھائی کیخاتو خان! حکومت بڑا دشوار کام ہے۔ حکمراں کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے آس پاس انتہائی احتیاط کے باوجود خود غرض اور خوشامدی جمع ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو اگر زخمی کیا جا سکتا ہے تو خوشامد کے ہتھیار سے۔ سعداللہ اور اس جیسے کئی دوسروں نے ہمیشہ خوشامد کے سہارے غلط سلط کام کیے اور بچ گئے۔ سعداللہ بھی یہی کر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی تمینہ بہت حسین اور یکتا ہو گی۔ اس کو سعداللہ کے جھونپڑے میں نہیں میرے محل میں ہونا چاہیے۔ سعداللہ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

کیخاتو خان نے رک رک کر کہا: "برادرِ محترم! اس لڑکی کو سعداللہ کے گھر سے نکال کر شاہی محل میں داخل کر دینا، کیا یہ مناسب ہو گا؟"

ارغون نے ہنس کر طنز کیا: "تب پھر کیا اس کو تیرے حوالے کر دیا جائے؟"

کیخاتو خان ڈر گیا، گھبرا گیا، بولا: "نہیں، میرا یہ مقصد ہرگز نہیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو اگر آزاد کر دیا جائے تو مناسب رہے گا۔"

ارغون نے حیرت سے پوچھا: "اس کو آزاد کر دیا جائے؟ مگر کیوں؟ تو نے تو اس کی بابت ابھی یہ بتلایا تھا کہ اس کا سارا خاندان مارا گیا۔ جب اس کا کوئی خاندان ہی نہیں رہ گیا تو وہ یہاں سے نکل کر جائے گی کہاں؟ اگر تیری نیت ہو تو اسے رکھ لے تو اور بات ہے۔"

کیخاتو خان پھر گھبرا گیا: "میرا یہ منشا ہرگز نہیں برادرِ محترم! میں اس کو لے کر کیا کروں گا؟"

ارغون نے کہا: "تب پھر اسے شاہی محل سے اعلیٰ اور اچھی جگہ نہیں مل سکتی۔"

کیخاتو خان نے عرض کیا: "لیکن مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اس کا ایک عزیز اب بھی موجود ہے، وہ زندہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ تمینہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔"

ارغون نے پوچھا: "یہ تمینہ کون ہے؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "یہ اس لڑکی کا نام ہے جسے آپ سعداللہ یہودی سے حاصل فرمائیں گے۔"

ارغون نے بڑا پُر معنی اور چبھتا ہوا سوال کیا: "تو تجھے اس کا نام بھی معلوم ہے؟ خوب!"

کیخاتو خان اور زیادہ گھبرا گیا: "اس لڑکی کا نام تمینہ ہے یا کچھ اور، میں نہیں جانتا لیکن اس کے خاندان کا جو شخص اس لڑکی کے لیے میرے پاس آیا تھا اس نے اس کا نام تمینہ ہی بتایا تھا۔"

ارغون نے پوچھا: "میری کنیز زرافشاں اور دونوں غلاموں کا کیا حال ہے؟"

کیخاتو خان نے مُردہ سی آواز میں جواب دیا: "دونوں ہی ٹھیک ہیں بلکہ تینوں ہی۔ ان کا دم غنیمت ہے۔ میری بڑی خدمت کرتے ہیں۔"

ارغون نے ہنس کر کہا: "بیشک ان کا دم غنیمت ہے۔ تینوں بہت کام کے ہیں۔"

کافی دیر بعد سعداللہ یہودی بھی آ گیا۔ اس نے دونوں بھائیوں کو یکجا جو دیکھا تو بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ بولا: "میری ہر وقت خدا سے یہی دعا رہتی ہے کہ خدا اس اتحاد کو قائم و دائم رکھے۔"

ارغون نے درشت لہجے میں کہا: "سعداللہ! ہمیں تجھ سے ایسی امید نہیں تھی۔"

سعداللہ نے گویا ارغون کی بات سنی ہی نہیں، بولا: "حضور کی خفگی اور شکایات اپنی جگہ، اس وقت میں نذرانے میں ایک نہایت قیمتی چیز لایا ہوں اگر حضورِ والا اسے قبول فرمالیں گے تو یہ میرے لیے بڑے اعزاز اور فخر کی بات ہو گی۔"

ارغون نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا: "مجھے کہاں تک چلنا ہو گا؟"

سعداللہ نے جواب دیا: "اسی محل کے بیرونی حصے میں۔ آپ کو زحمت تو ہو گی۔"

جب ارغون ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا تو سعداللہ نے کیخاتو کو مخاطب کیا: "اور جنابِ والا آپ بھی۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

ارغون نے اپنے بھائی کیخاتو خان کی طرف دیکھا اور کہا: "ہاں ہاں تو بھی چل۔"

راستے میں انہیں وہ خدمت گار ملے جو تھوڑی دیر پہلے سعداللہ کو بلانے گئے تھے، انہوں نے ارغون کو مطلع کیا: "سعداللہ گھر پر نہیں ہیں۔"

ارغون کو ہنسی آ گئی۔ اس نے سعداللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "سعداللہ اگر گھر پر نہیں ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے سعداللہ میرے سامنے موجود ہے۔"

سعداللہ نے عرض کیا: "حضورِ والا! میرا خیال ہے یہ میرے بعد گھر پہنچے ہوں گے، مجھے تو یہ راستے میں بھی نہیں ملے کہیں۔"

کچھ دیر بعد سعداللہ نے ارغون اور کیخاتو خان کو اس کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں ملاقات کے لیے آنے والوں کو بٹھا دیا جاتا تھا۔

ارغون نے دیکھا یہاں ایک نہایت حسین لڑکی بیٹھی کسی کا انتظار کر رہی تھی بیش قیمت لباس میں ملبوس اور زیورات سے آراستہ۔ ارغون اور کیخاتو خان کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ بھی نہ آسکا۔

ارغون نے پوچھا: ”سعداللہ! یہ کون ہے؟“

سعداللہ نے جواب دیا: ”حضور والا! مجھ کو یہ حسین لڑکی بغداد کی مسلم بستی سے ملی تھی۔ اس وقت یہ بہت کمزور تھی۔ میں اس کو اسی وقت حضور کی نذر کرنا چاہتا تھا مگر پھر یہ سوچ کر کہ پہلے کھلا پلا کر اس کی صحت بنا دوں، اس کے بعد حضور کی نذر کروں، اپنے گھر لے چلا گیا۔ اب یہ اس لائق ہے کہ اسے حضور کے حوالے کر دیا جائے۔“

ارغون کیخاتو خان کی شکل دیکھنے لگا۔

ارغون نے اس لڑکی کو محل میں بھیج دیا۔ کیخاتو خان نے تہمینہ کو دیکھا تو اس کو یوں لگا گویا رقیعہ کچھ کمسن ہو کر آگئی ہے۔

ارغون نے سعداللہ سے کہا: ”آج تو بچ گیا، بال بال بچ گیا۔ میں تو حیران تھا کہ تجھ سے یہ خیانت ہوئی کس طرح؟“

سعداللہ نے پوچھا: ”میں حضور کا مطلب نہیں سمجھا، یعنی؟ خیانت؟ کیسی خیانت؟ اور وہ بھی میری طرف سے؟ مجھ سے؟“

کیخاتو خان شرمندہ ہو چکا تھا۔ وہ ارغون اور سعداللہ کو باتیں کرتا چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ارغون نے اپنے بھائی پر ایک اچٹتی سی سرسری نظر ڈالی اور سعداللہ سے کہا: ”سعداللہ! ذرا دیکھنا تو یہ بھائی کیخاتو خان کو کیا ہو گیا؟“

سعداللہ کیخاتو خان کے پاس جا کھڑا ہوا اور کچھ دیر اس کی حالت کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا: ”میں آپ کا احترام کرتا ہوں لیکن آپ نے مجھ پر وار کر دیا۔ اب تو آپ قائل ہو گئے ہوں گے کہ مجھ میں دفاع کی صلاحیت ہے؟“

کیخاتو خان نے جواب دیا: ”میں نے تجھ پر کوئی وار نہیں کیا۔“

سعداللہ نے پوچھا: ”پھر یہ چکر سا کیوں آگیا؟“

کیخاتو خان نے جواب دیا: ”اس کا کوئی خاص سبب نہیں، بس یوں ہی۔“

سعداللہ نے کہا: ”میں اب بھی آپ کا احترام کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اپنے بھرم اور احترام کو قائم رکھیے گا۔“

کیخاتو خان کو سعداللہ یہودی پر غصہ تو بہت آرہا تھا مگر وہ اس کی چالاکیوں اور عیاریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے تلخی سے جواب دیا: ”سعداللہ! ہم آپس میں نااتفاقیوں کا شکار ہو چکے ہیں اور یہیں یہ تمدنی بیماری تہذیب و تمدن سے ملی ہے۔ جب تک ہم تمدن سے دور رہے، ہم میں اتفاق و اتحاد برقرار رہا۔ میرے بھائی کا دل و دماغ تو بدل چکا ہے اور وہ مجھ سے زیادہ تیری عزت کرتا ہے لیکن سعداللہ تو بھی یاد رکھ کہ یہ آگ کا کھیل ہے۔ آگ تیرا دامن پکڑ سکتی ہے اور جب تیرا دامن جل جائے گا تو تیرا سب کچھ جل جائے گا۔“

سعداللہ نے جواب دیا: ”میں آگ سے نہیں ڈرتا۔ جب آگ سے کھیلوں گا تو جلوں گا بھی لیکن جب میں جلنے لگوں گا تو اس آگ میں دوسروں کو بھی کھینچ لوں گا، میں تنہا نہیں جلوں گا۔“

کیخاتو خان لاجواب ہو چکا تھا۔

ارغون خان نے دور سے پوچھا: ”تم دونوں کن باتوں میں لگ گئے ہو؟“

سعداللہ نے کیخاتو خان سے کہا: ”شہزادے! بہتر یہی ہے کہ ان باتوں کو یہیں ختم کر دیا جائے۔“ اس کے بعد ارغون خان کو جواب دیا: ”خان محترم! شہزادے کو چکر سا آگیا تھا لیکن اب حالت بہتر ہے۔“

کیخاتو خان نے کہا: ”سعداللہ جو ہوا سو ہوا۔ میں دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں، میری تیری لڑائی ختم لیکن تجھ کو بھی مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ تو بھی آئندہ میری مخالفت نہیں کرے گا۔“

سعداللہ ہنسنے لگا، بولا: ”شہزادے! آپ کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ میں آپ کی مخالفت کرتا ہوں۔ آپ سوچیے تو سہی کہ آپ کی مخالفت سے مجھے حاصل کیا ہوگا؟“

چونکہ اب مزید باتوں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لیے دونوں مسکراتے ہوئے ارغون کے پاس چلے آئے۔ سعداللہ یہودی نے کیخاتو خان کے لیے ارغون سے سفارش کی: ”خان محترم! شہزادے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے انھیں شاہی طبیب کو دکھا دیا جائے تو بہتر ہے۔“

لیکن کیخاتو خان نے طبیب کو دکھانے سے انکار کیا، کہا: ”اب میں ٹھیک ہوں بس ذرا چکر سا آگیا تھا۔“

ارغون خان مسکرایا: ”یہ چکر کون سی بیماری ہے؟ تو کمزور بھی نہیں ہے کہ چکر آئیں اور میں سوچتا ہوں کہ منگولوں کے عساکر کے سپہ سالار اعلیٰ کو اگر چکر آنے لگے تو اس کے عساکر کا کیا حال ہوگا؟“

کیخاتو خان بہت کھسیایا ہوا تھا۔ سعداللہ نے شہزادے کی طرف سے جواب دیا: ”خان محترم! اب میں شہزادے کی طرف سے یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ انہیں آئندہ چکر نہیں آئیں گے۔“

ارغون نے اپنے بھائی کیخاتو خان کی پیٹھ تھپتھپائی، بولا: ”سعداللہ بہت عقلمند ہے اس کی عقل سے تو بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے تو اس سے ملتا جلتا رہ فائدے میں رہے گا۔“

کیخاتو خان نے کھسیاہٹ سے جواب دیا: ”میں نے سعداللہ سے دوستی کر لی ہے اس سے فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔“

کیخاتو خان اپنے بھائی ارغون کے پاس اس وقت تک موجود

رہا جب تک سعداللہ یہودی چلا نہیں گیا۔ سعداللہ کے جاتے ہی ارغون خان نے کہا۔ "کیخاتو! سعداللہ نے محض اس لیے اس لڑکی کو اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ اُس وقت وہ بہت کمزور تھی اور جب وہ کھا پی کر صحت مند ہو گئی تو اسے میرے حوالے کر دیا۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "لیکن میں سعداللہ کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ اس کو اس واقعے کی خبر مل گئی تھی اسی لیے وہ ستہمینہ کو لے کر حاضر ہو گیا۔"

ارغون نے بڑی معنی خیز بات کی، بولا۔ "سعداللہ کی طرح ایک شخص اور ہے جس نے ایک ایسی ہی چیز اپنے گھر میں چھپا رکھی ہے پھر کس کس کی شکایت کروں کس کس کی ناقابلِ اعتباری کا گلہ کروں؟"

کیخاتو خان گھبرا گیا۔ کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "برادرِ محترم اب میں جانا چاہتا ہوں، پھر کسی وقت آجاؤں گا۔"

ارغون خان نے کہا۔ "ٹھیک ہے تو جا سکتا ہے مگر کوشش کرنا کہ تیرا اعتبار قائم رہے۔"

کیخاتو خان چلا آیا لیکن اب وہ زیادہ پریشان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا ارغون کو رفیعہ کا علم ہو چکا ہے؟ اگر علم ہو چکا ہے تو یہ اطلاع کس نے دی ارغون کو اس کو یہ بات معلوم کس سے ہوئی؟"

جب وہ شاہی محل سے نکل رہا تھا تو اُس نے اُس وقت اپنے غلام اینال کو بھی شاہی محل سے نکلتے دیکھا۔ اُس نے اینال کو آواز دے کر روک لیا اور پوچھا۔ "تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟"

اینال ذرا بھی نہ گھبرایا۔ بولا۔ "شاہی محل کے کئی غلام میرے دوست ہیں کبھی کبھی اُن سے ملنے چلا آتا ہوں۔"

کیخاتو خان نے درشت لہجے میں کہا۔ "لیکن جب تک میں کہیں جانے کی اجازت نہ دوں تجھ کو نہیں جانا چاہیے۔"

اینال نے سہم کر جواب دیا۔ "آئندہ میں اس کا خیال رکھوں گا۔"

کیخاتو خان آگے آگے تھا اور اینال پیچھے پیچھے۔ راہ میں چھاؤنی کے منگول سرداروں نے کیخاتو خان کو سلام کیا اور احترام سے پیش آئے کیونکہ انہیں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کیخاتو خان عنقریب اُن کا سپہ سالارِ اعلیٰ بننے والا ہے۔

اپنے قصر میں داخل ہونے کے بعد کیخاتو خان نے اینال کے ذہین دوسرے غلام فرامرز کو بھی طلب کیا اور اُس سے پوچھا۔

"فرامرز! کیا شاہی محل کے غلاموں میں تیرے دوست بھی ہیں؟"

فرامرز نے جواب دیا۔ "جی بندہ پرور! کئی دوست ہیں۔"

کیخاتو خان بپھر کر بولا۔ "لیکن میں غلاموں کی دوستی کا قائل نہیں۔ میں نے اینال کو شاہی محل سے نکلتے دیکھا۔ کیا اس [illegible] میں میری [illegible] کی حکومت ہے؟ کیا غلام اپنی مرضی کے

محبت کا مطلب ہے کسی کی دل سے تعریف کرنا ۔۔۔ اور تعریف کرنے کا مطلب ہے کسی کو دماغ سے چاہنا۔

مالک ہوتے ہیں؟"

اینال نے جواب دیا۔ "بندہ پرور! میں نے آپ کے دل و دماغ پر اسلام کے اثرات محسوس کیے ہیں اور مسلمانوں میں آقا اور غلام میں مساوات پائی جاتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ اس کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیں گے اور مجھے اتنی آزادی تو حاصل ہی ہو گی کہ فارغ اوقات میں اپنی مرضی پر چل پھر سکوں۔"

کیخاتو خان تقریباً لاجواب ہو چکا تھا، بولا۔ "لیکن میں مسلمان نہیں ہوں اور میں بالکل پسند نہیں کرتا کہ میرے غلام اپنی مرضی استعمال کریں۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا زنان خانے میں چلا گیا۔ وہاں ارغون کی عطا کردہ زرافشاں اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ کیخاتو خان کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "میرے آقا! آپ نے مجھ میں کیا کمی دیکھی جو مجھے اپنی محبوبہ کی خدمت میں نہیں بھیجا اور وہاں معمولی درجے کی دو خادمائیں متعین کر دیں۔"

کیخاتو خاں نے پوچھا۔ "میری محبوبہ؟ کون سی محبوبہ؟ کہاں ہے میری محبوبہ؟"

زرافشاں نے جواب دیا۔ "قصر کے اس آخری کمرے میں جس کی کھڑکیاں باغ میں کھلتی ہیں۔"

کیخاتو خان نے برہمی سے کہا۔ "لیکن تو وہاں کس طرح پہنچ گئی تھی؟ وہاں کیوں گئی تھی؟"

زرافشاں نے جواب دیا۔ "میں اتفاق سے وہاں چلی گئی تھی مجھے وہاں جانے سے روکا بھی گیا مگر میں نہیں مانی کیونکہ میں جانتی تھی کہ میرا آقا مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے اور مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا۔"

کیخاتو خان نے اپنے لہجے کی برہمی قائم رکھی۔ "یہ تجھے کس نے بتایا کہ وہ میری محبوبہ ہے؟"

زرافشاں نے جواب دیا۔ "جس خوبصورت لڑکی کو آپ نے اتنے آرام اور اہتمام سے رکھا ہوا ہے جس کو اس قصر کا آراستہ پیراستہ کمرہ رہنے کو دیا گیا ہو اور جس پر دو خادمائیں خدمت کے لیے متعین کر دی گئی ہوں وہ محبوبہ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی۔"

کیخاتو خان نے نرمی سے کہا۔ "لیکن افسوس تو یہی ہے کہ وہ میری محبوبہ نہیں ہے۔ وہ ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے اور میرے پاس اس لیے آئی ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔"

زرافشاں نے کہا۔ "اگر بات صرف اتنی ہی تھی تو آپ نے اس کو اپنے قصر میں کیوں رکھا، اُس کی مدد کر کے رخصت کر دیا ہوتا۔"

کیغاتوخان اپنا سر پکڑ کر چوکی پر بیٹھ گیا۔ بولا: "نہ جانے کیوں مجھے بار بار چکر آ رہے ہیں۔"

زرافشاں ہنسے جا رہی تھی: "میں تو یہ کہتی ہوں کہ اگر آپ کو اس سے زیادہ اور ذاتی دلچسپی نہیں تھی تو اس کو اپنے قصر میں نہیں رکھنا تھا اور یہ بات بھی اپنی سمجھ سے بالاتر ہے کہ اتنی خوبصورت لڑکی کو آپ یوں ہی چلا جانے دیں۔"

کیغاتوخان بالکل مجبور اور بے بس ہو رہا تھا بولا: "زرافشاں یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اگر وہ مجھے پسند بھی ہو تو اس کا کیا علاج کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں۔ مجھے یہ بات کون بتائے گا؟ میں اس سے یہ بات کس طرح پوچھوں؟"

زرافشاں نے کہا: "آقا! آپ کیسے شہزادے ہیں۔ آپ کے بھائی ارغون خان تو اس طرح کبھی سوچتے ہی نہیں۔ آپ منگول تو اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ آپ نے کسی چیز کو پسند کر لیا، بس یہی کافی ہے۔ آپ نے اپنے اسی اصول پر ملکوں کو فتح کیا، قوموں کو پامال کیا، شہروں کو برباد کر ڈالا، اپنی خواہش اور مرضی سے، تہذیبوں کو آگ لگا دی۔ آپ لوگوں نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا کہ جو حسین ترین لڑکی آپ کی آغوش میں آپ کی خواہشات پوری کر رہی ہے وہ آپ کو پسند بھی کرتی ہے یا نہیں، اسے آپ سے محبت ہے بھی کہ نہیں۔ یہ حسین ترین لڑکی جو آپ کے قصر میں عیش اور آرام سے رہ رہی ہے آپ کی ملکیت ہے آپ اس کی مرضی، اس کی خواہش کیوں معلوم کریں؟"

کیغاتوخان کو آج تک زرافشاں کی شعلہ بیانی کا کوئی اندازہ نہ تھا وہ مسکرانے لگا۔ بولا: "زرافشاں! بخدا تو تو زبردست مقررہ ہے۔ میں نے تیرا یہ وصف آج سے پہلے تو سمجھا ہی نہ تھا۔ بہرحال تو نے جو کچھ کہا، وہ سچ ہے اس میں صداقت ہے وہ واقعات ہیں لیکن افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھ سے مدد لینے آئی ہے۔ میں اس کی مدد تو کر سکتا ہوں مگر اس پر ظلم نہیں کر سکتا۔"

زرافشاں نے پوچھا: "میرے آقا! مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے مگر اس کا سبب؟ مجبوری کی کوئی خاص وجہ؟"

کیغاتوخان نے مذبذب لہجے میں کہا: "میں وہ بات کہہ نہیں سکتا۔ اگر کہوں گا تو وہ مشہور ہو جائے گی اور اس کی تشہیر میرے لیے مضر ثابت ہو گی۔"

زرافشاں نے کہا: "لیکن وہ بات مشہور ہی کیوں ہو گی؟ میں اس کو راز رکھوں گی۔"

کیغاتوخان نے زرافشاں کو اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہو، کہ زرافشاں وعدہ کرو کہ میں جو کچھ کہوں گا اسے راز رکھو گی؟

زرافشاں نے ایک بار پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "میرے آقا! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں، مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں، مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔"

کیغاتوخان نے جواب دیا: "زرافشاں! میں مسلمان ہو چکا ہوں ابھی تک میں نے اس کا اعلان نہیں کیا۔ میں نے ابھی تک کلمہ بھی نہیں پڑھا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میرے دل و دماغ مسلمان ہو چکے ہیں اور اسلام مجھے روک رہا ہے کہ میں اس مہمان لڑکی پر جبر کروں اس کی مرضی معلوم کیے بغیر اپنی مرضی، اپنی خواہش اس پر مسلط کر دوں۔ دراصل میں اسلامی اخلاقیات کا پابند ہو گیا ہوں۔"

زرافشاں کچھ سوچنے لگی، بے خیالی میں بولی: "تو یہ بات ہے۔"

کیغاتوخان نے جواب دیا: "ہاں یہ بات ہے اور اگر یہ بات بھائی ارغون کو معلوم ہو گئی تو وہ مجھے اپنی افواج کا سپہ سالار نہیں بنائے گا۔"

زرافشاں نے پوچھا: "میرے آقا! پھر وہی بات کہ میں آپ کے راز کی باتیں معلوم کر رہی ہوں مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں نہیں معلوم کروں آپ کی محرم راز بنوں لیکن اگر میں ان معاملات میں کسی طرح آپ کی مدد کر سکتی ہوں تو میں حاضر ہوں۔ میں آپ کی مدد کروں گی۔"

کیغاتوخان کسی قدر پرامید ہو گیا اور اس نے رفیعہ اور تہمینہ کی ساری باتیں بتا دیں، بولا: "اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تہمینہ کو ارغون کے چنگل سے کس طرح رہائی دلاؤں اور رفیعہ کو کس طرح خوش رکھوں۔"

زرافشاں نے سوچ سے نکلتے ہوئے پوچھا: "ایک بات پوچھوں آپ سچ سچ بتائیں گے؟"

کیغاتوخان نے جواب دیا: "پوچھ۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

زرافشاں نے پوچھا: "اس لڑکی کا نام رفیعہ ہے، کیا یہ لڑکی آپ کو پسند ہے؟"

کیغاتوخان نے جواب دیا: "وہ مجھے اچھی تو بہت لگتی ہے، لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ رفیعہ مجھے زبردستی چاہنے لگے۔"

زرافشاں نے کہا: "میں اس سلسلے میں رفیعہ سے معلوم کروں گی۔"

کیغاتوخان پریشان ہو گیا، بولا: "مگر اس طرح کہ اسے یہ شبہ تک نہ ہو کہ اس مقصد سے میں نے تجھے بھیجا ہے۔"

زرافشاں نے جواب دیا: "اگر یہ بات رفیعہ کو معلوم ہو جائے تو اس میں میرا کیا کمال ہو گا۔"

کیغاتوخان نے کہا: "لیکن جب تک تہمینہ بھی نہ مل جائے اس سے یہ بات نہیں پوچھنی چاہیے۔"

زرافشاں نے تسلی دی: "میرے آقا! آپ اداس نہ ہوں شاید میں آپ کا یہ کام بھی کر سکوں گی میں شاہی محل سے تہمینہ کو بھی لا سکتی

ہوں مگر اس کے لیے ذرا وقت درکار ہوگا۔"

کیخاتو خان بے چینی سے کھڑا ہو گیا اور زرافشاں کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ بولا۔ "زرافشاں! بخدا میں نے تجھ کو اتنا کارآمد اور اتنی عقلمند کبھی نہیں سمجھا تھا۔ اگر تو نے میرا یہ کام کر دیا تو میں زندگی بھر تیرا احسان مند رہوں گا۔"

زرافشاں نے کہا۔ "لیکن میرے آقا! آپ کی احسان مندی میرے کس کام آئے گی؟ میں آپ کی احسان مندی کو کیا کروں گی۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "پھر تو ہی بتا کہ اپنے ان کاموں کے عوض تو مجھ سے کیا لینا پسند کرے گی؟"

زرافشاں نے کہا۔ "میرے آقا! یہ بات بھی آپ ہی سوچیں گے کہ میرے ان کاموں کا بدل کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے ان کا کیا معاوضہ ملنا چاہیے؟"

کیخاتو خان اپنے ذہن پر دیر تک زور دیتا رہا، پھر بولا۔ "تیری ان خدمات کا ایک معاوضہ ہے میرے ذہن میں۔ معلوم نہیں تو بھی اسے پسند کرے گی یا نہیں۔"

زرافشاں نے کہا۔ "کون سا معاوضہ؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "اب تو میں نے تجھ کو اپنی کنیز بنائے رکھا ہے اس کے بعد میں تجھ کو اپنی بیوی بناؤں گا اور۔۔۔ اور اگر میں کبھی ایل خان بن گیا تو تو میری ملکہ ہو گی۔"

زرافشاں کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پوچھا۔ "اور یہ رفیعہ کیا بنے گی؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "محض بیوی، وہ بھی تب جب وہ میری بیوی بننا پسند کرے گی۔"

زرافشاں کو عبرت ہو رہی تھی۔ منگول شہزادہ اپنی جبلت اپنی فطرت کو اتنا بدل چکا تھا کہ وہ خود اتنا معمولی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنے کام کے لیے زرافشاں کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میرے آقا! میں آپ کی بیوی اور پھر ملکہ بن جاؤں اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو گی لیکن میں آپ کے کام کسی لالچ سے نہیں، خلوص اور محبت سے انجام دوں گی۔ آپ مجھے رفیعہ سے ملوا دیجئے تہمینہ سے میں خود مل لوں گی۔"

کیخاتو خان زرافشاں کے ساتھ رفیعہ کے پاس پہنچا، اور زرافشاں کا شاندار لفظوں میں تعارف کرایا۔ چونکہ زرافشاں خود بھی بے حد حسین تھی اس لیے رفیعہ اسے دیکھ کر چونک گئی، پوچھا۔ "تو کیخاتو خان کی کیا لگتی ہے؟"

زرافشاں نے کیخاتو خان کی طرف دیکھا۔ کیخاتو خان اسی وقت باہر نکل گیا۔

زرافشاں نے جواب دیا۔ "میں شہزادہ کیخاتو خان کی کنیز ہوں۔"

رفیعہ نے زہرخند کیا۔ ہنس کر بولی۔ "یعنی ناجائز بیوی۔ جو جب یہاں میرے پاس کیوں آئی ہے؟"

زرافشاں نے جواب دیا۔ "میں نے اپنے آقا شہزادے سے وعدہ کیا ہے کہ میں آپ کی بہن تہمینہ کو نکال لاؤں گی اور آپ کے حوالے کر دوں گی مگر یہ تو بتلایئے کہ اگر میں آپ کی بہن کو نکال لاؤں تو آپ اس کو لے کر جائیں گی کہاں؟ ایل خان ارغون کے ہاتھ تو بہت لمبے ہیں۔"

رفیعہ نے بے مروتی سے کہا۔ "جو کام شہزادہ خود نہیں کر سکتا، اسے تیرے سپرد کیوں کر دیا؟"

زرافشاں نے کہا۔ "آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

رفیعہ نے کہا۔ "دیکھ عورت! یہ کام تو نہیں کر سکے گی یہ کام میں کروں گی۔ اگر تو کچھ کر سکتی ہے تو یہ کر کہ مجھے کسی طرح ارغون خان کے پاس پہنچا دے بقیہ کام میں خود کر لوں گی۔"

زرافشاں کو یہ تلخ و ترش لڑکی پسند نہیں آئی، چڑ کر بولی۔ "آپ اپنے کام کو اتنا آسان سمجھتی ہیں!"

رفیعہ نے اسی بدمزگی اور تلخی سے کہا۔ "عورت! اگر میں یہاں کیخاتو خان تک آ سکتی ہوں تو اس سے آگے بھی جا سکتی ہوں۔"

زرافشاں منہ بنا کر بولی۔ "اے لڑکی! یہ تو مجھے بار بار عورت کیوں کہتی ہے؟ تیری طرح میں بھی لڑکی ہوں۔"

رفیعہ نے جواب دیا۔ "جب تو شہزادے کی کنیز بن گئی اور شہزادے نے تجھ کو بیوی کی طرح رکھ لیا تو تو لڑکی کہاں رہی عورت بن گئی۔"

زرافشاں ذرا سی دیر میں اس سے عاجز آ گئی بھناتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے پھر کسی وقت ملوں گی اس وقت آپ اپنے آپے میں نہیں ہیں شاید۔"

رفیعہ نے کہا۔ "میں ہمیشہ اسی طرح ملوں گی تجھ سے۔"

زرافشاں وہاں سے چلی آئی اور باہر نکل کر کیخاتو خان سے کہا۔ "توبہ توبہ کیسی بد دماغ ہے یہ لڑکی، وہ تو بات تک کرنے کو تیار نہیں۔"

کیخاتو خان نے ذرا سی دیر کی تفصیل پوچھی، زرافشاں نے صاف صاف بتا دیا۔ شہزادے نے کہا۔ "زرافشاں! اس وقت تو تو جا۔ پھر کسی وقت آ جانا۔ اس وقت تو میں باتیں کرتا ہوں اس سے۔"

زرافشاں کے جاتے ہی کیخاتو خان رفیعہ کے پاس پہنچ گیا اور شکایتاً کہا۔ "رفیعہ! تو نے زرافشاں کو جھڑک کر اچھا نہیں کیا۔"

رفیعہ پہلے ہی سے بھری بیٹھی تھی، بولی۔ "شہزادے! تو مجھ کو ذلیل نہیں کرے گا، یہ عورت میری کیا مدد کرے گی، میری تو مجھ میں کوئی بات آتی نہیں، یہ تو مجھے رسوا کر دے گی۔"

کیخاتو خان نے کہا: "تیری مرضی۔ بہر حال آج میں نے تیری بہن تہمینہ کو دیکھ لیا۔"

رفیعہ مضطربانہ کھڑی ہو گئی: "کہاں دیکھ لیا میری بہن تہمینہ کو؟ کیا تو سعد اللہ یہودی کے گھر گیا تھا؟"

کیخاتو خان نے اسے پوری تفصیل سنا دی اور آخر میں کہا "اب وہ ارغون خان کے پاس پہنچ چکی ہے۔"

رفیعہ نے بے چینی سے جلدی جلدی کہنا شروع کیا: "اب میرا شاہی محل تک پہنچنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "تو اگر شاہی محل میں داخل بھی کرا دی گئی تو اس سے تجھے کیا فائدہ پہنچے گا اور تو وہاں کیا کرے گی؟"

رفیعہ نے کہا: "میں کیا کروں گی اور کیا نہیں کروں گی یہ میرا اپنا کام ہے تیرا جو کام ہے بس وہ کر دے تو۔"

کیخاتو خان یہ کہہ کر چلا آیا کہ میں پہلے اس معاملے پر غور کر لوں پھر کچھ بتا دوں گا۔

زرافشاں کیخاتو خان کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی پوچھا: "وہ کیا کہہ رہی تھی احمق لڑکی؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "جب سے اسے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تہمینہ بھی ارغون کے پاس پہنچ چکی ہے وہ شاہی محل تک پہنچنے کے لیے اور زیادہ بے قرار ہو چکی ہے۔"

زرافشاں نے کہا: "میرے آقا! ایک بات کہوں؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "کہہ، بات ماننے والی ہو گی تو ضرور مانوں گا۔"

زرافشاں نے مشورہ دیا: "آپ رفیعہ کو کسی بھی طرح ارغون کے پاس پہنچا دیں، اسی میں ہم سب کی بہتری اور نجات ہے۔"

کیخاتو خان ایک دم مشتعل ہو گیا: "زرافشاں! یہ تو کیسے احمقانہ مشورے دے رہی ہے مجھے؟"

زرافشاں نے جواب دیا: "میرے آقا! یہ میرا احمقانہ نہیں عاقلانہ مشورہ ہے۔ اگر رفیعہ نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح شاہی محل میں داخل ہو کر رہے گی تو کوئی اسے اس سے روک بھی نہیں سکے گا۔"

کیخاتو خان کا دل ڈوبنے لگا، پوچھا: "تو تو یہ معلوم کرنے گئی تھی کہ وہ مجھ پر کس حد تک راغب ہے؟ اس سلسلے میں کیا معلوم ہوا کیا اندازہ لگایا تو نے؟"

زرافشاں نے پوچھا: "شہزادے! میں نے کیا اندازہ لگایا، صاف صاف بتا دوں؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "ہاں! وہ صاف صاف بتا دے، یہ سوچے بغیر کہ وہ بات مجھ پر کتنی گراں گزرے گی۔"

زرافشاں نے کہا: "تو صاف بات یہ ہے کہ رفیعہ صحیح لڑکی نہیں ہے۔ یہاں آنے کا جو مقصد اس نے بتایا ہے، شاید وہ بھی نہیں وہ یہاں کسی اور ہی مقصد سے آئی ہے اور اس مقصد کا علم رفیعہ کے علاوہ کسی کو بھی نہیں، وہ شاہی محل تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہے۔"

کیخاتو خان نے کہا: "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ میرے بھائی ارغون سے مالی مفاد حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

زرافشاں نے جواب دیا: "نہیں، وہ اتنا معمولی سودا کرنے نہیں نکلی ہے میرے خیال کے مطابق وہ منگولوں کی ملکہ بننا چاہتی ہے، اس کے ارادے بلند، مقصد عظیم الشان اور منصوبہ بے مثل ہے۔"

کیخاتو خان نے بے بسی اور کرب سے کہا: "اچھا، تو یہ بات ہے۔ انسان کتنا گہرا اور عجیب ہے کہ ہوتا کچھ ہے اور نظر کچھ آتا ہے اور سانپوں کی طرح کینچلی میں بند رہنے والا انسان بھی کتنا عجیب اور حیرت انگیز ہے۔"

اس نے پورا دن بڑے کرب و اضطراب میں گزارا۔ وہ رفیعہ سے متنفر ہو چکا تھا۔ جھلاہٹ میں بار بار یہی فیصلہ کرتا کہ کیوں نہ اسے نکال باہر کرے لیکن زرافشاں نے اسے سمجھایا اور کہا: "اگر آپ نے اسے قصر سے نکال دیا تو میرے آقا! یہ لڑکی آپ کے لیے مصیبت بن جائے گی۔ سیدھی ایل خان کے پاس پہنچے گی اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

وہ اس دن خلاف معمول رات کو رفیعہ کے پاس پہنچ گیا۔ رفیعہ کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیموں کی شاخیں کھڑکی کے اندر جھانک رہی تھیں اور رفیعہ... لیموں کے پتے توڑ کر اس کی ترش خوشبو سونگھنے میں مشغول تھی۔ کیخاتو خان اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا، مگر رفیعہ کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ آخر وہ کھنکھارا اور رفیعہ گھوم کر اسے دیکھنے لگی۔ پوچھا: "کون؟"

کیخاتو خان نے مردہ سی آواز میں جواب دیا: "میں ہوں شہزادہ کیخاتو۔"

رفیعہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی، پوچھا: "خیریت؟ یہ بے وقت آنے کا سبب؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "دن میں جب میں یہاں آیا تھا اس وقت آپ بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔ اب آپ فرمائیں کہ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "شہزادے! یہ میں آپ جناب کی گفتگو تو جانتی نہیں جس طرح میں تم اور تو سے بات کرتی ہوں اسی طرح تو بھی بات کرے گا۔"

کیخاتو خان نے پوچھا: "اچھا یہ تو بتا کہ تو شاہی محل میں کیوں جانا چاہتی ہے؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "میرے پاس تیرے لیے اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جب بھی فرصت پاؤں تیرے حق میں دعائیں کرتی رہوں۔"

کیخاتو خان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور نبض زور زور سے اچھلنے لگی تھی، بولا: "رفیعہ! میں ایک بات پوچھوں؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "پوچھ، ضرور پوچھ۔"

کیخاتو خان نے کہا: "میں تیرا بہی خواہ ہوں، میرے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "تو اچھا آدمی ہے اور واقعی میرا بہی خواہ ہے۔"

کیخاتو خان نے کہا: "جب یہ بات ہے اور تو مانتی ہے کہ میں تیرا بہی خواہ ہوں تو تو اس قصر کو چھوڑ کر بھائی ارغون کے شاہی محل میں کیوں جانا چاہتی ہے؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "میرا ایک مقصد ہے جب تک وہ حاصل نہیں کر لوں گی، چین سے نہیں بیٹھوں گی۔"

کیخاتو خان نے کہا: "شاہی محل میں تیرا کون سا مقصد پنہاں ہے میں سوچ سوچ کر حیران ہو رہا ہوں، ہاں میری یہ بات یاد رکھنا کہ ارغون جیسے ہی تجھے دیکھے گا اپنا دل تجھے دے بیٹھے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ تو اس کی ملکہ بن جائے۔"

رفیعہ مسکرائی: "ملکہ بننا کوئی مقصد نہیں ہے، بہرحال میں شاہی محل میں پہنچ کر رہوں گی۔"

کیخاتو خان نے رفیعہ کی باتوں سے جو اندازہ لگایا تھا، وہ زرافشاں کے اندازے سے مختلف نہیں تھا۔ شاید رفیعہ منگولوں کی ملکہ بننا چاہتی تھی اور اس کا حسن اسے ملکہ بنا سکتا تھا۔ کیخاتو نے کہا: "اگر تو شاہی محل پہنچنا ہی چاہتی ہے تو میں تجھے روک بھی نہیں سکتا، اور پھر تیمینہ کو شاہی محل سے نکلوا کر تیرے حوالے کرنا فضول ہے۔"

رفیعہ نے جواب دیا: "میں تیمینہ کو سعد اللہ کے چنگل سے رہائی دلوانا چاہتی تھی، اب وہ جہاں پہنچی ہے اس کی صحیح جگہ ہے۔"

کیخاتو خان کو رفیعہ کی باتوں سے گھن آ رہی تھی، بولا: "خوب دولت، شہرت اور آرام و آسائش شاید یہی تم دونوں بہنوں کے نصب العین ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا ہے اور شرم سی محسوس کر رہا ہوں کہ تجھے پہچاننے میں کتنی بڑی غلطی کی ہے میں نے۔"

رفیعہ نے کہا: "بیشک تو نے ہمیں پہچاننے میں بڑی غلطی کی ہے۔"

کیخاتو خان کچھ دیر اس کے پاس کھڑا اسے گھورتا رہا — رفیعہ نے نہایت نرم اور شیریں لہجے میں کہا: "تو کھڑا کیوں ہے بیٹھ جا۔ کیخاتو خان! ہم دونوں تیرے لیے پہیلیاں بنی ہوئی ہیں، لیکن ذرا سوچ تو سہی کہ جن کا سب کچھ لٹ چکا ہو اور انہیں شاہی محل تک رسائی حاصل ہو رہی ہو تو وہ کیوں چوکے گا؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "رفیعہ! میں نے تجھے پناہ دی اور تیری بہن کی بابت یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسے کسی بھی طرح تجھ سے ملوا دوں گا۔ میری حکومت اور میری قوم نے تجھ پر جو ظلم کیا ہے میں اس کی یوں تلافی کرنا چاہتا تھا کہ مسلمان ہو کر تجھ سے شادی کر لوں کیونکہ میں عنقریب اپنی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ بننے والا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بھائی ارغون کے بعد میں ایل خان بن جاؤں لیکن تو انتظار نہیں کر سکتی تو صبر نہیں کر سکتی اس لیے مجبوری ہے، میں تجھ پر جبر نہیں کر سکتا۔"

رفیعہ اس کی باتیں سنتی رہی اور مسکراتی رہی، بولی: "تیری پیش کش کا شکریہ۔ اگر میں زندہ رہی اور تو ایل خان بن گیا تو میں تجھ سے ضرور ملوں گی اور اس وقت بھی میرے بارے میں تیرے یہی احساسات اور خیالات رہے تو میں شکریے کے ساتھ تیری پیش کش قبول کر لوں گی۔"

کیخاتو خان کو اس کی مسکراہٹ میں طنز، اور باتوں میں تمسخر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ناراض ہو کر وہاں سے چلا آیا اور اپنے کمرے میں تنہا بند ہو کر دیر تک خود کو ملامت کرتا رہا۔

زرافشاں نے بڑی غمخواری کی اور کمرے کا دروازہ کھلوا کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور شاندار اور پُراثر دلیلیں دے دے کر اسے سمجھاتی رہی۔

کیخاتو خان نے کہا: "زرافشاں! اب میں اس کو ایک لمحہ بھی اپنے قصر میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں اسی وقت اس کو نکال باہر کرنا چاہتا ہوں۔"

زرافشاں نے اسے سمجھایا، بولی: "میرے آقا! غیر جذباتی بنیے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، سب کچھ سدھر جائے گا۔"

کیخاتو خان بڑبڑاتا رہا: "احمق وہ ہے کیا۔ وہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟ کیا وہ اس طرح واقعی ملکہ بن سکتی ہے؟ کیا میں اپنے بھائی ارغون کو پہچانتا نہیں۔ زرافشاں! تو دیکھے گی کہ ارغون اس کو ملکہ نہیں کنیز بنا کے رکھے گا۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، سارے مقاصد خاک میں مل جائیں گے۔"

❊

جس طرح طوفان کی آمد سے پہلے ہوا رک جاتی ہے اور سناٹا طاری ہو جاتا ہے اسی طرح کیخاتو خان اور رفیعہ کے مابین پُراسرار سی کشیدگی طاری تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ کچھ سوچ رہے تھے، دونوں ایک دوسرے کے حال احوال سے غافل اور بے نیاز تھے کہ اچانک قصر میں زلزلہ سا آ گیا۔ قصر کے خدام

اور غلام حرکت میں آ گئے۔ ایل خان ارغون اپنے حشم و خدم کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کیخاتو خان سے اچانک ملاقات کرنے آ گیا تھا۔ کیخاتو خان بھاگا بھاگا قصر کے باہر پہنچا تو ارغون گھوڑے سے اتر رہا تھا اور سعد اللہ یہودی پہلے ہی اتر چکا تھا۔ خان کے خدمتگار بھی گھوڑوں سے پہلے ہی اتر چکے تھے۔ ارغون خان نے کیخاتو کو اپنی طرف آتے دیکھا تو شفقت سے بولا: "کیخاتو! تو تو ہر روز ہی شاہی محل پہنچ جاتا ہے، آج میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں خود کیوں نہ اپنے چھوٹے بھائی کے قصر چلا چلوں۔"

کیخاتو خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "برادرِ محترم! آپ کی آمد کا شکریہ، دیدہ و دل فرشِ راہ، میری خوش نصیبی کہ آپ تشریف لائے۔" وہ زبان سے جو کچھ بھی کہہ رہا تھا دل و دماغ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ارغون خان کی آمد خالی از علت ہرگز نہیں، وہ آیا نہیں بلکہ لایا گیا ہے۔

ارغون خان قصر میں داخل ہوا تو سعد اللہ یہودی کو باہر ہی رک جانا پڑا۔ کیخاتو نے اس کو دارالاقامہ میں پہنچا دیا، کیخاتو نے پوچھا۔ "سعد اللہ ہم دونوں میں تو دوستی ہو چکی ہے کیا میں اس دوستی کے حوالے سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ بھائی ارغون خان اچانک کس طرح آ گئے؟"

سعد اللہ نے جواب دیا: "ویسے مجھے تو کچھ پتہ نہیں لیکن میں نے سوچا کہ کیوں نہ حساب کتاب برابر کر دیا جائے۔ میں یہودی ہوں اور ہم لوگ حساب کتاب کے معاملے میں کھرے اور صاف ہوتے ہیں۔"

ایک خدمت گار دوڑتا ہوا آیا اور کیخاتو خان سے کہا: "آپ کو خانِ محترم یاد فرما رہے ہیں۔"

کیخاتو دوڑ کر بھائی ارغون کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت ایل خان اپنے عطا کردہ دونوں غلاموں سے باتیں کر رہا تھا۔ ارغون نے اس کو دیکھتے ہی کہا: "میں نے ایک عرصے سے تیرا قصر اندر سے نہیں دیکھا۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "تو اب دیکھ لیجئے۔"

ارغون خان ایک بڑے ہال سے گزر کر میدان میں پہنچ گیا۔ میدان سبزے سے اٹا ہوا تھا، میدان کے بعد جو عمارت تھی۔ اس میں کیخاتو کے عزیز اقارب رہتے تھے وہ سب کے سب پرا باندھ کر ارغون خان کا استقبال کرنے لگے۔

ارغون خان نے پوچھا: "اور کیخاتو! میری عطا کردہ کنیز کہاں چلی گئی؟ زندہ بھی ہے یا مار دی؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "آپ آگے تشریف لے چلیں زرافشاں زندہ ہے اور بڑی وفا شعار ہے۔"

ارغون خان نے ہنس کر کہا: "زرافشاں کتنی وفا شعار ہے، یہ میں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں۔"

ارغون خان اچانک ایک ایسے ہال میں داخل ہو گیا جس میں بڑے بڑے پردے لٹک رہے تھے اور ہر طرف رونق ہی رونق تھی، لیکن محض ساز و سامان سے۔ یہاں آدمی ایک بھی نظر نہیں آیا۔ ارغون نے کیخاتو سے پوچھا: "یہ خالی کیوں ہے؟ یہاں کون رہتا ہے؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "برادرِ محترم! یہ یونہی خالی پڑا رہتا ہے، سوچتا ہوں اب اس کو آباد کر دوں۔"

اس ہال سے گزر کر وہ جس کمرے میں داخل ہوا یہاں زرافشاں بھی موجود تھی۔ اس نے ادب سے خان کو سلام کیا اور ایک طرف سلیقے سے کھڑی ہو گئی۔ ارغون خان نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور پوچھا: "تجھے یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

زرافشاں نے جواب دیا: "میں یہاں بہت خوش ہوں۔"

ارغون اور آگے بڑھ گیا اور راستے میں جو ملتا گیا، وہ اس سے سوال جواب کرتا رہا۔

کیخاتو خان نے جب یہ دیکھا کہ ارغون اب رفیعہ والے کمرے کی طرف جائے گا تو اس کو راستے ہی میں روک دیا۔ کہا: "برادرِ محترم! آپ نے میرے قصر کا سب کچھ تو ملاحظہ فرما لیا، اب آیئے میں آپ کو اپنے باغ کی سیر کراؤں؟"

ارغون خان نے پوچھا: "کیا پورا قصر میں نے دیکھ لیا یا ابھی کچھ باقی ہے؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "قصر میں اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ باغ تشریف لے چلیں آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

ارغون خان آدھے راستے ہی سے واپس چلا گیا۔ بولا: "بہتر ہے وہی دکھا جو دیکھنے کے لائق ہو۔"

کیخاتو خان ارغون خان کو لے کر باغ میں پہنچ گیا۔ ارغون ایک ایک درخت اور پودے کو بڑے انہماک سے دیکھتا رہا اور پوچھا: "اس باغ کا مالی کون ہے؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "ایک ایرانی ہے۔"

ارغون خان نے کہا: "بہرحال مالی بہت اچھا ہے۔"

اس کے بعد وہ گھومتا گھامتا اس کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا، جہاں سے رفیعہ اس باغ کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ ارغون نے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "یہ کھڑکی قصر کے کس کمرے کی ہے؟"

کیخاتو نے جواب دیا: "برادرِ محترم! یہ جس کمرے کی کھڑکی ہے اس کی نشاندہی دشوار ہے۔"

ارغون نے پوچھا: "کیا میں اس کمرے میں جا چکا ہوں؟"

کیخاتو نے جواب دیا: "نہیں آپ اس کمرے میں نہیں گئے۔"

ارغون نے حیرت سے پوچھا: "لیکن میں اس کمرے میں کیوں

نہیں گیا؟ وجہ؟ سبب؟"

کیخاتو نے جواب دیا۔ "بس چوک ہو گئی۔"

ارغون اس کمرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا کیخاتو نے اس کی توجہ بٹانا چاہی مگر ارغون کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا، اس نے کہا۔ "جتنا مزہ باغ کی سیر میں نہیں آیا۔ اس سے زیادہ مزہ اس کھڑکی سے آتا۔"

ابھی ارغون کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کھڑکی کھل گئی اور اس میں سے رفیعہ اور زرافشاں کے چہرے ایک ساتھ نظر آئے۔ ارغون نے رفیعہ کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "ارے یہ تمینہ کہاں سے آ گئی؟"

اب کیخاتو خان کی پریشانی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔

ارغون نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ "یہ تمینہ تیرے قصر میں کیوں کر آ گئی؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "برادر محترم! یہ تمینہ نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

ارغون نے پوچھا۔ "پھر یہ کون ہے؟ یہ قصر میں کہاں تھی جو مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ ہے کون؟"

کیخاتو خان کے پاس ان باتوں کے مختصر جواب نہیں تھے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ رفیعہ کا تعارف کس طرح کرائے۔

ارغون خان نے حکم دیا۔ "اگر یہ تمینہ نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اس کو میرے روبرو باغ میں پیش کیا جائے۔"

کیخاتو خان نے سرکشی اختیار کی۔ "بھائی ارغون! یہ تمینہ نہیں ہے میں آپ کا بھائی ہوں کیا آپ کے لیے یہ مناسب ہے کہ آپ میرے قصر کی عورتوں کو بھی اپنی مرضی اور خواہش سے جہاں چاہیں لے جائیں اور ان کے ساتھ جو چاہیں کریں؟"

ارغون خان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "کیخاتو خان! میں ایل خان ہوں اور تو میری رعایا۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں میری حدودِ مملکت میں جو کچھ بھی ہے میرا ہے میری ملکیت ہے۔"

دوبارہ حکم دیا۔ "اس لڑکی کو حاضر کیا جائے۔"

کیخاتو خان ایل خان کے سامنے بے بس اور لاجواب ہو چکا تھا۔

ارغون خان نے کہا۔ "تو بلواتا ہے اس لڑکی کو یا میں اپنے آدمی بھیج کر زبردستی بلوا لوں۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "آپ قصر میں دوبارہ تشریف لے چلیں وہ لڑکی وہیں آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔"

ارغون خان دوبارہ قصر میں داخل ہوا تو کیخاتو خان نے رفیعہ کو اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ارغون خان اس مجسمہ حسن و رعنائی کو دیکھتا رہ گیا۔ اسے حیرت تھی کہ تمینہ سے اتنی مشابہت بھی کسی لڑکی میں ہو سکتی ہے؟

کیخاتو خان نے کہا۔ "آپ تمینہ اور رفیعہ کی حیرت انگیز مشابہت پر حیران نہ ہوں یہ دونوں حقیقی بہنیں ہیں۔"

ارغون خان نے پوچھا۔ "لیکن یہ تیرے پاس کہاں سے آ گئی؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "یہ میرے پاس خود بخود آ گئی تھی اور میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کرنے والا تھا۔"

ارغون خان نے کہا۔ "اگر تو میرے خاندان کا آخری بیٹا نہ ہوتا تو میں معلوم نہیں تیرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔"

کیخاتو خان کو رفیعہ اور زرافشاں پر غصہ آ رہا تھا جنھوں نے کھڑکی کھول کر اپنی رونمائی کر دی تھی اور اس طرح ارغون خان پر رفیعہ کی موجودگی کا راز افشا ہو گیا تھا۔

ارغون رفیعہ کو لے کر روانہ ہو گیا۔ کیخاتو خان کو ایسا لگا، گویا ارغون رفیعہ ہی کو لینے آیا تھا۔ ارغون کے قافلے کا آخری مسافر سعد اللہ تھا وہ سب سے پیچھے تھا اس نے کیخاتو خان کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمینہ کا حساب برابر ہوا۔ دراصل ہم یہودی لوگ حساب کتاب کے کھرے ہوتے ہیں۔"

کیخاتو خان جلا بھنا اپنے قصر میں واپس گیا اور زرافشاں پر برس پڑا۔ "یہ تجھ سے کس نے کہا تھا کہ تو رفیعہ کو لے کر کھڑکی کھول کر کھڑی ہو جائے۔"

زرافشاں نے جواب دیا۔ "کسی نے بھی نہیں۔ رفیعہ نے ضد کی اور کھڑکی کھول کر کھڑی ہو گئی۔"

کیخاتو خان کی جھنجلاہٹ کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا پورا وجود کئی آگوں میں جل رہا تھا۔ ایک آگ وہ تھی جو اپنی بے بسی اور مجبوری سے پیدا ہو گئی تھی اور دوسری آگ تھی رفیعہ کی بے مروتی اور احسان ناشناسی کی، اور تیسری آگ تھی رفیعہ کی جدائی کی۔"

جب وہ زیادہ اونچی آواز میں بولنے لگا تو زرافشاں نے اسے سمجھایا۔ "میرے آقا! آپ ہوش سے کام لیں اور آواز ذرا نیچی رکھیں۔"

کیخاتو خان کو اور غصہ آ گیا۔ "تو مجھے مشورہ دیتی ہے کہ میں اونچی آواز میں بات نہ کروں تو مجھ سے کہتی ہے کہ میں ہوش سے کام لوں!"

زرافشاں نے جواب دیا۔ "ہاں میں آپ سے ہوش میں رہنے اور اونچی آواز میں بات نہ کرنے کی بات کرتی ہوں اور اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ آپ مغضوب الغضب ہیں اس لیے میری باتیں آپ کی

مجھ کیا نہیں آتی ہے؟"

کیغاتو خان اور زور سے چیخا: "زرافشاں! میں اپنے انجام کی پروا کیے بغیر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

زرافشاں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا۔ "آپ بے شک مجھے قتل کر دیں میرے آقا لیکن ادھر آئیے میرے ساتھ اور میں جو کچھ کہوں اس کو غور سے سن کر فیصلہ کیجیے۔"

زرافشاں کیغاتو خان کو اسی کمرے میں لے گئی جہاں رفیعہ رہتی تھی۔ اس نے اپنے لباس کے اندر سے خنجر نکالا اور اسے کیغاتو کے ہاتھ میں دے دیا، بولی: "یہ خنجر حاضر ہے آپ میرا پیٹ چاک کر دیں، مجھے قتل کر دیں اور آپ یہاں بیٹھ بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔"

زرافشاں کا انداز بتا رہا تھا کہ ان واقعات کے پیچھے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، وہ ذرا نرم پڑ گیا مگر درشتی سے پوچھا: "کیا بات ہے، تو کیا کہنا چاہتی ہے؟"

اس نے خنجر زرافشاں کے ہاتھ سے لے لیا۔

زرافشاں نے پوچھا: "آپ نے رفیعہ کو روک کیوں نہیں لیا؟ اس کو جانے کیوں دیا؟"

کیغاتو خان نے جواب دیا: "میں مجبور تھا، میں ایل خان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔"

زرافشاں نے کہا: "میرے آقا! آپ کو ارغون خان کے بعد حکومت کرنی ہے، آپ کو اصولِ جہاں بانی اور رموزِ مملکت کا علم ہونا چاہیے، آپ کو علم ہونا چاہیے کہ حیلۂ ملوکیت کسے کہتے ہیں اور مکرِ شاہی کیا ہوتا ہے۔"

کیغاتو خان نے پوچھا: "تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

زرافشاں نے جواب دیا: "میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ ہم ایل خان کے غلام ہیں وہ ہمیں جس طرح چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت میں جو کچھ بتاؤں گی، اس کی سزا بھی بھگتوں گی مگر مجھے آپ سے جو انس ہو گیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں اپنی اور دونوں غلاموں فرامرز اور اینال کی اصل حقیقت بیان کر دوں۔"

کیغاتو خان کی توجہ زرافشاں کی باتوں پر مرکوز ہو گئی، پوچھا: "تم تینوں کی اصلیت! یعنی تم تینوں کی کوئی اصلیت بھی ہے؟"

زرافشاں نے جواب دیا: "ہم تینوں ارغون خان کے جاسوس ہیں، جب ہم تینوں کو آپ کے حوالے کیا گیا تھا تو ہمیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ آپ کی ایک ایک بات ارغون تک پہنچائیں، چنانچہ ہم تینوں نے ایل خان کی یہ خدمت پوری دیانتداری سے انجام دی ہے۔"

کیغاتو خان اپنی سادہ لوحی پر شرمندہ تھا حیرت سے پوچھا۔ "تو تم تینوں بھائی ارغون کے مخبر ہو؟"

زرافشاں نے جواب دیا: "ہاں اور براہِ کرم اس کا ذکر کسی اور سے نہ کیجیے گا۔ فرامرز اور اینال کو بھی یہ بات معلوم نہ ہو ورنہ ہم تینوں قتل کر دیے جائیں گے۔"

کیغاتو خان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا، بولا: "تو میں اس درجہ سادہ لوح انسان ہوں لیکن زرافشاں میں سادہ لوح نہیں ارغون کا بھائی ہوں اور میں ارغون پر بھروسا کرتا ہوں۔"

زرافشاں نے مشورہ دیا: "آپ کسی پر بھی بھروسا نہ کریں، ہمیشہ ہوشیار رہیں۔"

کیغاتو خان نے کہا: "میں نے تیرا مشورہ مان لیا اور میں دیکھوں گا کہ اب مجھے کون بے وقوف بناتا ہے۔"

اب کیغاتو خان نے یہ روش اختیار کی کہ وہ اینال اور فرامرز کے سامنے ہمیشہ ایسی حرکتیں اور باتیں کرتا جس سے ارغون کے ساتھ اس کی وفاداری اور محبت استوار ہوتی رہتی۔

رفیعہ کے جانے کے بعد وہ کئی دن تک ارغون کے پاس نہیں گیا۔ وہ گھنٹوں بیٹھا کچھ سوچتا رہتا اور جب کوئی اس سکوت اور غمزدگی کا سبب پوچھتا تو یہی بتاتا کہ وہ اپنے بھائی سے بے حد شرمندہ ہے آخر رفیعہ کو اپنے پاس اتنے دنوں تک کیوں روکے رکھا۔ جب یہ خبریں ارغون خان کو پہنچیں تو اسے اپنے بھائی پر رحم آگیا اور اس نے سعد اللہ یہودی کو بطورِ خاص بھیج کر بلوا لیا۔ سعد اللہ یہودی نے اسے تسلی دی، کہا: "شہزادے! آپ بہت خوش قسمت ہیں کیونکہ رفیعہ نے آپ کی بابت یہ گواہی دے دی ہے کہ آپ نے رفیعہ کو اپنے لیے نہیں اپنے بڑے بھائی ارغون کے لیے رکھا تھا اور آپ نے کسی مناسب موقع کے انتظار میں اتنا وقت گزار دیا۔"

کیغاتو خان نے جواب دیا: "میں تو اپنے بھائی پر جان تک قربان کر سکتا ہوں ایک لڑکی کیا چیز ہے۔"

جب وہ ارغون خان کے سامنے پہنچا تو اس طرح گم سم اور پریشاں حال پہنچا کہ ارغون کو اس پر رحم آگیا۔

ارغون خان نے پوچھا: "تو اتنے دنوں سے کہاں غائب تھا؟"

کیغاتو خان نے جواب دیا: "میری شرمندگی اور ندامت مجھے منہ چھپانے پر مجبور کرتی رہی۔ میں آپ لوگوں سے بھی شرمندہ ہوں۔"

ارغون نے ہنس کر کہا: "تو میرا بھائی ہے کیغاتو خان۔ میں تیری بڑی عزت کرتا ہوں۔"

کیغاتو خان نے مصلحت اندیشی سے کام لیا اور کہا: "جب تک نیلا جاودانی آسمان مجھ پر مہربان ہے میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

ارغون نے تائید کی، بولا: "بیشک۔"

اس کے بعد ارغون کئی دن متواتر کیغاتو خان کو بطورِ خاص

بلواتا رہا۔ اب قصر سے اطلاعات بھی بہت اچھی مل رہی تھیں اور ارغون بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ کیتغا تو خان اس سے بے حد محبت کرتا ہے اور اس کی وفاداری مسلّم ہے۔ اب وہ کئی دن سے یہی سوچ رہا تھا کہ کیتغا تو خان کو منگول عساکر کا سپہ سالارِ اعلیٰ بنا دیا جائے۔ خراسان، قفقاز اور مصر سے جو خبریں آ رہی تھیں اُن کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ فوجوں کو ہر وقت چاق و چوبند اور تیار رکھا جائے۔ جوجی خان کا خانوادہ اصرار کر رہا تھا کہ مراغہ اور تبریز اس کے ہیں اس لیے انھیں خالی کر دیا جائے۔ دوسری طرف چغتائیوں کا دعویٰ تھا کہ خراسان اور ہرات اُن کے ہیں اس لیے انھیں چغتائیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ تیسری طرف مصر کے مملوک شام اور فلسطین سے آگے بڑھنے کی فکر میں تھے۔ خود ارغون اِن محاذ آرائیوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اب وہ کیتغا تو خان کو اس لائق سمجھتا تھا کہ اُس پر اعتماد کیا جائے لیکن سعد اللہ یہودی اب بھی یہی کہہ رہا تھا: "بندہ پرور ابھی نہیں! کچھ دن اور انتظار کیجیے۔ اگر آپ نے عجلت میں یہ قدم اٹھا دیا تو یقین رکھیے کہ آپ نے جو کچھ اپنے بڑے بھائی نکودار کے ساتھ کیا ہے کیتغا تو خان بالکل وہی سلوک آپ کے ساتھ کرے گا۔"

ارغون پھر رُک گیا اور کیتغا تو خان سپہ سالارِ اعلیٰ بنتے بنتے رہ گیا۔

❁

ان باتوں کو دو سال گزر گئے۔ اس دوران رضیہ اور تہمینہ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ وہ ارغون کے محل میں جانے کہاں روپوش ہو گئی تھیں۔ سعد اللہ کے اثرات اور زیادہ گہرے اور قوی ہو چکے تھے۔ ارغون کچھ کچھ بیمار رہنے لگا تھا۔ اس کا چچازاد بھائی بایدو خان سپہ سالاری کی امید میں ارغون کی چاپلوسیوں میں لگا ہوا تھا۔ خود ارغون اب بھی اپنے بھائی کیتغا تو خان کے حق میں تھا۔

اس دوران ارغون نے اپنے کئی دوستوں اور جاننے والوں کو مرتے دیکھا تھا۔ اُن کی بیماریاں بھی زیادہ پیچیدہ نہیں تھیں۔ کوئی بخار میں چل بسا، کسی نے گٹھیا میں جان دے دی اور کوئی کسی ایسے مرض میں مر گیا کہ وہ جان لیوا بھی نہیں تھا۔ چونکہ ارغون خود بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا اس لیے دوستوں اور جاننے والوں کی موت نے اسے کچھ زیادہ ہی چوکنا کر دیا تھا۔ وہ کیتغا تو خان سے بار بار یہی پوچھتا رہتا تھا کہ وہ ہندو گیانی ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ جس کے پاس طویل العمری اور سدا شباب کے نسخے پائے جاتے ہیں۔

کیتغا تو خان کو بھی اُس گیانی کا بڑا انتظار تھا۔ ہندوستانی تاجر اُس سے کچھ رقم بھی لے گیا تھا۔ کیتغا تو خان نے سوچا، شاید وہ ہندوستانی تاجر اس سے دھوکا کر گیا ہے۔ ارغون نے کہا: "کیتغا تو خان آخر تو کب تک اس ہندوستانی تاجر کا انتظار کرے گا۔ اپنے بھائی، اپنے آقا، اپنے بادشاہ کے لیے تجھ کو خود ہی ہندوستان کا سفر کرنا چاہیے۔"

کیتغا تو خان نے جواب دیا: "برادرِ محترم! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ خود ہی ہندوستان جانا پڑے گا اور وہاں سے ہندو گیانی لانا پڑے گا۔"

ارغون نے ہنس کر کہا: "کیتغا تو خان! میرا کیا ہے جب تک ہندی گیانی نہیں آتا تو ہی خسارے میں رہے گا کیونکہ میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک ہندو گیانی نہیں آئے گا، میں بھی تجھے منگول عساکر کا سپہ سالار نہیں بننے دوں گا۔"

کیتغا تو خان نے جواب دیا: "میں سپہ سالار نہیں بننا چاہتا میں ملازمت بھی نہیں کروں گا۔"

ارغون نے پوچھا: "وہ کیوں؟ پہلے تو تو اس کا بھوکا تھا، پر اب کیا ہو گیا تجھ کو؟"

کیتغا تو خان نے جواب دیا: "میری دن رات یہی دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت یاب رکھے اور لمبی عمر دے اور آپ کو زندگی بھر ایل خان اور اپنی افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ بنائے رکھے۔"

ارغون اٹھ کر بیٹھ گیا مگر کمزوری اُس کو دوبارہ لیٹنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کیتغا تو خان کا خیال تھا کہ اگر ارغون اسی طرح کمزور ہوتا رہا تو یہ دو چار سال کے اندر ہی رخصت ہو جائے گا۔

ایک دن علی الصبح وہ ہندوستانی تاجر بھی اچانک آ گیا جس کا ارغون اور کیتغا تو خان بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہندوستانی تاجر اپنے ساتھ ایک ہندو گیانی بھی لایا تھا۔

کیتغا تو ان دونوں کو عزت و احترام سے اپنے قصر میں لے گیا۔ اُن دونوں کے سامنے خشک میوے رکھ دیے گئے۔ ہندو گیانی نے اپنے ساتھی سے پوچھا: "یہ شخص (کیتغا تو خان) مسلمان ہے یا کچھ اور؟"

ہندوستانی تاجر نے جواب دیا: "یہ مسلمان نہیں، آسمان پرست ہے۔"

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد ہندی گیانی خشک میوے کھانے لگا۔ کیتغا تو خان نے اُن دونوں کو شراب بھی فراہم کر دی۔

کیتغا تو خان نے ہندو گیانی جیسا آدمی اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے ایک دھوتی باندھ رکھی تھی اور اس کا نصف حصّہ اپنے کاندھے پر ڈال لیا تھا۔ داڑھی لمبی، مونچھ اور داڑھی کے بال بھی گھنے اور بڑے بڑے تھے۔ اگر داڑھی اور مونچھ نہ ہوتی تو سر کے بالوں کی وجہ سے وہ عورت نظر آتا۔

ہندوستانی تاجر نے اس کا تعارف کرایا: "خان بابا! یہ ہیں گرو شیو دیال جی۔ اِن کے گیان دھیان کا کوئی حساب نہیں۔ اور ان کے پاس ایسے نادر نسخے ہیں کہ جن کے استعمال سے انسان کئی کئی سو سال زندہ رہ سکتا ہے اور گرو جی بوڑھوں کو جوان تو اس طرح کر دیتے ہیں جیسے پہلی کا چاند آہستہ آہستہ چودھویں کا بن جائے۔ ان کا علم پورے

ہندوستان میں شہرۂ ہے اور ان کے دیدار کے لیے ہر روز اتنے انسان جمع ہو جایا کرتے ہیں کہ اس سے ایک بازار کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔"

ہندوستانی تاجر گرو شیو دیال جی کی تعریفیں کیے جا رہا تھا اور کیخاتو خان اس عجیب و غریب شخص میں کھو گیا تھا۔ گرو جی کو اپنی زبان کے علاوہ کچھ آتا ہی نہ تھا لیکن گرو جی آدمی بے حد ذہین تھے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ کیخاتو خان کی زبان بہت جلد سیکھ لیں گے۔

کیخاتو خان اس گیانی کو جلد از جلد اپنے بھائی ارغون کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے ہندوستانی تاجر کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ اور تینوں ارغون خان کے پاس چل دیے۔ راستے میں کیخاتو خان نے ہندوستانی تاجر کو سمجھایا: "دیکھو ایل خان تم سے پوچھے گا کہ تمھاری اس خدمت کے صلے میں وہ کتنی دولت عطا کرے، تم اس کے جواب میں کہنا کہ یہاں جو کچھ بھی ہے خان ہی کا ہے اس لیے میں خانِ محترم کی خوشنودی کی خاطر اپنے گرو کو لے آیا ہوں۔ اس جواب سے خان بہت خوش ہوگا کیونکہ ہمارے آبا و اجداد بھی اسی طرح چیزیں خریدا کرتے تھے۔ ارغون تمھیں تمھاری خدمت کا صلہ نہیں۔ انعام و اکرام دے گا اور وہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا جو تمھارے ذہن میں ہوگا۔"

کیخاتو خان نے جب ارغون کو ہندوستانی گیانی سے مطلع کیا تو وہ بہت خوش ہوا اور وہ جہاں اور جس حال میں تھا، وہیں ان تینوں کو طلب کر لیا۔ ارغون ہندو گرو کو اپنی طرف آتے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ کیخاتو خان نے ہندوستانی تاجر سے سرگوشی میں کہا: "ارغون گرو جی کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ سمجھ لو یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس سے اس گرو کو نوازا گیا ہے۔"

ارغون نے شیو دیال جی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور کہا: "میں مہینوں سے نہیں سالوں سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

شیو دیال جی نے ہندوستانی تاجر کی طرف دیکھا اور تاجر نے اس کا ترجمہ کر دیا۔ جواب میں گرو جی نے کہا: "میرا ملک یہاں سے بہت دور ہے، آتے آتے اتنا زمانہ گزر گیا۔"

ارغون نے ہندی تاجر سے پوچھا: "یہ ہماری زبان کیوں نہیں جانتا؟"

ہندی تاجر نے جواب دیا: "جناب یہ شخص دو ماہ میں آپ کی زبان سیکھ لے گا، آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔"

ارغون نے حکم دیا: "جب تک یہ ہماری زبان نہ سیکھ جائے تجھے یہیں رہنا ہوگا۔"

ہندی تاجر نے جواب دیا: "خانِ معظم کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں تو اس حکم پر پوری زندگی یہیں گزارنے کو تیار ہوں۔"

ارغون نے پوچھا: "ہندی تاجر! تو نے ہماری جو خدمت کی ہے میں تجھ کو اس کا صلہ کیا دوں؟"

ہندی تاجر نے جواب دیا: "یہ میری مجال کہ میں خان بابا سے اپنی محنت یا خدمت کا صلہ مانگوں! میں تو خان بابا کا غلام ہوں۔ مجھے آپ نے شرفِ باریابی بخشا ہے، میرے لیے یہی کیا کم ہے۔"

ارغون نے تالی بجائی، کنیزوں کو حکم دیا: "میں نے حکم دیا ہے کہ خزانچی کو حاضر کیا جائے۔"

تھوڑی دیر بعد خزانچی کو ارغون کے سامنے کھڑا کر دیا گیا، ارغون نے کہا: "جب تین ماہ بعد یہ مرانحصے جانے لگے تو اس کو میرے مشورے سے مالا مال کر دینا، یہ میرا حکم ہے۔" اس کے بعد ہندوستانی تاجر سے کہا: "پہلے تو اس عالم کو ہماری زبان سکھا دے اس کے بعد جہاں چاہنا چلے جانا۔ تو میرا مطلب تو سمجھ گیا ہوگا۔"

ہندوستانی تاجر نے کہا: "خان بابا! میں آپ کا غلام آپ کا تابعدار ہوں آپ جو حکم دیں گے اس کی تعمیل کروں گا۔"

آخر میں ارغون نے اپنے بھائی کیخاتو خان کو مخاطب کیا، اور بھائی کیخاتو خان! میں تیرا شکر گزار ہوں کہ یہ کام تیرے ہی طفیل تکمیل کو پہنچا۔"

ارغون ہندوستانی تاجر کو ترجمان بنا کے گرو شیو دیال جی سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ گرو جی سے معلوم کرتا رہا کہ کیا اس کے پاس ایسے نسخے ہیں جن سے انسانی عمر میں کئی کئی سو سال کا اضافہ ممکن ہو جائے اور یہ کہ کیا بڑھاپے کو جوانی میں بدلا جا سکتا ہے؟

گرو جی نے جواب دیا: "بچہ! سب کچھ ممکن ہے۔ میں تجھ کو کئی سو سال تک زندہ رکھ سکتا ہوں اور تیرے بڑھاپے اور جوانی کے بیچ میں ایک ایسی لکیر کھینچ سکتا ہوں کہ جوانی سدا کے لیے برقرار رہے اور بڑھاپا شرمندہ ہو کر اپنا منہ چھپا کے غائب ہو جائے۔"

ارغون بے حد خوش تھا، اس نے پوچھا: "تو نے اپنے لیے بھی کچھ کیا کبھی؟"

گرو جی نے جواب دیا: "میں نے اپنے لیے بھی کیا تھا، اور میں اسی کی وجہ سے کئی سو سال گزار چکا ہوں۔"

ارغون نے اس کے پاؤں میں لکڑی کی چپل دیکھی جس کو گرو شیو دیال جی کھڑاؤں کہتے تھے۔ لکڑی کی چپل کے تلے میں انگوٹھے کے پاس لکڑی کی ایک کھونٹی جڑی ہوئی تھی جن میں انگلی اور انگوٹھے کو پھنسا کر وہ چلتا تھا۔ ارغون نے ایسی مخلوق پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی وہ اسے دیکھ کر بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے گرو جی کو کئی بار چلایا پھرایا اور اسے چلتے پھرتے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ گرو جی نے بائیں کاندھے پر جنیو ڈال رکھا تھا جو سیدھی طرف کولھے تک لٹکا ہوا تھا۔ اس میں لوہے کی چھوٹی سی کنجی پروئی ہوئی تھی۔

ارغون نے ہندی تاجر اور گرو شیو دیال جی کو محل کے ایک حصے میں رکھ لیا۔ گرو جی ہندی تاجر سے ارغون کی زبان سیکھنے لگے۔

اب ارغون اپنے چھوٹے بھائی کیخاتو خان سے بے حد خوش تھا۔ اس نے سعداللہ یہودی سے پوچھا "سعداللہ! بھائی کیخاتو خان نے ہمیشہ میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔ اس نے ہندوستان سے میری خاطر ایک زبردست گیانی بلوا لیا ہے چنانچہ اب میں اس کے احسان کی ادنیٰ سی قیمت ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

سعداللہ یہودی نے پوچھا "محترم خان آپ اپنے بھائی کو اُن کی خدمات کے صلے میں کیا دینا چاہتے ہیں؟"

ارغون نے جواب دیا "اپنی افواج کی سپہ سالاری۔"

سعداللہ نے اس سے اختلاف کیا، بولا "خان محترم! میں آپ کو ایسا مشورہ نہیں دے سکتا جو آپ کے لیے مضر ہو، نقصان دہ ہو۔"

ارغون نے کہا "سعداللہ! میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں ---- میں بڑھاپے سے پہلے ہی بوڑھا ہو چکا ہوں، میرے ہاتھ کپکپاتے ہیں۔ اور جب میں چلتا ہوں تو میں کسی قدر کمان کی طرح جھک جاتا ہوں۔"

سعداللہ یہودی نے پوچھا "پھر، پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

ارغون نے جواب دیا "اس سے فرق یہ پڑتا ہے کہ میں اپنے دشمنوں کی افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک ایسا شخص درکار ہے جو میری افواج کی سپہ سالاری کر سکے۔"

سعداللہ نے کہا "اس کام کے لیے آپ کے چچا کا بیٹا بایدو خان زیادہ مستحق ہے۔"

ارغون برہم ہو گیا اور سعداللہ یہودی کو برا بھلا کہنے لگا۔ "تو غداری کر رہا ہے کیا تو یہ چاہتا ہے کہ حکومت میرے چچا کے خاندان میں چلی جائے۔ حالانکہ میں اپنے چچا کی اولاد سے نفرت کرتا ہوں۔"

ارغون نے اسی وقت کیخاتو خان کو بلوا کر سعداللہ یہودی کے سامنے اپنی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کر دیا۔ سعداللہ یہودی ان ساری حرکات کو صبر و سکون سے دیکھتا رہا اور سپہ سالار اعلیٰ کیخاتو خان کو جس نے سب سے پہلے مبارکباد پیش کی وہ بھی سعداللہ یہودی تھا۔

ارغون سعداللہ کو دیکھ کر مسکرایا، کہا "سعداللہ! کیا بات ہے ابھی تو تو کیخاتو خان کی مخالفت کر رہا تھا اور اب تو ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے کیخاتو خان کو مبارکباد پیش کی ہے۔"

سعداللہ نے جواب دیا "میں نے آپ کو ایک مشورہ دیا تھا اس کو آپ نے مسترد کر دیا اور اپنا فیصلہ مسلط کر دیا۔ میں آپ کا خدمتگار ہوں اور خدمتگار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کے ہر حکم کی کی تعمیل کرے۔"

ارغون خان کے دل میں سعداللہ کے خلاف جو ذرا سی گرد جم گئی تھی، وہ پھر صاف ہو گئی۔

ارغون خان اپنے چھوٹے بھائی کیخاتو خان کو محل کے اندر لے گیا اور کہا "کیخاتو خان! اب تو میری افواج کا سپہ سالار اعلیٰ ہے گویا تو میرے بہت قریب آ چکا ہے۔ اب محل کے دروازے تجھ پر کھل چکے ہیں تو یہاں ہر وقت آ جا سکتا ہے مگر خبردار میرے اس کمرے میں ہرگز نہ جانا جہاں میں آرام کرتا ہوں۔"

کیخاتو خان نے اپنے بڑے بھائی کا شکریہ ادا کیا۔

ارغون نے کہا "ہندوستانی وید آ چکا ہے اور وہ دن دور نہیں جب میں کئی سو سال کے لیے دوبارہ جوان ہو چکا ہوں گا۔"

کیخاتو خان نے اپنے بھائی کو دعا دی "میری دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت یاب کرے۔"

محل میں اس کی نظریں رفیعہ اور تمینہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن ان کا کہیں پتہ نہ چلتا تھا۔

وہ کافی دیر بعد ہوش میں آیا تو دیکھا اور سنا کہ ارغون خان اس کے پاس کھڑا نصیحتیں کر رہا تھا۔ ارغون اسے سمجھا رہا تھا "کیخاتو! تو میرا چھوٹا بھائی ہے میرے مخلص لوگ مجھے خوفزدہ کرتے ہیں کہ تو سپہ سالار بنتے ہی مجھے معزول کر دے گا اور میں نے ان حاسدوں اور مفسدوں سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کیخاتو خان اگر چاہے تو مجھے ہلاک کر کے حکومت پر قبضہ کر لے، یہاں تک کہ میں ان مفسدوں اور حاسدوں سے تنگ آ گیا۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ بھائی کیخاتو خان اگر چاہے تو مجھے معزول کر دے۔"

کیخاتو خان اپنے بھائی سے لپٹ گیا، بولا "بھائی! میں یہ کیونکر کر سکتا ہوں۔ میں آپ سے اتحاد ہی رکھوں گا کیونکہ میں نے اپنے والد مرحوم سے اس کا وعدہ کر لیا تھا۔"

ارغون اس کو لیے ہوئے دیوان جیسے حصے میں چلا گیا اور وہاں اپنے سامنے بٹھا کر بات کرنے لگا، بولا "بھائی کیخاتو خان! تو اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں کتنا بوڑھا ہو چکا ہوں۔ بوڑھا تو میں پہلے بھی ہو چلا تھا تقریباً دو سال پہلے۔ لیکن ادھر کے دو سالوں نے مجھے بے حد کمزور کر دیا۔ اب وید آ چکا ہے اور نیلے جلودانی آسمان نے چاہا تو میں پھر سے جوان بھی ہو جاؤں گا اور کئی سو سال زندہ بھی رہوں گا۔"

کیخاتو خان نے ایک بار پھر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں وہ غیر ارادی طور پر دونوں بہنوں کو تلاش کر رہا تھا۔ ارغون نے پوچھا "کیخاتو خان! یہ تیری نظریں دیر سے کس کو تلاش کر رہی ہیں؟"

کیخاتو خان گھبرا گیا، ارغون خان مسکرانے لگا، بولا "میں جانتا ہوں تیری نظریں رفیعہ کو تلاش کر رہی ہوں گی، کیا تو اس سے ملنا چاہتا ہے؟"

کیخاتو خان اور زیادہ گھبرا گیا، اس کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ارغون اسے دھوکا دے کر اندر تو نہیں لے آیا اور یہاں قتل کرا دے لیکن ارغون

نے خلافِ توقع رفیعہ کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ کینخاتو خان نے دو سال بعد رفیعہ کو دیکھا تھا۔ اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ رفیعہ میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی، اس کے حسن میں دھبہ سا لگ گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے، سیاہ حلقے۔ کینخاتو خان رفیعہ کو زیادہ دیر نہیں دیکھ سکا۔

ارغون نے رفیعہ کی شکایت کی: "کینخاتو خان! جب سے میں رفیعہ کو تیرے پاس سے لایا ہوں اس کی صحت تیزی سے گرتی چلی گئی۔ معلوم نہیں کیوں؟"

کینخاتو خان نے رفیعہ سے پوچھا: "کیوں رفیعہ! کیا صاحب ارغون سچ کہہ رہے ہیں؟"

رفیعہ زیادہ بے باک ہو چکی تھی، شوخی سے جواب دیا: "جب چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے عورتوں میں گزریں گے تو بڑھاپا تو آئے گا ہی۔"

ارغون ہنس دیا: "کینخاتو خان! اس کو سمجھا۔ انسان کو جوانی کس لیے دی گئی ہے اور پھر میں ایل خان ہوں، دنیا کے تمام انسانوں سے عظیم تر، برتر۔ مجھے لافانی نیلے آسمان نے وہ قوت دی ہے جو دنیا بھر کی عورتوں کے لیے کافی ہے۔ اگر مجھ میں قوت کی کمی آ گئی ہے تو مجھے اتنا اختیار بھی دیا گیا ہے کہ میں ہندوستان سے وید کو بلوا کر اپنی عمر کو کئی سو سال آگے بڑھا دوں۔ میں جوانی کو بڑھاپے میں بدل سکتا ہوں۔"

کینخاتو خان نے رفیعہ کو سمجھانے کی کوشش کی: "رفیعہ! تجھے خوش ہونا چاہیے کہ تو ایل خان ارغون کی محبوبہ ہے۔ اگر یہی باتیں پچاس ساٹھ سال پہلے کسی منگول حکمراں یا شہزادے سے کسی عورت نے کہی ہوتیں تو وہ اسی وقت ناپید کر دی جاتی لیکن اب ہم لوگ تمدن کی دنیا میں رہ بس گئے ہیں۔ ہمارے مزاج انہی جیسے ہوتے جا رہے ہیں۔ بھائی ارغون نے تیری تلخ ترش باتیں بھی برداشت کر لیں، بس اسی کو غنیمت جان۔"

ارغون نے کینخاتو خان کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا: "کینخاتو! کیا تو رفیعہ سے محبت کرتا تھا؟"

کینخاتو خان یہی سمجھ رہا تھا کہ ارغون کی نیت ٹھیک نہیں ہے اور وہ کینخاتو خان کو قتل کرنے کے بہانے تلاش کر رہا ہے وہ ہاں یا نہیں کہتے گھبرا رہا تھا۔

ارغون نے کینخاتو خان کو تسلی دی: "کینخاتو خان! تو ڈر نہیں۔ خوف نہ کھا۔ میں جانتا ہوں کہ تو رفیعہ سے محبت کرتا ہے مگر میرے خوف یا احترام کی وجہ سے تو اس کا اقرار نہیں کرے گا۔"

کینخاتو خان نے جواب دیا: "بھائی ارغون! میں جو کچھ چاہتا ہوں اسے خوف سے زیادہ احترام روک رہا ہے۔"

ارغون نے رفیعہ سے پوچھا: "کیا تو بھی کینخاتو خان کو پسند کرتی ہے؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "خان محترم! آپ نے یہ بات دو سال پہلے کیوں نہیں پوچھی؟"

ارغون برداشتہ خاطر ہو گیا: "میں تجھ سے جو پوچھ رہا ہوں، بس اس کا جواب درکار ہے۔" رفیعہ خاموش ہو گئی۔

کینخاتو خان نے حوصلے سے کہا: "برادرِ محترم! آج میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں رفیعہ سے آج بھی محبت کرتا ہوں حالانکہ ہم دونوں کی مفارقت میں دو سال حائل ہو چکے ہیں۔"

ارغون مسکرا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر رفیعہ سے سوال کیا: "اور تیرا کیا حال ہے رفیعہ؟"

رفیعہ نے جواب دیا: "میں نے تو اس سے دو سال پہلے محبت کی تھی اور نہ ہی آج کوئی گنجائش ہے اس کے لیے میرے دل میں۔"

ارغون نے تحکمانہ شان سے کہا: "بہرحال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں میرے لیے یہی کافی ہے کہ تجھے میرا بھائی کینخاتو خان پسند کرتا ہے اب میں تجھے کینخاتو خان کے حوالے کرتا ہوں۔"

لیکن رفیعہ نے جانے سے انکار کر دیا۔ انتہائی حقارت سے کہا: "لیکن میں یہیں اسی محل میں رہوں گی خان کے پاس۔ میں کینخاتو خان کے پاس نہیں جاؤں گی میں کینخاتو خان کو ذرا بھی پسند نہیں کرتی۔"

ارغون اور زیادہ برہم ہو گیا: "لڑکی! میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ تو کینخاتو خان کے پاس چلی جا۔ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔ اگر تو حجر مجر کرے گی تو میں رسیوں سے باندھ کر کینخاتو خان کے حوالے کر دوں گا۔"

رفیعہ چپ ہو گئی۔ کینخاتو خان نے رفیعہ کے چہرے پر بے بسی اور مجبوری کے آثار دیکھ لیے تھے۔

ارغون کہتا رہا: "میرے لیے تہمینہ اس کی بہن ہی کافی ہے، اور یارو! یہ کیسی بدمذاقی ہے کہ میں ایک ہی شکل و صورت کی دو لڑکیوں سے دل بہلاؤں۔ میں رفیعہ سے تھک چکا ہوں میں اس کو اب برداشت نہیں کر سکتا۔ رفیعہ کو لے جا اور پھر کبھی اس کو میرے پاس ہرگز نہ لانا۔"

کینخاتو خان کھڑا ہو گیا اور رفیعہ سے کہا: "آ رفیعہ! چل میرے ساتھ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو میرے ساتھ نہیں بھی رہنا چاہے گی تو میں تجھ سے زبردستی نہیں کروں گا، تجھ کو تیری مرضی پر چھوڑ دوں گا۔"

رفیعہ نے جواب دیا: "کینخاتو خان! اب تو میں اس ماحول کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ اگر تو مجھے چھوڑ دے گا، تب بھی میں یہاں سے نہیں جاؤں گی اور پھر میری بہن تہمینہ کو ابھی محل ہی میں رہنا ہے میں اگر محل سے کہیں دور جانا بھی چاہوں تو نہیں جا سکتی۔"

ارغون نے کہا: "یہاں زیادہ باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ بس

جو ہونا تھیں ہو چکیں ۔"

کیخاتو خان کھڑا ہو گیا، بولا" محترم خان! اب میں جانا چاہتا ہوں ۔"

وہ رفیعہ کو لے کر باہر نکلا اور گھوڑے پر بیٹھ کر قصر روانہ ہو گیا۔

زرافشاں رفیعہ کو دوبارہ دیکھ کر حیران رہ گئی، پوچھا" خان! خیر تو ہے؟ یہ رفیعہ آپ کے ساتھ؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا" آج کل بھائی ارغون مجھ سے بہت خوش رہتے ہیں، انہوں نے رفیعہ کو بخش دیا۔"

زرافشاں نے بے یقینی سے پوچھا" سچ؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا" سچ بالکل سچ۔ ارغون کہتا ہے کہ تہمینہ اور رفیعہ ہم شکل ہیں اس لیے وہ تہمینہ کو اپنے پاس رکھے گا اور رفیعہ سے بیزار ہو کر میرے حوالے کر دیا۔"

زرافشاں رفیعہ کے سامنے تو کچھ بھی نہیں بولی، بس اتنا کہہ کر چلی گئی کہ خدا کرے آپ کی بات سچ ہو۔"

کیخاتو خان نے رفیعہ سے پوچھا" تجھے اس قصر کا کون سا کمرہ پسند ہے؟"

رفیعہ نے جواب دیا" کوئی بھی نہیں۔ میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی، زبردستی بھیجی گئی ہوں جو کمرہ چاہیں دے دیں۔"

کیخاتو خان نے پوچھا" وہ باغ کے برابر والا کیسا رہے گا؟"

رفیعہ نے جواب دیا" ٹھیک ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔"

زرافشاں نے خشک لہجے میں کہا" اب وہ کمرہ کیوں؟ اسے کسی بھی کمرے میں بسا دو۔"

رفیعہ نے زرافشاں کو گھور کر دیکھا مگر بولی کچھ بھی نہیں۔

کیخاتو خان رفیعہ کو لے تو آیا تھا لیکن اب اسے دو باتیں زیادہ پریشان کر رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ رفیعہ کو دو سال بعد جس حال میں اسے واپس کیا گیا تھا وہ کیخاتو خان کی نظر میں ایسا تھا، جیسے چچوڑی ہڈی کتے کے آگے ڈال دی جائے۔ دوسری یہ بات خاصی اذیت ناک تھی کہ رفیعہ اسے بالکل نہیں چاہتی تھی مگر اسے بخش دی گئی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھا۔

کیخاتو خان نے کچھ دنوں کے لیے خود کو فوجیوں میں مشغول کر لیا۔ وہ ہر روز اپنی افواج میں جاتا۔ اس کا نظم و نسق دیکھتا۔ فوجی منصب داروں سے باتیں کرتا۔ ان کے گھوڑوں اور ہتھیاروں کا معائنہ کرتا۔ یہاں اس نے ہتھیاروں کو زنگ آلود اور گھوڑوں کو کمزور نحیف پایا۔ یہ انہی منگولوں کی باقیات تھیں جنھوں نے قراقرم سے نکل کر ایشیا اور یورپ کو روند ڈالا تھا جن کی ترک تازیاں میلوں اور کوسوں میں نہیں عرض البلد اور طول البلد میں ہوا کرتی تھیں۔ پہلے یہ وحشی تھے اور اب یہ متمدن ہوتے جا رہے تھے۔

کیخاتو خان کو اس وید اور اس کے کارنامے پر بھی سوچنا پڑ رہا تھا جو ہندوستان سے اس کی ایما پر آیا تھا اور جو اس راز سے واقف تھا کہ انسان کو صدیوں کس طرح زندہ رکھا جائے۔ اور یہ کہ بڑھاپے پر جوانی کو کس طرح مسلط کیا جائے۔ اب اس کی دلچسپیاں شاہی محل سے بھی وابستہ ہو گئی تھیں۔ وہ ہر روز پابندی سے اپنے بھائی ارغون کے پاس جانے لگا تھا اور وہ جب بھی جاتا ارغون اور ہندی وید کو یکجا پاتا۔ وہ دونوں معلوم نہیں کن امور پر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ہندوستانی تاجر جو کچھ دنوں ترجمان کے فرائض انجام دے چکا تھا اپنا انعام لے کر چلا گیا تھا۔ اب وید اور ارغون براہ راست باتیں کرنے لگے تھے۔

کیخاتو خان بھی وید کی مزے دار باتوں میں بڑی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے ایک دن سہ پہر کو وید اور بایدو خان کو کہیں جاتے دیکھا۔ کیخاتو خان نے یہ خبر ارغون کو پہنچا دی اور اپنا یہ شبہ ظاہر کیا کہ کہیں بایدو خان وید سے ساز باز کر کے ارغون کے خلاف کوئی منصوبہ تو نہیں بنا رہا۔ ارغون خان نے کیخاتو کی بات گرہ میں باندھ لی اور جب وید ارغون کے پاس آیا تو اس نے کیخاتو خان کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

ارغون کہہ رہا تھا" کیخاتو خان! کیا یہ درست ہے کہ تو بایدو خان سے رسم و راہ بڑھا رہا ہے؟"

کیخاتو خان نے کہا" خان محترم! بایدو میرے چچا کا بیٹا ہے اس سے ملنے میں ہرج ہی کیا ہے؟"

ارغون غصے میں چیخنے لگا" جانتا ہوں وہ تیرا بھائی ہے، تیرے چچا کا بیٹا ہے لیکن تو ولی عہد ہے میرے بعد تجھی کو حکومت سنبھالنی ہے تجھ کو اس سے محتاط رہنا چاہیے کہ وہ خود بھی حکومت کا امیدوار ہے اور پھر میں خود بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے پاس اٹھنے بیٹھنے والے لوگ میرے عزیزوں اور رشتہ داروں سے تعلقات قائم کریں۔" اس کے بعد اس نے ہندوستانی وید دان سے پوچھا" کیوں ہندی عالم! اس بارے میں تیرا علم کیا کہتا ہے؟"

ہندی وید دان نے جواب دیا" میرا علم بھی وہی کہتا ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ میرا علم کہتا ہے کہ حکمراں کا کوئی رشتے دار نہیں ہوتا اور اس کو اپنے رازوں کو چھپانا چاہیے جس طرح بلی اپنی اجابت۔"

ارغون نے برا سا منہ بنا کر ہندی وید دان سے پوچھا" ہندی بزرگ! میں اپنے دونوں بیٹوں میں سے ولی عہد کس کو بناؤں؟"

ہندی عالم نے جواب دیا" چھوٹے کو۔"

ارغون نے حیرت سے پوچھا" بڑے کو کیوں نہیں؟ دنیا بھر میں قانون تو یہی ہے کہ بڑا بیٹا ولی عہد ہوتا ہے۔"

ہندی عالم نے جواب دیا" جی خان محترم! لیکن ہمارا ہندی قانون چھوٹے کو ولی عہد قرار دیتا ہے کیونکہ ہمارے دھرم میں بڑے بیٹے کو شہوت کی اولاد کہا جاتا ہے اور چھوٹے کو عزو فکر اور منصوبے کی

پیدائش مانا جاتا ہے اسی لیے ہم چھوٹے بیٹے کو ولی عہد بناتے ہیں۔"

ارغون اور کیخاتو خان ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

ارغون نے پوچھا۔ "ہندی عالم! کیا تجھے سیاست بھی آتی ہے؟"

ہندی عالم نے جواب دیا۔ "مجھے کیا نہیں آتا خانِ محترم! آپ مجھ سے بات تو کریں۔ مجھ سے مشورے تو لیں!"

ارغون کو اس کی باتوں میں مزہ آرہا تھا، پوچھا۔ "ہندی عالم مجھے اپنے پڑوسی ملکوں سے کس قسم کے تعلقات رکھنا چاہئیں!"

ہندی عالم نے جواب دیا۔ "خانِ محترم! آپ کو اتنا طاقتور ہونا چاہیے کہ پڑوسی آپ سے مرعوب بلکہ خوفزدہ رہیں اور دوستی ہمیشہ دور کے طاقتور ملکوں سے رکھنا چاہیے تاکہ بیچ کے کمزور ملک آپ کے مطیع اور فرماں بردار رہیں۔"

ارغون نے ایک نیا سوال کر دیا۔ "ہندی عالم! پڑوس کے کئی ملک میرے ملک پر للچائی نظریں ڈال رہے ہیں، ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

ہندی عالم گردشیو دیال جی نے جواب دیا۔ "خان محترم! آپ نے ہمیشہ ہتھیاروں سے جنگیں جیتی ہیں لیکن یہ تو کوئی کمال نہیں، اپنے دشمن کو حیلہ سازی سے زیر کرو۔ اگر آپ کو حیلہ سازی آتی ہے تو آپ کوتاہ قامت ہی کیوں نہ ہوں رستم تک کو زیر کر لیں گے۔"

کیخاتو خان نے پوچھا۔ "بعض لوگ غداری کر جاتے ہیں اور ملازمتیں چھوڑ کر دشمنوں کی چاکری میں چلے جاتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے آخر؟"

گردشیو دیال جی نے جواب دیا۔ "انسان کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ آدمی آدمی کی نوکری نہیں کرتا زر و مال کی نوکری کرتا ہے۔ یہ جس کے ... یہ اور سریع الحصول ہو آدمی وہیں چلا جائے گا۔"

وہ دونوں ہندی ودوان سے روزانہ اسی قسم کے سوال کرتے اور اُن کے دلچسپ اور معنی خیز جواب پاتے رہے اور چند دنوں میں ہی اس نے ارغون کے دل و دماغ پر اپنا قبضہ جما لیا کہ اس کو یقین ہو گیا کہ یہ وید اسے ایسی ادویات تیار کر دے گا جس سے وہ کئی سو سال تک زندہ اور جوان رہ سکے۔

❀

دونوں بھائیوں میں محبت اور خلوص جتنا بڑھ رہا تھا سعد اللہ یہودی کو اس سے اتنا ہی دکھ ہو رہا تھا۔ مسیحی اپنی طرف فکرمند تھے کیونکہ انہیں یہ بات معلوم تھی کہ کیخاتو خان اپنے بھائی تکودار کی طرح اسلام پر مائل ہے۔

سعد اللہ یہودی نے ارغون خان کے لیے بڑی محنت کی تھی اُس نے جوینی اور تکودار کے خلاف ایک شاندار معرکہ مارا تھا اور اب اس کو کیخاتو خان ضائع کر رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ارغون یا تو یہودی مذہب اختیار کر لے یا پھر عیسائی ہو جائے لیکن ارغون اپنا آبائی دین چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ سعد اللہ ارغون کی طرف سے مایوس ہو کر بایدو خان سے مل گیا۔ کبھی کبھی کیخاتو خان سے بھی میٹھی میٹھی باتیں کر کے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا۔ کمزور ارغون نے جب ہندی وید کو بلوایا تو وہ سعد اللہ یہودی سے اور زیادہ دور ہو گیا۔ اب وہ گردشیو دیال سے بھی حسد کرنے لگا۔

اسی دوران جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ارغون نے رفیعہ کو کیخاتو کو واپس کر دیا ہے تو حسد نے اور زور مارا اور اُس نے سوچا کہ اگر رفیعہ کیخاتو خان کو واپس کی جا سکتی ہے تو تہمینہ بھی سعد اللہ کے حوالے کی جا سکتی ہے۔ پہلے کچھ دنوں تک تو سعد اللہ کو اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا کہ رفیعہ کیخاتو خان کو واپس کی جا چکی ہے۔ اس کی عقل یہ بات ماننے کو تیار ہی نہ تھی کہ ارغون خان جیسا عورتوں کا حریص کسی لڑکی یا عورت کو واپس بھی کر سکتا ہے۔ اُس نے اس کا ذکر بایدو سے کیا۔ بایدو خان نے اس کی تصدیق کر دی مگر چالاک یہودی نے اس تصدیق پر بھی اعتبار نہیں کیا۔ اب وہ اس کی تصدیق کیخاتو خان سے کرنا چاہتا تھا۔

کیخاتو خان ابھی اپنے قصر سے نکلا نہیں تھا کہ سعد اللہ یہودی اس کی خیریت معلوم کرنے پہنچ گیا۔ کیخاتو اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن مہمان نوازی کے خیال سے اس کو بٹھایا اور دودھ اور پھلوں سے اُس کی تواضع کی۔ سعد اللہ نے کمرے کے منقش پردوں کو بہت پسند کیا۔ زرد پردوں پر سبز پودے اور درخت بنے ہوئے تھے اور ان پودوں اور درختوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو بیٹھا دکھایا گیا تھا۔ سعد اللہ نے کہا۔ "محترم کیخاتو خان! میں ان پردوں کی کس زبان سے تعریف کروں بہت خوبصورت ہیں۔ یہ کہاں کے بنے ہوئے ہیں؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "دمشق کے، کیونکہ وہاں کے کاریگروں کا جواب نہیں۔"

سعد اللہ دیر تک ان پردوں کی تعریفیں کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک دم گریز کیا اور سپہ سالاری کا ذکر چھیڑ گیا۔ "کیخاتو محترم! حالانکہ یہ مبارکباد مجھے بہت دن پہلے دینا تھی لیکن مصروفیات نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ بہرحال سپہ سالاری کی مبارکباد قبول ہو۔"

کیخاتو نے کہا۔ "سپہ سالاری تو تھی ہی میری، ملی دیر میں۔ اپنے دنوں بھائی ارغون معلوم نہیں کیا سوچتے رہے!"

سعد اللہ نے کہا۔ "خانِ محترم میں ساری صلاحیتیں موجود ہیں مگر قوتِ فیصلہ ذرا کمزور ہے۔ میں تو بار بار اور تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن باور کراتا رہتا ہوں کہ آپ اپنی قوتِ فیصلہ کو تیز کریں۔"

کیخاتو خان نے جواب دیا۔ "بھائی ارغون اور قوتِ فیصلہ! خوب! آخر آپ کس مرض کی دوا ہیں! وہ خود فیصلے کیوں کریں؟"

سعداللہ نے کہا: "لیکن کیخاتو محترم! میں اُن کے ذاتی معاملات میں کیوں کر دخل دے سکتا ہوں؟ اب انہوں نے رفیعہ کو دو سال بعد آپ کو واپس کر دیا۔ اگر وہ اس سلسلے میں مجھ سے بات کرتے تو میں انہیں کیا مشورہ دیتا۔"

کیخاتو خان قائل ہو گیا، بولا: "لیکن میں حیران ہوں کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟"

سعداللہ ہنسنے لگا: "ایسا کیا کیوں؟ یہ مت سوچیے یہ مت پوچھیے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ دو سال پہلے جب وہ رفیعہ کو یہاں سے لے گئے تھے تو کیوں لے گئے تھے؟ انھیں اپنے بھائی کے ساتھ ایسا نہیں کرنا تھا۔"

کیخاتو خان نے پوچھا: "میری تہمینہ کا کیا ہوا؟"

سعداللہ نے سرد آہ بھری: "کیا پتہ کیا ہوا؟ بہر حال مجھے تو ابھی تک وہ ملی نہیں۔"

کیخاتو خان نے کہا: "مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ دونوں بہنیں چونکہ ہم شکل تھیں اس لیے کم عمر کو اپنے پاس رکھ لیا اور زیادہ عمر والی کو میرے حوالے کر دیا، واپس کر دیا۔"

سعداللہ جذباتی ہو گیا: "لیکن بڑے آدمیوں میں رکھ رکھاؤ ضرور ہونا چاہیے۔"

کیخاتو خان ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ سعداللہ کے معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

لیکن سعداللہ بھرا ہوا تھا، وہ کہہ رہا تھا: "حالانکہ میں وہ آدمی ہوں جس نے ارغون خان کو حکومت دلائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے اُس کے کردار اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کی۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ میں کیخاتو خان کی جگہ آپ کو حکمران بنا دیتا۔ اور یہ میرے لیے بہت آسان تھا۔"

کیخاتو خان نے کہا: "بڑے بھائی کی موجودگی میں میں کس طرح حکومت کر سکتا تھا۔ وہ میرے اور ہم سب کے بادشاہ ہیں اور ہم سب ان کی رعایا ہیں اور رعایا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے بادشاہ کو ہدفِ ملامت بنائے۔"

سعداللہ نے احتیاط اختیار کی، بولا: "بیشک ہم سب خان کی رعایا ہیں لیکن اگر کبھی کوئی موقع ہاتھ آئے تو آپ محترم خان سے تہمینہ کا ذکر ضرور کیجیے گا اور کہیے گا کہ اگر وہ بھی واپس مرحمت کی جائے تو عین نوازش ہوگی اور میں زندگی بھر خانِ محترم کو دولت و اقبال کی دعائیں دیتا رہوں گا۔"

کیخاتو خان نے مشورہ دیا: "خیر میں خود تو اس سلسلے میں ارغون بھائی سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر تو پسند کرے تو ہندوستانی عالم کو پکڑ لے اور یہی بات اس سے کہلوا دے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ترکیب سے تیرا کام ضرور بن جائے گا۔"

سعداللہ نے کہا: "میں اس ہندوستانی سے کئی بار مل چکا ہوں۔ آدمی کیسا ہے؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "آدمی بہت اچھا ہے اور اس کے علم و دانش کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔"

سعداللہ کو ترکیب جو معلوم ہوئی تو وہ وہاں پھر نہیں رکا۔ اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا، بولا: "اچھا پھر ملوں گا آپ سے۔ اس وقت تو میں اس ہندوستانی عالم کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

کیخاتو خان سعداللہ کے چلے جانے کے بعد خوب خوب ہنسا۔ اپنے آپ سے بولا: "بہت چالاک سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ میں نے وہ ڈنک مارا ہے کہ زندگی بھر خوار اور تڑپتا رہے گا۔"

اندر رفیعہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ کیخاتو اندر پہنچا تو رفیعہ نے پوچھا: "یہ سعداللہ کیا لینے آیا تھا؟"

کیخاتو نے جواب دیا: "وہ نہ لینے آیا تھا نہ دینے آیا تھا۔ بس یوں ہی چلا آیا تھا۔"

لیکن رفیعہ شاید کیخاتو خان کی باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ رفیعہ کے پاس سے ہٹا تو زرافشاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ زرافشاں نے بھی وہی سوال کیا: "یہ سعداللہ یہاں کیوں آیا تھا؟"

کیخاتو نے جواب دیا: "وہ میرے ذریعے بھائی ارغون سے تہمینہ کو واپس لینا چاہتا ہے کہتا تھا سفارش کر دو۔"

زرافشاں نے پوچھا: "پھر آپ نے کیا کیا؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "میں نے کہہ دیا کہ جو کچھ کرنا ہے خود کرو۔ اس میں دوسروں کو نہ ڈالو۔"

زرافشاں بہت بے چین تھی پوچھا: "پھر کیا ہوا؟ آگے کیا ہوا؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "پھر آگے کیا ہوتا۔ میں نے اس کو گرو شیو دیال کے حوالے کر دیا۔"

زرافشاں نے کہا: "آپ نے بہت اچھا کیا۔ اور آئندہ آپ اسے بٹھایئے گا بھی نہیں۔"

کیخاتو خان قصر میں کچھ دیر رک کر اپنے بھائی ارغون کے پاس روانہ ہو گیا۔ اب وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ سعداللہ نے اور کیا کیا اور اگر ہندوستانی عالم نے اس کی سفارش کر بھی دی تو اس کا ردِعمل کیا ہوا؟

ہندوستانی وید ان دنوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ مراغہ اور اس کے مضافات میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ ارغون کے غلام اس کے ساتھ ساتھ چل پھر رہے تھے۔ اسے تھوہڑ کی سخت تلاش تھی اور وہ تھوہڑ کی تلاش میں میلوں گھوم پھر آیا مگر وہ نہیں ملا۔

ایک دن اس نے ایک چرواہے کو مویشیوں کا ریوڑ لے جاتے دیکھا تو اس کو روک لیا اور پوچھا: "کیا تو نے اس علاقے میں تھوہڑ کہیں دیکھا ہے؟"

چرواہے نے جواب دیا: "تقریباً بیس میل یعنی سات فرسخ قریب ہے۔"

گرو شیو دیال نے کہا: "میں تجھے اپنے ساتھ لے چلوں گا اور انعام و اکرام بھی دلواؤں گا، تو چلے گا نہ ہمارے ساتھ؟"

چرواہا عذر کرنے لگا۔ لیکن خان کے آدمیوں نے اسے گدی سے پکڑ کر گھوڑے پر ڈال لیا۔ اور اس کی رہنمائی میں وہاں تک پہنچ گئے جہاں تھوہڑ کے درختوں کی بہتات تھی۔ گرو شیو دیال جی نے تھوہڑ کے پتوں کو توڑا تو اس میں سے سفید سفید دودھ نکلنے لگا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور اس نے بہت سارے تھوہڑ توڑ کر ایک گٹھڑی سی باندھ لی اور چرواہے کو جہاں سے پکڑا تھا، وہیں پہنچا دیا۔ اسے چند سکے بھی دیے اور کہا: "چرواہے اب مجھے تھوہڑ کی وہ قسم درکار ہے جس میں سے سفید دودھ کے بجائے سرخ دودھ نکلتا ہے۔"

چرواہے نے جواب دیا: "جنابِ والا! ہم نے آج تک ایسا تھوہڑ نہیں دیکھا جس میں سے سفید دودھ کے بجائے سرخ دودھ نکلتا ہو۔"

گرو شیو دیال جی بضد رہے: "بہرحال کل مجھے تیری ضرورت ہے، میں تیرا انتظار کروں گا۔"

چرواہا روہانسا ہو گیا۔ "چرواہے میں طبیب ہوں بادشاہ کے لیے دوائیں تیار کر رہا ہوں۔ اگر تو نے مجھ سے تعاون نہ کیا، تو بادشاہ تجھ کو وہ سزا دے گا کہ یاد کرے گا۔"

چرواہا تیار ہو گیا، اس کے بعد وہ کئی دن تک سرخ دودھ والے تھوہڑ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے مگر ناکام رہے۔ آخر اس کام کا بیڑا سعد اللہ نے اٹھایا اور کہا: "میں اس تھوہڑ کو اپنے خان کے لیے ضرور تلاش کروں گا۔"

اور پھر سعد اللہ بھی عاجز آ گیا۔ اس نے گرو شیو دیال جی سے پوچھا: "گرو جی! کیا ایسا تھوہڑ ہوتا بھی ہے جس سے سرخ دودھ نکلتا ہو؟"

گرو شیو دیال جی نے جواب دیا: "ہوتا تو ہے، ہندوستان میں مل جاتا ہے لیکن اس میں دو ڈھائی سال ضائع ہو جائیں گے۔"

سعد اللہ نے پوچھا: "اور اس دوا کے بغیر ارغون خان کی زندگی کتنی ہے؟"

شیو دیال جی نے سعد اللہ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی، پوچھا: "اس سوال سے تیرا مطلب؟"

سعد اللہ نے عرض کیا: "صرف یہ کہ کیا ارغون خان اتنے دنوں اس دوا کا انتظار کر سکیں گے؟"

شیو دیال جی نے جواب دیا: "نہیں وہ اتنے دن نہیں جی سکیں گے۔"

سعد اللہ نے سرگوشی میں سمجھایا: "ہندوستانی دوست! اگر آپ ارغون خان کو اصل حقیقت بتا دیں گے تو وہ سرخ دودھ والے تھوہڑ کی تلاش میں ادھر ادھر اتنا بھٹکائے گا کہ آپ اپنی زندگی سے بیزار ہو جائیں گے۔ آپ کو وہ ہندوستان بھی نہیں جانے دے گا۔"

شیو دیال جی فکرمند ہو گئے، بولے: "اچھا، یوں بھی ہو سکتا ہے؟"

"سعد اللہ نے جواب دیا: "بالکل، یوں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ جبر کی سرزمین ہے۔ یہاں رشتوں اور محبتوں کی بات نہیں ہوتی، یہاں حکم چلتا ہے اور صرف اپنے مطلب کی بات کی جاتی ہے۔ آپ خود کو اس مصیبت سے کس طرح نکالیں گے میرے پاس اس کی بھی ایک ترکیب ہے۔"

شیو دیال جی نے پوچھا: "کون سی ترکیب؟ مجھے ضرور بتا۔"

سعد اللہ نے جواب دیا: "ان سفید دودھ والے تھوہڑوں سے بہت سارا دودھ نکال کر اس میں انسانی خون شامل کر کے سرخ بنا دیں۔"

شیو دیال جی کو یہ ترکیب بہت پسند آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "تو صحیح کہتا ہے مجھے یہ تجویز منظور ہے۔"

اسی دن اعلان کر دیا گیا کہ سرخ دودھ والا تھوہڑ مل گیا۔

بہت سارا عام تھوہڑ تڑوا کر شاہی محل کے اس حصے میں پہنچا دیا گیا جہاں شیو دیال جی کو ٹھہرایا گیا تھا۔

خان ارغون خان نے ان جڑی بوٹیوں کا خود معائنہ کیا، اور بہت خوش ہوا، پوچھا: "اب یہ دوائیں کب تک تیار ہو جائیں گی؟"

گرو شیو دیال جی نے فرمایا: "بندہ پرور! ابھی اس میں دو جزو اور پڑیں گے اور ان دو میں سے ایک جزو بہت ضروری ہے۔ اس جزو کی فراہمی بھی ایک بادشاہ ہی کر سکتا ہے ہر شخص نہیں۔"

ارغون خان نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا: "کون سا جزو؟ اور اس کی حصولیابی میں کیا دشواری پیش آئے گی؟"

گرو شیو دیال نے کہا: "جنابِ والا! میری ان جڑی بوٹیوں کو انسان کے دو بچوں کا خون درکار ہوگا اور یہ کہاں سے ملے گا؟ کون دے گا؟"

ارغون نے ہنس کر جواب دیا: "یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے؟ کل تجھے یہ جزو بھی فراہم کر دیا جائے گا۔"

سعد اللہ اپنی جگہ خوش تھا کہ گرو شیو دیال اور ایل خان نے اس کی تجویز مان لی تھی۔

دوسرے دن دو لڑکوں کا خون بھی فراہم کر دیا گیا اور تمام جڑی

بوٹیوں کو اس خون میں ڈبو دیا گیا۔

اب سعد اللہ گرو شیو دیال سے اپنی بات کرنا چاہتا تھا۔ جب شیو دیال جی جڑی بوٹیاں اور ادویات کو خون میں جوش دینے لگے تو سعد اللہ نے ان سے کہنا شروع کیا " گرو جی محترم! آپ مجھ کو کب سے دیکھ رہے ہیں؟"

گرو شیو دیال جی نے جواب دیا " جب سے میں یہاں آیا ہوں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

سعد اللہ نے پوچھا " میں کیسا آدمی ہوں؟ وفادار یا بے وفا، غدار؟"

شیو دیال جی نے جواب دیا " ابھی تک تو میں نے تجھ کو اچھا اور وفادار ہی پایا ہے اندر کا حال ایشور جانے۔"

سعد اللہ نے جلدی جلدی کہا " میں اندر سے بھی ایسا ہی ہوں۔" پھر کچھ دیر چپ رہ کر بولا " گرو جی میں خان ارغون خان کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں مگر ہمت نہیں پڑتی اگر آپ اس کو پیش کر دیں اور منظور کرا دیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔"

دوائیں آگ پر ابل رہی تھیں اور شیو دیال جی کی پوری توجہ ان ادویات پر تھی۔ انھوں نے کہا " اپنا مقصد بیان کر۔"

سعد اللہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا " استاد من! دو سال پہلے ارغون خان کو تہمینہ نامی ایک لڑکی پسند آ گئی تھی۔ یہ لڑکی میرے پاس تھی، ارغون خان نے اسے مجھ سے لے لیا۔ تہمینہ کی ایک بہن رقیہ کینا تو خان کے پاس تھی ارغون نے اُسے بھی لے لیا۔ اب دو سال بعد کینا تو خان کی رقیہ کو تو واپس کر دیا مگر تہمینہ ابھی تک شاہی محل ہی میں ہے اگر آپ کوشش کریں تو تہمینہ مجھے واپس مل سکتی ہے۔"

گرو شیو دیال جی نے سُنا تو بڑی توجہ سے مگر ظاہر یوں کیا گویا کچھ سنا ہی نہیں، پوچھا " تو کیا چاہتا ہے؟"

سعد اللہ نے جواب دیا " ہندی استاد! کیا آپ نے میری رُوداد سُنی نہیں؟"

شیو دیال جی نے کہا " سُنی کیوں نہیں مگر ایک بار اور بتا دے کہ تو چاہتا کیا ہے؟"

سعد اللہ نے عرض کیا " میں چاہتا ہوں کہ تہمینہ مجھے واپس مل جائے۔"

شیو دیال جی حیران تھے کہ ارغون خان کا وزیر ان سے سفارش کروا رہا ہے، انھوں نے پوچھا " تو ارغون خان کا وزیر ہے؟"

سعد اللہ نے جواب دیا " ہاں ہندی استاد! میں ارغون خان کا وزیر ہوں۔"

[illegible] بات مجھ سے کیوں کر رہا ہے؟ منگول راج کا پردھان منتری اپنے بادشاہ کو خود راضی نہیں کر سکتا؟"

سعد اللہ نے جواب دیا " ہندی استاد! یہ میرا معاملہ نہ ہوتا تو میں آزادی اور دلیری سے بات کر سکتا تھا۔"

شیو دیال جی نے کہا " تب پھر پردھان منتری جی میرا جواب بھی سُن لو۔ میں تمھارے بادشاہ کا بلایا ہوا ہندوستان جیسے دور دراز ملک سے آیا ہوں۔ میں دولت کمانے آیا ہوں، ابھی مجھے نہیں معلوم کہ تیرا بادشاہ میرے کام کا کیا صلہ دے گا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں کوئی کام مفت نہیں کروں گا تو اگر اپنا کام کرانا چاہتا ہے تو اس کے لیے میں تجھ سے پانچ سیر سونا لوں گا۔ یہ میرا ذمہ کہ تیرا کام ہو جائے گا۔"

شیو دیال نے تیز آنچ کو کم کیا۔ بولے " ارے میں نے ادھر تو توجہ ہی نہیں دی۔ تیز آنچ میں دوائیں جلی جا رہی تھیں۔"

سعد اللہ نے جواب دیا " میں پانچ سیر سونے کا انتظام کر دوں گا لیکن میرا کام ہو جانا چاہیے۔"

شیو دیال جی نے بے مروتی اختیار کی، بولے " اُجرت پیشگی، کام بعد میں۔"

سعد اللہ اسی وقت اپنے گھر گیا اور پانچ سیر سونا شیو دیال جی کے حوالے کیا، پوچھا " میرا کام کب تک ہو جائے گا؟"

شیو دیال جی نے سونے کے ڈلے سعد اللہ کی طرف پھینک دیئے بے غرضی سے کہا " کام دو چار دن میں نہیں، دس بارہ دن میں ہو گا۔ اگر تو مجھ پر اعتبار کرے گا تو میں سونے کے ڈلے رکھ لوں گا، ورنہ یہ تیرے ہیں واپس لے جا۔"

سعد اللہ نے سونے کے ڈلے اٹھا کر دوبارہ شیو دیال جی کے حوالے کر دیے، کہا " استاد! مجھے جلدی نہیں ہے دس بارہ دن، پندرہ دن چاہے بھی لگیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے لیکن یہ کام ہونا چاہیے اگر کام پانچ سات دن میں ہو جائے تو میں اور سونا پیش کر سکتا ہوں۔"

شیو جی نے پوچھا " اور کتنا سونا دے سکتا ہے تو؟ اگر اس میں دو سیر کا اضافہ ہو جائے تو میں دوسروں کے کام روک کر تیرا پہلے کر دوں گا۔"

سعد اللہ بھاگا بھاگا گھر گیا اور دو سیر سونا اور لے آیا۔ سیر سیر بھر کے دو ڈلے شیو دیال جی کے حوالے کر دیے اور کہا " گرو اب میرا کام پانچ سات دن میں ضرور ہو جائے گا؟"

شیو دیال جی نے سونے کے تمام ڈلے یوں ہی بڑے رہنے دیے اور کہا " اب تو جا سکتا ہے ایشور نے چاہا تو تیرا کام پانچ سات دن میں ضرور ہو جائے گا۔"

سعد اللہ چلا گیا۔ شیو دیال جی نے سونے کے ڈلے ایک پوٹلی میں باندھ کر صندوق میں بند کر دیے۔

ارغون خان نے جب یہ سنا تھا کہ گرو شیو دیال نے اپنا کام شروع کر دیا ہے وہ بہت خوش نظر آنے لگا تھا۔ وہ جب تب شیو دیال جی کے پاس چلا آتا اور دیگ میں اُبلتی ہوئی ادویات کی خوشبو سونگھتا رہتا۔ اس کے جسم میں خوشی خون اور ہوا کی طرح دوڑ رہی تھی۔ اس دوران شیو دیال جی سفوف کی کئی پڑیاں تیار کر چکے تھے۔ وہ ان پڑیوں کو ارغون کے سامنے رکھ دیتے اور کہتے ۔" یہی وہ سفوف ہے جو آپ کو جوان کر دے گا۔ پہلے میں آپ کو ان ادویات کے پانی سے نہلاؤں گا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک یہ سفوف پھنکواؤں گا اور آپ دوبارہ جوان ہونے لگیں گے ۔"

ارغون خان خوشی سے پاگل سا ہو جاتا۔ کہتا ۔" میں وہ کام کر رہا ہوں جو میرے آباؤ اجداد بھی نہ کر سکے۔ میں اپنے خاندان کا عظیم ترین انسان ہوں۔ اتنا عظیم کہ جو کام خانِ اعظم چنگیز خان بھی انجام نہ دے سکا میں پورا کر دکھاؤں گا ۔"

ایک دن شیو دیال جی نے ارغون خان کو سمجھایا۔" خانِ محترم! میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ کیمیا کی قسم کا ایک فن ہے ایک علم ہے، ایک وِدیا ہے اور اس وِدیا کا نام رسائن ہے۔ میں نے رسائن کی وِدیا اس فن کے مشہور زمانہ گرو ناگارجن کی کتابوں سے حاصل کی ہے۔ گرو ناگارجن سومنات کے قریب قلعہ دیہک کے رہنے والے تھے اور اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ جب میں اپنے نسخوں سے آپ کو نہلاؤں گا اور سفوف کھلاؤں گا تو آپ کیسے جوان ہو جائیں گے۔ آپ کے سفیدی کی طرف مائل سر کے بال نوجوانوں کی طرح سیاہ چمکدار اور گھنے ہو جائیں گے۔ مضمحل جسم میں تیزی اور بطش و جماع میں شیر جیسی چستی اور قوت آ جائے گی اور اس حال میں آپ صدیوں زندہ رہیں گے۔"

ارغون خان نے کہا ۔" اور اے ہندی عالم! میں بھی تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تجھے مالا مال کر دوں گا اور تجھے تیرے وزن کے مطابق سونا دوں گا ۔"

شیو دیال جی نے کہا ۔" خان! اب میں خواب میں اُن روحوں کا انتظار کرتا ہوں جو مجھے یہ بتائیں گی کہ میں آپ کا علاج کس دن سے شروع کروں اور وہ میری کتنی مددگار ثابت ہوں گی ۔"

ارغون نے پوچھا ۔" یہ روحیں کس کی آتی ہیں ؟"

شیو دیال جی نے جواب دیا ۔" بہاری جی کی جو اُجین کا رہنے والا تھا اور مہاراجہ بکرماجیت کا ہم عصر تھا جو رسائن کے فن میں یکتا تھا اور اُس عورت کی روح جس کا نام راجہ شوبھی تھا اور جس نے علم رسائن کے تجربے کے لیے بہاری کو اپنی ساری دولت دے دی تھی۔ سومنات کے ناگارجن کی روح جس کی کتابوں سے میں نے یہ فن یہ علم سیکھا ہے۔ یہ عالم رویا میں میرے پاس آتی ہیں۔ اور ہدایتیں دے کر چلی جاتی ہیں اس کے بعد میں علاج شروع کرتا ہوں اور کامیابی حاصل کرتا ہوں ۔"

ارغون خان علاج کے لیے بے چین تھا۔ وہ طویل العمری اور جوانی کی خاطر دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ پوچھا۔" یہ روحیں کب تک آئیں گی؟"

شیو دیال جی نے جواب دیا ۔" میں گیان دھیان میں لگا ہوا ہوں امید ہے کہ دو چار دن میں یہ روحیں ضرور آ جائیں گی ۔"

اس بات کے تیسرے روز یہ روحیں خواب میں آ گئیں اور انھوں نے خواب میں جو ہدایات دیں ۔ شیو دیال جی انہیں بتلاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے ۔

جب ارغون خان شیو دیال جی سے روحوں کی ہدایات سننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا، مدتوں بعد شمس الدین جوینی کیخاتو خان کے ساتھ ارغون خان سے ملنے آیا۔ جوینی نے ارغون خان کو شیو دیال جی کے روبرو سر جھکائے بیٹھے جو دیکھا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔

کیخاتو خان نے باآواز بلند ارغون خان سے کہا۔" برادرِ محترم! جوینی آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

ارغون خان نے آنکھیں کھول دیں اور جوینی کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔" جوینی تو اتنے دنوں کہاں رہا؟"

جوینی نے جواب دیا ۔" محترم خان! جب میں نے خود کو حکومت کے لائق نہیں سمجھا تو عزلت نشینی اختیار کر لی اور میری صلاحیتیں زنگ خوردہ ہو کر رہ گئیں ۔"

ارغون خان نے پوچھا ۔" اس وقت یہاں میرے پاس کیوں آیا ہے ؟"

جوینی نے جواب دیا ۔" محترم خان! میں دو چار ماہ کے لیے بغداد جانا چاہتا ہوں اس سلسلے میں مجھے آپ کی اجازت درکار ہے ۔"

ارغون خان نے کہا ۔" تو جا سکتا ہے جہاں بھی جانا چاہے، بغداد، دمشق، حلب، بعلبک جہاں بھی جانا چاہے بشوق جا سکتا ہے۔"

اُس وقت وہاں ادویات کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور کئی قسم کے سفوف پڑیوں میں باندھے جا رہے تھے۔ جوینی نے ان ادویات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ۔" یہ سب کیا ہے خانِ محترم ؟"

ارغون قہقہہ مار کر ہنس دیا، بولا ۔" ان ادویات اور سفوف میں میری کئی سو سالہ زندگی قید ہے اور میں عنقریب کڑیل نوجوان ہو جاؤں گا اور کئی سو سال تک زندہ رہوں گا ۔"

جوینی کو ہنسی آ گئی، بولا ۔" خوب! خوب!"

کچھ دیر بعد جب کیخاتو خان جوینی کو چھوڑنے کے لیے باہر گیا تو جوینی نے بڑے افسوس سے کہا ۔" یہ ارغون خان کو آخر ہو کیا گیا ہے ؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا ۔" وہ کئی سو سال تک زندگی اور شباب

کے زور سے ایسا کرے گا؟"

جوینی معنی خیز مسکراہٹ سے بولا: "تب پھر میں ابھی بغداد نہیں جاؤں گا اور شہزادہ کیخاتو خان! آپ اقتدار سنبھالنے کی تیاری کیجیے۔ ارغون خان کی زندگی بہت کم رہ گئی ہے۔"

کیخاتو خان نے ادھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا: "خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔"

ان مختصر مکالموں کے بعد جوینی اپنی راہ چلا گیا اور کیخاتو خان دوبارہ ارغون خان کے پاس مودب بیٹھ گیا۔ اس وقت شیو دیال جی فرما رہے تھے: "خانِ محترم! رات تینوں رُوحیں ایک ساتھ میرے پاس آئی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اپنے خان سے کہو کہ وہ کسی تمینہ نامی لڑکی کو اپنے پاس جبراً رکھے ہوئے ہے۔ اب وہ جس دن اُس لڑکی کو اپنے محل سے نکال دے گا وہی دن علاج کے لیے مناسب ترین دن ہوگا۔"

ارغون خان نے حیرت سے پوچھا: "تینوں رُوحوں نے یہ کہا ہے! لیکن میں نے تمینہ کو جبراً نہیں روکا ہے۔ وہ اپنی خوشی سے میرے پاس رہ رہی ہے اور شاید وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے۔"

شیو دیال جی نے کہا: "خان جی! میں نے جو کچھ خواب میں سُنا تھا، آپ کے گوش گزار کر دیا۔ یوں میں آج پھر ان تینوں رُوحوں کو بُلا کر ان سے ان کا قطعی فیصلہ معلوم کروں گا۔"

ارغون خان نے کہا: "یوں میں اس پر بھی آمادہ ہوں کہ اگر وہ تینوں روحیں یہی چاہتی ہیں کہ میں تمینہ کو اپنے محل سے نکال دوں تو میں تمینہ کو سعداللہ یہودی کے حوالے کر دوں گا کیونکہ تمینہ مجھے اسی سے ملی تھی۔"

شیو دیال جی نے کہا: "کیا میں ایک بار اُس دیوی کے درشن کر سکتا ہوں جس کا نام تمینہ ہے۔ میں اس سے اُس کی مرضی معلوم کروں گا اور پھر تینوں روحوں سے بحث کروں گا اور اُن کا جو آخری فیصلہ ہوگا اُس سے آپ کو مطلع کر دوں گا۔"

ارغون نے اسی وقت تمینہ کو بُلوا لیا اور کہا: "تمینہ موجود ہے تُو اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتا ہے پوچھ لے۔"

شیو دیال جی نے کہا: "لیکن اس کے لیے مجھے تخلیہ درکار ہوگا چند لمحوں کے لیے، کیونکہ لڑکی سب کے سامنے اپنے من کی بات نہیں کہہ سکے گی۔"

ارغون اور کیخاتو خان وہاں سے ہٹ گئے مگر کیخاتو خان اس ہندوستانی ودوان کی اقبال مندی پر رشک کر رہا تھا۔ اس نے ارغون خان کو مٹھی میں لے لیا تھا۔

کچھ دیر بعد شیو دیال جی، ارغون خان اور کیخاتو خان کے

آپ سے پریم کرتی ہے اور وہ کسی جبر سے محل میں نہیں رہ رہی ہے اب میں تینوں رُوحوں کو ایمانداری سے بتا سکوں گا کہ تمینہ اپنی خوشی سے آپ کے پاس رہ رہی ہے اسے بادشاہ سے جُدا نہ کیا جائے۔"

ارغون خان کی جان میں جان آئی اور وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے شیو دیال جی کی عزت کرنے لگا۔

دوسرے دن خواب میں تینوں روحوں نے شیو دیال جی کو یہ کہہ کر خوش کر دیا کہ وہ خود جہاں رہنا چاہے رہے اُس پر جبر ہرگز نہ کیا جائے۔

ارغون نے پُوچھا: "پھر میرا علاج کب شروع ہوگا؟"

شیو دیال جی نے جواب دیا: "پرسوں سے کیونکہ رسائن کی تینوں رُوحوں نے یہی دن مقرر کیا ہے آپ کے علاج کے لیے۔"

ارغون خان کیخاتو خان کو اپنے محل میں لے گیا اور کہا۔ "جب میں پھر سے نوجوان ہو جاؤں گا اور میری زندگی کئی سو سال کی ہو جائے گی تو میں تمینہ کو بھی انہی ادویات سے نہلواؤں گا اور انہی سفوف کو کھلواؤں گا۔"

جب یہ باتیں مشہور ہو گئیں اور سعداللہ کے کانوں تک پہنچیں تو وہ نہایت برہم شیو دیال جی کے پاس پہنچا، پُوچھا: "او مکار ہندی عالم! یہ سب کیا ہو رہا ہے! یہ میرے کان کیا سن رہے ہیں؟"

مشغول

طبیب ابوبکر رازی کے پاس ایک لڑکا پہنچا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سے بغداد تک سفر کیا تھا۔ راستے میں اس کے منہ سے خون آنے کی شکایت ہو گئی۔ رازی نے خون، قارورہ اور نبض دیکھ کر مرض تشخیص کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے سل کا مرض ہو گیا ہے مگر سل کے آثار نہیں ملے۔ رازی نے لڑکے سے دریافت کیا کہ اس نے راستے میں پانی کہاں کہاں کا استعمال کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ اس نے تالابوں کا پانی پیا تھا۔ رازی نے کہا: "اچھا، ہم تمھارا علاج کریں گے مگر شرط یہ ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی میری ہدایت پر عمل کریں۔" لڑکے نے وعدہ کر لیا۔ دوسرے دن رازی نے دو مٹکیں بھر کر کائی منگوائی اور لڑکے سے کہا وہ کائی نگلنا شروع کرے۔ لڑکے نے بہت مشکل سے تھوڑی سی کائی نگل لی۔ رازی نے اس کے ساتھیوں کی مدد سے زبردستی کائی اس کے منہ میں بھرنی شروع کر دی۔ لڑکے کی حالت غیر ہوئی اور قے شروع ہو گئی۔ رازی نے لڑکے کو چھوڑ دیا اور غور سے قے کا معائنہ کرنے لگا۔ اس میں ایک جونک پائی گئی۔ لڑکا کسی تالاب کا پانی پیتے وقت جونک نگل گیا تھا اور وہ اس کے معدے میں پیوست ہو گئی تھی۔ کائی جونک کی غذا ہے اس لیے کائی کی وجہ سے اس نے اپنا مستقر چھوڑ دیا اور قے کے ذریعے خارج ہو گئی۔

اور کہا۔"شریمان جی! اپنی زبان کو لگام دے، تو اپنے سونے کے ڈبے واپس لے سکتا ہے۔"

لیکن سعد اللہ یہودی نے کہا۔"نہیں بندی عالم نہیں، میں نے تجھ سے اس لڑکی کے عوض معاملہ کیا تھا۔ میں تو تہمینہ کو آپ سے لوں گا۔"

شیو دیال جی نے جواب دیا۔"وہ لڑکی تیرے پاس نہیں آنا چاہتی اور جو لڑکی اپنے ارادوں کی پکی اور دل کی مضبوط ہو اس کو تو بھگوان بھی مجبور نہیں کر سکتے، ایشور بھی دخل نہیں دے سکتے۔"

سعد اللہ نے کہا۔"تب پھر میرے سونے کے ڈبے واپس کر دے۔"

شیو دیال جی نے کہا۔"شریمان جی! زیادہ گرمی نہ دکھاؤ۔ اگر یہ باتیں ارغون خان کے کانوں میں پڑ گئیں تو سوچ لو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔"

سعد اللہ تلملا رہا تھا۔"تو کیا تو میرے سونے کے ڈبے واپس نہیں کرے گا؟"

شیو دیال جی نے جواب دیا۔"کیوں۔ واپس کیوں نہیں کروں گا لیکن کیا تم چند دن صبر نہیں کر سکتے؟"

سعد اللہ نے کہا۔"بندی عالم! تو مجھے دھمکی دے رہا ہے یہ اچھی بات نہیں ہے۔ میں بھی تیرے خلاف کچھ کر سکتا ہوں۔"

شیو دیال جی گویا برف کے بنے تھے۔ انہیں غصہ آیا بھی، مگر ظاہر نہیں ہوا، کہا۔"برہان منتری جی! تم آزاد ہو جو چاہو، کرو۔ میں آزاد ہوں جو چاہوں کروں۔ ہم دونوں آزاد ہیں، جو چاہیں کریں لیکن بہتری اسی میں ہے کہ تم چار پانچ دن انتظار کر لو۔"

سعد اللہ یہ کہہ کر چلا گیا۔"تو میرا سونا ہضم نہیں کر سکتا میں چار پانچ دن صبر کروں گا لیکن اس کے بعد دیکھوں گا کہ تو کس طرح میرا سونا واپس نہیں کرتا۔"

شیو دیال جی کی دیگیں آگ پر چڑھی ہوئی تھیں۔ ان میں ادویات کو الگ الگ جوش دیا جا رہا تھا۔ ارغون خان وسیع و عریض غسل خانے کے ایک کونے میں کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ شیو دیال جی اسے کب اپنے پاس بلائیں اور غسل دیں۔ مختلف سفوف کی پڑیاں دیگوں کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔

شیو دیال جی نے ارغون سے کہا۔"خان جی! اس موقع پر آپ جس جس کو اپنے پاس رکھنا چاہیں، بلا لیں۔"

ارغون خان نے جواب دیا۔"میرے بھائی کیخاتو خان اور تہمینہ کو یہیں بلوا لیا جائے۔ تاکہ وہ اس عجیب و غریب جادوئی عمل کو دیکھیں اور مجھے مبارکباد دیں کہ میں عنقریب اپنے چھوٹے بھائی

خوش ہو جائے گی کہ اس کا محبوب کتنا کم سن ہو گیا ہے۔"

ارغون خان نے کیخاتو خان اور تہمینہ کو غسل خانے ہی میں بلوا لیا۔

شیو دیال جی نے ایک دیگ میں سے تھوڑا سا پانی نکالا اور سفوف کی ایک پڑیا لے کر ارغون کے پاس پہنچا، بولا۔"خان جی! یہ سفوف پھانک کر یہ پانی پی لیجیے۔"

ارغون نے کسی تامل کے بغیر سفوف پھانک کر پانی پی لیا۔ شاید سفوف بہت بدمزہ تھا، ارغون خان منہ بنانے لگا۔

اب شیو دیال جی نے اپنے ہاتھوں سے غسل دینا شروع کر دیا۔ پانی میں پڑی ہوئی ادویات کی ملی جلی خوشبو سے پورا غسل خانہ مہک رہا تھا۔ جب ایک دیگ سے غسل دیا جا چکا تو ارغون کو چادر اڑھا کر ایک تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس طرح تقریباً ایک گھنٹے تک بٹھائے رکھا گیا۔ اس کے بعد دوسرے سفوف کی پڑیا دی گئی اور دوسری دیگ کے پانی کے ساتھ اسے بھی حلق کے نیچے اتار دیا گیا اور دوسری دیگ کے پانی سے ارغون خان کو نہلا دیا گیا اور اس بار بھی ایک موٹی چادر میں لپیٹ کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔

شیو دیال جی نے پوچھا۔"مہاراج! آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

ارغون خان نے جواب دیا۔"میں خود کو بیمار اور سست محسوس کر رہا ہوں۔ میری کھال گلی جا رہی ہے اور گوشت ادھڑا جا رہا ہے۔"

شیو دیال جی نے تسلی دی۔"مہاراج! مبارک ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی پرانی کھال اتر رہی ہے اور اس کی جگہ نئی کھال پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح یہ پرانا گوشت گل کر ہڈیوں پر سے اتر جائے گا۔ اور اس کی جگہ نیا گوشت پیدا ہو جائے گا۔"

تہمینہ بہت خوش تھی۔ اس نے کہا۔"گرو شیو دیال جی! یہ عمل کب تک مکمل ہو جائے گا؟"

شیو دیال جی نے جواب دیا۔"تقریباً سات دن۔ انہی سات دنوں میں جو کچھ ہونا ہے ہو جائے گا۔"

ارغون خان سات دن کا سن کر گھبرا گیا۔ بولا۔"او بندی عالم! یہ سات دن کیوں؟ پہلے تو تو نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

شیو دیال جی نے جواب دیا۔"مہاراج گھبرائیں نہیں! ابھی سفوف کی دو پڑیاں اور ادویات کے پانی کی دو دیگیں باقی ہیں۔"

شیو دیال جی نے سفوف کی ایک پڑیا اور کھلا دی اور اوپر سے ادویات کا پانی پلا دیا اور تیسری دیگ کے پانی سے نہلا دیا۔ اسی طرح جب چوتھی دیگ کا عمل بھی ختم ہو گیا تو ارغون خان کی حالت بالکل ابتر ہو چکی تھی، وہ تڑپنے لگا۔ اس کی کھال گلی جا

رہی تھی اور گوشت پھٹتا جا رہا تھا۔ کانوں کی لوئیں گل کر جھڑ گئیں اور ناک پھول کر کُپا ہو گئی۔ ارغون خان کو اس کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ شیو دیال جی نے ارغون خان کو مشورہ دیا کہ جب تک پرانی کھال اور گوشت جسم سے جدا نہ ہو جائیں اور اُن کی جگہ نئی کھال اور نیا گوشت نہ پیدا ہو جائے آپ کسی خدمت گار یا رشتہ دار کو اندر نہ آنے دیں ہاں کیخاتو خان اور تہمینہ اندر ارغون خان کے پاس رہ سکتے ہیں۔"

شیو دیال جی یہ مشورہ دے کر چلے گئے اور ارغون خان درد و کرب سے تڑپنے لگا۔ کئی گھنٹے بعد ارغون نے اپنے بھائی کیخاتو خان سے کہا: "یہ شیو دیال کہاں چلا گیا؟"

کیخاتو خان نے جواب دیا: "محل ہی میں اپنے کمرے میں، کیوں؟"

ارغون خان نے کہا: "بھائی کیخاتو خان! تو جا اور اس کو میرے پاس پکڑ لا۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ یہ درد اور یہ اذیت کتنی دیر اور رہے گی؟"

کیخاتو خان چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کے جواب دیا: "برادرِ محترم! شیو دیال جی نے آنے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اذیت کم از کم تین دن ضرور رہے گی۔"

ارغون خان چیخنے چلانے لگا: "تین دن اور رہے گی اور وہ بھی کم از کم۔ کیخاتو خان! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو شیو دیال کو گرفتار کر کے میرے روبرو حاضر کر۔ میں اسے سزا دوں گا۔"

کیخاتو خان نے پوچھا: "آپ اسے کس بات کی سزا دیں گے؟"

ارغون خان نے جواب دیا: "شیو دیال نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔"

کیخاتو خان وہاں سے ایسا گیا کہ پلٹ کر ہی نہ آیا۔ ارغون خان بہت پریشان تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیامت کا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر سرہانے کھڑی ہوئی تہمینہ کو دیکھا اور غصے میں کہا: "یہ کیخاتو خان معلوم نہیں کہاں مر گیا جا کر؟"

تہمینہ نے جواب دیا: "صبر کریں خانِ محترم! کیخاتو خان آتا ہی ہو گا۔"

ارغون خان اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی انگلیاں گل چکی تھیں۔ ارغون خان نے انگلیوں کی طرف دیکھا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ "ہائے میری انگلیاں۔ تہمینہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تو ہی جا اور شیو دیال کو پکڑوا کر میرے پاس لے آ۔"

تہمینہ نے جواب دیا: "ارغون خان! پریشان نہ ہو اور نہ مجھے پریشان کرو۔ اب شیو دیال یہاں نہیں آئے گا۔"

ارغون نے جھنجلا کر پوچھا: "وہ یہاں کیوں نہیں آئے گا؟ اس کی اتنی ہمت کہ میں بلواؤں اور وہ نہ آئے۔"

تہمینہ نے جواب دیا: "ارغون خان! یہ ہمت کی بات نہیں ہے۔ شیو دیال جی تو یہاں اس لیے نہیں آئیں گے کہ ان کا کام ختم ہو چکا۔ ہاں کیخاتو خان اور رفیعہ بس آتے ہی ہوں گے۔"

ارغون خان نیم پاگل ہو چکا تھا، بولا: "لیکن میں نے رفیعہ کو تو نہیں بلوایا تھا!"

تہمینہ نے جواب دیا: "وہ آپ کی بن بلائی مہمان بننے والی ہے۔"

ارغون خان نے غصے میں کہا: "تم سب پاگل ہو چکے ہو۔ میں کنیزوں اور خدمت گاروں کو بلوا کر تجھے بھی قتل کرا دوں گا، اور کیخاتو خان، رفیعہ اور شیو دیال کو سسکا سسکا کر موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔"

تہمینہ مسکرا مسکرا کر ارغون کے زخمی دل و دماغ پر نمک پاشی کر رہی تھی۔ اس نے کہا: "خانِ محترم! تالی بجانے کی زحمت نہ کیجیے گا کیونکہ آپ کی انگلیاں تو جھڑ چکیں اور دونوں ہتھیلیاں کافی زخمی ہیں ان سے تالی نہ بجے گی اور اگر بفرضِ محال تالی بج بھی گئی، تو کوئی یہاں آئے گا نہیں۔"

ارغون خان نے پوچھا: "کوئی یہاں کیوں نہیں آئے گا؟"

تہمینہ نے جواب دیا: "کوئی یہاں موجود ہی نہیں تو تالی کی آواز پر آئے گا کہاں سے؟"

ارغون خان چیخنے لگا: "تہمینہ! میں تجھے بھی کبھی نہیں بخشوں گا، تو خدا کے لیے سچ بتا یہ سب کیا ہے؟ کس کی سازش ہے؟"

تہمینہ نے جواب دیا: "خانِ محترم! آپ ذرا بھی نہ گھبرائیں۔ آپ کئی سو سال تک زندہ رہیں گے، آپ تو جوان ہو جائیں گے۔ تاکہ عورتوں پر دلیری اور پوری قوت سے حملہ آور ہو سکیں، آپ صدیوں اس لیے زندہ رہیں گے کہ خدا کی مخلوق کا قتلِ عام کر سکیں۔ مسلمانوں کو نیست و نابود کر سکیں۔ ان کے بوڑھے، بچے، عورتیں اور مریض تک آپ کی تلوار سے محفوظ نہ رہیں۔"

ارغون خان کرب و اذیت سے نیم بلبہ مدہوش ہو گیا۔ تہمینہ ارغون کی خواب گاہ سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور خواب گاہ کو باہر سے بند کر دیا۔

کئی گھنٹے بعد کیخاتو خان فاتحانہ شان سے محل میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ رفیعہ بھی تھی اور زر افشاں بھی۔ ان دو کے علاوہ اس کی حمایتی سپاہ کا ایک دستہ بھی تھا جس نے شاہی محل کے دربانوں اور سپاہیوں کو گرفتار کر کے ایک بڑے ہال میں قید کر دیا۔

کیخاتو خان نے رفیعہ کو ساتھ لیا اور ارغون کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ اس وقت ارغون خان چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اس کا جسم

تیزی سے سر گل رہا تھا۔ کینخا تو خان کو اپنے سامنے دیکھ کر ارغون خان مشتعل ہو گیا: "مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ یہ ساری شرارت تیری ہے اور یہ شیو دیال تیرا ہی آدمی تھا۔ تو نے مجھے مار دیا، لیکن اگر میں بچ گیا تو تیری بوٹیاں کروا کے چیل کوؤں کو کھلوا دوں گا۔"

رفیعہ آگے بڑھی اور کہا: "او ظالم خان! یاد ہے تجھے وہ دن جب تو نے مسلمانوں کی بربادی اور قتلِ عام کا حکم دیا تھا۔ ہم دونوں بہنوں نے اسی دن سے یہ عہد کر لیا تھا کہ تیرے اس ظلم کا تجھ سے ہم بھیانک ترین انتقام لیں گے۔ جو رحم نہیں کرے گا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔"

اب ارغون خان بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اس نے تہمینہ کو آواز دی لیکن تہمینہ وہاں نہیں تھی۔ آخر میں نے اپنے وزیر سعد اللہ یہودی کو پکارا۔ رفیعہ نے جواب دیا: "وہ قتل کر دیا گیا ہے۔"

ارغون خان نے دھندلی آنکھوں سے جوینی کو اپنی خوابگاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو پوچھا: "یہ تو جوینی؟ کیا تو بغداد سے اتنی جلدی واپس آ گیا؟"

لیکن جوینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ارغون خان نے سنا، جوینی کینخا تو خان سے کہہ رہا تھا: "شہزادے محترم! آپ باہر جا کر یہ اعلان کر دیں کہ ارغون خان کی حالت نازک ہے اور ہنگامی اور عارضی طور پر آپ اس کی ذمہ داریاں سنبھال رہے ہیں۔"

کینخا تو خان وہاں سے چلا گیا اور ارغون نے پوچھا: "تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟"

جوینی نے پوچھا: "ارغون خان! کیا میں تجھ سے پوچھ سکتا ہوں کہ تو نے حالتِ نماز میں اپنے بڑے بھائی تکودار کو کیوں قتل کر دیا تھا؟ یہ سوال تو تکودار کو تجھ سے کرنا تھا لیکن مجبوراً میں اس کی طرف سے کر رہا ہوں۔"

ارغون نے جواب دیا: "لیکن جوینی یاد رکھ میں تو مر جاؤں گا لیکن میری قوم کے لوگ تجھ سے اور کینخا تو خان سے انتقام ضرور لیں گے کیونکہ یہ ظلم رنگ لا کر رہے گا۔"

ارغون کی قوتِ گویائی بھی ختم ہوتی چلی گئی۔ بالکل آخری لمحات میں ارغون کو سبھی نے چھوڑ دیا تھا۔ بس تہمینہ خاص طور پر ارغون کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ارغون ادھ کھلی نظروں سے اسے دیکھ کر زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔ تہمینہ نے اپنا دایاں کان اس کے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ارغون کہہ رہا تھا: "میں مر رہا ہوں اور مرتے مرتے اپنی قوم کو حکم دے رہا ہوں کہ وہ کینخا تو خان، جوینی تہمینہ کو ہرگز معاف نہ کریں اور اگر شیو دیال ان کے ہاتھ آ جائے تو اس کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔"

تہمینہ اس کی باتیں سن کر اس کے کان پر جھک گئی، بولی۔ "ارغون! میں بھی بس ایک بات کہنے کے لیے تیرے پاس رکی ہوئی ہوں، شاید تجھ کو یاد ہو گا کہ تیرا دادا ہلاکو خان الموت کے شیخ الجبال کو تباہ و برباد کر کے اس کے قلعوں پر قابض ہو گیا تھا اور اس کی قوم اور پرستاروں کو ہلاک کر کے آخری شیخ الجبال رکن الدین خور شاہ کو گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔ وہ آخری شیخ الجبال ہمارا دادا تھا، آج ہم دونوں بہنیں بہت خوش ہیں کہ دادا پر ہونے والے ظلم کا بدلہ مظلوم دادا کی پوتیوں نے ظالم دادا کے ظالم پوتے سے لے لیا۔"

ارغون خان نے ہونٹ بھینچ لیے جس سے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ ارغون خان پوری قوت سے کہہ رہا تھا "تہمینہ اور رفیعہ کو فی الفور قتل کر دیا جائے اسی وقت اور ابھی۔"

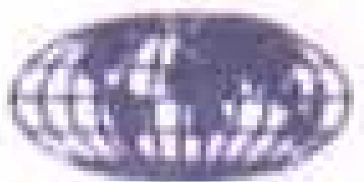
اس کے بعد وہ سسک سسک کر مر گیا۔

کینخا تو خان سپہ سالارِ اعلیٰ بھی تھا اور ارغون کے بعد اس کا حقیقی جانشین بھی۔ اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ اس نے ارغون کو کسی عام اور گمنام آدمی کی طرح دفن کر دیا۔

شیو دیال مراغہ سے بہت سارا سونا کما کر ہندوستان واپس چلا گیا۔ بعد میں یہ بھی سنا گیا کہ شیو دیال نے تہمینہ سے بھی کافی سونا کمایا تھا۔

کینخا تو خان نے پہلی بار کاغذ کا سکہ جاری کیا جس کو منگول تربوت کہتے تھے، مگر آج اس کو نوٹ کہا جاتا ہے۔ کینخا تو خان نے اپنے یوت کے دونوں طرف کلمہ طیبہ طبع کروایا تھا کلمے کے نیچے کینخا تو خان کا نام اور یوت کی قیمت درج تھی۔

کینخا تو خان نے زرافشاں سے جو وعدہ کیا تھا، پورا کیا۔ زرافشاں اس کی ملکہ بن گئی اور رفیعہ اور تہمینہ کو ان کی مرضی اور حال پر چھوڑ دیا گیا۔ رفیعہ کو امید تھی کہ کینخا تو خان اسے اپنی ملکہ بنا لے گا لیکن کینخا تو خان کو رفیعہ کی وفاداریوں پر شبہ تھا۔ اس لیے اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ یہ دونوں اپنی آخری ناکامیوں سے دل برداشتہ ہو کر بحیرۂ خزر کے جنوب مغربی شہر موغان واپس چلی گئیں۔ اسی موغان میں ان کا آبائی قصبہ تھا اور اسی قصبہ کی آب و ہوا نے انہیں پالا تھا۔





آتشِ خلوش

الیاس سیتاپوری

آیئے قرطبہ چلیں جہاں کبھی مسلمانوں کے اقبال کا شاندار سورج طلوع ہوا تھا۔ وادی کبیر میں جنم لینے والی یہ داستان دو گروہوں سے شروع ہوئی۔ اس دور میں مذہبی معتقدات اور جذباتِ انسانی دل و دماغ پر حکومت کرتے تھے۔ اور انسان ان سے ہٹ کر سوچنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ ایک معزز شخص اپنے خاندان اور خود اپنے لیے ایک فیصلہ کرتا ہے۔ ایک ایسا فیصلہ جو عمل کے بعد دردِ سر بن گیا۔ کرداروں کی کشمکش، ان کی الجھنیں، ان کی پیچیدگیاں اور ان کے قول اور فعل کی اونچ نیچ نے کسی کو کرب بخشا۔ کسی کو اذیت دی۔ کسی کو گھٹن سے دوچار کر دیا اور جب یہ کہانی قرطبہ کے پڑوسی شہر طلیطلہ میں داخل ہوئی تو عشق و محبت کی ایک نادرِ روزگار داستان بن گئی۔ بل کھاتی لہراتی ندی کی طرح، کرداروں کے سینوں میں عشق و محبت کی آگ دھیمی دھیمی جلنے لگی۔ اس عشق کی آگ میں جس کے لیے رسولِ مقبول نے فرمایا تھا کہ "عشق کی آگ میں اللہ کے سوا سب کچھ جل جاتا ہے۔"

دیکھیے اس آگ میں کیا کچھ جل گیا؟

سعید کو اپنے خاندان کی عظمت اور بڑائی کا بڑا احساس تھا۔ اس کا تعلق سعد بن عبادہؓ کے خاندان سے تھا اور سعد بن عبادہؓ وہی صحابی تھے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں مدینے کے انصاروں کے سردار تھے۔ جب رسول اللہؐ اپنے دس ہزار جیش کے ساتھ فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں داخل ہو رہے تھے، تو اس وقت انصار دستے کی قیادت سعدؓ بن عبادہ ہی کو سونپی گئی تھی اور یہی سعدؓ بن عبادہؓ تھے جنھیں رسول اللہؐ کے وصال کے بعد انصار نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے مقابلے میں اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا۔ لیکن جب انصار اور مہاجرین نے متفقہ طور پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا تو سعد بن عبادہؓ نے مدینے کو چھوڑ دیا اور مفقود الخبر ہو گئے۔

پھر شوال ۹۲ھ اور جمادی الاوّل ۹۳ھ (جولائی ۷۱۱ء اور اپریل ۷۱۲ء) کے درمیان مشہور جرنیل طارق ابن زیاد نے سرزمینِ اندلس میں اپنے فاتحانہ قدم رکھ دیے تو عرب قبائل نے اندلس کی طرف مراجعت اختیار کر لی۔ ان میں سعد بن عبادہ کا خاندان بھی تھا۔ اندلس کی سرسبز چراگاہوں، حسین باغات، خوش ذائقہ پھلوں، دلکش کوہساروں، گنگناتے چشموں اور بل کھاتے خاموش دریاؤں نے ان کے دلوں کو موہ لیا اور یہ ہمیشہ کے لیے اندلس ہی کے ہو کر رہ گئے۔ نئے قصبے آباد ہوئے اور جدید شہروں کی بنیادیں پڑیں۔ ان شہروں کو اپنے مذاق اور سلوب آباد کیا گیا۔ کئی قبائل بلنسیہ میں بس گئے۔ کچھ نے اشبیلیہ کو پسند کیا۔ انھی میں مرسیہ، رندہ، غرناطہ اور قرطبہ بھی شامل تھے۔ سعید کا خاندان قرطبہ میں بس گیا۔ قرطبہ، جسے اندلس والے کوردوبا (Cordoba) کہتے تھے۔ اپنے معنی کے اعتبار سے یہ اپنے ساکنوں کا صلہ کہلاتا تھا۔ عرب قبائل کو یہ صلہ بہت پسند آیا۔ اور اس شہر نے انھیں فرش سے عرش تک پہنچا دیا لیکن عربوں نے بھی اپنا حق ادا کر دیا، اور قرطبہ کو دلھن کی طرح سجا ڈالا۔ انھوں نے یہاں شاندار محل تعمیر کیے، باغات لگائے، نہریں نکالیں۔ دریائے کبیر اور اس کے معاون دریاؤں سے نہریں نکال کر یہاں کی زمین کو سیراب اور باغات کو شاداب کیا۔ ایک طرف دریائے شنیل تھا تو دوسری طرف دریائے شوش، تیسری طرف بمبیذر، دریائے کرنہ، دریائے ملاتو اور دریائے آنہ تھے۔ جب نو واردان عرب اندلس کی زمینوں پر اپنے گھوڑے دوڑاتے تو انھیں بڑا مزہ آتا۔ یہاں عرب ریگزاروں کی رکاوٹیں ان کے قدم نہیں پکڑتی تھیں۔ سعید نے کئی سال پہلے حج پر جاتے ہوئے عرب کے ریگزار دیکھے تھے۔ اور وہ اسی وقت سے اندلس کی قدر و قیمت سے



آگاہ ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا، عرب حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے تو بہترین مُلک ہو سکتا ہے مگر رہائش کے لیے نہیں۔ اندلس نے اُسے اور اس کے خاندان کو بہت کچھ دیا تھا، شہرت، عزت، دولت اور طمانیت۔ اس کا دادا اشبیلیہ کا قاضی تھا۔ باپ نے مرسیہ میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا منصب سنبھال رکھا تھا۔ خود سعید کو اموی حکمران ہشام کے عہد میں اُس کے وزیر منصور ابن ابی عامر نے قاضی کا منصب پیش کیا تھا۔ قاضی سعید کے لیے یہ بہت بڑا منصب تھا اور وہ اس سلسلے میں منصور ابن ابی عامر کا بے حد شکر گزار تھا۔

قاضی سعید نے شادی سے پہلے جس لڑکی سے عشق کیا تھا وہ بہت بیدار مغز اور بلا کی ذہین تھی۔ قاضی سعید اس سے نیاز مندانہ پیش آتا۔ اس کی بیوی نے شادی سے پہلے قاضی سعید سے قرآنِ پاک بیچ میں رکھ کر وعدہ لیا تھا کہ وہ اپنی اس بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرے گا۔ اس نے اپنے اس عہد کو کئی سال نبھایا پھر تکان سی محسوس کرنے لگا اور اُسے دوسری عورت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

شام کو جب وہ ہوا خوری کی غرض سے گھر سے باہر نکلتا تو دو خدمت گار اس کے دائیں بائیں پیدل چلتے۔

کوہستان کے سرے پر ایک گرجا سر اٹھائے کھڑا تھا لیکن اونچے اونچے درختوں نے اُسے چھپا رکھا تھا۔ گرجا کا مینارہ جس پر پیتل کی صلیب نصب تھی، دُور سے نظر آتا تھا۔ سعید نے صلیب کو دیکھا تو دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا جس نے اہلِ تثلیث پر مسلمانوں کو حکومت اور فضیلت بخشی تھی۔

سعید غیر ارادی طور پر خود بخود گرجے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گرجے کے چاروں طرف ایک شاندار احاطے کی دیواریں تھیں۔ اور اُن دیواروں کے اندر گرجے اور دیواروں کے درمیان اونچے اونچے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ سعید گرجے کی چوحدی کے صدر دروازے پر گھوڑا روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے خدمت گار اس کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں حیران تھے کہ اُن کا آقا گرجے کے سامنے کیوں کھڑا ہو گیا۔

گرجے کی چوحدی میں مرد اور عورتیں اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے اور کہیں درختوں کے سائے میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مُسکرا مُسکرا کر باتوں میں مشغول تھے۔ سعید کو لمحہ بھر کے لیے مسجدوں کو خیال آ گیا۔ اُس نے سوچا، کاش مسجدوں میں بھی عورتوں اور لڑکیوں کو آنے اور نمازیں پڑھنے کی اجازت دے دی جاتی تو کتنا مزہ آتا۔

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے قاضی سعید کو گرجے کے دروازے پر کھڑا دیکھا تو مسکرانے لگے۔ قاضی سعید کو اُن کی یہ حرکت بہت بُری لگی، مگر وہ اُن کا کیا کر سکتا تھا۔

قاضی سعید کو گھورتے دیکھ کر ایک بوڑھا شخص باہر نکلا اور پوچھا۔ "محترم قاضی! آپ کس سے کیا چاہتے ہیں؟"

قاضی سعید نے جواب دیا۔ "نہیں، میں کسی سے کچھ نہیں لینا چاہتا۔ بلکہ میں گرجے کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

بوڑھے شخص نے کہا۔ "تب پھر اندر تشریف لائیں، یہ تکلف کیوں؟"

قاضی سعید نے گھوڑے کو دونوں خدمت گاروں کے حوالے کیا اور بڑے میاں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ لڑکیوں اور لڑکوں نے ایک مسلمان کو اندر آتے دیکھا تو کچھ پریشان سے ہو گئے۔

بوڑھا شخص قاضی سعید کو گرجے کی سیڑھیوں تک لے گیا، اور پوچھا۔ "جناب والا! بس یا گرجے کے اندر بھی دیکھنا چاہتے ہیں؟"

قاضی سعید کو جیسے کسی کی تلاش تھی۔ جواب دیا۔ "ہاں، میں اندر بھی دیکھنا چاہتا ہوں اور اندر کے بعد باہر بھی گرجے کے چاروں طرف گھوم پھر کر۔"

بوڑھا مسیحی بھی سمجھ چکا تھا کہ قاضی سعید کی نظریں کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔ وہ قاضی کو گرجے کے اندر لے گیا۔ وہاں دو حسین لڑکیاں کتاب اللہ تعالیٰ پڑھ رہی تھیں۔ اور قربان گاہ کے قریب کی دیوار پر حضرت مسیحؑ کو مریم کی گود میں دکھایا گیا تھا۔

قاضی سعید کی مذہبی رگ حمیت پھڑکی۔ بولا۔ "محترم بزرگ! خدا آپ کو ہدایت دے۔ اس تصویر میں یہ عورت کون ہے، اور اس بچے کا نام کیا ہے؟"

محترم مسیحی نے ناگواری سے منہ بنایا مگر نہایت نرم لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کی دُعا کا شکریہ، اگر خدا نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو آج میں مسیحی نہ ہوتا۔ یہ دعا تو آپ کو اپنے لیے مانگنی چاہیے تھی۔" بوڑھا مسیحی اپنے جواب کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے خاموش ہو گیا۔ قاضی سعید نے بھی برداشت سے کام لیا۔ آخر مسیحی نے قاضی کے سوال کے دوسرے حصے کا جواب دیا۔ "تصویر کی عورت خداوند مسیح کی مادرِ محترم مریم اور بچہ مسیح ہیں۔"

قاضی سعید نے پیشانی پر شکنیں ڈال لیں۔ "توبہ توبہ نبیوں اور اُن کی ماؤں کی فرضی شبیہیں بنانا حرام ہے اگر تو یہ چاہتا ہے کہ خدا تجھ سے راضی رہے اور تو جنت میں اپنا گھر بنائے تو ان تصاویر کو مٹا دے اور مسلمان ہو جا۔"

مسیحی نے بے دلی سے جواب دیا۔ "آپ کے مشوروں کا شکریہ۔ آپ یہاں اور کیا دیکھنا پسند کریں گے؟"

قاضی سعید گرجے سے باہر آ گیا۔ اور اس کے عقب میں چلا گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ بوڑھا مسیحی جوں جوں وقت گزر رہا تھا

پریشان ہو رہا تھا۔ اس کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں قاضی کو گرجے کا محلِ وقوع پسند تو نہیں آ گیا جو واپس جا کے اس کی خریداری کی بات شروع کر دے اور پھر گرجے کو گرا کر یہاں مسجد تعمیر کر دی جائے۔ اس نے قاضی کو گرجے سے باہر لے جانے کی کوشش کی۔ "قاضی محترم! اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ آپ چاہتے کیا ہیں تو شاید میں آپ کی خاطر خواہ مدد کر سکوں لیکن اس سے پہلے میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا اور آپ کی شایانِ شان خاطر مدارات کروں گا۔"

قاضی سعید نے نارنگی کے درختوں کے سائے میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "مجھے جس کی تلاش تھی میں نے اسے پالیا ہے۔"

بوڑھے مسیحی نے ایک بیس بائیس سالہ خوبصورت عورت کو پانچ چھ سالہ بچے کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھا۔

عورت قاضی سعید کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

قاضی سعید نے پوچھا: "خاتون! تجھے انتظار کی زحمت موت کے مزے سے دوچار کر رہی ہوگی۔"

عورت نے بوڑھے مسیحی کو دیکھ کر اپنا سر جھکا لیا، بولی۔ "میں تھوڑی دیر پہلے یہاں پہنچی ہوں۔"

بوڑھا مسیحی معاملات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن قاضی سعید نے اس کا موقع ہی نہیں دیا، بولا: "یہاں سے تیرا گھر کتنی دور ہے؟ وہیں چلتے ہیں۔" پھر بوڑھے مسیحی سے کہا: "اب تو جا سکتا ہے۔ تیری رہنمائی اور مہربانی کا شکریہ۔"

بوڑھا مسیحی اس بات سے خوش تھا کہ اس کا گرجا مسجد بننے سے بال بال بچ گیا۔

قاضی سعید نے عورت اور بچے کو ساتھ لیا اور گرجے سے باہر نکل گیا۔ گرجے کے نوجوان اور لڑکیاں ان دونوں کو پرتجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا مسیحی نارنگیوں کے جھنڈ کے باہر کھڑا ان دونوں کو سوالیہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

باہر نکل کر قاضی سعید نے اس عورت سے ایک بار پھر پوچھا "یہاں سے تیرا گھر کتنی دور ہے؟"

عورت نے جواب دیا: "چوتھائی فرسخ سے بھی کچھ کم، وادی الکبیر (دریائے کبیر) کے قریب، جہاں پن چکیاں لگی ہوئی ہیں اور جو یہاں کے قدیم شہریوں کا محلہ کہلاتا ہے۔"

قاضی سعید اس محلے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس محلے کو مسلمان ربض المدینۃ العتیقۃ (قدیم شہریوں کا محلہ) کہتے تھے۔

گھوڑا ایک تھا اور سواریاں دو، جن کے ساتھ ایک پانچ چھ سالہ بچہ بھی تھا۔ قاضی سعید نے پوچھا: "تو یہاں کس طرح آئی تھی؟"

عورت نے جواب دیا: "کرائے کے گدھے پر۔"

قاضی نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ کہیں سے کرائے کا گدھا لے آئیں۔ جب یہ دونوں چلے گئے تو قاضی نے عورت کو سمجھایا: "تو نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟ شاید ازابلا۔ میرے یہ دونوں خدمت گار کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ میں انہیں انعام و اکرام سے اپنا ہم نوا بنا لوں گا لیکن تجھ کو ان دونوں کے سامنے بہت محتاط رہنا ہوگا۔"

عورت نے جواب دیا: "میں زیادہ باتیں نہیں کرتی۔"

دونوں اسی وقت کرائے کا گدھا لے آئے۔ قاضی نے عورت اور اس کے بچے کو گدھے پر بٹھایا اور خود اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ خدمت گاروں سے کہا: "اب تم دونوں اس خاتون کے پیچھے پیچھے چلو۔"

گدھے کے ادھیڑ عمر مالک نے گدھے کے گلے میں بندھی ہوئی رسی پکڑ کے آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔ قاضی سعید نے اپنے گھوڑے کو گدھے کے متوازی ساتھ ساتھ چلانا شروع کر دیا۔

دونوں خدمت گاروں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرانے لگے۔

دریائے کبیر سے پہلے انہیں پن چکیوں کی حد درجہ مانوس آواز سنائی دینے لگی۔ یہ پن چکیاں ربض رقاقین (نانبائیوں کا محلہ) میں واقع تھیں۔ نانبائیوں کے محلے سے ذرا آگے قدیم شہریوں کا محلہ تھا۔ اس محلے کے چاروں طرف زیتون، شاہ بلوط اور دوسرے کئی اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ تھے اور ان درختوں سے بھی پہلے نارنگیوں، لیموؤں اور مہندی کی جھاڑیاں تھیں۔ ان درختوں کو سینچنے کے لیے چھوٹی چھوٹی نالے نما نہریں بنی ہوئی تھیں۔

پرانے شہریوں کے محلے میں ایک پھاٹک نما دروازہ لگا ہوا تھا۔ قاضی اور عورت ازابلا اس پھاٹک نما دروازے سے گزر کر اصل محلے میں داخل ہو گئے۔

ازابلا کا مکان شروع ہی میں بنا ہوا تھا۔ اس نے گدھے کو رکوایا اور خود گھوڑے سے اتر کر نیچے آ گیا۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ اپنے دونوں خدمت گاروں کو واپس بھیج دے لیکن نہیں بھیج سکا کیونکہ اس طرح یہ نیا خدشہ پیدا ہو جاتا کہ دونوں خدمت گار گھر واپس جا کے اس کی بیوی سے ازابلا کی بابت معلوم نہیں کیا کچھ کہہ دیں۔

ازابلا نے ایک شاندار گھر کا قفل کھولا اور لڑکے کو لے کر اندر چلی گئی۔

قاضی سعید نے گدھے والے کو اس کا کرایہ ادا کیا اور گھوڑے کو دونوں خدمت گاروں کے حوالے کر کے مکان کے اندر چلا گیا۔ مکان اندر سے اور زیادہ حسین تھا۔ باہری کمرے کے فوراً بعد ایک صحن تھا۔ اس صحن میں انگور کی بیلوں کا سائبان تنا ہوا تھا اور

ان پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ کسی کسی لمحہ ان کی چوں چوں اور چہچہانے کی آوازیں بھی سنائی دیتیں۔ قاضی انگوروں کے سائبان تلے کھڑا ہو گیا۔ یہاں دو تپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد ازابلا کسی اندرونی کمرے سے واپس آئی اور پوچھا۔

"اندر چل کے بیٹھئے گا یا یہیں تپائیوں پر بیٹھ کر باتیں کریں؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "یہیں ٹھیک رہے گا۔" پھر پوچھا۔

"لڑکا کہاں ہے؟"

ازابلا قاضی کے مقابل بیٹھ گئی۔ بولی۔ "میں نہیں چاہتی کہ ہماری باتیں وہ بھی سنے۔ اس لیے اس کو اندر کمرے میں چھوڑ دیا۔"

قاضی نے ادھر ادھر دیکھ کر شانے اچکائے اور سر کھجانے لگا۔ بولا۔ "ازابلا! جب میں نے سعدونہ سے شادی کی تھی تو اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے یا لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔"

ازابلا نے سر جھکا لیا تھا۔ بولی۔ "اور شاید یہ قسم آپ نے قرآن کو گواہ بنا کے کھائی تھی؟"

قاضی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "ہاں یہ بھی درست ہے، میں ابھی اس قسم پر سات سال تک قائم رہا لیکن ادھر چند ہفتے قبل جب میں نے تجھے اپنی عدالت میں بحیثیت فریادی کھڑے دیکھا تو میرے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ میرے پائے ثبات میں لرزش پیدا ہوئی اور میں منہ کے بل ڈھیر ہو گیا۔"

ازابلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لمحہ بھر کے لیے نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ "اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

قاضی نے بے چینی سے جواب دیا۔ "ازابلا! بخدا تیرے بغیر میری زندگی ادھوری رہے گی۔"

ازابلا نے قاضی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ پوچھا۔

"اور اس عہد اس قسم کا کیا ہو گا جو قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کھائی گئی تھی۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "ازابلا! میں اس عہد کی پابندی کر رہا ہوں۔ میں تجھ سے شادی کروں گا مگر سعدونہ کی موجودگی میں نہیں اس کی عدم موجودگی میں۔ میں اس طرح جھوٹی قسم کے عذاب سے بچ جاؤں گا۔"

ازابلا نے چونک کر چالاک قاضی کی طرف دیکھا۔ اس نے سوچا قاضی لفظوں کے ہیر پھیر سے کیسا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ بولی۔ "میں تیار ہوں لیکن میرے بچے کا کیا ہو گا؟"

قاضی کا چہرہ باغ باغ نظر آ رہا تھا۔ جواب دیا۔ "شادی کے بعد وہ میرا بیٹا کہلائے گا۔"

ازابلا نے کہا۔ "لیکن میرا بیٹا آرتھر میرے مسیحی شوہر کی یادگار ہے۔ ایک مسیحی لڑکا آپ کا بیٹا کیونکر کہلائے گا؟"

قاضی نے پرسکون لہجے میں ازابلا کو سمجھایا۔ "ازابلا! سعدونہ سے کوئی اولاد نہیں۔ اس لیے تیرا بیٹا آرتھر ہی میرا بیٹا اسحاق ہو گا۔ میں اس کی مسلمان بچوں کی طرح پرورش کروں گا۔ اگر تو یہ چاہتی ہے کہ میرے بعد تیرا لڑکا اسحاق قاضی یا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بن جائے تو تجھ کو میری بات ماننی پڑے گی۔"

ازابلا کو ایک دم شکست ہو گئی۔ بیٹے کے شاندار مستقبل کی طمع میں وہ قاضی سے الجھ نہیں سکی، پھر بھی پوچھا۔ "اور اگر آپ کی بیوی سعدونہ کسی لڑکے کی ماں بن گئی تو؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "ایسا نہیں ہو گا ازابلا! سعدونہ بانجھ ہے۔ اولاد اگر مزید ہو گی تو وہ تجھ سے ہو گی لیکن میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو نے اپنے بیٹے اسحاق کو مسلمان ہو جانے دیا تو میں اسی کو اپنا ولی عہد قرار دوں گا۔"

ازابلا نے کہا۔ "تب پھر بہتر ہے لیکن کہیں آپ کا یہ عہد بھی پچھلے عہد کی طرح کسی تاویل کی نذر نہ ہو جائے۔"

قاضی کھسیایا ہوا تھا۔ بولا۔ "ایسا نہیں ہو گا ازابلا! خدا کے لیے تو مجھے اس قسم کی باتوں سے شرمندہ نہ کر۔"

ازابلا ہنسنے لگی۔ قاضی نے ازابلا کے ہنستے ہوئے سرخ سرخ رخساروں میں آنچ سی محسوس کی۔ اس نے ازابلا کو اپنی آغوش میں لینا چاہا لیکن ازابلا پیچھے ہٹ گئی اور کہا۔ "نہیں۔ میرا بیٹا اسحاق نہ آ جائے کہیں۔"

قاضی محتاط ہو گیا۔ اب وہ حال سے قال پر آ چکا تھا۔ ازابلا سے پیار محبت کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ خاموشی سے اٹھا اور کہا۔ "ازابلا! میں آج ہی تجھ سے شادی کروں گا اور اسحاق کو قرطبہ کی درس گاہ میں داخل کر دوں گا مگر ایک بات کا تو بھی خیال کرے گی۔ میں تجھ سے شادی سعدونہ سے چھپا کر کر رہا ہوں تو بھی اسے راز میں رکھے گی، خبردار! جو اس کا چرچا کیا۔"

ازابلا نے جواب دیا۔ "میں خاموش رہوں گی اور اسے راز بھی رکھوں گی لیکن آپ بھی مجھے نظر انداز نہیں کریں گے اور ہر ماہ کی چند راتیں مجھے بھی دیا کریں گے۔"

قاضی نے وعدہ کر لیا۔ وہ کچھ دیر وہاں اور ٹھہرا اس کے بعد باہر نکل آیا۔ یہاں دونوں خدمت گار قاضی کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ قاضی نے ان دونوں کے چہروں پر عجیب سا تجسس محسوس کیا۔

قاضی نے جاتے جاتے مڑ کر ازابلا کے گھر کی طرف دیکھا۔ تو دروازے سے ٹیک لگائے ازابلا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے

پایا۔ شاید وہ بڑی حسرت سے قاضی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

قاضی گھوڑے پر سوار ہونے کے بجائے دونوں خدمتگاروں کے ساتھ پیدل ہی چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک خدمتگار نے پوچھا۔ "آپ گھوڑے پر نہیں بیٹھیں گے کیا؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "بیٹھوں گا، مگر ابھی نہیں۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد۔"

اس ذرا سی بات چیت کے بعد پھر سکوت طاری ہو گیا۔ آخر اس سکوت کو قاضی نے ختم کر دیا، بولا۔ "تم دونوں اگر چاہو تو میں منصور ابن ابی عامر سے کہہ سن کر اونچے منصب دلوا سکتا ہوں۔"

ایک خدمتگار نے جواب دیا۔ "اونچا منصب کون نہیں چاہتا میرے آقا!"

قاضی نے کہا۔ "اور جو لوگ بلند مناصب حاصل کر لیتے ہیں انھیں بڑی پریشانیاں بھی اٹھانا پڑتی ہیں۔ وہ پیٹ کے ہلکے نہیں ہوتے۔ وہ اپنے پرائے اور سرکاری رازوں کے امین ہوتے ہیں۔"

ایک خدمت گار نے جواب دیا۔ "میرے آقا! میں قسم کھا کر یقین دلا سکتا ہوں کہ میں سب سے زیادہ راز دار اور وفادار ثابت ہوں گا۔"

قاضی نے پوچھا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تم دونوں نے کیا دیکھا؟"

ایک نے بعجلت جواب دیا۔ "کچھ بھی نہیں۔ ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔"

قاضی نے کہا۔ "لیکن یہ جھوٹ ہے۔ تم دونوں نے جو کچھ دیکھا ہے میں چاہتا ہوں اسے راز رکھو۔ میری بیوی سعدونہ ان باتوں کو برداشت نہیں کرے گی اور میں نہیں چاہتا کہ میری گھریلو زندگی میں میرا کوئی خدمت گار زہر گھول دے۔"

دونوں خدمت گاروں نے اسی وقت قسمیں کھائیں کہ وہ ہمیشہ اپنے آقا کے وفادار اور راز دار رہیں گے۔

قاضی نے اسی شام کو ازابلا سے شادی کر لی۔ دونوں خدمت گاروں کو اپنے ساتھ رکھا اور سعدونہ کو یہی معلوم ہو سکا کہ اس کا شوہر قاضی سعید اپنے دونوں خدمت گاروں کے ساتھ چند دنوں کے لیے اپنے فرائض منصبی کی طرف سے قرطبہ سے باہر جا رہا ہے۔ چنانچہ شادی کے بعد قاضی سعید نے ازابلا کے ساتھ ایک ہفتہ گزار دیا۔ دونوں خدمت گاروں کے ساتھ قاضی نے خود کو ازابلا کے مکان میں نظر بند کر لیا تھا۔ اس دوران قاضی نے اسحاق کو بڑی محبت دی اور اسے اتنا مانوس کر لیا کہ وہ قاضی کے گن گانے لگا۔

قاضی نے اسحاق کو ایک ابتدائی مدرسے میں داخل کر دیا جہاں وہ اسلامی نصاب کا درس لینے لگا لیکن گھر میں ازابلا بھی تعلیم دیتی۔ اس طرح تین سال گزر گئے۔ ان تین سالوں میں قاضی نے اپنی دوسری شادی کو پوری طرح راز میں رکھا۔ دونوں خدمت گاروں کو انعام و اکرام کے چابک سے قابو میں رکھا گیا تھا اور قاضی کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ انھیں گھر سے دور اور اپنے قریب رکھا جائے۔ یہ مجرب نسخہ بڑا کارآمد ثابت ہوا۔



قاضی نے تین سال بعد سعدونہ میں تبدیلی محسوس کی۔ اسے کہیں سے سن گن مل گئی تھی چنانچہ اب وہ اپنی مرضی کے مطابق ازابلا کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ جب بھی قاضی اپنے منصبی امور کے لیے سفر کرنا چاہتا، سعدونہ ساتھ چلنے پر مصر ہو جاتی اور قاضی کو اپنا منصوبہ ترک کرنا پڑتا۔ اب وہ بمشکل کسی کسی دن چند گھنٹوں کے لیے ازابلا کے پاس چلا جاتا تھا۔ ازابلا اپنی حق تلفی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے قاضی سے صاف صاف کہہ دیا۔ "میں چند گھنٹے نہیں چند دن چاہتی ہوں، ہر ماہ کے چند دن۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "ازابلا! مت گھبرا۔ سعدونہ کو شک ہو گیا ہے۔ میں اس شک کو اس کے دل سے بہت جلد نکال دوں گا اور پھر حسب سابق تیرے پاس آزادی سے رہ سکوں گا۔"

ازابلا نے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ اب اس راز کو افشا ہی کر دیں کیونکہ اسلام میں دوسری شادی معیوب نہیں ہے۔"

قاضی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ازابلا کی شکل دیکھنے لگا، پھر بولا۔ "ازابلا! کیا تو جانتی ہے کہ اس کو ہم دونوں کی شادی کا جیسے ہی علم ہوگا، وہ خودکشی کر لے گی۔"

ازابلا نے ہنس کر جواب دیا۔ "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ وہ خودکشی کر لے گی تو میں آپ کے ساتھ آزادی سے رہ سکوں گی۔"

قاضی حیرت سے ازابلا کی صورت دیکھنے لگا، اس کو شبہ گزرا، شاید ازابلا نشے میں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس گیا اور اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ازابلا نے پوچھا۔ "آپ کیا دیکھ رہے ہیں اس طرح؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "تیرا منہ سونگھ کر یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت کہیں تو نشے میں تو نہیں ہے۔"

ازابلا نے پوچھا۔ "پھر کیا معلوم ہوا؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "تو نشے میں تو نہیں ہے لیکن پھر بھی تو صحیح الدماغ نہیں ہے معلوم نہیں کیوں؟"

ازابلا خاموش ہو گئی۔ قاضی چند سانسیں گزار کر جب

گھر واپس آیا تو اس نے اپنے گھر سے قرطبہ کی مشہور زمانہ دائی کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ قاضی نے اُسے روک لیا، پوچھا "تو اندر کیا لینے گئی تھی؟"

دائی نے جواب دیا "بھائی صاحب! یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں مجھ سے؟"

قاضی نے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بنجر زمین کے پاس تو کیا لینے گئی تھی؟"

دائی مسکرانے لگی، بولی "جناب قاضی صاحب! خاتونِ خانہ امید سے ہیں، شاید یہ دوسرا مہینہ چل رہا ہے۔"

قاضی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، پوچھا "کیا سچ؟ دوبارہ تو کہنا۔"

دائی نے وہی بات دوبارہ دہرا دی، کہا "خاتونِ خانہ حاملہ ہیں۔"

قاضی کا اس وقت حال ہی کچھ اور تھا جس چیز کی کوئی امید ہی نہیں تھی، وہ اچانک مل جا رہی تھی۔

دائی نے پوچھا "حضور! اب تو میں جا سکتی ہوں؟"

قاضی نے ایک بار پھر وہی سوال کیا "تو یہ بات پکی ہے کہ سعدونہ امید سے ہے؟"

دائی نے پھر وہی جواب دیا "میں جو کہہ رہی ہوں۔"

قاضی نے دائی کو چلا جانے دیا اور خود سعدونہ کے پاس چلا گیا۔ اس وقت سعدونہ چادر اوڑھے منہ چھپائے خاموش پڑی تھی۔ قاضی نے اندر داخل ہوتے ہی پکارا "سعدونہ!"

سعدونہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسا لگا جیسے وہ گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ قاضی سعدونہ کے سرہانے جا کھڑا ہوا اور ایک بار پھر آواز دی "سعدونہ! کیا سو گئیں؟"

سعدونہ نے آنکھیں کھول کر قاضی کی طرف دیکھا اور دوبارہ بند کر لیں۔

قاضی نے محسوس کیا، شاید سعدونہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے فوراً اپنی انگلیوں کو دونوں آنکھوں کے گوشوں پر رکھ دیا، انگلیاں بھیگ گئیں۔ قاضی اس پر جھک گیا، پوچھا "سعدونہ کیا بات ہے؟ تو رو کیوں رہی ہے؟"

سعدونہ نے کروٹ بدلی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔

قاضی دوسری طرف چلا گیا، بولا "سعدونہ! تجھے بتانا پڑے گا کہ تو مجھ سے ناراض کیوں ہے؟"

سعدونہ نے جواب دیا "میں کیوں ناراض ہوں، بتلاؤں؟"

قاضی گھبرا گیا۔ بڑی ہمت کر کے پوچھا "بتا۔ میں تیرے سوال کا جواب بعد میں دوں گا، پہلے تو میرے سوال کا جواب تو دے دے۔"

سعدونہ نے انتہائی سوچ سمجھ کر سوال کیا "میں جاننا چاہتی ہوں وہ اسحاق نامی لڑکا کون ہے، وہ آپ کا کون ہے؟"

قاضی بدحواس ہو گیا، بڑی کوشش سے حواس پر کسی حد تک قابو پا سکا، بولا "تجھے اس لڑکے کی بابت کس نے بتایا؟"

سعدونہ اٹھ کر بیٹھ گئی، بولی "میں نے آپ سے جو کچھ پوچھا مجھے اس کا جواب چاہیے۔"

قاضی نے جواب دیا "سعدونہ! اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ اس یتیم اور مجبور لڑکے کی بابت کس نے کیا بتایا ہے تو شاید میں تیرے سوالوں کا بہترین جواب دے سکتا۔"

سعدونہ بہت جذباتی ہو رہی تھی، بولی "میں اپنے سوال کا بہترین نہیں، سچا جواب چاہتی ہوں۔"

قاضی نے جواب دیا "لڑکا اسحاق عیسائی ہے اس کا باپ مر چکا ہے ماں زندہ ہے مگر اس لائق نہیں ہے کہ اس کی کفالت کر سکے۔ میں نے اس لڑکے کی ذمے داری اس لیے قبول کر لی کہ اس طرح وہ مسلمان ہو جائے گا اور میں بارگاہِ ایزدی میں ثواب کا مستحق ٹھیروں گا۔"

سعدونہ مشتعل ہو کر کھڑی ہو گئی "مجھ سے جھوٹ نہ بولیے آپ نے اس کی ماں ازابلا سے شادی کر کے اسحاق کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔"

اب قاضی مزید جھوٹ نہیں بول سکتا تھا، وہ چپ ہو گیا۔

سعدونہ بڑبڑاتی رہی "اب بولتے کیوں نہیں! میری باتوں کا جواب دیجئے۔ آپ نے مجھ سے دوسری شادی نہ کرنے کا عہد کیا تھا، قرآن پاک کو اس عہد کا گواہ بنایا تھا اور اب... اور اب...."

وہ آگے نہیں بول سکی، زار و قطار رونے لگی۔

قاضی نے عافیت اسی میں سمجھی کہ کسی طرح موضوع ہی بدل دیا جائے۔ پوچھا "یہ دائی کیوں آئی تھی؟"

سعدونہ نے جواب دیا "آپ تو یہ سمجھتے تھے کہ میں بانجھ ہوں، اولاد نہیں پیدا کر سکتی۔ شاید اسی لیے اس مسیحی عورت ازابلا سے شادی کر لی لیکن میرے خدا نے میری سن لی اور اب میں آپ کو اولاد دے سکوں گی۔"

سعدونہ برابر روئے جا رہی تھی، اس کی آواز بھرا گئی تھی

قاضی کو سعدونہ کی بات پر یقین نہیں آیا، بولا "کیا سچ؟"

سعدونہ نے جواب دیا "میں جھوٹ کیوں بولوں گی، اگر آپ نے اس مسیح زادے کو اپنا بیٹا بنا ہی لیا ہے تو میرے بچے کا کیا بنے گا؟"

قاضی نے کہا: "وہ میرا بیٹا نہیں ہے، میرا بیٹا وہی ہو گا، جو تیرے بطن سے ہو گا۔"

سعدونہ نے کہا: "لیکن میں اس پر کس طرح اعتبار کروں؟"

قاضی نے جواب دیا: "اس پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے سعدونہ! کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ اپنے بیٹے سے پیارا کسی دوسرے کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ جب تیرا بچہ پیدا ہو جائے گا تو میں اپنے قول کو عمل سے بھی ثابت کر دوں گا۔"

سعدونہ کی اداسی برقرار تھی، بولی: "آپ ازابلا کو طلاق دے دیں۔"

قاضی نے اٹل لہجے میں جواب دیا: "میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

سعدونہ نے ایک دوسری تجویز پیش کی: "اچھا اگر ازابلا کو طلاق نہیں دیتے تو نہ سہی، اُس سے کوئی اولاد نہیں ہونی چاہیے۔"

قاضی ہنسنے لگا: "یہ کیا مہمل اور فضول تجویزیں لا رہی ہو۔ اولاد تو خدا کی دین ہے وہ جس کو چاہے دے دے، میں اُس کو کس طرح روک سکتا ہوں، واہ وا، ماشاءاللہ۔ اس میں انسان کا کیا دخل؟"

سعدونہ نے جب یہ دیکھا کہ قاضی اس کی کوئی بات مان ہی نہیں رہا تو اپنی آخری تجویز بھی پیش کر دی، کہا: "اچھا، تب پھر آپ کم از کم اسحاق ہی سے دست کشی اختیار کر لیجئے۔"

قاضی نے بُرا سا منہ بنایا، بولا: "دیکھ سعدونہ! اسحاق ہم سے کچھ بھی تو نہیں مانگتا۔ وہ عیسائی ہے لیکن وہ اسلامی درس گاہوں سے مسلمان ہو کر نکلے گا۔ میں ایک مسیحی کو مسلمان کر کے دین اور دُنیا میں سُرخروئی حاصل کروں گا اور تو چاہتی ہے کہ میں اس سے محروم ہو جاؤں۔"

سعدونہ دوبارہ لیٹ گئی، دل برداشتہ لہجے میں بولی: "میں جانتی ہوں کہ آپ میری ایک بات بھی نہیں مانیں گے، خیر۔۔۔ آپ جو چاہیں کریں، دین و دنیا کا ثواب لوٹیں، یتیم اور بے آسرا بچوں کے باپ بن جائیں، مجھے کیا۔" پھر وہ ایکدم گرم ہو گئی اور اونچی آواز میں بولی: "دیکھیے جناب! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دُنیا میں میں اکیلی ہوں، تو یہ آپ کی بھول ہو گی۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے، میرے لیے یہی کافی ہے۔"

قاضی نے دیکھا اور باہر جاتے ہوئے کہا: "سعدونہ! اچھا ہوا جواز ابلا والی بات تجھے معلوم ہو گئی۔ اب تک اس کی بڑی حق تلفی ہوتی رہی۔ مگر اب میں، اللہ نے چاہا تو انصاف کر سکوں گا۔"

قاضی باہر چلا گیا اور سعدونہ اس کے جاتے ہی زور زور سے رونے لگی: "قاضی سعید! بخدا اگر آپ نے میرے بچے کے ساتھ زیادتی کی اور انصاف نہ کیا تو میں بھی ازابلا اور اس کے بیٹے کو دیکھ لوں گی۔"

قاضی سعید اب ایک نئی کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ اس خبر سے بے حد خوش تھا کہ سعدونہ صاحب اولاد ہو جائے گی۔ اس کا دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اپنے بچے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس نے تصور میں اسحاق کو ہمکتے ہمکتے دیکھا۔ وہ بےکس بچہ دیکھا۔ قاضی چونک گیا کیونکہ مجبور اور بے کس اسحاق کے لیے اس کے دل میں پہلی جیسی تڑپ نہیں رہ گئی تھی۔



وزیر منصور ابن ابی عامر نے قاضی سعید کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ پورے قرطبہ کے عدالتی نظام کا جائزہ لے اور قاضیوں کی کارکردگی سے حکومت کو مطلع کرے۔ منصور ابن ابی عامر کچھ عرصے سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ کئی قاضی من مانی کر رہے ہیں اور انہیں اپنے فرائض منصبی کا ذرا بھی احساس نہیں۔

قاضی سعید نے قرطبہ کے طول و عرض اور منصب قضاۃ پر فائز قاضیوں کا اندازہ جو لگایا تو یہ معلوم ہوا کہ اس میں تیس دن ضرور لگ جائیں گے۔ اس نے اپنے دورے کی ساری تیاریاں مکمل کر لیں اس کے بعد اپنی بیوی سعدونہ کو مطلع کیا کہ وہ کم از کم تیس دنوں کے لیے دورے پر جا رہا ہے۔

سعدونہ نے حالتِ اضطراب میں کہا: "کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ میں دس بارہ دن میں ماں بن جاؤں گی؟"

قاضی کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا، بولا: "کیا واللہ! تو نے مجھے خوش کر دیا۔ خدا تجھے خوش رکھے۔"

سعدونہ نے کہا: "کیا آپ اپنے دورے کو کم از کم پندرہ دن کے لیے ملتوی نہیں کر سکتے؟"

قاضی نے جواب دیا: "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، کسی حال میں بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔"

سعدونہ نے صبر کر لیا، مزید اصرار نہیں کیا۔ قاضی اُسے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ گھر واپس آئے گا تو اپنے گھر میں ایک نومولود بچہ اس کی گود میں آنے کے لیے ہمک رہا ہو گا۔ بچے کے شدید تصور نے اُس کے ارادے میں بیزاری اور غیر مستقل مزاجی پیدا کر دی۔ وہ سیدھا منصور ابن ابی عامر کے پاس پہنچا اور کہا۔

"وزیر محترم! کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ میں ایک ماہ بعد دورے پر نکلوں؟"

وزیر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، بولا: "کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں تیری اس قسم کی باتوں سے ہذیان میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور قاضی سعید! کان کھول کر میری یہ بات سُن لو کہ آئندہ میں اس قسم کی بے ہودگی برداشت نہیں کروں گا۔"

قاضی سعید اپنا سا منہ لے کر وہاں سے اٹھ آیا۔ اس نے گھر آکر پہلا کام یہ کیا کہ ایک بوڑھی عورت کا انتظام کر دیا جو سعدونہ کے ساتھ

گھر میں رہ سکے۔ اِدھر سے مطمئن ہونے کے بعد وہ ازابلا کے پاس چلا گیا۔ اس بار وہ ازابلا کے پاس کئی دن بعد گیا تھا۔ ازابلا اس سے ناراض بیٹھی تھی۔ اس نے قاضی کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر ازابلا کے پاس ہی بیٹھ گیا اور کہا: "ازابلا! میں کافی دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں۔"

ازابلا سب کچھ بھول گئی اور بے اختیار پوچھا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

قاضی سعید نے ساری تفصیل بتا دی اور آخر میں کہا: "ازابلا! میں مجبور ہو گیا ہوں معلوم نہیں کیوں وزیر منصور ابن ابی عامر اس پر مصر ہے کہ میں فوراً دورے پر نکل جاؤں۔"

ازابلا نے کہا: "بہتر ہے، میں تو تمہارہ لوں گی کیونکہ میں تنہا رہنے کی عادی ہوں مگر آپ کی چہیتی بیوی سعدونہ آپ کی عدم موجودگی میں کیا کرے گی؟"

قاضی سعید نے جواب دیا: "ازابلا! مجھے افسوس تو سعدونہ ہی کا ہے مگر وہ صابر و شاکر عورت بھی مان گئی۔"

قاضی کو بھی فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ ازابلا سے معذرت کرنے لگا۔

وہ کئی گھنٹے ازابلا کے ساتھ رہ کر چلا گیا۔

اس نے اپنے سفر کا آغاز قرطبہ کے آخری شمالی شہر غافق سے کیا۔ قرطبہ سے دو دن کی مسافت کا یہ شہر اس اعتبار سے بہت مشہور تھا کہ یہاں صدیوں پہلے ابوالحسن علی بن محمد نامی ایک بزرگ پچپن سال تک مقدمات کے فیصلے کرتے رہے۔ قاضی نے یہاں کے قاضیوں کو سست اور آرام طلب پایا۔ اس نے مقامی قاضیوں کی اچھی طرح خبر لی۔ آخر میں قاضی ابوالحسن علی بن محمد کے مزار پر گیا، فاتحہ پڑھی اور ان سے دعاؤں کا طالب ہوا۔

پھر وہ سات میل دور بطروش چلا گیا۔ قرطبہ کے شمال مشرق میں تقریباً سبھی امام مالکؒ کے پیرو تھے۔ یہاں کے قاضیوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں سے وہ المدور چلا گیا۔ دریا وادی المدور یہاں کے لوگ بڑے ہنس مکھ تھے۔ یہاں سے وہ قرطبہ واپس گیا۔ قرطبہ والوں نے قاضی کی کچھ ایسی مدارات کیں کہ وہ حیران رہ گیا۔ ربضوں (محلوں) کا یہ شہر بڑا وسیع و عریض تھا۔ یہاں کے قاضیوں نے قاضی سعید کی دعوتیں شروع کر دیں۔ وہ اگر چاہتا تو یہاں سے اپنے اور ازابلا کے گھر جا سکتا تھا لیکن وہ نہیں گیا۔ اس دوران لوگوں نے جب ابن ابی عامر کو یہ بتایا کہ قاضی سعید کئی راتوں سے مسلسل کام کرتا رہا تھا۔ اس نے یہاں کی بابت اپنے جائزے میں لکھا:

"قرطبہ کے قاضی دلیر، حق پرست اور مہمان نواز تھے۔"

قرطبہ سے وہ بیانہ چلا گیا۔ یہاں اس نے روغن زیتون نکالنے والے

لوگوں کے گھر دیکھے۔ یہ لوگ اپنے گھروں کی سجاوٹ پر خاص توجہ دیتے تھے۔ یہیں وہ کاریگر بھی بستے تھے جن کے بنائے ہوئے [illegible] یہاں کے [illegible] خاص توجہ نہیں دی۔ قاضی سعد نے اُن کی بابت لکھا: "چونکہ یہ لوگ اچھے اور کھرے ہیں اس لیے کسی کی خوشامد نہیں کرتے۔"

یہاں سے وہ الیسانہ چلا گیا۔ الیسانہ میں ہر طرف یہودی ہی یہودی نظر آتے تھے۔ ایک چھوٹا سا دریا جو دریائے شنیل کا معاون ندیا کہلاتا تھا، الیسانہ کے کنارے سے گزر گیا تھا۔ یہاں کے قاضیوں کو یہ پریشانی تھی کہ یہودی اُن کے فیصلے نہیں مانتے تھے۔

اس طرح وہ تقریباً پینتالیس روز تک حالتِ سفر میں رہا۔ اس نے اپنے سفری جائزے میں لکھا کہ تقریباً ہر قاضی ان خیالوں میں مگن تھا کہ وہ قاضی ہے اور اس کے اختیارات نہایت وسیع ہیں۔ اس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ قاضیوں کو ڈھیل ہرگز نہ دے اور ہر ماہ کوئی نہ کوئی دورہ کرتا رہے تاکہ اُن پر خوف طاری رہے۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو وہاں لڑکا پیدا ہو چکا تھا۔ سعدونہ بہت خوش تھی۔ اس نے قاضی سعد پر کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ لڑکے کی ولادت نے اسے کسی حد تک مغرور کر دیا تھا۔ قاضی سعدونہ کے پاس بچے پر جھک گیا۔ سعدونہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

قاضی نے پوچھا: "آج کتنے دن کا ہو چکا ہے؟"

سعدونہ نے جواب دیا: "دس دن کا۔"

قاضی نے کہا: "یہ تو بہت خوبصورت ہے۔"

سعدونہ نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ بولی: "بالکل آپ کی طرح ہے۔"

جب قاضی نے بچے کو گود میں لینا چاہا تو سعدونہ نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولی: "نہیں جناب! ابھی نہیں۔"

قاضی نے کھسیا کر پوچھا: "ابھی نہیں، تب پھر کب؟"

سعدونہ ازابلا کو قطعاً بھی نہیں بھولی تھی۔ بولی: "ازابلا کو طلاق دینے کے بعد اور اسحاق سے بری الذمہ ہونے کے بعد۔"

قاضی نے دیکھا سعدونہ مسکرا رہی تھی۔ قاضی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ پوچھا: "سعدونہ! تو نے یہ بات ازراہِ مذاق کہی ہے یا سنجیدگی سے؟"

سعدونہ نے اس کا جواب ہی نہیں دیا۔ بولی: "کیا آپ نے اس کے سر کی ساخت پر غور کیا؟ بالکل آپ جیسی ہے۔"

قاضی نے پوچھا: "سعدونہ! بات نہ ٹال۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟"

سعدونہ نے بچے کا ہاتھ چوم لیا۔ پوچھا: "آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟"

قاضی نے [illegible] بڑھایا اور اس بار پھر سعدونہ نے بچے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا: "ابھی نہیں۔"

قاضی نے پھر وہی سوال کیا: "ابھی نہیں تو کب؟"

سعدونہ نے جواب دیا: "جب اس کی گردن ٹھہر جائے تب۔"

قاضی اداس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ سعدونہ اس کی کیفیت کو خوب سمجھ رہی تھی۔ بات ٹالنے کی غرض سے بولی: "آپ کا کام پورا ہو گیا؟"

قاضی نے رکھے لہجے میں جواب دیا: "ہاں پورا ہو گیا۔"

سعدونہ نے جلانے کے لیے پوچھا: "اب پھر کب جائیے گا؟"

قاضی نے جواب دیا: "پتہ نہیں۔"

سعدونہ نے کہا: "دیکھیے اب مجھے بانجھ نہ کہیے گا۔"

قاضی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سعدونہ پھر بولی: "میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے یہ پیارا سا بیٹا دیا۔"

قاضی نے ایک بار پھر بچے کو لینا چاہا۔ بولا: "سعدونہ! کیا بات ہے کیا یہ میرا بچہ نہیں ہے؟"

سعدونہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے: "یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟"

قاضی نے کہا: "اگر یہ میرا بچہ ہے تو مجھے گود میں لینے کیوں نہیں دیتی؟"

سعدونہ نے کوئی جواب دیے بغیر بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اس سے باتیں کرنے لگی: "جس نے میری ماں کو دکھ پہنچایا ہے میں اس کی گود میں کیوں جاؤں؟ جس نے ایک مسیحی لڑکے کو اپنا بیٹا لیا میں اس کا بیٹا کیوں بنوں؟"

قاضی نے سعدونہ کو ڈانٹ دیا: "سعدونہ! اب یہ بکواس بند کر۔ میں ازابلا کو طلاق نہیں دے سکتا۔ میں اسحاق کو بدستور تعلیم دلاتا رہوں گا۔"

سعدونہ نے نہ تو قاضی کی طرف دیکھا اور نہ ہی اس کی کسی بات کا جواب دیا۔ وہ اب بھی اپنے بچے ہی سے مخاطب تھی۔ بولی: "میں تیرا نام نصر رکھوں گی تاکہ نصرت تیرے ہم رکاب رہے۔ تو تیرا نصر ہے، میرا بیٹا، میرے خاندان، میری قوم اور زمانے بھر کا نصر۔ خدا تجھے عمرِ نوح عطا فرمائے۔"

قاضی کو ایسا لگ رہا تھا گویا یہ اس کا نہیں، سعدونہ اور صرف سعدونہ ہی کا بیٹا ہے۔ قاضی اپنی بے عزتی سی محسوس کر رہا تھا۔

جب قاضی وہاں سے جانے لگا تو سعدونہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "سنیے، میری بات سنیے۔"

قاضی رک گیا۔ پوچھا: "کیا بات ہے؟"

سعدونہ نے پوچھا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

قاضی نے کہا: "مجھے نہیں معلوم۔ تو مجھے گھر سے نکال رہی

ہے، میں نکل رہا ہوں، بس۔"

سعدونہ نے کہا: "میں نے اپنے بچے کا نام نصر رکھ دیا ہے، آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

قاضی نے کہا: "تو مجھے اس خوشی میں شریک ہی کب کر رہی ہے۔"

سعدونہ نے جواب دیا: "میں آپ کو اس خوشی میں شریک کروں یا نہ کروں لیکن یہ بیٹا ہے تو آپ ہی کا۔"

قاضی نے کہا: "مجھے نصر نام ذرا بھی پسند نہیں۔ میں اس کا نام فضل رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ ہمارے گھر میں ہمارا افضل ہے۔"

سعدونہ نے کہا: "لیکن میں نے اس کا نام نصر رکھ دیا ہے۔ میری جیت ہے میری فتح ہے۔"

قاضی سوچ رہا تھا، آج سعدونہ کچھ اور ہی ہے۔ یہ وہ سعدونہ نہیں تھی جس کو وہ چالیس پینتالیس دن پہلے چھوڑ گیا تھا۔

سعدونہ نے کہا: "آپ کہیں جا رہے تھے۔"

قاضی نے رنج ہو کر پوچھا: "تم نے مجھے روکا کیوں تھا؟"

سعدونہ نے جواب دیا: "یوں ہی، کسی خاص وجہ سے نہیں۔"

قاضی نے کہا: "اچھا اب میں جا رہا ہوں تجھ کو کچھ کہنا ہے؟"

سعدونہ نے جواب دیا: "میں کیا کہوں گی، مجھے کچھ بھی نہیں کہنا، آپ جا سکتے ہیں۔"

قاضی کو ایسا لگا جیسے سعدونہ نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا ہو۔ وہ غصے میں پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ دیر تک ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں جائے اور کس سے اپنا دکھ درد بیان کرے۔ وہ گھومتا پھرتا دریائے کبیر کے پل پر پہنچ گیا۔ باب القنطرہ اس کے سامنے تھا۔ یہ ڈھلوان پل جو جنوب سے شمال کی طرف کچھ کچھ جھکا ہوا تھا۔ قاضی پل پر کھڑے ہو کر سست رو دریا کی سطح دیکھنے لگا۔ یہیں سے اس نے جامع مسجد قرطبہ کے مینارے دیکھے اور بے چین ہو گیا۔ مغربی سمت کا مینارا درختوں کے اوپر سر اٹھائے کھڑا تھا۔

اس نے پل کو چھوڑ دیا اور جامع مسجد میں چلا گیا۔ یہاں اس نے بے شمار ستونوں کے درمیان کھڑے ہو کر دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی جب وہ دونوں ہاتھ دراز کیے ہوئے توبہ و استغفار کر رہا تھا، اس نے کہا: "بارِ الٰہی! یہ تو نے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے مجھے۔"

اس کی آوازیں ستونوں اور ہالوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ [illegible] تو دلوں کا حال جاننے والا ہے تو جانتا [illegible] میری بیوی [illegible] ہے [illegible] اور [illegible] عقل [illegible]

وہ دیر تک یوں ہی گڑگڑاتا رہا، پھر اس کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ اس نے مڑ کر جو اچانک دیکھا تو وہاں ایک آٹھ نو سالہ بچہ کھڑا ہوا تھا۔ قاضی نے اس لڑکے کو پہچان لیا، یہ اسحاق تھا ازابلا کا بیٹا۔ نماز پڑھنے آگیا تھا۔ قاضی نے اسحاق کو سینے سے لگا لیا اور پوچھا: "بیٹے! تو یہاں کہاں؟"

اسحاق نے جواب دیا: "بابا جان! میں نماز پڑھنے اکثر یہاں آجاتا ہوں۔"

قاضی کو اسحاق کا جواب بہت اچھا لگا، کہا: "ہاں بیٹے! تم نماز ہرگز نہ چھوڑنا۔"

قاضی نے اسحاق کا ہاتھ پکڑ لیا اور مسجد سے باہر آگیا، پوچھا: "بیٹے! تو اس وقت کہاں جائے گا؟"

اسحاق نے جواب دیا: "ماں کے پاس۔"

قاضی نے کہا: "اچھا تب پھر چل میں بھی وہیں چل رہا ہوں۔"

قاضی اسحاق کے ساتھ ازابلا کی طرف روانہ ہو گیا۔ قاضی کو اس معصوم پر رحم آ رہا تھا۔ جب وہ نانبائیوں کے محلے کے سامنے سے گزرے تو ان کی ناک میں گرم گرم روٹیوں کی خوشبو داخل ہوگئی، اور انھیں بھوک لگنے لگی۔ پن چکیوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ قاضی نے دیکھا، اسحاق کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہے، پوچھا: "اسحاق بیٹے! کیا بات ہے؟ تو کیا سوچ رہا ہے؟"

اسحاق نے شرما کر جواب دیا: "کچھ بھی نہیں، مجھے اپنی ماں یاد آرہی ہے۔"

قاضی نے اسحاق کے دائیں گال پر ہلکی سی چپت رسید کر دی، کہا: "ماں یاد آرہی ہے، وہیں تو چل رہے ہیں ہم دونوں۔"

کچھ دیر بعد دونوں ازابلا کے در پر پہنچ گئے۔ قاضی نے آہستہ سے دستک دی اور جب دروازہ کھلا تو دروازے کے پیچھے ازابلا کھڑی نظر آئی۔ ازابلا کی نظر اسحاق پر جیسے ہی پڑی اس نے فرطِ محبت سے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ قاضی اسحاق سے قرابت سی محسوس کرنے لگا۔

قاضی ازابلا کے پاس ہی کھڑا تھا مگر ازابلا اس پر کسی قسم کی توجہ نہیں دے رہی تھی۔ قاضی سوچ رہا تھا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ جب ازابلا اپنے بیٹے کو لے کر اندر جانے لگی تو قاضی نے کہا: "کیا بات ہے ازابلا! مجھ کو اندر نہیں بلاؤ گی؟"

ازابلا نے بے رخی سے جواب دیا: "آپ اندر آسکتے ہیں۔"

قاضی بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ یہاں صحن میں انگوروں کی چھت کے نیچے تینوں تپائیوں پر بیٹھ گئے۔

ازابلا قاضی سے مخاطب ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے بھی اپنے بیٹے [illegible] ہی کو مخاطب کیا: "آرزک! تم نے جتنا کچھ پڑھ لیا،

قاضی نے ازابلا کو ٹوک دیا: "ازابلا! یہ آزرک نہیں اسحاق ہے۔"

ازابلا نے بحث نہیں کی۔ قاضی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر جواب دیا: "نہیں، یہ اسحاق نہیں آزرک ہے۔"

قاضی نے نہایت تحمل سے کہا: "ازابلا! شاید میں بڑا بدقسمت انسان ہوں۔"

ازابلا نے کوئی جواب نہیں دیا، اسحاق کو اندر لے گئی۔ قاضی باہر صحن ہی میں بیٹھا رہ گیا۔

ازابلا نے اس کو اندر لے جا کر سمجھایا: "بیٹے آزرک! اسلامی درس گاہ میں تجھے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب میں تجھے مسیحی درس گاہ میں داخل کرا دوں گی۔"

قاضی یہ کہتا ہوا اندر داخل ہو گیا: "ایسا نہیں ہو گا ازابلا! یہ مسیحی درس گاہ میں نہیں پڑھے گا۔"

ازابلا نے قاضی کو منع کیا: "آپ خاموش رہیں۔ آزرک میرا بیٹا ہے۔"

قاضی نے جواب دیا: "صرف تیرا ہی نہیں میرا بھی تو ہے۔"

ازابلا نے کہا: "پہلے تھا لیکن اب نہیں ہے۔ خدا کے لیے قاضی صاحب ایسی باتیں اب نہ کیجیے۔"

قاضی نے کہا: "ازابلا! تو کہنا کیا چاہتی ہے ذرا صاف صاف بتا دے۔"

ازابلا نے جواب دیا: "قاضی صاحب! اب آپ خداوند مسیح کے فضل سے صاحب اولاد ہو چکے ہیں۔ آپ کی بانجھ بیوی نے لڑکا پیدا کر دیا۔ جب گھر میں اپنا لڑکا موجود ہو تو کسی اور کا بیٹا لینے یا پالنے سے حاصل؟"

قاضی نے کہا: "تو یہ خبر یہاں تک آ چکی ہے۔"

ازابلا نے کہا: "کیوں؟ کیا آپ اگر ایک خبر چھپائیں گے تو کوئی دوسرا اسے بازار میں پہنچا دے گا۔ جو بات ہونٹوں سے نکلتی ہے وہ کوٹھوں پر چڑھ جاتی ہے۔"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تجھے میرے بچے کی ولادت کی خبر کس نے پہنچائی؟"

ازابلا نے جواب دیا: "آپ خود آدمی ہیں۔ آپ کی ہر بات جلد از جلد بازاروں، محلوں، گلی کوچوں میں پھیل جاتی ہے۔" اس کے بعد وہ پھر آزرک کو سمجھانے لگی: "بیٹے آزرک! میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ میں نے تجھ کو اسلامی درس گاہوں میں کیوں بھیج دیا۔ خداوند مسیح مجھے معاف فرمائیں۔ میں نے یہ کیا کر دیا تھا۔"

قاضی نے نہایت آہستہ سے کہا: "ازابلا! میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تیرے بیٹے کو اسلامی درس گاہ میں داخل کرا دیا تھا اور میں اس پر بھی شرمندہ ہوں کہ میں نے تجھ سے شادی کیوں کی تھی۔ بہرحال ابھی وقت نہیں گیا۔ وقت ہے، آ، ہم شریفوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔"

ازابلا بپھر کر قاضی کے سامنے آ گئی: "قاضی صاحب! آپ نے سوچا بھی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا: "ہاں میں نے جو کچھ کہا ہے خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے۔"

ازابلا روہانسی ہو گئی: "اگر اس طرح اچانک یہ سلسلہ ختم ہی کرنا تھا تو جوڑا کیوں تھا؟"

قاضی نے جواب دیا: "رشتہ میں نے جوڑا تھا اور اسے توڑ رہا ہوں تیری ایما، تیری خواہش پر۔"

ازابلا نے تند و تیز لہجے میں پوچھا: "میری ایما، میری خواہش پر! وہ کس طرح؟"

قاضی نے جواب دیا: "ہم دونوں میں شادی سے پہلے جو معاہدہ ہوا تھا اس میں آزرک کا مسئلہ بھی شامل تھا اور آج تو نے اپنے طور پر مجھ سے مشورہ لیے بغیر اسے ختم کر دیا ہے، اس کو توڑ دیا ہے۔ یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟"

ازابلا نے کہا: "قاضی صاحب! آپ خود سوچیں اب آپ کو آزرک کی ضرورت نہیں رہی۔"

قاضی نے پرجوش لہجے میں کہا: "تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ مجھے اسحاق کی ضرورت نہیں رہی۔"

ازابلا نے کہا: "آپ جذباتی ہو رہے ہیں ورنہ سیدھی سچی بات تو یہ ہے کہ اب آزرک کی وہ اہمیت نہیں رہ گئی جو پہلے تھی۔"

قاضی نے جواب دیا: "ازابلا! تو بات کو سمجھنے کی کوشش کر۔ اب میں ایک بچے کا باپ ہوں لیکن تجھ کو یہ نہیں معلوم کہ میں نے تم دونوں کی خاطر اپنے گھر میں کیسی جنگ لڑی ہے۔ سعدونہ مجھے تم دونوں کا طعنہ دیتی ہے اور میں اس سے بیزار ہو کر تم دونوں کے پاس چلا آتا ہوں۔ ازابلا! ذرا تو سوچ تو سہی کہ میں ان حالات میں سعدونہ اور اس کے بیٹے سے کس طرح خوش رہ سکتا ہوں۔ میں محبت کا بھوکا ہوں ازابلا! میں پیار چاہتا ہوں۔ اگر تم دونوں نے بھی مجھے ٹھکرا دیا تو میں پیار محبت کی تلاش میں کسی تیسری طرف نکل جاؤں گا۔"

لیکن ازابلا ذرا بھی نہیں پسیجی۔ اس نے کہا: "اگر آج آپ کے گھر میں حالات کشیدہ ہیں تو کل سدھر بھی سکتے ہیں۔ آپ ایمانداری سے سوچ کر بتائیں تو سہی کہ آپ کی اولاد کی موجودگی میں آزرک کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔"

قاضی نے جواب دیا: "ازابلا! حیثیت اور مقام انسانوں کے

دلوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد معاشرے میں۔ اسحاق کا مقام میرے دل میں ہے اور معاشرے میں مقام میں دلاؤں گا۔ تو کیوں فکر کرتی ہے؟"

شاید ازابلا لاجواب ہو چکی تھی، بولی: "بہرحال آپ کہتے ہیں تو میں مان لوں گی لیکن صرف زبان سے۔ دل نہیں مانتا۔"

اسحاق ان دونوں کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ اُسے قاضی میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی کہ اس کی ماں قاضی سے آخر کس بات پر الجھ رہی ہے۔

قاضی نے کہا: "تب پھر میں اسحاق کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں اس کو پڑھا لکھا کے ایک لائق انسان بنانا چاہتا ہوں۔"

ازابلا نے جواب دیا: "مجھے جو تشویش تھی میں نے ظاہر کر دی۔ اب یہ اسحاق سے پوچھیے کہ وہ آپکے ساتھ جائے گا یا نہیں؟"

اب قاضی اسحاق کی طرف متوجہ ہوا، بولا: "اسحاق بیٹے! تو میرے ساتھ چلے گا؟"

اسحاق پہلے تو اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوا، اس کے بعد ایک دم مڑ کر قاضی کو دیکھنے لگا، پوچھا: "اور آپ کہاں رہیں گے قاضی چچا! میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

وہ دوڑ کر قاضی سے چمٹ گیا، ازابلا اس دردناک منظر کو نہیں دیکھ سکی، وہ سامنے سے ہٹ گئی۔

قاضی نے ازابلا کے گھر میں سارا وقت خوشگوار باتوں میں گزار دیا اور جب چلنے لگا تو اسحاق کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: "ازابلا! میں اسے لیے جا رہا ہوں۔"

ازابلا نے جواب دیا: "اب ایسی بھی کیا جلدی، اس کو دو چار ہفتے میرے پاس رہنے دیجیے۔"

قاضی نے کہا: "ازابلا! اس کا وقت مت ضائع کر، یہ تیرے پاس آتا جاتا رہے گا۔"

قاضی نے اسحاق کو دوبارہ ایک درس گاہ میں داخل کرا دیا۔

قاضی اسحاق پر خصوصی توجہ دے رہا تھا مگر سعدونہ کو یہ باتیں بہت بری طرح پریشان کر رہی تھیں۔ اسے جب بھی موقع ملتا، قاضی سے یہی کہہ دیتی کہ ازابلا کو طلاق دے دو اور اسحاق سے دست کش ہو جاؤ مگر اب قاضی نے سعدونہ کی ان باتوں کو سننا ہی ترک کر دیا تھا۔

اسحاق اسلامی درس گاہوں میں پڑھتا رہا اور اس پر اسلامی رنگ چڑھتا رہا۔ اس نے علم حدیث، فقہ، صرف و نحو، ادب اور فلسفہ اتنی محنت سے حاصل کیا تھا کہ دوسرے لڑکے رشک و حسد میں مبتلا ہو چکے تھے۔

دوسری طرف سعدونہ کا بیٹا نصر بڑا ہو رہا تھا۔ سعدونہ قاضی سے اسی طرح پیش آتی جس طرح نصر کی پیدائش کے بعد پیش آتی تھی لیکن جب نصر پانچ چھ سال کا ہو گیا تو چالاک قاضی نے اس پر شفقتوں اور محبتوں کی بھرمار کر دی۔ نصر آہستہ آہستہ قاضی کی طرف راغب ہوتا چلا گیا۔ شروع شروع میں سعدونہ کو یہ باتیں تکلیف پہنچاتی رہیں لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی اور اس نے نصر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

نصر بھی مدرسے میں داخل ہو چکا تھا۔ نصر کو کبھی کبھی قاضی اپنی عدالت میں لے جاتا۔ یہاں اسحاق بھی ہوتا تھا۔ عدالت کے کارندے اسحاق کی بھی بڑی عزت کرتے تھے مگر جب نصر آنے جانے لگا تو اسحاق کی توقیر میں کمی ہونے لگی۔

اسحاق جب اپنی ماں ازابلا کے پاس جاتا تو وہ پہلا سوال یہی کرتی کہ "قاضی تجھ سے کس طرح پیش آتا ہے؟"

اور اسحاق پُر مسرت لہجے میں جواب دیتا: "بہت اچھی طرح۔"

ازابلا پوچھتی: "اور قاضی کے کارندے؟"

اسحاق جواب دیتا: "وہ بھی میری بڑی عزت کرتے ہیں۔"

اس کے بعد ازابلا پوچھتی: "اور وہ۔ کیا کہتے ہیں اس کو قاضی کا بیٹا نصر۔ کیا وہ بھی آتا ہے؟"

ان دنوں وہ نہیں آتا تھا، اسحاق جواب دیتا: "نہیں ماں! وہ نہیں آتا۔"

ازابلا خوب سوچ سمجھ کر پوچھتی: "قاضی کے آس پاس اٹھنے بیٹھنے والے لوگ جب تجھ کو قاضی کے پاس دیکھتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟"

اسحاق جواب دیتا: "وہ کہتے ہیں کہ قاضی کے بعد اس کی جگہ میں لوں گا۔ میں یعنی ماں! آپ کا بیٹا اسحاق۔"

ازابلا کا تجسس اپنی جگہ تھا وہ مزید پوچھتی: "اور جب یہ باتیں قاضی سنتا ہے تو کیا کہتا ہے؟"

اسحاق جواب دیتا: "وہ کہتے ہیں بیشک میری جگہ اسحاق لے گا۔"

یہ ساری باتیں ازابلا کو بے انتہا خوش کر دیتیں۔ اُسے بھی اب قاضی کی شرافت اور اسحاق سے بے انتہا محبت کا احساس ہو چکا تھا۔

دوسری طرف سعدونہ نے کچھ سوچ سمجھ کر اپنے بیٹے نصر کو قاضی کی عدالت میں بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نصر کو تنہائی میں یہی سمجھاتی۔ "بیٹے نصر! تو اپنے باپ کا اکلوتا ہے، اپنے باپ کے پاس اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گزار اور اُسے اپنی محبت کا اسیر کر لے۔"

لیکن سعدونہ یہ نہیں جانتی تھی کہ نصر اپنے باپ کو محبت کرنے پر مجبور کرے یا نہ کرے۔ اس کا باپ قاضی سعید البتہ اس کو اتنی محبت اتنی شفقت دے گا کہ نصر اس کا ہو کر رہ جائے گا۔

جب نصر نے عدالت میں پابندی سے جانا شروع کر دیا تو کارندوں اور دوستوں نے نصر کا احترام شروع کر دیا۔ جب نصر اور اسحاق دونوں ہی وہاں موجود ہوتے تو لوگ اسحاق کو نظر انداز کر دیتے اور نصر پر خصوصی توجہ دیتے۔

جب نصر گھر پہنچتا تو سعدونہ اس سے پوچھ گچھ شروع کر دیتی۔

وہ نصر سے پوچھتی: "تیرے باپ کے دوست احباب اور عدالت کے کارندے تجھ سے کس طرح پیش آتے ہیں؟"

نصر جواب دیتا: "بہت اچھی طرح۔ وہ سب مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔"

سعدونہ کھر کھر کر پوچھتی: "وہاں اور کون کون آتا ہے؟"

نصر جواب دیتا: "بہت سارے لوگ آتے ہیں مگر کیوں؟"

سعدونہ پوچھتی: "وہاں کوئی نوعمر لڑکا اسحاق بھی آتا ہے؟"

نصر جواب دیتا: "ہاں آتا تو ہے اس کے بیے لوگ کہتے ہیں تیرا رشتے کا بھائی ہے۔"

سعدونہ بپھر کر کہتی: "نہیں وہ تیرا بھائی نہیں ہے۔ خبردار جو تو نے اسے اپنا بھائی سمجھا۔"

اس کے بعد ہی سعدونہ نے نصر کو قاضی کی عدالت میں روز بھیجنا شروع کر دیا۔ وہ نصر کو خوب سکھاتی پڑھاتی رہتی۔ یہاں اسحاق قاضی سے تربیت لینے لگا تھا۔ قاضی کا خیال تھا کہ جب اسحاق تعلیم سے فراغت حاصل کرے گا تو وہ اسحاق کو ضرور اس لائق کر دے کہ اسے کہیں ملازم رکھ دیا جائے۔

قاضی سعید کو کئی بار کورہ قرطبہ (صوبہ قرطبہ) کا دورہ کرنا پڑا تھا اور ہر بار اس کا جائزہ اتنا بھرپور اور مدلل ہوتا تھا کہ وزیر ابن ابی عامر اس پر فخر کرنے لگا تھا۔ وزیر اسے انعام و اکرام سے نوازتا۔

وزیر منصور ابن ابی عامر نوعمر خلیفہ ہشام پر حاوی آیا ہوا تھا۔ ابن ابی عامر نے خلیفہ ہشام کو لوگوں سے دور رکھنے کے لیے ایک عجیب و غریب منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے خلیفہ کے مدینۃ الزہرہ کے مقابلے میں اپنا مدینۃ الزہرہ تعمیر کرایا تھا اور سارا کاروبار حکمرانی اپنے اسی نئے شہر میں اٹھا لے گیا تھا۔ خلیفہ کا مدینۃ الزہرا قرطبہ سے باہر تین چار میل دور شمال میں پہاڑی کے نیچے آباد کیا گیا تھا اور ابن ابی عامر کا مدینۃ الزہرہ قرطبہ کے مشرق میں بسایا گیا تھا۔ ابن ابی عامر نے خلیفہ ہشام کو بس اس حد تک باقی رکھا تھا کہ خطبوں میں منبر پر اس کے لیے دعا کی جاتی تھی اور اس کا نام سکے و طراز پر لکھا جاتا تھا۔

قاضی سعید نے اسحاق کے لیے ایک بار ابن ابی عامر سے ذکر کیا تھا۔ ابن ابی عامر نے قاضی کو یہ جواب دیا تھا کہ جب میں اس کو طلب کروں لے آنا۔ پھر کچھ کروں گا۔

قاضی سعید نصر کے ساتھ عدالت سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ابن ابی عامر کا آدمی پہنچ گیا۔ اس نے کہا: "قاضی محترم! کل آپ وزیر محترم سے علی الصبح مل لیں۔"

قاضی بہت خوش ہوا اور اسحاق سے کہا: "اسحاق بیٹے! اللہ نے چاہا تو اب تو بھی کچھ ہو جائے گا۔"

یہاں قاضی کے چند دوست بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے قاضی کو سمجھایا: "دوست! اسحاق آپ کا کیا لگتا ہے؟"

قاضی نے جواب دیا: "بیٹا۔"

دوست نے پوچھا: "کیا یہ نصر کا بڑا بھائی ہے؟"

قاضی نے جواب دیا: "نہیں، یہ نصر کا بڑا بھائی نہیں ہے۔"

ایک دوسرے دوست نے رشتے کی وضاحت کر دی: "نہیں بھائی! نصر کا بھائی نہیں ہے۔ اسحاق کی ماں ایک نصرانیہ ہے اور اسحاق اس کے پہلے شوہر کا بیٹا ہے۔"

قاضی کا دوست مسکرایا اور کہا: "دوست! یہ آپ کیا کر رہے ہیں! اگر آپ وزیر ابن ابی عامر سے کام لے سکتے ہیں تو نصر کے لیے لیجیے گا۔ ایک نصرانی کے لیے وزیر کا ذریعہ کیوں اختیار کر رہے ہیں؟"

قاضی نے اسحاق کی طرف دیکھا اس کے چہرے کا تاثر بتاتا تھا کہ وہ قاضی کے دوستوں کی باتوں سے بڑی اذیت محسوس کر رہا تھا۔

قاضی نے اپنے دوستوں کو جواب دیا: "یہ آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں! اسحاق میرا بیٹا ہے۔ میں نے اسے پڑھایا لکھایا اور اس قابل کیا کہ وزیر سے کام لیا جائے اور پھر یہ کون کہتا ہے کہ اسحاق نصرانی ہے۔ اسحاق مسلمان ہے۔"

اس دوست نے طنزیہ کہا: "اس کے اسلام کو میں نہیں مانتا۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ آپ کو جو کچھ کرنا ہے نصر کے لیے کیجیے۔"

قاضی شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ اس نے کہا: "اچھا دوستو! تم نے بہت دل دکھا لیا، اب رحم کرو اور اپنا راستہ لو۔ تمہارے مشوروں کا بہت بہت شکریہ۔"

دوست تو چلے گئے مگر اسحاق اور نصر کو سوچنے کے لیے بہت کچھ دے گئے۔

چونکہ دوسرے دن ابن ابی عامر کے پاس علی الصبح پہنچنا تھا اور اسحاق کو اپنے ساتھ لے جانا تھا اس لیے قاضی نے اسحاق کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ اس نے کہا: "بیٹے اسحاق! آج تو میرے ساتھ میرے گھر چلے گا تاکہ کل علی الصبح تجھ کو وزیر کے پاس لے جاؤں۔"

اسحاق نے جواب دیا: "بابا جان! میں اپنی ماں کے پاس جاؤں گا۔"

قاضی نے اصرار کیا: "لیکن کل صبح ہمیں وزیر کے پاس پہنچنا ہے۔"

اسحاق نے کہا: "لیکن میں وزیر کے پاس نہیں جاؤں گا میرے لیے کہیں اور کوشش کر دیجیے گا۔"

قاضی سمجھ گیا کہ اسحاق ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "بیٹے! میرے دوستوں نے جو باتیں کہیں ان سے تیرا کوئی تعلق نہیں۔"

لیکن اسحاق مزید بات کیے بغیر ہی اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔

نصر نے راستے میں اپنے باپ سے پوچھا: "بابا جان! کیا اسحاق میرا بھائی

نہیں ہے"

قاضی نے بدمزگی سے جواب دیا "بھائی ہے۔"

نصر نے پھر پوچھا "کیا اسحاق نصرانی ہے، مسلمان نہیں ہے؟"

قاضی نے گھبرا کر جواب دیا "بیٹے نصر! اسحاق مسلمان ہے، نصرانی نہیں ہے۔"

نصر نے معصومیت سے پوچھا "بادا جان! اگر وہ میرا بھائی ہے تو وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتا۔ یہ روز چلا کہاں جاتا ہے؟"

اب قاضی لاجواب اور بے بس ہو چکا تھا۔ اس کو غصہ آ گیا بولا "نصر! فضول باتیں نہیں کرتے۔"



اُس دن قاضی نصر کو گھر چھوڑ کر ازابلا کے پاس چلا گیا۔ وہاں کی فضا حد سے زیادہ کشیدہ تھی۔ اس وقت ازابلا اور اسحاق انگور کے سائے میں بیٹھے تھے اور دونوں ہی بہت زیادہ سوگوار اور فکرمند تھے۔ ازابلا نے قاضی کو دیکھتے ہی بڑبڑانا شروع کر دیا "آپ کے وہ دوست کہاں چلے گئے جنھیں میرا بیٹا نصرانی نظر آتا ہے؟"

قاضی نے خفت زدہ لہجے میں جواب دیا "ازابلا! اب اس بات کو ختم کرو۔ آج میرے دوستوں نے مجھے بہت زیادہ شرمندہ کر دیا۔"

اسحاق وہاں سے جانے لگا تو قاضی نے روک دیا۔ پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

اسحاق نے جواب دیا "میں کہیں جاؤں گا نہیں، ذرا باہر جاؤں گا اور پھر آ جاؤں گا۔"

قاضی نے کچھ سوچ کر اسحاق کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔

اسحاق کے جانے کے بعد قاضی نے کہا "ازابلا! شاید تو یقین نہیں کرے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج میرے دوستوں نے مجھے حد درجہ شرمندہ کیا ہے۔ اُن سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔"

ازابلا نے کہا "جو بات آپ کے دوست کر گئے ہیں وہ اُن کی انتہا بات نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اور ہی ذات کارفرما نظر آتی ہے۔ لیکن آپ اس پر یقین نہیں کریں گے۔"

قاضی بہت کھسیایا ہوا تھا۔ بولا "آج تو جو کچھ بھی کہو گی، میں بے چون و چرا مان لوں گا۔"

ازابلا نے دھیمی آواز میں کہا "یہ آج جو کچھ پیش آیا ہے میں نے بہت پہلے ہی چشمِ تصور میں دیکھ لیا تھا۔"

قاضی نے ترش روئی سے کہا "میں یہاں فضول نہیں آیا ہوں، ایک مقصد لے کر آیا ہوں۔"

ازابلا نے جواب دیا "میں جانتی ہوں آپ اس وقت یہاں کیوں آئے ہیں۔"

قاضی نے کہا "یہ اسحاق کہاں چلا گیا؟"

ازابلا نے جواب دیا "کہیں باہر اپنے دوستوں میں ہو گا۔"

قاضی نے کہا "یہاں کے لوگ بہت ہی ملنسار نظر آتے ہیں۔"

ازابلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

قاضی نے پھر کہا "یہاں کے لوگ حد درجہ شریف اور سیدھے ہیں۔"

ازابلا نے جواب دیا "بہرحال مجھے اُن سے کیا لینا۔۔۔۔"

قاضی نے بات کاٹ دی، بولا "یہ خدا گواہ ہے ازابلا! میں نے نصر اور اسحاق میں کبھی بھی فرق نہیں کیا۔"

ازابلا بہت فکرمند تھی، اٹھ کر اندر جاتے جاتے کہا "میں نے آج تک گھر یلو سیاست کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن میں اپنے بیٹے کو تنہا و لاوارث نہیں چھوڑ سکتی۔ میں خوب سمجھ رہی ہوں کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔"

قاضی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی "ازابلا! تو اندر کیسے جا رہی ہے یہاں بیٹھ تاکہ میں تجھے سمجھا سکوں، مطمئن کر سکوں۔"

لیکن ازابلا ایسی اندر گئی کہ دیر تک باہر نہیں نکلی۔

قاضی ایک نئی افتاد کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ رات اس نے ازابلا ہی کے گھر گزاری۔ علی الصبح وہ اسحاق کو اس کی مرضی کے خلاف وزیر ابن ابی عامر کے پاس لے گیا۔ ابن ابی عامر کے شاندار محل کے باہر طالبانِ ملاقات کا بازار لگا ہوا تھا۔ اس بازار میں قاضی اور اسحاق بھی شامل تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دو دو تین تین آدمیوں کو اندر بلایا جاتا تھا اور ابن ابی عامر سے ملا کر رخصت کر دیا جاتا۔ کئی گھنٹے بعد جب اُن دونوں کی باری آئی تو اسحاق کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ اس نے قاضی سے کہا بھی کہ بادا جان! گھر واپس چلیے میرا تو دل گھبرا گیا۔

قاضی نے کہا "اسحاق! چپ رہ، یہ وزیر کا محل ہے یہاں تو انتظار کرنا ہی پڑتا ہے اپنی باری کا۔"

جب یہ دونوں وزیر کے سامنے پہنچے تو اس نے ان دونوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ اسحاق نے وزیر کو خاصا مغرور محسوس کیا۔ وزیر جس تخت پر براجمان تھا اس پر خوبصورت گل بوٹوں کے پھولوں کا غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ فرش پر نہایت قیمتی قالین تھا۔ اُن دونوں کو وزیر کے سامنے کھڑا رکھا گیا تھا کیونکہ ابن ابی عامر اپنے ملاقاتیوں کو زیادہ دیر تک نہیں روکتا تھا۔ بغلی دیوار سے متصل میز پر خشک اور تر میوے رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں اور دیواروں کو منقش پردوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ دیواروں کے اوپری حصوں میں خوبصورت مینا کاری تھی یا کاشی کا کام کیا ہوا تھا۔

اچانک ابن ابی عامر کی آواز سنائی دی "قاضی سعید! اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

قاضی سعید نے اسحاق کی طرف اشارہ کیا "وزیر محترم! یہ اسحاق میرا بیٹا ہے اس نے فقہ، حدیث، صرف و نحو اور ادب اور شاعری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے میں چاہتا ہوں اس کو کوئی شایانِ شان جگہ مرحمت

فرمائی جائے۔"

ابن ابی عامر نے اسحاق پر سرسری نظر ڈال کر قاضی کی طرف دیکھا۔ "یہ کس کا بیٹا ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "میرا۔۔۔ یہ میرا بیٹا ہے۔"

ابن ابی عامر نے کہا۔ "قاضی سعید! یہ تمہارا بیٹا کب سے ہو گیا میں نے تو سنا ہے کہ یہ نصرانی ہے، کسی نصرانیہ کا بیٹا۔"

قاضی نے جلدی جلدی صفائی پیش کی۔ "آپ نے جو کچھ سنا، درست سنا ہے، یہ یقیناً ایک نصرانیہ کا بیٹا ہے لیکن اب وہ نصرانیہ میری بیوی ہے۔ اور میں نے ہی اسے پال پوس کر بڑا کیا اور تعلیم و تربیت دلوا کر اس لائق کر دیا کہ آج آپ سے اس کی ملازمت کی بات کر رہا ہوں۔"

ابن ابی عامر نے قاضی کو سرزنش کی۔ "قاضی سعید! تم پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی ہو، کسی کے خانۂ ولدیت میں اپنا نام داخل کر کے گناہ گار مت بنو۔"

قاضی خاصا شرمسار ہو رہا تھا اور اسحاق اندر سے بالکل ٹوٹا پھوٹا جا رہا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب اسحاق نے حد درجہ احساس کمتری محسوس کیا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ ملازمت حاصل کیے بغیر ہی یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہاں قاضی اور ابن ابی عامر میں کیا باتیں ہو رہی تھیں، وہ آگے نہیں سن سکا ہاں اس نے یہ ضرور سنا کہ قاضی ابن ابی عامر کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ اب اسحاق مسلمان ہے اس لیے ایک نو مسلم نوجوان کا وزیر کو خاص خیال رکھنا چاہیے۔"

اور ابن ابی عامر نے جواب دیا۔ "قاضی سعید! تمہیں کچھ انتظار کرنا ہو گا، تھوڑا سا انتظار۔ میں اسے عنقریب غافق کا قاضی مقرر کر دوں گا۔"

اس کے بعد قاضی کا کام ختم ہو چکا تھا۔ یہ دونوں محل سے باہر آ گئے۔ قاضی خوش تھا کہ اس کا کام بن گیا تھا اور اسحاق کو عنقریب غافق کا قاضی مقرر کر دیا جائے گا مگر اسحاق کے دل و دماغ پر چند الفاظ ہتھوڑے کی ضربیں لگا رہے تھے۔ اسحاق ناصری ہے نصرانیہ کا بیٹا۔ قاضی اس کا کچھ بھی نہیں۔

قاضی نے اس کو عدالت لے جانا چاہا مگر اسحاق اپنے گھر چلا گیا۔ وہاں اس کی ماں ازابلا اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ جب چپ چاپ اداس اور فکر مند اسحاق گھر میں داخل ہوا تو ازابلا نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کام بنا یا نہیں؟"

اسحاق نے اپنی ماں کو اس طرح دیکھا گویا وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ازابلا اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ بولی۔ "آئزک بیٹے بتا بات کیا ہے؟ کیا ہوا؟ وزیر نے کیا کہا؟"

اسحاق نے بیزاری سے جواب دیا۔ "میں یہ تو بعد میں بتاؤں گا کہ وزیر نے کیا کہا، آپ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ میں آئزک ہوں یا اسحاق؟"

ازابلا اس سوال سے چکرا گئی۔ بولی۔ "آئزک اور اسحاق میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ہی ایک ہیں۔ ہم عیسائی آئزک کہتے ہیں اور مسلمان اسے اسحاق کہتے ہیں۔"

اسحاق نے پھر بیزاری سے سوال کیا۔ "ماں! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میں آئزک ہوں یا اسحاق؟"

ازابلا نے جواب دیا۔ "بیٹے! میں نے کہہ تو دیا کہ تو آئزک بھی ہے اور اسحاق بھی۔"

اسحاق چیخ کر بولا۔ "لیکن ماں میں دونوں ہی کس طرح ہو سکتا ہوں مجھے ایک ہی رہنے دیں، آئزک یا اسحاق۔ باہر لوگ مجھے نصرانیہ کا بیٹا کہتے ہیں، کوئی نصرانی کہتا ہے لیکن قاضی مجھے اپنا بیٹا کہتا ہے اور لوگ اس رشتے کو نہیں مانتے۔ ماں بتلائیے میں اب کیا کروں؟"

ازابلا نے جواب دیا۔ "تو لوگوں کی کیوں پروا کرتا ہے، تو قاضی کی بات مان کیونکہ وہی تیرا سب کچھ ہے۔"

اسحاق نے کہا۔ "ماں! یہ غلط ہے۔ قاضی میرا کچھ بھی نہیں۔ وہ اپنے رشتے کا کتنا ہی اعلان کرے لیکن لوگوں کی نظر میں میں نصرانی اور نصرانیہ کا بیٹا ہی رہوں گا۔"

ازابلا نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "بیٹے! لوگ حسد سے باتیں بناتے ہیں، تو اپنے کام سے کام رکھ۔ جب تو قاضی بن کر غافق چلا جائے گا تو باتیں بنانے والوں سے خود بخود تیرا پیچھا چھوٹ جائے گا۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ماں! آپ نے ایک مسلمان سے شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں نے اسلامی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کی اور مسلمانوں میں رہ کر مسلمانوں جیسا ہو گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرا باپ عیسائی تھا اور میری ماں اب بھی عیسائی ہے۔ میں نے اسلام کبھی بھی قبول نہیں کیا لیکن مسلمان کہلاتا ہوں۔ میں کیا ہوں، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔"

ازابلا ان جملوں کی تاب نہ لا سکی، بیٹے کو سینے سے لگا لیا، اور اپنی مجبوریاں گنائیں۔ "بیٹے! میں مجبور تھی۔ میں تجھ کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی تھی اور یہاں اسلامی درسگاہوں سے پڑھ کر ہی انسان بڑا آدمی بن سکتا ہے۔"

اسحاق نے بڑے کرب سے کہا۔ "اور اس کوشش میں میں بڑا انسان نہیں، گھٹیا انسان بن کر رہ گیا۔"

ازابلا نے اپنے چہرے کو رومال سے چھپا لیا اور روتی ہوئی

دوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ کمرے میں پہنچتے ہوئے قالین پر اوندھے منہ گر کر سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اسحاق کچھ دیر تو اس حرکت پر غور کرتا رہا۔ اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو باہر نکل گیا۔



اسحاق نے قاضی کے پاس آنا جانا بالکل ترک کر دیا۔ قاضی کو اسحاق سے محبت ہو گئی تھی اس لیے وہ دو دن برداشت کر کے تیسرے دن اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت اسحاق گھر ہی میں موجود تھا لیکن قاضی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر کہیں چلا گیا۔ ازابلا تو پہلے ہی سے بھری بیٹھی تھی چنانچہ قاضی نے جیسے ہی اس سے یہ پوچھا ”ازابلا! یہ تین دن سے اسحاق میرے پاس کیوں نہیں آ رہا ؟“

ازابلا نے جواب دیا۔ ”ایک نصرانی اور نصرانیہ کے بیٹے کا آپ کے پاس کیا کام ؟“

قاضی نے کہا۔ ”دیکھ ازابلا! یہ جو کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے میں مجبور ہوں، میں اسحاق کو اپنا بیٹا سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سمجھتا رہوں گا تو اسحاق کو سمجھا کہ جذباتی نہ بنے، جذباتی لوگ بڑی ناکام زندگی گزارتے ہیں۔“

ازابلا نے جواب دیا۔ ”اب میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔“ وہ روہانسی ہو گئی، آنکھیں بھیگ گئیں اور ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ ”وہ مجھ سے کہتا ہے کہ ماں تو نے ایک مسلمان سے شادی کیوں کی، بتائیے میں اس کا کیا جواب دوں ؟“

قاضی نے کہا۔ ”اسحاق ہے کہاں، اسے بلوا تو سہی — میں کوشش کروں گا کہ اس کے گلے شکوے دور کر دوں۔ میں نے سعدونہ کو ہموار کر لیا ہے اور میرا بیٹا نصر بھی اس کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہے۔ میں اس کے دل و دماغ سے احساسِ کمتری اور خیالِ محرومی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔“

ازابلا نے اپنے آنسوؤں کو انگلیوں پر لے لیا اور انھیں جھٹک کر بولی۔ ”وہ آپ کو دیکھتے ہی باہر چلا گیا۔ اس کو میں کہاں تلاش کروں گی۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بہر حال میں جاتا ہوں اور اس کو تلاش کر کے لاتا ہوں۔“

وہ اسحاق کو دیر تک تلاش کرتا رہا آخر اسے جامع قرطبہ کے سامنے سے پکڑ لیا۔ قاضی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”پیچھے مت دیکھنا بیٹے!“

قاضی نے اسحاق کو جب بھی بہلانے کی کوشش کی، اسحاق اور زیادہ برہم ہو گیا، بولا۔ ”اب آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

قاضی نے نہایت بردباری سے سمجھانا شروع کیا۔ ”بیٹے! مجھ سے ناراض ......“

اسحاق نے جواب دیا۔ ”میں کسی سے بھی ناراض نہیں اور نہ ہی مجھے کسی سے شکایت ہے۔ مجھے تو اپنی قسمت سے شکایت ہے اور بس۔ کسی سے بھی نہیں۔“

قاضی ان دونوں کے لیے انگور لایا تھا اور مالقہ کا انجیر بھی۔ ”رَبّی۔ بخدا مالقہ کے رَبّی کا کوئی جواب نہیں۔“ قاضی نے یہ پھل اسحاق کے سامنے رکھ دیے۔ اندلس والے مالقہ کے مشہور زمانہ انجیر کو رَبّی کہتے تھے۔

اسحاق کو قاضی پر رحم آ رہا تھا، جب قاضی اس کو ڈھونڈتا ہوا جامع قرطبہ تک پہنچا تھا تو اسحاق کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا تھا اور اب جو قاضی نے ازابلا اور اسحاق کے سامنے انگور اور انجیر رکھ دیے تو وہ بالکل ہی پسیج گیا۔ بالکل ہی نرم پڑ گیا۔ اسحاق نے انگور اور انجیر کھانا شروع کر دیے۔ ازابلا نے جو یہ منظر دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ خود بھی اپنے بیٹے کے ساتھ کھانے لگی۔

کچھ دیر بعد قاضی نے اسحاق سے پوچھا۔ ”بیٹے اسحاق! کیا بات ہے تو تین دن سے کہاں غائب ہے ؟“

اسحاق نے جواب دیا۔ ”آپ یہ سوال نہ کریں تو بہتر ہے۔“

قاضی نے کہا۔ ”میں یہ سوال تجھ سے ضرور کروں گا۔ بیٹے! تو نہیں جانتا کہ میں تیری خاطر کہاں کہاں اور کس کس سے لڑتا پھر رہا ہوں تو میرا بیٹا ہے میں تجھ کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔“

اسحاق نے برا سا منہ بنایا، بولا۔ ”میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں، میں نصرانی ہوں، ایک نصرانیہ کا بیٹا۔ خدا کے لیے آپ میرے خانۂ ابوّت میں اپنا نام لکھ کر گناہ گار نہ ہوں۔“

قاضی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اسحاق! میں نے تیری خاطر صرف تیری خاطر اپنی بیوی سعدونہ کو ہموار کیا۔ اب وہ تجھ سے نفرت نہیں کرے گی اور اب میں تجھ کو اپنے اس گھر میں بھی رکھ سکوں گا۔ نصر تجھ کو اپنا بڑا بھائی سمجھے گا اور میں تجھ کو غافق کا قاضی بنا دوں گا۔“

اسحاق کو قاضی پر رحم آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا قاضی کی شکل دیکھتا رہا، پھر وہ فرطِ جوش سے چمٹ گیا۔ قاضی نے اسے انتہائی گرم جوشی سے بھینچ لیا۔ ازابلا نے یہ منظر دیکھا تو خود بھی جذبات سے بے قابو ہو گئی۔

قاضی اسحاق کی پشت تھپتھپا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”بیٹے اسحاق! جب تک میں زندہ اور موجود ہوں میں تجھ کو شرمندہ یا ذلیل نہیں ہونے دوں گا۔ تو میرا بیٹا ہے خدا کے لیے تو بھی میرا خیال رکھ اور میرا دل نہ دکھا۔“

قاضی اس دن اسحاق کو اپنے گھر لے گیا۔ حالانکہ ازابلا نے اس کی مخالفت کی اور قاضی کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ ”فی الحال ایسا نہ کیجیے کیونکہ سعدونہ کا کوئی بھروسہ نہیں، وہ نصر کے مقابلے میں اسحاق

کو کس طرح برداشت کرے گی۔"

قاضی نے جواب دیا۔"ازابلا! سعدونہ کو میں نے سمجھا دیا ہے کہ اس کا بیٹا نصر بھی ایک نہ ایک دن پڑھ لکھ کر کوئی بڑا مقام حاصل کرے گا اور یہ کہ اسحاق کی وجہ سے نصر کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ اگر سعدونہ اسحاق کو بھی اپنا بیٹا مان لے تو اس کو دو بیٹے مل جائیں گے۔ شاید میری یہ باتیں سعدونہ کی سمجھ میں آگئی ہیں۔"

ازابلا نے کہا۔"ممکن ہے سعدونہ بدل گئی ہو لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔"

قاضی اسحاق کو لے کر سعدونہ کے پاس چلا گیا۔ اسحاق اِس گھر میں پہلی بار داخل ہوا تھا سعدونہ نے اسحاق کو اور اسحاق نے سعدونہ کو بہت غور سے دیکھا۔ نصر اور اسحاق پہلے ہی سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔

سعدونہ اسحاق کو دیکھ کر مسکرائی۔"تو یہ ہیں وہ صاحبزادے جو کچھ دنوں میں خافق کے قاضی بن جائیں گے۔ خوب!"

اسحاق نے سعدونہ کو سلام کیا مگر سعدونہ نے جواب نہیں دیا، اور ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

قاضی کھسیانا ہو رہا تھا۔ اس نے اسحاق کو بٹھا دیا اور خود سعدونہ کے کمرے میں پہنچ گیا، بولا۔"سعدونہ! تو نے اسحاق کے سلام کا جواب نہ دے کر بڑا ظلم کیا ہے تجھ کو ایسا نہیں کرنا تھا۔"

سعدونہ نے جواب دیا۔"میں مجبور ہوں۔ میں نے یہ سوچ کر اس نوجوان کو قبول کر لیا تھا کہ چند دنوں بعد یہ خافق دفعان ہو جائے گا لیکن جب یہ سامنے آیا تو یہ احساس مجھے تکلیف پہنچانے لگا کہ اسحاق ایک نصرانی ماں کا بیٹا ہے۔"

قاضی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔"عورت! زبان کو قابو میں رکھ۔ مجھے شرمندہ کرانے کے کیوں درپے ہے؟"

سعدونہ نے اپنے منہ پر سے قاضی کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی اور بولی۔"میرا منہ کیوں داب رہے ہیں آپ! کیا آپ اس نوجوان کی خاطر میرا گلا گھونٹنا چاہتے ہیں۔"

قاضی نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا اور کہا۔"سعدونہ! میں اس کو بڑی مشکل سے لایا ہوں۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تیری یا تیرے بیٹے کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ سعدونہ! تو شفیق ماں بن جا اس میں ہم سب کا بھلا ہے۔"

سعدونہ نے مسکرا کر جواب دیا۔"اچھا بابا! اچھا۔ آپ اپنے مہمان کے پاس جائیں، کچھ دیر بعد میں بھی آجاؤں گی۔"

قاضی کی جان میں جان آئی اور سعدونہ ایک بار پھر اسحاق کے کمرے میں پہنچ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ تو گئے تھے مگر دونوں میں بات ایک بھی نہیں کر رہا تھا۔

قاضی کسی ضرورت سے باہر چلا گیا تو سعدونہ نے اسحاق سے انتہائی رازداری سے باتیں شروع کر دیں۔"اسحاق! تیرا یہ نام کس نے رکھا؟"

اسحاق نے جواب دیا۔"مجھے پتہ نہیں یہ نام کس نے رکھا تھا۔ ویسے میری ماں مجھے آئزک کہتی ہے اور میں خود اپنے آپ اسحاق سمجھتا ہوں۔"

سعدونہ نے کہا۔"احمق نوجوان! تیری ماں تجھے آئزک کہتی ہے تو صحیح کہتی ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تیرا باپ نصرانی تھا اور تیری ماں اب بھی آج بھی نصرانیہ ہے تجھ کو اپنا آبائی دین نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

اسحاق کا دم الجھنے لگا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر راہِ فرار اختیار کرنا چاہی مگر سعدونہ اس کا ارادہ بھانپ گئی، بولی۔"یہ تو ادھر اُدھر کیا دیکھ رہا ہے کیا تو سمجھتا ہے کہ تو اس گھر سے کچھ کھائے پیے بغیر ہی چلا جائے گا؟ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔"

اس کے بعد اُس نے اسحاق کو میوے دیے اور ایک دم میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔

اسحاق کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ سعدونہ کبھی تو اپنی باتوں سے اسحاق کا دل جلانے لگتی ہے اور کبھی میٹھے جلے اور زخمی دل پر میٹھی میٹھی باتوں کا مرہم رکھنے لگتی ہے۔

دیر بعد جب قاضی گھر واپس آیا اور اسحاق کو کھاتے پیتے دیکھا تو بہت خوش ہوا اور سعدونہ کا شکریہ ادا کیا، بولا۔"سعدونہ! مجھ کو تجھ سے ایسی ہی امید تھی۔ خدا تجھے اس کا اجر دے۔"

اسحاق اس گھر میں متواتر کئی دن رہا اور ان کئی دنوں میں کبھی تو وہ سعدونہ کی باتوں سے خوش ہو جاتا اور کبھی اس کا دل رونے لگتا۔

قاضی پھولا نہیں سما رہا تھا اس نے اسحاق سے کہا۔"دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ میری بیوی ہیرا ہے۔ صاف، کھری اور کھردری مگر دل کی بہت اچھی ہے۔"

اسحاق نے جواب دیا۔"ہاں وہ بہت اچھی ہیں لیکن ہر وقت اور ہمیشہ نہیں۔ بس کبھی کبھی۔"

قاضی نے چونک کر پوچھا۔"یعنی؟ کیا مطلب؟"

اسحاق نے جواب دیا۔"بابا جان! ہر کوئی آپ جیسا نہیں ہو سکتا۔"

قاضی اسحاق کے پیچھے پڑ گیا، پھر پوچھا۔"نہیں بیٹے! تم مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں۔ بات کیا ہوئی ہے؟"

اسحاق نے بات ٹالنی چاہی، بولا۔"بات تو کوئی نہیں ہوئی لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ کسی اور کا آپ جیسا ہونا ناممکن ہے۔"

اب قاضی کی جان میں جان آئی، مسکرا کر بولا۔"تو نے میرا دل

ہی دہلا دیا تھا۔"
اسحاق خاموش ہو گیا۔

قاضی کو وزیر ابن ابی عامر کے فرمان کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا لیکن وہ پندرہ دن گزر جانے کے بعد بھی نہیں پہنچا۔ اب ازابلا اس پر طنز کرنے لگی تھی۔ وہ قاضی کو چھیڑنے کی خاطر کہتی۔ "وہ فرمان کیا ہوا؟ ابھی تک تو آیا نہیں۔ بشاید وزیر بھول گیا۔"

قاضی نے نظر بھر کے ان دونوں کو دیکھا اور پوچھا۔ "کیا بات ہے یہ ڈرتے ڈرتے۔۔۔۔"

ازابلا نے جواب دیا۔ "محترم قاضی سعید صاحب! آپ وزیر کے رقعہ کا کب تک انتظار کریں گے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "ازابلا! میں درباری آداب سے واقف ہوں اس لیے میں وزیر کو مجبور تو نہیں کر سکتا کہ وہ میری مرضی اور میرے فرمانے پر ہمیں رقعہ لکھ دے۔"

اسحاق کو قاضی کی طرفداری مقصود تھی۔ کہا۔ "ماں! آپ نے وزیر کا دربار نہیں دیکھا۔ وہاں ملاقاتیوں کا بازار لگتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ وزیر کا کام اتنی آسانی سے کیونکر ہو سکتا ہے؟"

قاضی نے دونوں ہی کو جواب دیا۔ "ازابلا! کوئی خاص وجہ ہو گی جو ابھی تک وزیر کا رقعہ نہیں ملا۔" پھر اسحاق کو جواب دیا۔ "بیٹے اسحاق! جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے لیکن وزیر موصوف ہمیں ٹال نہیں سکتے۔ انہیں ایک نہ ایک دن رقعہ بھیجنا ہی پڑے گا۔"

ماں ازابلا اپنے بیٹے سے مارے ڈر کے ابھی تک یہ نہیں پوچھ سکی تھی کہ بیٹے اسحاق! تیری سوتیلی ماں سعدونہ تجھ سے کس طرح پیش آئی؟

اسحاق نے جواب دیا۔ "بہت اچھی طرح۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ خود بہت اچھی ہیں ورنہ۔۔۔۔"

ازابلا نے گھبرا کر پوچھا۔ "ورنہ۔۔۔ ورنہ کیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "ورنہ میں وہاں کا آنا جانا ہی ترک کر دیتا۔"

اب اس خاندان میں خوشی لوٹ آئی تھی۔ رونقیں دوبارہ مل گئی تھیں۔ قاضی، ازابلا اور اسحاق ہر کوئی خوش تھا۔

قاضی مطمئن ہو کر سعدونہ کے پاس چلا گیا۔ اب اسحاق بھی معمول پر آیا ہوا تھا۔

کئی دن بعد نصر اچانک بیمار پڑ گیا۔ اسے بخار آ گیا تھا۔ یہ بخار علاج کے ساتھ بڑھتا رہا۔ قرطبہ کا لائق ترین طبیب ابن بیطار نصر کا علاج کر رہا تھا۔ قاضی پر جیسے سکرات کا عالم طاری تھا۔ وہ ہر وقت نصر کے پاس موجود رہتا۔ نصر کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

اس کمزوری میں دست کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابن بیطار کی دوائیں بیکار ہوتی چلی گئیں۔ سعدونہ اپنے کمزور بچے سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہ ہوتی۔ اسہالوں نے اس کے معدے کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کھاتا قے یا اسہال سے نکل جاتا۔ جسم کا پانی کم ہوتا جا رہا تھا۔ نصر کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور آنکھیں حلقوں میں گھس گئی تھیں۔

اسحاق بھی بھاگ دوڑ میں مدد کرنے لگا۔ اس مصیبت کے عالم میں قاضی نے ازابلا کو مشورہ دیا کہ وہ سعدونہ سے مل لے تاکہ دونوں کے تعلقات استوار ہو جائیں۔ ازابلا کو تامل تھا کیونکہ اسے شبہ تھا کہ شاید سعدونہ کا دل اس طرح بھی صاف ہو لیکن انسانی ہمدردی نے ازابلا کو سعدونہ کے در پر پہنچا دیا۔ شام کا جھٹ پٹا تھا۔ ازابلا نے ہلکا عنابی لباس پہن رکھا تھا اور سر کے بال گلابی رومال سے باندھ لیے اور انگوری رنگ کی شال دونوں شانوں سے گزار کر سینے پر ایک کانٹے سے پھنسا کر روک رکھی تھی۔ اسحاق اس کے ساتھ تھا۔

قاضی کو ان دونوں کی آمد کا علم تھا۔ وہ ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی ان دونوں نے قاضی کی حویلی میں قدم رکھے اس نے سعدونہ کو مطلع کیا۔ "سعدونہ! ازابلا نصر کو دیکھنے آ رہی ہے، دیکھو، کوئی ایسی بات نہ ہو کہ آئے ہوئے مہمان کی دل آزاری ہو۔"

سعدونہ نے کوئی جواب نہیں دیا بدستور بیٹھی رہی۔ لیکن اس کی نظریں اس راہ پر جمی تھیں جدھر سے ازابلا آ رہی تھی پھر جیسے ہی ازابلا کی جھلک دکھائی دی، سعدونہ کھڑی ہو گئی اور کچھ دور چل کر ازابلا کا استقبال کیا۔ بولی۔ "اچھا ہوا تم آ گئیں۔ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔"

ازابلا نے سعدونہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولی۔ "میں بھی آپ سے ملنا چاہتی تھی لیکن کوئی تقریب برملاقات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔"

سعدونہ نے ہنس کر طنز کیا۔ "خوب! اب تو تقریب برملاقات بھی ہاتھ آ گئی۔ شاید تم انتظار کر رہی تھیں کہ میرا بیٹا نصر بیمار ہو اور تم اسے دیکھنے کے بہانے اس حویلی میں بھی داخل ہو جاؤ۔"

قاضی نے دور ہی سے کہا۔ "سعدونہ! میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟"

ازابلا نے سعدونہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ بولی۔ "میں نے آپ کی حویلی میں رسماً قدم رکھا ہے۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔" اس کے بعد وہ بیمار و نزار نصر پر جھک گئی۔ پوچھا۔ "بیٹے نصر! کیسے ہو اب؟"

کمزور نصر نے اَدھ کھلی آنکھوں سے ازابلا کی طرف دیکھا اور نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

ازابلا نے قاضی سے پوچھا: "اس کو آپ کھلا کیا رہے ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا: "جب یہ کچھ ہضم ہی نہیں کر سکتا تو یہ کھائے گا کیا؟ اور ------"

سعدونہ ان کی باتیں سنتی رہی اور نصر کی نبضیں دیکھتی رہی۔ پھر اچانک چیخی: "طبیب کو جلد از جلد بلائیے ورنہ میرا پلا پلایا بچہ ہمارے ہاتھ سے گیا۔"

ازابلا نے بھی نصر کی نبضیں دیکھیں اور کہا: "نصر بہت کمزور ہو چکا ہے آپ اس کو انار کا عرق پلائیں، تھوڑی تھوڑی دیر۔ پھر دیکھیے گا کہ نصر کیسا چاق و چوبند نظر آئے گا۔"

ازابلا نے کسی کا انتظار بھی نہیں کیا پوچھا گھر میں انار ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا: "ہیں۔ بہت سارے ہیں۔"

ازابلا نے کہا: "تب پھر لے لیجیے انار۔ میں خود انار کا عرق نکال کر پلاؤں گی۔"

قاضی انار ازابلا کو دے کر طبیب ابن بیطار کے پاس چلا گیا۔ ازابلا انار کا عرق نکالنے لگی اور پھر ہر پانچ سات منٹ بعد ازابلا نے نصر کو انار کا عرق پلانا شروع کر دیا۔ اس سے نصر کی طبیعت میں بڑا فرق پڑا۔

سعدونہ یہ سب ہوتا دیکھتی رہی۔ اسحاق نصر کے سرہانے بیٹھا دل ہی دل میں اس کی صحت یابی کی دعا مانگ رہا تھا۔

قاضی طبیب کو لے کر آیا اس نے نصر کو خوب اچھی طرح دیکھ کر چند دوائیں تجویز کیں ان دواؤں کو قاضی خدمت گاروں سے منگوا سکتا تھا مگر اپنے بیٹے نصر کا کام وہ خود کر رہا تھا۔

چار دن اور چار راتیں بہت دکھ اور مصیبت میں گزریں۔ آخر نصر کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ ازابلا بہت خوش تھی کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی تھی۔ اسحاق بہت خوش تھا لیکن سعدونہ اب بھی فکر مند نظر آ رہی تھی۔

نصر کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد قاضی نے اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں اور عدالتی امور میں مشغول ہو گیا۔ اسحاق بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ حویلی میں سعدونہ، ازابلا اور نصر رہ گئے۔ اب ازابلا کا کام ختم ہو چکا تھا وہ اپنے گھر واپس جانا چاہتی تھی۔ بستر پر نصر لیٹا ہوا تھا اور اس کے دائیں طرف اس کی ماں سعدونہ بیٹھی تھی، اور بائیں جانب ازابلا۔ ازابلا بہت خوش تھی مگر سعدونہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ازابلا نے کہا: "اگر آپ اجازت دیں تو میں گھر چلی جاؤں؟"

سعدونہ نے خشک لب و لہجے میں جواب دیا: "ازابلا! تم نہ تو میری اجازت سے آئی تھیں اور نہ ہی مجھ سے اجازت لے کر جاؤ گی۔ جس طرح چپ چاپ آئی تھیں اسی طرح چپ چاپ اپنی مرضی سے واپس جا سکتی ہو۔"

ازابلا ہکا بکا سعدونہ کی شکل دیکھنے لگی۔

سعدونہ کی نظروں سے قہر ٹپک رہا تھا۔ مزید بولی: "تم نصر کی بیماری میں یہاں کیوں آئی تھیں میں خوب جانتی ہوں لیکن ازابلا تم یہ کبھی نہ بھولنا کہ میں کوئی بے وقوف عورت نہیں ہوں میں سب سمجھتی ہوں۔"

ازابلا نے نہایت مہذب پیرایہ اختیار کیا، بولی: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی، آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

سعدونہ نے جواب دیا: "میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ میں قاضی سعید کی جائز بیوی ہوں تو نے میرے شوہر سے چپ چاپ شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔"

ازابلا کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سعدونہ کو کیا جواب دے۔ اس نے کہا: "بیمار نصر کے سامنے ایسی باتیں نہ کیجیے۔"

سعدونہ بپھر کر کھڑی ہو گئی: "شاید تو نہیں جانتی کہ میرا بیٹا نصر بے حد حساس ہے اس کی بیماری کا سبب بھی تو ہی ہے، تو اور تیرا بیٹا اسحاق۔ میں نے تجھ کو چند دن حویلی میں اس لیے برداشت کر لیا کہ میرا شوہر بھی یہاں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اور میں اس سے محبت بھی کرتی ہوں اور احترام بھی۔"

سعدونہ نے جواب دیا: "آپ اپنے دل سے یہ غلط فہمی دور کر دیں کہ آپ کے شوہر سے میں نے چپ چاپ شادی کر لی۔ پہل ان کی طرف سے ہوئی تھی اور یہ جو کچھ بھی ہوا، اس کی بیشتر ذمے داری آپ کے شوہر قاضی سعید کے سر ہے۔"

سعدونہ نے کہا: "خیر، یہ فضول بحث ہمارے کس کام کی اب تم اس حویلی میں آ ہی گئی ہو تو میں چاہتی ہوں کام کی باتیں بھی ہو جائیں۔"

ازابلا نے اتنی بد اخلاق اور سر پھری عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، آہستہ سے بولی: "کہیے کام کی باتیں میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

اب سعدونہ کا قہر و غضب دور ہو چکا تھا، اب وہ مسکرا رہی تھی، کھڑی ہوتی ہوئی بولی: "یوں نہیں۔ میں یوں باتیں نہیں کروں گی پہلے تم بیٹھ جاؤ، پھر باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

ازابلا نے سعدونہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کو سعدونہ کی صحیح الدماغی پر شبہ ہونے لگا۔

ازابلا کو کھڑا دیکھ کر سعدونہ نے اصرار کیا: "ازابلا! پہلے بیٹھ

جاؤ پھر بات کروں گی۔"

ازابلا نے جواب دیا: "آپ بات کریں میں کھڑے کھڑے بھی باتیں کر سکتی ہوں۔"

سعدونہ نے آگے بڑھ کر ازابلا کا ہاتھ پکڑ لیا اور مسہری پر زبردستی بٹھا دیا۔ ازابلا اس عورت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

سعدونہ نے رک رک کر کہنا شروع کیا: "ازابلا! میرے شوہر نے جب تم سے شادی کی تھی، میں اولاد سے محروم تھی لیکن اب خدا کے فضل سے میری گود بھر چکی ہے۔ تمھاری جیسی قماش کی عورتوں کے لیے مردوں کی کوئی کمی نہیں، تم میرے شوہر کو چھوڑ کر اس سے بھی اچھے کسی دوسرے صاحب حیثیت مرد کو پکڑ سکتی ہو۔" اس کے بعد وہ نصر کو دیکھنے لگی: "میرا بیٹا نصر مجھ سے اکثر تیرے اسحاق کی بابت طرح طرح کے سوالات کرتا رہتا ہے۔ میں اس کو کوئی جواب نہیں دے سکتی۔"

ازابلا نے کہا: "آپ بات مختصر کریں، آپ مجھ سے چاہتی کیا ہیں؟"

سعدونہ نے جواب دیا: "یہ کہ تم میرے شوہر سے الگ ہو جاؤ، تم میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو اور اپنے بیٹے اسحاق سے کہو کہ وہ بھی اپنے فرضی اور خواہ مخواہ کے باپ سے کہیں دور چلا جائے۔"

ازابلا کو رونا آرہا تھا، بولی: "آپ فکر مند نہ ہوں، آپ جو چاہتی ہیں وہی ہوگا۔"

سعدونہ کے چہرے پر تازگی دوڑ گئی۔ بولی: "میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں تو تمھارا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ تم مجھ سے تعاون کرو گی اور میں اپنا دلی مدعا حاصل کر لوں گی۔"

ازابلا نے بڑے کرب سے کہا: "آپ کو اور کیا کہنا ہے؟ جلدی جلدی کہہ دیجیے تاکہ میں چلی جاؤں۔"

سعدونہ نے جواب دیا: "میں مزید یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو، اپنے بیٹے اسحاق سے کہو کہ وہ بھی کنارہ کشی اختیار کرے اور قرطبہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔" اچانک ایک بار پھر وہ جذباتی ہو گئی۔ بولی: "اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ آسانی سے میرے شوہر کو ہتھیانے کے بعد اس حویلی کو بھی حاصل کر لو گی تو یہ بہت مشکل ہے جب تک میں زندہ ہوں تم کیا، تم جیسی کوئی بھی عورت اس حویلی میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ میں تمھیں قتل کر سکتی ہوں، میں اسے ......"

ازابلا کا اس فضول اور نیم پاگل عورت سے باتیں کرنا بے کار تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی، بولی: "آئندہ میں یہاں نہیں آؤں گی، کبھی بھی نہیں، مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔"

سعدونہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔

ازابلا تیزی سے اٹھی، نصر کی پیشانی چومی اور باہر نکل گئی۔

○

قاضی کو عدالت میں دیر لگ گئی اس لیے گھر کا ضروری سامان اسحاق کے ذریعے بھیج دیا۔ وہ جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا، اس کی نظریں اپنی ماں کو تلاش کرنے لگیں۔ سعدونہ نے اس سے سامان لیا اور پوچھا: "یہ تو چکر مکر ادھر ادھر کیوں دیکھ رہا ہے؟"

اسحاق نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ پوچھا: "میری والدہ کہاں ہیں؟"

سعدونہ نے جواب دیا: "تیری ماں اپنے گھر چلی گئی۔"

اسحاق نے اس کا جواب دہرا دیا: "میری ماں اپنے گھر چلی گئی! لیکن انھوں نے صبح تو نہیں بتایا تھا کہ آج وہ اپنے گھر چلی جائیں گی؟"

سعدونہ نے بے رخی اختیار کی: "لڑکے! تیری ماں تو آج بھی اپنے گھر جانے سے گریز کر رہی تھی لیکن جب میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ بہت دن مزے کر لیے اس حویلی میں تو وہ چلی گئی۔"

اسحاق کو اس عورت پر غصہ آرہا تھا، بولا: "اگر آپ نے یہی کہا ہے جو ابھی ابھی دہرا رہی تھیں تو آپ نے میری ماں پر بڑا ظلم کیا۔ میری ماں پر بڑی زیادتی کی، آپ کو ایسا نہیں کرنا تھا۔"

سعدونہ پھر گرم ہو گئی: "لڑکے! ایک بات جو میں نے تیری ماں سے بھی کہہ دی تجھ سے بھی کہہ رہی ہوں۔ میرا بیٹا بڑا حساس اور جذباتی ہے اب وہ سن شعور کو پہنچ رہا ہے۔ طبیب ابن بیطار کا خیال ہے کہ نصر اس لیے بیمار پڑ گیا کہ اسے تیرا اس حویلی اور اپنے خاندان میں ناجائز حیثیت کا علم ہو گیا ہے وہ اپنے باپ کی محبت میں تیرا حصہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

اسحاق کے دل و دماغ پر ضربیں لگتی رہیں اور وہ ضبط و برداشت سے کام لیتا رہا۔ وہ اپنی حیثیت اور مقام کا جائزہ لیتا رہا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔

اس نے دور سے قاضی سعید کو آتے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا۔ سعدونہ نے بھی قاضی کو آتے دیکھ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسحاق اور ازابلا سے جس قسم کی باتیں کر چکی ہے اس کے شوہر کے علم میں آ جائیں۔ اس نے جلدی سے اسحاق کو سمجھایا: "اسحاق! بات کو بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اب تو جا سکتا ہے۔"

اسحاق جانے لگا تو قاضی نے اسے روک لیا، مگر اسحاق پھر بھی نہیں رکا اور آگے بڑھ گیا۔ قاضی کو اس کی جسارت پر غصہ آ گیا۔ اس نے لپک کر اسحاق کو شانوں سے پکڑ لیا: "کیا تو نے سنا نہیں کہ میں نے تجھے روکا تھا؟"

اسحاق نے جواب دیا: "بابا جان! میری ماں یہاں سے جا چکی ہے اور وہ ہدایت کر گئی ہے کہ مجھے فوراً اس کے پاس بھیج دیا جائے۔"

قاضی نے حیرت سے پوچھا: "کیا تیری ماں چلی گئی؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں وہ چلی گئی۔"

قاضی نے افسوس کا اظہار کیا۔ "تم دونوں نے میرے بیٹے نصر کیلیے جو کچھ کیا ہے آج میں تم دونوں کی موجودگی میں اس کا اعتراف کرنا چاہتا تھا، تیری ماں نے جانے میں بڑی جلدی کی، خیر۔ دو چار دن بعد میں تم دونوں کو بطورِ خاص بلواؤں گا۔"

اسحاق نے کہا۔ "باوا جان! اس کی کوئی ضرورت نہیں اب مجھے اجازت دیجیے۔"

قاضی نے اُسے اپنے بیٹے نصر کے بستر کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "اسحاق! یہ تو آج کیسی باتیں کر رہا ہے؟" اس کے بعد اپنی بیوی سعدونہ سے کہا۔ "سعدونہ! تو دیکھ رہی ہے میں اسے روک رہا ہوں اور یہ بھاگا چلا جا رہا ہے جب کہ اسکی ماں بتائے بغیر ہی چلی گئی۔"

سعدونہ نے جواب دیا۔ "اگر یہ نہیں رُک رہا تو اسے جانے دیں۔"

لیکن عین اُس وقت جب قاضی اسحاق کو شانوں سے پکڑ کر زبردستی نصر کے بستر کیطرف لے آیا تھا، نصر نے اپنے باپ سے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔ پوچھا۔ "باوا جان! آپ میرے باوا ہیں یا اس کے؟"

قاضی اس سوال کیلیے تیار نہیں تھا۔ اس نے بوکھلا کر جواب دیا۔ "تم دونوں کا۔"

نصر نے کہا۔ "لیکن لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ آپ صرف میرے باوا ہیں اور بھائی اسحاق کا باپ کوئی عیسائی تھا۔"

قاضی پریشان ہو گیا۔ اس نے نصر کو ڈانٹ دیا۔ "نصر! تجھ کو ان بے ہودہ اور فضول باتوں میں نہیں پڑنا چاہیے اسحاق تیرا بھائی ہے۔"

لیکن نصر بھی کسی کا پکا کیا ہوا تھا، ضدی لہجے میں کہا۔ "باوا! آپ کسی ایک کے باپ ہیں۔ بھائی اسحاق کے یا صرف میرے۔ میں اپنے باپ کے حصے بخرے نہیں برداشت کر سکتا۔"

قاضی کی وحشتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، سختی سے پوچھا۔ "نصر! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے آج! تجھے یہ سبق کس نے پڑھایا؟ تجھے یہ ساری باتیں کس نے سکھائی ہیں؟" اس کے بعد وہ سعدونہ کی طرف دیکھنے لگا، سعدونہ وہاں سے ہٹ گئی۔

اسحاق شرم و ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

نصر نے پہلے سے تند و تیز لہجے میں کہا۔ "باوا جان! میں مر جاؤں گا، میں پھر بیمار پڑ جاؤں گا۔ میں پھر بیمار پڑ جاؤں گا۔ آپ یا تو صرف میرے باوا رہیں گے یا پھر صرف بھائی اسحاق کے۔ ایک ہی وقت میں دونوں کے نہیں۔"

اسحاق نے آہستہ سے کہا۔ "آپ مجھے جانے دیں کیونکہ ان حالات میں میرا یہاں سے چلا جانا ہی اچھا ہے۔"

قاضی بے دست و پا ہو چکا تھا، شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "تو جا سکتا ہے۔"

جب اسحاق جانے لگا تو نصر نے کہا۔ "بھائی اسحاق! اب آپ یہاں نہ آئیے گا کیونکہ آپ کے آنے سے میری ماں کو تکلیف پہنچتی ہے۔"

اب قاضی کی سمجھ میں سب کچھ آ چکا تھا۔ اسحاق چلا گیا اور قاضی جھنجلایا ہوا سعدونہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ سعدونہ ایک کمرے میں بیٹھی اپنے کپڑے درست کر رہی تھی۔ قاضی جاتے ہی برس پڑا، بولا۔ "سعدونہ! یہ تو نے نصر کے دل و دماغ میں کیا بھر دیا ہے ازا بلا، اور اسحاق کے خلاف؟"

سعدونہ نے جواب دیا۔ "میں نے ازا بلا یا اسحاق کے خلاف کچھ بھی نہیں کہا سُنا۔ نصر نے جو کچھ بھی کہا ہو گا وہ اس کے اپنے ذاتی احساسات اور خیالات ہوں گے۔"

قاضی چیخنے لگا۔ "نصر اس قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔ سعدونہ! سچ بتا، ازا بلا اور اسحاق نے نصر کی کتنی تیمارداری کی، کم از کم اسی کا خیال کیا ہوتا۔"

سعدونہ نے جواب دیا۔ "اگر آپ ازا بلا اور اسحاق کی تیمارداری کی بابت مجھ سے کچھ سننا ہی چاہتے ہیں تو سنیے، وہ دونوں میرے بیٹے کی تیمارداری یا خدمت کی غرض سے اس حویلی میں نہیں آتے تھے بلکہ ان دونوں نے اس طرح چالاکی سے میری حویلی میں داخلے کا راستہ نکالا تھا۔ وہ ہمیں یہاں سے بے دخل کرنا چاہتے تھے لیکن میرے بیٹے نے انہیں ناکام بنا دیا۔"

قاضی نے چیخ کر کہا۔ "ایسا نہیں تھا سعدونہ! ایسا بالکل نہیں تھا۔ وہ دونوں بہت زیادہ شریف ہیں۔"

سعدونہ بھی گرم ہو گئی، بولی۔ "اگر وہ شریف ہوتے تو ہماری زندگیوں میں نہ داخل ہوتے، میں جانتی ہوں ان دونوں کی شرافت کو۔"

قاضی سر پکڑ کے بیٹھ گیا، بولا۔ "سعدونہ! تو اُن دونوں کو ذرا بھی نہیں جانتی۔ اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ تو اس طرح ان دونوں کو بے یار و مددگار کر دے گی تو یہ تیرا خیالِ خام ہو گا۔ میں اُن دونوں کو بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا۔"

سعدونہ نے پوچھا۔ "تو کیا آپ اُن دونوں کو اس حویلی میں لے آئیں گے؟"

قاضی نے کہا۔ "اگر اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں ایسا بھی کر سکتا ہوں۔"

اس دوران بیمار نصر بھی قاضی کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا، اس نے پوچھا۔ "باوا جان! کیا آپ اُن دونوں کو اس حویلی میں لے آئیں گے؟"

قاضی نے گھبرا کر نصر کو دیکھا اور کہا۔ "نصر! تو ابھی پوری طرح صحتیاب نہیں ہوا تو اپنے بستر پر جا اور ان فضول باتوں میں نہ پڑ۔"

لیکن نصر اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ "باوا جان! آپ صرف اتنا بتا دیجیے کہ کیا آپ اُن دونوں کو

مستقلاً اس حویلی میں لے آئیں گے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "بیٹے نصر! اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ دونوں شریف ماں بیٹے تیری وجہ سے اس حویلی میں تیرے قریب رہنے کے خواہش مند ہیں تو میں ان کی یہ خواہش ضرور پوری کر دوں گا۔"

نصر نے جواب دیا۔ "لیکن بابا جان! وہ دونوں اس حویلی میں نہیں آئیں گے۔ اگر آ بھی گئے تو میں پھر بیمار پڑ جاؤں گا۔"

قاضی ہوا کا رخ بدلا ہوا دیکھ کر سہم گیا۔ جو کام سعدونہ کسی اور کے بس کا نہیں تھا، نصر نے انجام دے دیا تھا۔ اس نے نصر کا دل رکھنے کے لیے جواب دیا۔ "بیٹے! اگر تو ان دونوں کے لیے نہیں چاہتا کہ اس حویلی میں آئیں تو میں نہیں آنے دوں گا۔"

نصر مسکرانے لگا۔

سعدونہ دور کھڑی اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھی۔ جو کام وہ نہیں کر سکتی تھی اپنے بیٹے نصر کے ذریعے انجام دے لیا تھا۔



اسحاق سیدھا اپنی ماں ازابلا کے پاس پہنچا۔ وہ کافی دیر تک رونے کی وجہ سے نڈھال سی ہو رہی تھی اس کی آنکھیں سرخ اور پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ اسحاق خود بھی بہت افسردہ تھا۔

ازابلا نے اسے دیکھتے ہی مشورہ دیا۔ "آئزک! میں قرطبہ چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔"

اسحاق نے کہا۔ "ماں! آپ مجھے آئزک نہ کہا کریں۔ میں اسحاق ہوں۔"

ازابلا نے اسحاق کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے لیے اور انہیں وقفے وقفے سے دبانے لگی۔ "بیٹے! تیرا باپ مسیحی تھا، اسی لیے میں تجھے آئزک کہتی ہوں۔"

اسحاق نے بیزاری سے ماں کے دونوں ہاتھ جھٹک دیے "ماں! اب ان فضول باتوں کا وقت نہیں رہا۔ میں اسحاق ہوں، میں نے اسلامی فقہ، حدیث، صرف و نحو اور ادب و شاعری کا درس لیا ہے یہ علوم میری روح تک میں بس گئے ہیں۔ میں نے جامع قرطبہ میں برسوں پانچ وقت کی نمازیں ادا کی ہیں۔ میں نے رمضان کے روزے رکھے ہیں اور عیدین کی نمازیں پڑھی ہیں۔ میں مسلمان ہوں ماں!"

ازابلا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "قاضی ابن سعد! تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔"

اسحاق نے کہا۔ "ماں! میں آپ کو یہ بتلانے آیا ہوں کہ اب میں یہاں قرطبہ میں نہیں رہوں گا۔"

ازابلا نے گھبرا کر پوچھا۔ "پھر کہاں رہے گا؟ وزیر ابن ابی عامر تجھے خافق کا قاضی بنانے والا ہے۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "میں وزیر ابن ابی عامر کی عطا کردہ ملازمت نہیں کروں گا۔ میں قرطبہ سے دور چلا جانا چاہتا ہوں۔"

ازابلا نے مایوسی سے پوچھا۔ "میرا کیا بنے گا؟ میں کہاں رہوں گی؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں، آپ کا کیا بنے گا۔ بہر حال اگر زندگی رہی تو ملاقات دوبارہ ہو جائے گی ورنہ معاف کر دیجئے گا اور میں کوشش کر کے۔۔۔۔"

ازابلا نے اس کی بات کاٹ دی، بولی۔ "میں تجھ کو کہیں بھی نہیں جانے دوں گی، اپنے پاس رکھوں گی۔"

اسحاق نے بڑی بے رخی کا مظاہرہ کیا، بولا۔ "ماں! اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ یہ میری شرافت اور نیک نفسی تھی جو میں نے آپ کو بتا دیا کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں چاہتا تو چپ چاپ چلا جاتا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی۔"

ازابلا اسے روکتی ہی رہ گئی مگر اسحاق نہیں رکا۔

قرطبہ سے نکل کر وہ اندلس کے انتہائی جنوبی صوبے مالقہ روانہ ہو گیا۔ اس نے مالقہ کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ یہ صوبہ اور شہر قرطبہ سے قریب ہونے کے باوجود کوہستانی تھا۔ وہ شمالی حصے سے مالقہ میں داخل ہوا۔ یہ حصہ ہموار اور میدانی تھا۔ اسحاق نے یہ سفر ایک گدھے پر کیا۔ وہ سرسبز اور شاداب حصوں سے گزرتا ہوا مشرقی کوہستانی سلسلے میں داخل ہوا۔ اس کوہستانی سلسلے میں سمندری ساحل پر مالقہ شہر آباد تھا۔ اسحاق نے قاضی ابن سعد سے وقتاً فوقتاً جو کچھ حاصل کیا تھا وہ اس کو پس انداز کرتا رہا تھا اور اب یہی اس کے کام آ رہا تھا۔ اس نے جگہ جگہ مقامی رہنماؤں کی خدمات حاصل کیں اور جب وہ مالقہ شہر میں داخل ہوا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی شاید یہ قرطبہ سے زیادہ حسین شہر تھا، چھوٹا مگر حد درجہ سرسبز و شاداب۔ انگوروں کی بیلوں نے جگہ جگہ سائبان سے تان رکھے تھے یہاں شاہ بلوط اور کاک کے جنگلات تھے، یہاں انجیر کی بھی کثرت تھی اور مقامی لوگ اسے زیتی کہتے تھے۔

اسحاق مالقہ کی سرائے میں ٹھہر گیا۔ یہاں پورے اندلس اور افریقہ کے لوگ قیام کرتے تھے۔ ان دنوں بھی افریقہ اور بالائی اندلس کے لوگ اس سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اسحاق نے ان میں اپنے آپ کو سیاح ظاہر کیا جو جنوبی اندلس کی سیر کرنے نکلا تھا۔ وہ جس کمرے میں ٹھہرا تھا وہ کمرے سے زیادہ حجرہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ کئی دن تک اس حجرے میں منہ چھپائے روتا رہا۔ یہاں اس کو قرطبہ، ماں ازابلا، قاضی اور دوسرے کئی لوگ بہت یاد آئے۔

کئی دن بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ یہاں کہیں ملازمت کرے گا۔ یہاں بھی مسلمان عربوں کا بڑا زور تھا۔ وہ کئی دن تک

ملازمت کی تلاش میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا مگر ملازمت نہیں ملی۔ یہاں کے امراء اور ان کے دربار میں بھی سفارشوں کا زور تھا۔ یہاں عیسائی بھی آباد تھے اور یہودی بھی۔ یہودیوں کی حالت عیسائیوں سے بہتر تھی۔ یہودیوں نے انجیر کے باغ لگا رکھے تھے۔

وہ انجیر اور سنگتروں کے باغات میں لوگوں کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے ایک قافلے کو انجیر کے ایک باغ کے باہر قیام کرتے دیکھا۔ یہاں خود رو درختوں کا ایک جھنڈ تھا جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس قافلے نے کلہاڑیوں اور خنجروں کی مدد سے درختوں کے جھنڈ کا درمیانی حصہ صاف کیا اور وہاں اپنے خیمے نصب کر دیے اور پھر یہاں ان خیموں میں یہ خاندان آباد ہو گیا۔ اسحاق کو ان کا یہ طریقہ آباد کاری بہت اچھا لگا۔ تقریباً پچیس تیس خیموں میں ڈیڑھ دو سو افراد سما گئے تھے۔ ان کے بچوں نے میدان میں نکل کر کھیلنا شروع کر دیا۔ درختوں سے الگنیاں باندھ دی گئیں اور ان پر کپڑے لٹکا دیے گئے۔ جگہ جگہ زمینوں پر چولہے بنائے گئے اور ان سے دھواں اٹھنے لگا۔

وہ دیر تک اس نئی بستی کا نظارہ کرتا رہا اس کے بعد وہ انجیر کے باغ میں چلا گیا۔ باغ کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا۔ اس دو کمرے کے مکان میں باغ کے مالک کا نوکر رہتا تھا۔ اسحاق نے مکان کے در پر دستک دی۔ اندر سے ایک چالیس پینتالیس سالہ ادھیڑ عمر نکلا۔ اس نے پوچھا: "کیا بات ہے کس سے ملنا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا: "جناب والا! میں ایک پڑھا لکھا انسان اس چند ماہ کے لیے آپ کے شہر مالقہ آ گیا۔ اگر آپ اپنے باغ میں مجھے ملازم رکھ لیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اور میں یہاں چند ماہ عزت آبرو سے قیام بھی کر سکوں گا۔"

باغ کے نگران نے اسحاق کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور پوچھا: "یہاں تو رہتا کہاں ہے؟"

اسحاق نے جلدی جلدی جواب دیا: "سرائے میں۔ کیونکہ مالقہ میں میں اجنبی ہوں۔"

باغ کے نگران نے کہا: "بھائی! ہم لوگ جب اپنے باغات میں کام لیتے ہیں تو ایک یا دو آدمیوں کو نہیں رکھتے بلکہ پورے پورے خاندان سے معاملہ کر لیتے ہیں۔ یہاں ہمارے کئی باغ ہیں اور ہم نے باغ کے باہر والے خاندان سے معاملہ کر لیا ہے۔ ان کے کچھ آدمی اس باغ میں کام کریں گے اور کچھ ہمارے دوسرے باغ میں۔ تم اگر چاہو تو ان لوگوں سے معاملہ کر لو اور ان لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام کر لو۔"

اسحاق خیموں کی بستی میں چلا گیا اور پوچھتے پوچھتے اس خاندان کے سربراہ تک پہنچ گیا۔ یہ شخص پچپن ساٹھ کا [illegible] ہوگا۔ اس کا خیمہ دوسرے خیموں سے شاندار تھا۔ خیمے کی [illegible]

حرب بجے ہوئے تھے اور بالکل سامنے ناک کی سیدھ پر چاندی کی صلیب نصب تھی اور صلیب کے نیچے حضرت مریم کی تصویر تھی جس میں آپ اپنے بیٹے مسیح کو اٹھائے ہوئے تھیں۔ اسحاق نے ان علامتوں سے سمجھ لیا کہ یہ خاندان مسیحی ہے۔

بوڑھے سردار نے پوچھا: "تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا: "میرا نام اسحاق ہے لیکن میری ماں مجھے آئزک کہتی ہے۔ اس شہر میں نووارد ہوں اور آپ کے ساتھ انجیر کے باغ میں کام کرنا چاہتا ہوں۔"

بوڑھے نے پوچھا: "تو مسلمان ہے یا یہودی؟"

اسحاق نے جواب دیا: "مسلمان!"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا: "جب تو مسلمان ہے تو پڑھا لکھا بھی ہوگا؟"

اسحاق نے خیمے کا در کھلتے اور ایک لڑکی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے بھی اسحاق کو دیکھا تو ذرا جھجکی اور سردار کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ سردار نے پھر اپنا سوال دہرایا: "تو تو نے بتایا نہیں کہ تو پڑھا لکھا بھی ہے یا نہیں؟"

اسحاق نے جواب دیا: "میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔"

سردار نے کہا: "تب پھر باغ میں کام کر کے اپنی مٹی کیوں پلید کریگا۔ جا کسی دربار سے وابستہ ہو جا۔"

اسحاق نے جواب دیا: "سردار! میں تنہا ہوں۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔" لڑکی دزدیدہ نظروں سے اسحاق کو دیکھ رہی تھی۔

سردار نے پوچھا: "تو رہتا کہاں ہے؟"

اس نے جواب دیا: "یہاں کی سرائے میں۔"

سردار کو اس نوجوان پر رحم آ گیا۔ اس نے مشورہ دیا: "تو سرائے میں کب تک رہے گا یہیں آ جا۔ تیرا کوئی خاندان؟"

اسحاق نے جواب دیا: "میری صرف ایک ماں ہے اور بس۔ وہ مسیحی ہے۔"

لڑکی چونک پڑی۔ سردار سے پہلے بولی: "تیری ماں مسیحی ہے اور تو خود؟"

سردار نے لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسحاق کی طرف سے جواب دیا: "یہ خود مسلمان ہے۔" پھر اسحاق سے کہا: "نوجوان! یہ میری بیٹی ماریہ ہے، شوخ و شریر لیکن میری چہیتی۔"

ماریہ جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگی، باپ سے پوچھا: "جب اس کی ماں مسیحی ہے تو یہ خود مسلمان کیوں ہے؟"

سردار نے ماریہ کو ترش لب و لہجے میں سمجھایا: "ماریہ! کسی کے ذاتی معاملوں کی چھان بین سے فائدہ؟" پھر وہ شکوہ کرنے لگا۔ "نوجوان! امید ہے کہ تو [illegible] لوگ [illegible] افراد نے بزور شمشیر فتح کر لیا ہے اور ہم مقامی لوگ ان کی نوکریاں کر کے [illegible]

خوار ہو رہے ہیں۔ خود مجھے دیکھو دی جان کار لو اپنے قبیلے کا سردار، ہم کاتھ قوم کے لوگ یہاں کے اصلی باشندے ہیں یہ قسمت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ گھر کے حقیقی مالک غاصبوں اور ڈاکوؤں کی چاکری کریں۔"

ماریہ نے اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "بابا! آپ جانتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے پھر آپ مسلمانوں کو برا بھلا کہہ کے اسے شرمندہ کیوں کر رہے ہیں؟"

اسحاق نے کہا۔ "لیکن میں برا نہیں مان رہا جس کا دل دکھتا ہے، ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔"

سردار دی جان کار لو نے کہا۔ "اچھا اب تو جا سکتا ہے اور سرائے سے یہیں آ جا۔" پھر ماریہ سے کہا۔ "اگر یہ میری عدم موجودگی میں سرائے سے یہاں آ جائے تو اس کو معقہ چھوٹا خیمہ دے دینا پھر دیکھا جائے گا۔"

اسحاق نے ماریہ کو دیکھا تو اس نے نظریں پھیر لیں۔ اسحاق کو اس معصوم مگر شوخ و شریر لڑکی میں نہ جانے کیا دکھائی دیا کہ وہ کچھ دیر دم بخود اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ماریہ نے اس کے انہماک سے جھینپ کر نظر گھبرا کر باپ سے کہا۔ "کیا یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہے گا؟"

سردار دی جان کار لو نے جواب دیا۔ "ہاں بیٹی! یہ تنہا ہے، اکیلا کہاں رہے گا۔ کام ہمارے ساتھ کرے گا تو رہے گا بھی ہمارے ساتھ۔ اس طرح اسے خاصا سکون مل جائے گا۔"

اسحاق نے انجیر کے باغ میں کام شروع کر دیا۔ دی جان کار لو اس پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گیا تھا۔ ماریہ کی ماں ہر روز صبح ماریہ کے ساتھ گرجا ضرور جاتی تھی۔ کتاب الدعا ماریہ کے ہاتھ میں ہوتی اور ماں پیشانی تک سر کو چھپائے جب گرجا میں داخل ہوتی تو اس کے چہرے سے تقدس نور کی طرح جھلکتا رہتا۔ اسحاق راہ میں کھڑا ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ ماریہ بھی کنکھیوں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتی۔ دونوں وقت کا کھانا بھی ماریہ ہی اس کے پاس لے جاتی۔ وہ کھانا دے کر ادھر ادھر ہو جاتی اور جب برتن خالی ہو جاتے تو وہ لے کر واپس چلی جاتی۔

ایک دن ماں کسی وجہ سے گرجے میں نہیں جا سکی اور ماریہ کو اکیلے ہی جانا پڑا۔ اس نے حسب معمول اسحاق کو ایک درخت کے نیچے کھڑے دیکھا تو گھبرا گئی۔ اسحاق ہمت کر کے آگے بڑھ گیا اور پوچھا۔ "آج ماں نہیں آئیں؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "نہیں، وہ بیمار ہیں۔"

اسحاق نے ماریہ کے ہاتھ سے کتاب الدعا لینا چاہی، بولا۔ "ماریہ! تو تھک جائے گی، کتاب مجھے دے دے میں پہنچا دوں گا۔"

ماریہ نے اس کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا بولی۔ "نہیں! میں چلی جاؤں گی، تم کیوں زحمت کرو۔"

لیکن اسحاق نہیں مانا اور کتاب الدعا اس کے ہاتھ سے لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ایک آدھ بار ماریہ نے مڑ کر دیکھا مگر بولی نہیں۔ کچھ دیر بعد ماریہ نے اسحاق سے پوچھا۔ "یہ تم ہر روز میری راہ میں کیوں کھڑے ہو جاتے ہو؟"

اسحاق کی خوشی کی انتہا نہیں رہی، گھبرا کر جواب دیا۔ "ماریہ! اب میں اس کا کیا جواب دوں، تو خود بھی میرا جواب سمجھ سکتی ہے۔"

ماریہ نے جواب دیا۔ "میرا باپ کٹر عیسائی ہے اس نے انسان دوستی میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ تو لیا ہے مگر انہیں یہ بات بالکل اچھی نہیں لگے گی کہ تم ان کی بیٹی کو تاکتے جھانکتے رہو۔"

اسحاق نے جی کڑا کر کے جواب دیا۔ "ماریہ! میں جو کچھ کر رہا ہوں مجھے اس کی خرابی کا احساس ہے لیکن میں کیا کروں، میں یہاں رہنا نہیں چاہتا مگر پتہ نہیں مجھے یہاں کون لے آتا ہے۔"

ماریہ کو اس کی باتوں سے دیوانگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گرجے میں داخل ہو گئی۔ اس دن دونوں وقت کا کھانا خاندان کا ایک لڑکا لایا۔ اور ماریہ کہیں نظر ہی نہیں آئی۔ اسحاق کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ اس کو بار بار ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی اس کے دل کو آرے سے مسل رہا ہے۔

اس نے وہ رات بڑے کرب میں گزاری اور صبح ہوتے ہی وہ گرجے کے قریب ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دور سے ماریہ اور اس کی ماں کو آتے دیکھ لیا۔ ماریہ ہر روز اس کی طرف ہوتی تھی مگر اس بار ماں اس کی طرف تھی اور ماریہ دوسری طرف۔ ماں نے اسحاق کو درخت تلے کھڑے دیکھا تو پاس پہنچ کر رک گئی۔ اور خلاف معمول اسحاق سے پوچھا۔ "لڑکے! کیا تو وہی ہے جسے قبیلے کے سردار دی جان کار لو نے پناہ دی ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں میں وہی ہوں مادر محترم۔"

ماں نے کہا۔ "میں کئی دنوں سے تجھے یہاں کھڑا دیکھتی ہوں، آخر کیوں؟ کیا بات ہے؟"

اسحاق گھبرا گیا، بولا۔ "مادرِ محترم! میں آپ کے ذوق و شوق اور بے پایاں انہماک کو دیکھنے کے لیے ہر روز یہاں کھڑا ہو جاتا ہوں جی بس، اور کچھ نہیں۔"

بڑی بی لاجواب ہو کر آگے بڑھ گئیں۔

دوسرے دن حسب معمول ماریہ کھانا لے کر اس کے خیمے میں پہنچ گئی۔ اسحاق کھانا کھانے لگا۔ اس کا چہرہ کھانے کی طرف تھا۔ مگر دھیان ماریہ کی طرف۔ اس نے سر اٹھائے بغیر ہی سوال کیا۔ "ماریہ! کل اور پرسوں تم کہاں تھیں؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں کہاں تھی۔ تم مجھ سے اس قسم کے سوالات نہیں کر سکتے۔"

اسحاق شرمندہ ہو کر معذرت کرنے لگا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ایسی جسارت نہیں کرے گا۔

ایک دن سفر کے بعد سردار دی جان کارلو نے اسحاق کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ وہ سہم گیا اور دل ہی دل میں خیریت کی دعا مانگنے لگا۔ خیمے کے اندر چاروں کونوں پر بڑی بڑی مشعلیں روشن تھیں اور بیچ میں موم بتیوں کا ہفت شاخہ روشن تھا اور اس کے پیچھے زمین فرش پر دی جان کارلو بیٹھا تھا۔

اسحاق اس سے کچھ دور کھڑا ہو گیا۔ دی جان کارلو نے اسحاق کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور پوچھا: "ہاں تو تو نے ایک دن بتایا تھا کہ تیری ماں مسیحی ہے اور وہ تجھے آئزک کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔"

اسحاق نے جواب دیا: "ہاں میں نے یہ کہا تو تھا، اور اب بھی یہی کہوں گا۔"

سردار دی جان کارلو نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا: "تو تیری ماں مسیحی ہے؟"

اسحاق نے کہا: "ہاں میری ماں مسیحی ہے۔"

سردار نے کہا: "پھر تو مسلمان کیوں ہے؟"

اسحاق کو اپنی ماں کی پوری داستان سنانی پڑی، آخر میں کہا۔ "میں نے مسلم درسگاہوں سے تعلیم حاصل کی اور قاضی سعید کی زیرِ تربیت رہا، اس لیے مسلمان ہوں۔"

سردار دی جان کارلو نے کہا: "کیا تو نے مسلمانوں کا کلمہ پڑھا تھا؟"

اسحاق نے جواب دیا: "نہیں۔"

جان کارلو کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

اس نے اسحاق کی پشت تھپتھپائی اور کہا: "تب پھر تو مسلمان کیونکر ہو گیا، تو اب بھی مسیحی ہے۔ خداوند یسوع مسیح ہم سب کے نجات دہندہ ہیں اور انہی کے حکم پر تو ہمارے پاس آیا ہے۔ کل سے تو چرچ جائے گا اور اپنے دل سے یہ خیالِ خام نکال دے گا کہ تو مسلمان ہے۔"

اسحاق اس اچانک حیرت انگیز فیصلے سے پریشان ہو کر دیکھنے لگا، اس نے محسوس کیا، اس کے آس پاس لوگ چھپے ہوئے دونوں کی باتیں سن رہے ہیں۔ اسحاق نے کہا: "لیکن میں مسلمان ہوں اور مسیحیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

سردار دی جان کارلو کھڑا ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خیمے کے باہر لے گیا، بولا: "تو میرے ساتھ اسی وقت چرچ چل وہاں مقدس باپ سے مشورہ کر کے صحیح صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔"

دل نہ چاہنے کے باوجود اسحاق کو اسی وقت چرچ جانا پڑ گیا۔ سردار دی جان کارلو نے مقدس باپ کو اسحاق کی روداد سنا دی اور کہا: "مقدس باپ! جب اس نوجوان نے تبدیلی مذہب کا اعلان ہی کبھی نہیں کیا اور اس نے مسلمانوں کا کلمہ ہی نہیں پڑھا، پھر یہ مسلمان کیونکر ہو گیا۔"

دُبلے پتلے مقدس باپ کے سامنے اپنی نوعیت کا واحد، اور منفرد مقدمہ پیش ہوا تھا۔ انھوں نے اس معاملے پر اچھی طرح غور و خوض کے بعد اعلان کر دیا: "سردار دی جان کارلو سچ کہتا ہے، میرے بچے! تو اب بھی مسیحی ہے۔ مسیحی باپ اور مسیحی ماں کا بیٹا مسیحی۔ خداوند مسیح کی مہربانیاں تیرے شاملِ حال ہیں۔"

اسحاق نے کمزور آواز میں کہا: "لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔"

مقدس باپ نے جواب دیا: "میرے بچے تیرا معاملہ انتہائی سیدھا سادہ ہے، تو جا اور فکر نہ کر۔ یسوع مسیح نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور تو صمیم قلب سے مسیحی ہونے کا اقرار کرے گا۔"

بات ختم ہو چکی تھی۔ سردار دی جان کارلو اپنے خاندان میں واپس گیا اور اُن سب کو یہ خوشخبری سنائی کہ اسحاق مسلمان نہیں مسیحی ہے۔

ماریہ چھپتی چھپاتی اس کے پاس آئی، وہ بہت شرما رہی تھی، مگر ہنسی تھی کہ ہونٹوں سے اُبل رہی تھی۔ اس نے پوچھا: "کیا تم سچ مچ مسیحی ہو؟"

اسحاق نے جواب دیا: "شاید، لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

ماریہ نے کہا: "تم صمیم قلب سے اپنے مسیحی ہونے کا اعلان کر دو۔ اس کے بعد میرا خاندان تمھیں اپنے سر پر بٹھائے گا۔"

اسحاق نے کہا: "ماریہ! مجھے سوچنے دے، خوب اچھی طرح سوچ لینے دے۔"

اس کے بعد سردار دی جان کارلو کے خاندان نے اسحاق کی بڑی عزت کی اور ہر شخص اس پر اپنی جان چھڑکنے لگا۔

اب ماریہ بھی اس کے پاس آنے جانے اور اٹھنے بیٹھنے لگی۔ وہ اسحاق پر زور دیتی کہ وہ اس کے ساتھ چرچ چلا کرے، مگر اسحاق کو اس میں تامل تھا۔ جب ماریہ نے اپنے باپ سے کہا کہ اسحاق اس کے ساتھ چرچ نہیں جاتا تو اس نے ماریہ کو سمجھایا: "دیکھ! ابھی اس پر دباؤ نہیں ڈالنا۔ وہ بچپن سے مسلمانوں کی صحبت میں رہا ہے، پہلے اس اثر کو زائل ہو جانے دو، پھر یہ خود بخود چرچ جانے لگے گا۔"

اب ماریہ اس کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتی رہتی، اسحاق بھی اس کی باتوں میں گم ہو جاتا اور وقت کا احساس ختم ہو جاتا۔ اس گفتگو میں بھی ماریہ بیچ بیچ میں یہی کہتی رہتی: "اسحاق! تم چرچ چلا کرو کیونکہ تم مسیحی ہو۔"

اسحاق کہتا: "ماریہ! پہلے مجھ میں وہ یقین پیدا ہو جانے دو، جو مجھے مسیحی قرار دے دے گا پھر میں چرچ بھی چلا کروں گا۔"

ماریہ اداس اور دل برداشتہ ہو کر چلی جاتی۔

ایک دن اسحاق کی طبیعت اتنی زیادہ گھبرائی کہ وہ مالقہ کی جامع مسجد چلا گیا۔ مسجد کے صحن میں سنگتروں کے درختوں کی دو رویہ قطاریں آنے والوں کو سایہ اور ترش خوشبو فراہم کرتی تھیں۔ وہ کافی دیر انہی درختوں کے سائے میں بیٹھا رہا۔ پھر وہ مسجد کے ستونوں میں

چلا گیا۔ یہاں اسے اپنی ماں، نصر، سعدونہ اور قاضی سعد ایک ساتھ یاد آ رہے تھے۔ اس کا دل بھر آیا اور کرتے کے دامن سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

کافی دیر بعد جب وہ مسجد سے باہر نکلا تو اس نے ماریہ کو مسجد کی آخری سیڑھی پر کھڑے دیکھا۔ اس کی تیوریوں پر بل تھے اور چہرے سے جھنجھلاہٹ ہویدا تھی۔ اس نے تلخ اور ترش لہجے میں پوچھا۔

"تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "کچھ بھی نہیں، میرا ان سے پرانا رشتہ ہے۔ میں انہیں کس طرح بھلا دوں۔"

ماریہ اس کو سیڑھیوں سے اتار کر شاہ بلوط کے سائے میں لے گئی بولی۔ "اسحاق! تم یہاں میرے قبیلے میں کیوں آئے تھے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں کیوں آیا تھا، شاید تیرے لیے کیونکہ تیرے قبیلے میں تیرے علاوہ کوئی شے بھی اتنی دلکش نہیں جو میرے پاؤں پکڑ لے۔"

ماریہ نے تلخی سے کہا۔ "اور شاید تم یہ بھی جان چکے ہو کہ میں بھی تمہیں پسند کرتی ہوں۔"

یہ کہتے کہتے وہ شرما گئی۔ اسحاق ان لفظوں کے لیے کتنے ہی شب و روز گزار چکا تھا، اس نے بے ساختہ پوچھا۔ "ماریہ کیا تو واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے؟"

ماریہ نے دل جلے لہجے میں جواب دیا۔ "اسحاق! اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں مسجد کی سیڑھیوں تک نہ آتی۔ میرا باپ یہ سمجھتا ہے کہ تو مسیحی ماں باپ کا مسیحی بیٹا ہے وہ مجھے منع کرتا رہتا ہے کہ میں دین کے معاملے میں جبر نہ کروں، تو ایک نہ ایک دن خود ہی مسیحی دین کا اقرار کرے گا لیکن میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تو مسجد کے چکر لگا رہا ہے۔"

اسحاق نے کہا۔ "خوب! تو تم سے تو بُرا لگتی ہو؟"

ماریہ نے پوچھا۔ "کیا اس قوم میں اپنائیت اور یگانگت نہیں؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں، اور بہت زیادہ ہے۔"

وہ اسحاق کو لیے ہوئے اپنے قبیلے میں پہنچی تو دیکھنے والوں نے آپس میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھ لینا یہ مسلمان ایک نہ ایک دن مسیحی ہو کر رہے گا کیونکہ ماریہ نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا ہے۔"

کسی اور نے کہا۔ "ماریہ نے اس کا اچھی طرح محاصرہ کر لیا ہے اب تو یہ مسلم اس محاصرے کو نہیں توڑ سکتا۔"

ماریہ نے اس کو اس کے خیمے میں پہنچا دیا اور کہا۔ "میں نہیں جانتی کہ تیرے دل میں کیا ہے لیکن میرے دل میں جو کچھ ہے اس کا میں اظہار کر چکی ہوں۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ماریہ! میں نے بھی اپنے دل کی بات صاف صاف بتا دی ہے لیکن میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں، کہ اسلام کو کس طرح چھوڑ دوں؟"

ماریہ نے کہا۔ "جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تو مسلمان نہیں ہے تو اسلام کا چھوڑنا کیا معنی؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ماریہ! اگر ازکم تو تو ایسی بات نہ کہہ۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی اسلام کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا اور جس مذہب نے مجھے علم دیا ہو اس کو میں کس طرح۔۔۔"

لیکن ماریہ نے بات پوری نہیں ہونے دی، وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ "شاید میری قسمت ہی خراب ہے۔"

O

اسحاق نے ماریہ کو کھیتوں کے آس پاس گھومتے پھرتے دیکھا وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ وہ کچھ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی۔ اس کا باپ سردار دی جان کارلو حیران تھا کہ ماریہ کو کیا ہو گیا ہے اس کو نہیں معلوم تھا کہ ماریہ اسحاق سے دور دور کیوں رہنے لگی ہے۔

ایک دن سردار نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اسحاق ماریہ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ماریہ نے اسے نظر انداز کر دیا۔ سردار دی جان کارلو نے کچھ دیر بعد ہی ان دونوں کو اپنے خیمے میں طلب کر لیا۔ اس نے اپنی بیٹی ماریہ کو ڈانٹا اور کہا۔ "ماریہ! کیا بات ہے کہ تو اسحاق سے کھنچنے لگی ہے؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "بابا! کبھی کبھی میں اداس ہو جاتی ہوں، اس وقت مجھے کسی سے بھی ملنا جلنا اچھا نہیں لگتا۔"

اسحاق نے اپنی سانس روک رکھی تھی، وہ ڈر رہا تھا کہ ماریہ کہیں مسجد والی بات اپنے باپ کو نہ بتا دے۔ ماریہ نے بات پوری کر کے اسحاق کی طرف دیکھا تو اسحاق نے نظروں ہی نظروں میں ماریہ کا شکریہ ادا کیا۔

سردار دی جان کارلو نے کہا۔ "ماریہ اور اسحاق! تم دونوں میری بات غور سے سنو۔ کچھ دنوں پہلے میں تم دونوں کی بابت اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ شاید تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہو۔ میرے لیے یہ بڑا تکلیف دہ مسئلہ تھا لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اسحاق مسیحی والدین کا مسیحی بیٹا ہے تو میں بےحد خوش ہوا۔ کل تک میں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ تم دونوں کی شادی کر دوں گا لیکن اس وقت، جب اسحاق اپنے مسیحی ہونے کا باقاعدہ اعلان کرے گا۔ لیکن آج جب میں نے ماریہ کو تجھ سے بچتا چرا کر نکل جاتے دیکھا تو اپنا فیصلہ بدل دیا۔"

ماریہ اور اسحاق گھبرا گئے، ماریہ نے رک رک کر لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔ "نہیں بابا! میں نے نفرت یا کسی اور وجہ سے اسحاق کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ آپ نے ہم دونوں کی بابت کل تک جو کچھ رکھا تھا، وہی درست ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ اتنی زیادہ شرما گئی کہ اس کا سر جھک گیا اور زبان بند ہو گئی۔

سردار دی جان کارلو نے اسحاق سے پوچھا۔ "اور، اسحاق

تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "میں ماریہ سے ہر قیمت شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

سردار نے کہا۔ "تب پھر دیر کیوں؟ کل میرے ساتھ چرچ چل اور اپنے مسیحی ہونے کا اعلان کر دے۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "نہیں اس طرح نہیں۔ پہلے قرطبہ سے میں اپنی ماں کو لاؤں گا اور اُس کی موجودگی میں میں اپنے مسیحی ہونے کا اعلان کروں گا۔"

سردار دی جان کارلو مسکرانے لگا، بولا۔ "چلو یونہی سہی۔ اس طرح تیری ماں بھی یہیں آ جائے گی۔"

لیکن ماریہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اسحاق اس طرح معاملے کو طول دے رہا ہے اور کچھ نہیں۔

شام کو ماریہ اس سے ملنے آئی تو اسحاق نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے کہا۔ "ماریہ! اس وقت تو میں ڈر گیا تھا اگر تو اپنے بابا سے یہ نہ دیتی کہ تو نے مجھے جامع مسجد سے نکلتے دیکھا تھا تو یہ معاملہ آج ہی ختم ہو جاتا۔"

ماریہ نے جواب دیا۔ "یہ معاملہ آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گا۔ رہ گئی یہ بات کہ تو اپنی ماں کو قرطبہ سے لائے گا اور اس کی موجودگی میں اپنے مسیحی ہونے کا اعلان کرے گا۔ کیا یہ درست ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔"

ماریہ کا دل دکھ رہا تھا باتیں کرتے۔ اس نے کہا۔ "تو کہتا ہے تو میں یقین کیے لیتی ہوں۔"

اسحاق ماریہ کی خوشامد کرنے لگا۔ "ماریہ! جب وقت آئے گا تو میں اپنی سچائی کو بآسانی ثابت کر سکوں گا۔"

اس کے بعد ماریہ کو کچھ سکون سا ہو گیا۔ شاید اس کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اسحاق اپنے قول کا سچا اور پکا ہے۔ دوسری طرف اسحاق بھی بہت مطمئن تھا۔ ماریہ قدم قدم پر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

کئی دن بعد ماریہ نے اسحاق کے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا اور لے کر اس کے خیمے میں پہنچ گئی۔ اسحاق کھانا کھاتا رہا اور ماریہ کے ہاتھ کی تعریفیں کرتا رہا۔

ماریہ نے کہا۔ "اسحاق! میں تیری وجہ سے پورے قبیلے پورے خاندان میں بدنام ہو گئی ہوں۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "اور میں بھی۔"

ماریہ نے چڑ کر کہا۔ "مگر میری اور تیری بدنامی میں بڑا فرق ہے تجھے میرے قبیلے کا ایک فرد بھی نہیں جانتا جبکہ میں اسی قبیلے میں پلی بڑھی ہوں اور اس قبیلے میں کئی ایسے نوجوان بھی موجود ہیں جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

اسحاق نے نوالہ چباتے ہوئے پوچھا۔ "اس طرح تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "یہ کہ اگر تو نے دھوکا دیا تو میں کہیں کی بھی نہیں رہ جاؤں گی۔"

اسحاق نے کہا۔ "مگر میں دھوکا کیوں دوں گا۔"

ماریہ نے کہا۔ "تب پھر تو یہ کر کہ قرطبہ جلدی ہی چلا جا اور اپنی ماں کو لے کر فوراً آ۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "میں یہی کروں گا، بالکل یہی کروں گا۔"

اس کے بعد وہ دونوں مستقبل کی باتیں کرنے لگے۔ پیارے پیارے خوبصورت مستقبل کی باتیں۔ وہ دونوں کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے۔

کئی دن بعد سردار دی جان کارلو نے اسحاق کو اپنے خیمے میں بلایا۔ سردار کے خیمے میں کئی اور نوجوان بھی بیٹھے تھے۔ سردار کچھ زیادہ ہی فکرمند نظر آ رہا تھا۔ اس نے اسحاق کا خوش دلی اور مسکراہٹ سے استقبال کیا، پوچھا۔ "اسحاق! میں نے سنا ہے کہ تو اپنی ماں کو لینے قرطبہ جانے والا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں! میں نے ماریہ سے وعدہ کیا ہے کہ میں ماں کو قرطبہ سے لا کر اس کے سامنے اپنے مسیحی ہونے کا اعلان کروں گا۔"

سردار دی جان کارلو نے اسے دعا دی۔ "خداوند مسیح تیری مدد فرمائیں اور مجھے اپنے قبیلے کے ان نوجوانوں کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع عطا فرمائیں۔"

یہ کل پانچ نوجوان تھے۔ اسحاق نے دیکھا ہر نوجوان کی نظر اسحاق پر جمی ہوئی ہے۔

سردار دی جان کارلو نے ان نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسحاق! ان نوجوانوں کو دیکھ۔ یہ میرے قبیلے کے روشن ستارے ہیں۔ یہ پانچوں ماریہ کے امیدوار ہیں۔ اگر درمیان میں تو نہ آ جاتا تو انہی میں سے کوئی ایک ماریہ کا حقدار ٹھہرتا لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔"

سردار کچھ کہتے کہتے رک گیا ان میں کا ایک نوجوان اسحاق سے مخاطب ہوا۔ "اجنبی نوجوان! میں صرف اس لیے خاموش ہوں وہ تیرے حق میں دستبردار ہو گیا ہوں کہ شاید اس طرح مسیحی دین میں ایک کا اضافہ ہو جائے۔ ورنہ تو کوئی برملا ماریہ سے عشق نہیں کر سکتا تھا۔

سردار دی جان کارلو نے پوچھا۔ "پھر تو قرطبہ کب جا رہا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "بہت جلدی، کسی بھی دن لیکن میری ماں خیموں کی زندگی کی عادی نہیں ہے۔"

سردار نے کہا۔ "اوہ تو خود اس زندگی کا عادی کب ہے؟ شادی کے بعد میں ماریہ کو اجازت دے دوں گا کہ وہ پختہ مکان میں رہ سکتی ہے۔"

اسحاق سردار سے بات کر کے باہر نکلا تو خیمے کے موڑ پر ماریہ مل گئی وہ اسحاق کا انتظار کر رہی تھی۔ ماریہ اسے اپنے ساتھ انجیروں کے باغ کی طرف لے گئی اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھے

ہوئے پوچھا: "بابا نے تجھے کیوں بلایا تھا؟"

اسحاق نے جواب دیا: "وہ کہتا تھا میں اپنی ماں کو لے آؤں تاکہ وہ تیری مجھ سے شادی کر دے۔"

ماریہ نے پوچھا: "پھر تو نے کیا جواب دیا؟"

اسحاق نے جواب دیا: "میں نے کہہ دیا کہ بہت جلدی، کسی بھی دن جا کر لے آؤں گا۔"

ماریہ نے اسحاق کے ہاتھ پکڑ کر اس کے شانے پر سر ٹکا دیا۔ بولی: "اسحاق! تجھے جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کر کیونکہ میرا باپ زیادہ دن تک تیری حمایت نہیں کر سکے گا۔"

اسحاق نے کہا: "ماریہ! اگر میری ماں یہاں آنے پر تیار نہ ہوئی تو؟"

ماریہ نے جواب دیا: "کیا وہ تجھ سے محبت نہیں کرتی! ماں کو تیری خوشی کے لیے آنا ہی پڑے گا۔"

اسحاق نے ماریہ کی زلفوں پر اپنا منہ رکھ دیا۔ نتھنوں میں بالوں کی خوشبو نشے کی طرح چڑھ گئی، اس نے کہا: "ماریہ! میں ذہنی الجھن میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔ میں بالقصد اپنی ماں سے ناراض ہو کر آیا تھا۔ میری ماں نے ایک ایسے مسلمان سے شادی کی ہے جو پہلے ہی سے شادی شدہ تھا۔ قاضی نے مجھے اپنا بیٹا بنا کر تعلیم و تربیت دی۔ اسی دوران اس کی پہلی بیوی سے لڑکا ہو گیا اس لڑکے نے میرا مستقبل سیاہ کر دیا مجھے اور میری ماں کو لوگوں سے طعنے ملنے لگے۔ قاضی نے مجھے کبھی بھی کوئی شکایت نہیں ہونے دی لیکن میں اپنی ماں سے کئی بار اس بات پر جھگڑا کہ انھیں میری وجہ سے دوسری شادی نہیں کرنا تھی اور آخر اسی بات پر ایک دن میں نے ایسا جھگڑا کیا کہ میں یہاں بھاگ آیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اپنی ماں کو یہاں کس منہ سے لاؤں گا۔"

ماریہ گھبرا گئی بے چین ہو کر بولی: "اگر ماں نہ آئیں تو یہ شادی بھی نہیں ہو گی۔"

اسحاق نے کہا: "اور اگر ماں آ بھی گئیں تو ایک مشکل پھر بھی حائل رہے گی۔"

ماریہ بہت گھبرائی ہوئی تھی، بدحواس ہو کر پوچھا: "کون سی مشکل؟"

اسحاق نے جواب دیا: "وہ مشکل تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلے تو یہ بتا کہ کیا میرے مسیحی ہوئے بغیر ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی؟"

ماریہ بہت پریشان ہو گئی، گھبرا کر پوچھا: "میں تیرا مطلب نہیں سمجھی تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا: "ماریہ! حقیقت یہ ہے کہ میری ماں اور باپ دونوں ہی مسیحی تھے مگر میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام ہی کی آغوش میں تعلیم و تربیت حاصل کی ہے میں سخت پریشان ہوں کہ میں اسلام کو اپنے دل و دماغ سے کس طرح کھرچ پھینکوں؟"

ماریہ نے گھبرا کر اسحاق کے شانے پر سے اپنا سر ہٹا لیا، بولی: "اسحاق! تو اپنے ہوش و حواس میں تو ہے تو نے میرے باپ سے وعدہ کیا ہے کہ تو اپنی ماں کی موجودگی میں اپنے مسیحی ہونے کا اعلان کر دے گا۔"

اسحاق نے جواب دیا: "ہاں ماریہ! میں تیرے باپ سے یہ وعدہ کر چکا ہوں، مگر میرے اندر اسی دن سے ایک جنگ جاری ہے اور میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ اس جنگ میں اسلام جیت گیا۔"

ماریہ کی چیخ نکل گئی: "یہ تو کیا کہہ رہا ہے، اسحاق! میں برباد ہو جاؤں گی میں تباہ ہو جاؤں گی۔"

اسحاق رو رہا تھا، اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ بند آنکھوں سے آنسو باہر آ چکے تھے۔ بولا: "ماریہ! میں تجھ سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اگر تو کہے کہ میں پہاڑ سے کود کر اپنی جان دے دوں تو میں آنکھ بند کر کے یہ کر گزروں گا، مگر پتہ نہیں اسلام کی گرفت کتنی مضبوط ہے کہ مجھے اس نے بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہے۔"

ماریہ نے سرد آہ بھری: "پھر اب کیا ہو گا؟"

اسحاق نے جواب دیا: "پتہ نہیں کیا ہو گا مگر وہی ہو گا جو قسمت میں لکھا ہو گا۔"

ماریہ نے کہا: "اسحاق! مجھے تو تیرے دل کا حال معلوم نہیں مگر تجھ کو ایسا نہیں کرنا تھا جب تجھے یہ معلوم تھا کہ تو میرا ساتھ نہیں دے سکے گا تو تجھ کو مجھے محبت کا فریب نہیں دینا تھا۔"

وہ اٹھی اور اسحاق کو چھوڑ کر چلی گئی، اسحاق اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے ماریہ پر رحم آ رہا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ



"کاش ہر شرابی اتنا ہی تعاون کرے۔"

وہ دوڑ کر ماریہ کے پاس جائے اور کہہ دے کہ ماریہ! میں اپنی مسیحیت کا اسی وقت اعلان کرنے کو تیار ہوں تو پریشان نہ ہو لیکن وہ نہیں دوڑ سکا، بس ماریہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

جب ماریہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ خود بھی اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اس کو وہی نوجوان مل گیا جو ماریہ کے باپ دی جان کارلو کے خیمے میں ملا تھا اور جس نے کہا تھا۔ "اجنبی نوجوان! میں صرف اس لیے خاموش ہوں اور تیرے حق میں دستبردار ہو گیا ہوں کہ شاید اس طرح مسیحی دین میں ایک کا اضافہ ہو جائے ورنہ تو میں برملا ماریہ سے عشق نہیں کر سکتا تھا۔"

اس نوجوان نے اسحاق کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ "اجنبی نوجوان کیا ابھی ماریہ تیرے پاس سے گئی ہے؟"

اسحاق جھوٹ نہیں بول سکا، بولا۔ "ہاں وہ میرے پاس سے ہی گئی ہے۔"

نوجوان نے بگڑ کر پوچھا۔ "وہ رو کیوں رہی تھی؟" نوجوان نے اسحاق کا گریبان پکڑ لیا، بولا۔ "نوجوان! پتہ نہیں تو نے ماریہ پر کیا جادو کر دیا کہ وہ تیرا ہی کلمہ پڑھتی ہے لیکن ایک بات یاد رکھ، اگر تو نے ماریہ کو دکھ دیا تو میں تجھے جان سے مار دوں گا۔"

اسحاق نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا، بولا۔ "میں نے ماریہ سے محبت کی ہے میں اسے دکھ کیوں پہنچاؤں گا اور اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ تو مجھے مار سکتا ہے تو یہ تیری بدترین خوش فہمی ہے اگر تو نے مجھ پر پیچھے سے وار کیا تو شاید میں مارا جاؤں لیکن اگر سامنے سے وار کیا تو وہ تیری زندگی کا آخری وار ہو گا۔"

نوجوان نے کہا۔ "تو ماریہ کو خوش نہیں رکھ سکے گا اس لیے میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو ماریہ کو اس کے حال پر چھوڑ دے اور قرطبہ چلا جا۔"

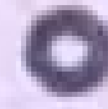
اسحاق نے پوچھا۔ "اگر میں تیرے مشورے کے مطابق قرطبہ چلا جاؤں تو کیا ماریہ تجھ سے محبت کرنے لگے گی؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "وہ بعد کی بات ہے اجنبی نوجوان۔ میرا خیال ہے میں اس کو محبت کرنے پر مجبور کر دوں گا۔"

اسحاق نے کہا۔ "لیکن میں اسے کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

نوجوان نے کہا۔ "لیکن میں تجھ کو آزمائش میں کسی وقت بھی ڈال سکتا ہوں۔ میں ماریہ کو غمزدہ نہیں دیکھ سکتا۔"

اسحاق اور وہ نوجوان دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر کھڑے گھورتے رہے پھر اپنی اپنی راہ چلے گئے۔



کے اندر جو جنگ ہو رہی تھی اس نے اسے ہلکان کر دیا۔ وہ رات رات بھر جاگتا رہتا۔ بستر نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسحاق اس بیمار جیسا تھا جو حالت نزع میں ہو اور موت کی اذیت اسے کسی کروٹ کسی پہلو چین نہ لینے دے یہی ہو۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ پندرھویں یا سولھویں کا چاند تھا۔ اسحاق نے خیمے سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھا تو ایسا لگا گویا پورا ماحول، پوری کائنات اسی کی طرح سوگوار ہے۔ مشرق میں مالقہ کی پہاڑیاں سائے کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ وہاں سے کچھ دور اندلس کی زبان میں گواڈل میڈینہ THE GUADAL MEDINA بہہ رہی تھی۔ عربوں نے اس ندی کا نام وادی المدینہ (شہر والی ندی) رکھا تھا مگر اندلس والے اسے گواڈل میڈینہ کہنے لگے۔ یہ موسمی ندی موسم بہار اور موسم سرما میں بہتی ہے۔ یہ موسم بہار تھا اور ندی شہریوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اسحاق اسی ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے چاندنی میں پانچ سات اونٹوں کو شہر کے ربض الثبانین (بھوسے کی منڈی) نامی محلے کی طرف جاتے دیکھا۔ ان اونٹوں پر بھوسا لدا ہوا تھا اور یہ کاروبار ان افریقیوں کے ہاتھ میں تھا جو مالقہ میں عرصہ دراز سے رہ رہے تھے۔ اونٹوں کے ساتھ کئی کتے بھونکتے ہوئے چل رہے تھے۔

اسحاق بڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ شبنم نے اس کے بالوں کو تر کر دیا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ مالقہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے گا۔ اور ماریہ سے صاف صاف کہہ دے گا کہ وہ اسلام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں اگر ماریہ چاہے تو مسلمان ہو کر اس سے شادی کر لے۔

مالقہ کی جامع مسجد کے مینارے سے اذان کی آواز آنے لگی۔ موذن اللہ کی بڑائی اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی رسالت کی گواہی دے رہا تھا اور سونے والوں کو بتا رہا تھا کہ نماز نیند سے بہتر ہے۔ وہ یہاں سے سیدھا جامع مسجد چلا گیا۔ وہاں فجر کی نماز ادا کی اور پھر دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر اپنے رب سے کہنے لگا۔ "الٰہ العالمین! میں مسلمان ہوں لیکن کلیسا کا سایہ میری طرف بڑھ رہا ہے، تو میری مدد فرما تاکہ میں تیرے دین مبین پر قائم و دائم رہوں۔"

فجر کی نماز پڑھ کر وہ جیسے ہی باہر نکلا، اس نے مسجد کی سیڑھیوں پر ماریہ کے باپ سردار دی جان کارلو اور اس نوجوان کو کھڑے دیکھا جو ماریہ کا عاشق تھا اور اسحاق سے الجھ چکا تھا۔

سردار دی جان کارلو کی زہریلی نظریں اسحاق کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تو رات بھر اسی مسجد میں رہا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "نہیں میں اذان کے بعد مسجد میں آیا تھا۔"

سردار دی جان کارلو نے پوچھا۔ "تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "مسجد میں لوگ کیوں آتے ہیں؟ نماز پڑھنے۔ میں بھی نماز پڑھنے آیا تھا۔"

قبیلے کا نوجوان بولا۔ "جان کارلو بابا! میں جانتا ہوں یہ مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔"

لیکن دی جان کارو نے نوجوان کو بولنے سے روک دیا، بولا۔ "ویلیز رو بیو! تو چپ رہ، مجھے بات کرنے دے۔" اس کے بعد پھر اسحاق سے مخاطب ہوا۔ "لیکن تو نے تو یہ کہا تھا کہ تو مسیحی والدین کا بیٹا ہے۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے یہ کہا تھا اور جھوٹ نہیں کہا تھا۔"

سردار دی جان کارو نے مسجد سے نمازیوں کو نکلتے دیکھا تو وہ اسحاق کو وہاں سے ہٹا کر دور لے گیا۔ زیتون کے پیچھے دی جان کارو اور نوجوان ویلیز رو بیو کے گھوڑے کھڑے ہوئے تھے۔ سردار دی جان کارو نے پوچھا۔ "میں بات یہاں کروں یا اپنے خیمے میں؟"

نوجوان ویلیز رو بیو نے مشورہ دیا۔ "یہاں بات نہ کیجئے کیونکہ یہاں بہت سارے مسلمان اس کے حمایتی بن جائیں گے۔"

سردار دی جان کارو کو اس کا مشورہ پسند آیا، بولا۔ "اچھا اسحاق تو میرے خیمے میں چل، وہیں بات کروں گا۔"

سردار دی جان کارو کی ہدایت پر نوجوان ویلیز رو بیو کے علاوہ کسی کو اندر نہیں آنے دیا گیا۔ اسحاق ان سب کے سامنے مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔

سردار نے اپنی بیوی اور ماریہ سے کہا۔ "تم دونوں جانتی ہو کہ میں اس نوجوان کو کہاں سے لا رہا ہوں؟"

ماریہ کو اسحاق کی حالت پر رحم آ رہا تھا، اس کی ماں نے پوچھا۔ "یہ کہاں تھا؟"

سردار دی جان کارو نے جواب دیا۔ "جامع مسجد میں۔ وہاں نماز پڑھ رہا تھا۔"

ماریہ نے تلملا کر اسحاق کو دیکھا۔ وہ نظروں ہی نظروں میں اسحاق سے گلا کر رہی تھی کہ یہ کیا کیا تو نے؟

ماریہ کی ماں کا پارہ چڑھ گیا۔ اسحاق کو برا بھلا کہنے لگی۔ "جب تجھ کو مسلمان ہی رہنا تھا اور نمازیں پڑھنا تھیں تو تو نے میری بیٹی کو دھوکے میں کیوں رکھا، تجھ کو ایسا نہیں کرنا تھا۔"

نوجوان ویلیز رو بیو نے کہا۔ "آپ لوگ اس کو چھوڑ دیں گے اور نرمی برتیں گے تو یہی کچھ ہوگا۔"

سردار دی جان کارو نے کہا۔ "اب میں رعایت نہیں دے سکتا۔ میں نے اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا، اس کو کام دیا، رہنے کو ٹھکانہ دیا بستر دیا، کھانا دیا، گھر کا سکھ چین دیا یہاں تک کہ اس نے میری بیٹی ماریہ سے محبت کی تو میں شادی کے لیے آمادہ ہو گیا۔ میں نے کیا نہیں کیا اس کے ساتھ۔ اور یہ ہے کہ ان تمام کے عوض اپنا دین تک نہیں چھوڑ سکتا۔"

ماریہ کی ماں نے کہا۔ "نظریں اوپر اٹھا کر اور آنکھیں ملا کر بات کر، تو نے کیا سوچا ہے؟"

ویلیز رو بیو نے ایک بار پھر مشورہ دیا۔ "اس سے کہیے کہ یہ فوراً عیسائی ہو جائے۔"

سردار دی جان کارو نے اپنے عزیزوں کی طرف دیکھا، اور فہمائش کی۔ "میں اپنی بدنامی اور رسوائی کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے، وہ بے غیرت اور ذلیل ہیں لیکن میں اپنے نام کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہونے دوں گا۔"

ویلیز رو بیو نے اسحاق کی ٹھوڑی میں ہاتھ دے کر چہرہ اوپر اٹھایا اور کہا۔ "نیچے مت دیکھ، آنکھیں ملا کر بات کر، شاید تو یہ نہیں جانتا ہم جب کسی کے دشمن بنتے ہیں تو اس کے وجود تک کو مٹا دیتے ہیں۔"

اسحاق نے سب کو جواب دیا۔ "یہ تم سب کی زیادتی ہے کہ ایک اکیلے کو چاروں طرف سے گھیر کر تیر چلا رہے ہو۔"

ماریہ کے لیے اب ناقابل برداشت تھا، وہ گڑگڑا کر بولی۔ "ایک اکیلے کو تم سب نے دیوانہ بنا کے رکھ دیا ہے۔" اس کے بعد اسحاق پر برس پڑی۔ "جب تجھے اپنے دین پر قائم ہی رہنا ہے اور مجھے حاصل نہیں کرنا تو پھر یہاں ہمارے درمیان قیام کیوں کیا؟ یہاں سے بھاگ جا۔"

سردار دی جان کارو نے کرخت لہجے میں کہا۔ "اسحاق! آج میں تجھ سے حتمی جواب لوں گا۔ تو کیا چاہتا ہے؟ ماریہ سے شادی کرے گا یا نہیں؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "سردار میرے اندر ایک جنگ ہو رہی ہے اور افسوس کہ ابھی تک اسلام غالب ہے اور میری محبت مغلوب۔"

ماریہ رونے لگی، اپنے باپ سے کہا۔ "بابا جان! اس کو یہاں سے چلا جانے دیں۔"

لیکن سردار دی جان کارو نے اسحاق کو ایک موقع اور دیا، اور کہا۔ "میں تجھ کو پندرہ دن اور دیتا ہوں تو کہتا ہے کہ تیرے اندر ایک جنگ جاری ہے اور اس جنگ میں ابھی تک اسلام غالب اور محبت مغلوب ہے۔ جس دن یہ جنگ ختم ہو جائے مجھے مطلع کر دینا۔ ہو سکتا ہے کسی دن ماریہ کی محبت اسلام پر غالب آ جائے۔"

نوجوان ویلیز رو بیو نے کہا۔ "لیکن میں اس تجویز سے اتفاق نہیں کروں گا۔ اس نے ماریہ سے جو مذاق کیا ہے اس کی اسے سزا ملنی چاہیے۔"

لیکن ماریہ نے پھر دخل دیا۔ "ویلیز رو بیو! جب میں اسے معاف کر رہی ہوں تو تو سزا تجویز کرنے والا کون ہوتا ہے۔"

ماریہ کی ماں نے اپنی بیٹی کو ڈانٹ دیا۔ "تیری فراخ دلی، اور نرمی نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے ویلیز رو بیو کی بات معقول ہے۔"

لیکن سردار نے کہا۔ "جب میں نے اسحاق کو پندرہ دن دے

دے تو دے دے، پندرہ دن بعد میں کوئی فیصلہ کر دوں گا۔"

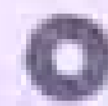
اس کے بعد سردار نے مجلس برخاست کر دی۔

جب اسحاق سر جھکائے خیمے سے باہر نکلا تو اس کے پیچھے پیچھے ماریہ بھی باہر نکلی۔ اس نے اسحاق کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "شاید پندرہ دن بعد بھی تیرا فیصلہ یہی ہو پھر تو کیوں وقت ضائع کر رہا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے تیری محبت غالب آ جائے۔"

ماریہ نے آہستہ سے کہا۔ "ایسے میرے نصیب کہاں۔"

اسحاق لرز گیا اور اس مختصر سے فقرے نے ذرا سی دیر کے لیے اسلام کو مغلوب کر لیا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اسی وقت ماریہ کے ساتھ چرچ چلا جائے اور وہاں اصطباغ لے کر مسیحی بن جائے۔ لیکن وہ اس کا اعلان نہ کر سکا اور اسلام پھر غالب آ گیا۔



معلوم نہیں کیوں اور کس امید پر ماریہ اسحاق سے پھر ملنے جلنے لگی۔ وہ دونوں وقت کا کھانا لے کر خود پہنچتی اور اس وقت تک اس کے پاس رہتی جب تک وہ کھانا کھا نہ لیتا۔ پھر خالی برتن لے کر واپس چلی جاتی۔ اس کے بعد پھر آ جاتی اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ کسی قسم کی بات بھی نہیں کرتی پھر ماریہ کی ماں آ جاتی اور اس کو زبردستی کھینچ کر لے جاتی۔

جب آٹھ دن گزر گئے تو ماریہ نے اچانک اس سے پوچھ لیا۔ "اسحاق! کچھ پتہ ہے کتنے دن گزر گئے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں پتہ ہے آٹھ دن گزر گئے۔"

ماریہ نے پوچھا۔ "وہ جنگ جو تیرے اندر جاری تھی، کیا اب بھی جاری ہے؟"

اسحاق نے جواب کے لیے منہ کھولا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

ماریہ نے کہا۔ "اسحاق! میں نے جو کچھ پوچھا ہے اس کا سیدھا سچا جواب دے۔ میں ہیر پھیر کو بالکل پسند نہیں کرتی۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ماریہ! کیا تو اپنا دین ترک کر سکتی ہے؟"

ماریہ غصے سے لال ہو گئی۔ "تو آٹھ دن بعد اس فیصلے پر پہنچا ہے۔ تیرا یہ سوال اگر میرا باپ سن لے گا تو تجھے قتل کر دے گا اور پھر میں مسلمان کیوں ہو جاؤں؟"

اسحاق نے کہا۔ "ماریہ! جس طرح تو اپنا دین نہیں چھوڑ سکتی اسی طرح میں اسلام نہیں چھوڑ سکتا۔"

ماریہ کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ بولی۔ "اسحاق! تیری محبت میں میں کتنی بے غیرت ہو گئی ہوں۔ میری ماں کو یہ بات پسند نہیں کہ میں تیرے پاس آؤں۔ میرے باپ نے مجھ سے بات چیت بند کر رکھی ہے خاندان والوں نے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے لیکن میں ہوں کہ تیرے پاس آئے چلی جا رہی ہوں۔ معلوم نہیں کیوں جب کہ میں یہ جانتی ہوں کہ پندرہ دن بعد بھی تیرا وہی فیصلہ ہو گا جو پندرہ دن پہلے تھا۔ اسحاق! بتا میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس طرح جیوں؟"

اسحاق کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

ماریہ نے پوچھا۔ "اچھا آج تو میرے ایک سوال کا جواب دے دے۔"

اسحاق نے کہا۔ "کر سوال۔"

ماریہ نے پوچھا۔ "کیا تو مجھ سے واقعی محبت کرتا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں ماریہ میں تجھ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔"

ماریہ نے کہا۔ "پھر تو مجھے حاصل کیوں نہیں کر لیتا؟"

اسحاق نے کہا۔ "ماریہ! اب میں نے پھر وہی فیصلہ کیا ہے میں قرطبہ واپس جاؤں گا اور تیرا مقدمہ اپنی ماں کی عدالت میں پیش کر دوں گا۔ اگر میری ماں نے کہا کہ عیسائی ہو کر تجھ کو حاصل کروں تو مجھے کوئی انکار نہ ہو گا اور میں اپنی ماں کو لے کر واپس آ جاؤں گا اور تجھ کو حاصل کر لوں گا۔"

ماریہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بے اختیار بولی۔ "کیا سچ؟ کیا تو نے واقعی یہ فیصلہ کر لیا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں ماریہ! میں نے واقعی یہ فیصلہ کیا ہے۔"

ماریہ نے بے چینی سے پوچھا۔ "اور کیا تیری ماں راسخ العقیدہ مسیحی ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں وہ کٹر مسیحی ہے۔"

ماریہ نے کہا۔ "تب پھر مجھے یقین ہے کہ اس کا فیصلہ میرے حق میں ہو گا۔"

اسحاق نے ماریہ سے رائے لی۔ "ماریہ! کیا میں اپنے فیصلے کا آج ہی اعلان کر دوں؟"

ماریہ نے کہا۔ "نہیں ابھی نہیں! ٹھیک پندرہ دن بعد جب تجھ سے پوچھا جائے تو اپنا یہ فیصلہ سنا دینا۔"

ماریہ خوشی خوشی جب واپس جانے لگی تو اسحاق نے اس کو روک لیا۔ اور اپنے صندوق میں سے ڈھیر سارے سکے نکال لایا انہیں ماریہ کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ "ماریہ! یہ میری وہ کمائی ہے جو میں پس انداز کرتا رہا ہوں۔ کمائی کا کچھ میں نے رکھ لیا ہے بقیہ تیری نذر ہے۔"

ماریہ نے کہا۔ "لیکن میں انہیں لے کر کیا کروں گی؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ماریہ! جب میں نے تجھ کو اپنا مان لیا

تو میرا جو کچھ ہے وہ تیرا ہے انھیں رکھ لے۔"

ماریہ نے بدستور انکار کیا "نہیں! میں انھیں نہیں لے سکتی۔ جب تم بالکل میرے ہو جاؤ گے تو میں قبول کر لوں گی۔"

اسحاق نے بہت کوشش کی کہ ماریہ اس کی بات مان لے۔ لیکن وہ نہیں مانی اور وہاں سے خالی ہاتھ واپس چلی گئی۔

سولھویں دن سردار دی جان کارلو نے اسحاق کو طلب کر لیا اس دن بھی وہی لوگ موجود تھے۔ ولیمیز ردیو، ماریہ، ماریہ کی ماں اور ماریہ کا باپ دی جان کارلو۔

اس نے اسحاق سے پوچھا "اسحاق! آج کتنے دن ہو گئے؟"

اسحاق نے جواب دیا "آج سولھواں دن ہے سردار۔"

سردار نے پوچھا "پھر کیا فیصلہ کیا ہے؟ اندر کی جنگ میں کون غالب آیا اور کون مغلوب ہوا؟"

اسحاق نے کہا "سردار! آپ میرا مذاق نہ اڑائیں تو بتاؤں۔"

سردار نے جواب دیا "یہاں میری موجودگی میں کون ہے جو تیرا یا کسی اور کا مذاق اڑائے؟"

اسحاق نے کہا "سردار! جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ میری ماں راسخ العقیدہ رہی ہے۔ میں عنقریب اس کے پاس چلا جاؤں گا اور یہ معاملہ اس کے سامنے رکھ دوں گا پھر جیسا میری ماں کہے گی، میں اسی پر عمل کروں گا۔"

سردار نے پوچھا "ویسے تیرا خیال کیا ہے، تیری ماں کیا فیصلہ دے گی؟"

اسحاق نے جواب دیا "میری ماں کٹر مسیحی ہے اور اس نے آج تک مجھے اسحاق نہیں آئزک کہا ہے اس لیے اس کا فیصلہ بھی ماریہ کے حق میں ہو گا۔"

سردار نے اس تجویز پر خوشی کا اظہار نہیں کیا وہ کچھ سوچتا رہا، پھر پوچھا "مگر اس بات کا کیا ثبوت کہ تم نے جو کچھ کہا، وہ درست ہے؟"

اسحاق نے کہا "لیکن میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟"

سردار نے کہا "اس کا صحیح جواب تو تو خود ہی دے سکتا ہے، میں کیا جواب دوں؟"

اسحاق نے کہا "سردار! میں اسلام اور ماریہ کی محبت کی قسم کھا کھا کے تجھے یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا سچ کہا ہے۔"

ولیمیز ردیو نے اپنی رائے دی "سردار! میرا خیال ہے کہ یہ نوجوان اس طرح اپنی جان بچا رہا ہے۔"

ماریہ کی ماں نے تائید کی "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

لیکن ماریہ چڑ گئی، جھنجلا کر بولی "اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر جھوٹ اور سچ کو سمجھنے کے لیے قرطبہ کے کچھ لوگ اسحاق کے ساتھ قرطبہ چلے جائیں اور وہاں کے حالات اور معاملات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔"

سردار نے کہا "نہیں میرا کوئی مقصد نہیں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ میری بیٹی جہاں بھی چلی جائے، راج کرے، حکومت کرے۔" پھر سردار نے پوچھا "تب پھر تو اپنی ماں کے پاس کب جائے گا؟"

اسحاق نے جواب دیا "دو تین دن بعد، جب جاؤں گا، آپ کو مطلع کر کے جاؤں گا۔"

سردار نے اپنی بیٹی سے پوچھا "تو کیا کہتی ہے؟"

ماریہ نے جواب دیا "آپ مطمئن ہیں تو میں بھی مطمئن ہوں۔"

سردار مجلس سے مخاطب ہوا "آپ سب نے اس کا فیصلہ سن لیا! اگر آپ کو اس فیصلے سے اتفاق نہ ہو تو ابھی بتا دیں۔"

لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو سردار سے اختلاف کرتا۔ سردار دی جان کارلو نے اسحاق کو اجازت دے دی کہ وہ قرطبہ جا سکتا ہے اور اپنی ماں کو اپنے ساتھ لا سکتا ہے۔

اس دن ماریہ کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ وہ کھلی جا رہی تھی اس کا رواں رواں اور انگ انگ مسکرا رہا تھا، ہنس رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں عشق و محبت کی بازی سر کر لی تھی۔

اب اسحاق بظاہر خوش نظر آتا تھا مگر اس کی اندرونی کیفیت بڑی پریشان کن تھی۔ اس نے انجیر کے باغ کا کام چھوڑ دیا تھا۔

ماریہ اور اسحاق نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ چند دن وہ ساتھ ساتھ گزاریں گے۔ ماریہ اسحاق کو مالقہ کی بندرگاہ میں لے گئی جہاں جہازوں کی کثرت تھی اور سیپ اور موتیوں کی بنی ہوئی چیزیں لکڑی کے تختوں پر سجی ہوئی تھیں۔ یہیں علاقہ کے خوبصورت سنہری برتن بھی رکھے ہوئے تھے۔ مٹی کے ان برتنوں کی بڑی مانگ تھی اور غیر ملکی سیاح اور مسافر انہیں خرید کر دور دور لے جاتے تھے۔ ماریہ اسحاق کو ان دکانوں پر لے گئی۔ اس نے یہاں سے موتیوں کا ایک قیمتی ہار خریدا۔ یہ چار لڑیوں والا ہار بہت اچھا لگتا تھا۔ ماریہ نے کہا "یہ ہار اپنی ماں کو میری طرف سے پیش کر دینا۔"

اسحاق نے طوعاً و کرہاً ہار لے تو لیا مگر کچھ اور خریدنے سے منع کر دیا۔ لیکن ماریہ نہیں مانی اور اس نے چند برتن بھی خریدے۔ ایک خوبصورت پیالہ اور چند پلیٹیں، پیالے اور پلیٹوں پر عربی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ماریہ نے کہا "اس پیالے پر کیا لکھا ہے ذرا پڑھنا تو سہی۔"

شوہر نے بڑے پیار سے بیوی سے کہا "تم ہی ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا آئیڈیل مجھے مل گیا۔"

بیوی نے سرد آہ بھری اور بولی "مرد واقعی خوش قسمت ہوتے ہیں۔!"

اسحاق نے پڑھا۔ اس پر کندہ تھا۔ "پیالے کے مالک کے لیے برکت و راحت ہو۔"

ماریہ مسکرائی، بولی۔ "خدا برکت و راحت دے۔" پھر پلیٹوں کی بابت پوچھا۔ "اور ان پہ کیا لکھا ہے؟"

اسحاق نے پڑھا۔ ان پر الگ الگ عبارتیں کندہ تھیں ایک پر کندہ تھا۔ "خدا اس کے مالک کے رزق میں وسعت عطا کرے۔"

دوسری پر کندہ تھا۔ "خدا تیرے دسترخوان کو وسیع کرے۔"

تیسری پر کندہ تھا۔ "بسم اللہ، کھائیں اور خوش و خرم رہیں۔"

ماریہ کو یہ عبارتیں بہت پسند آئیں، پھر وہ اسحاق کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی اونچی نیچی پہاڑیوں پر چڑھتی اترتی رہی جو سطح سمندر پر یوں ابھری تھیں گویا قدرت نے انھیں آنے جانے والوں کی سہولت کے لیے پیدا کر دیا تھا۔ سمندری موجوں کی متواتر کوششوں نے چٹانوں کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں اور اب یہ کھوکھلے حصے بڑے بڑے اژدہوں اور مگرمچھ کے منہ کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

ماریہ نے سمندر کی سرکش موجوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسحاق! کچھ یہی حال میرے دل کا ہے اس میں تیری محبت اسی طرح موجزن ہے۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "میرا بھی یہی حال ہے ماریہ۔ اگر میرے دل کی ہیجانی کیفیت زیادہ دن برقرار رہی تو شاید اس میں بھی جوف سے پڑ جائیں گے۔"

ماریہ بڑے انہماک سے سمندر کی سرکش امواج کا نظارہ کرتی رہی۔ پھر یہ پہاڑی سے نیچے اترے اور ساحلی ریت پر چلنے لگے ان کے پاؤں ریت میں دھنسے جا رہے تھے۔ وہ دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے اور اسحاق نے ریت پر انگلیوں سے لکھا۔ "ماریہ، میری زندگی، میری کائنات۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔"

ماریہ نے لکھا۔ "اسحاق، میری جان، میری آن اور میرا سب کچھ تجھ پر قربان۔ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی تحریریں پڑھیں اور ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگے۔ دوسرے تماشائیوں اور سیاحوں نے ان دونوں کو اس طرح ہنستے دیکھا تو وہ بھی ہنسنے لگے، وہ انھیں کچھ پاگل محسوس کر رہے تھے۔

وہ یہاں سے بھی کچھ آگے بڑھ گئے اور ماریہ نے کہا۔ "آؤ ہم دونوں یہاں کچھ دیر بیٹھ کر اپنی زندگی کی یادگار باتیں کریں۔"

اسحاق بیٹھ گیا۔ ماریہ نے کہا۔ "ہاں تو اب یہ بتا کہ تو کب تک واپس آ جائے گا؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "زیادہ سے زیادہ ایک ماہ میں، کیونکہ میں وہاں رکوں گا نہیں۔"

ماریہ نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ "اگر تو کسی وجہ سے نہ آسکا تو؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "میں ضرور آؤں گا۔"

ماریہ نے کہا۔ "اگر تو نہ آیا تو یہاں میرا بڑا مذاق اڑے گا اور میری زندگی دوبھر ہو جائے گی۔"

اسحاق نے کہا۔ "ماریہ! میں ضرور آؤں گا۔"

لیکن ماریہ کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا، اس نے کہا۔ "اگر مجھے خاندان کی بدنامی کا احساس نہ ہوتا تو میں تیرے ساتھ چلتی اور ماں کو لے کر واپس آ جاتی لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اسحاق کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ "ماریہ! میں ضرور واپس آؤں گا۔"

... کچھ دیر بعد جب یہ دونوں اس جگہ دوبارہ گئے جہاں زمین پر انھوں نے اظہارِ عشق کیا تھا تو وہاں ہواؤں کے تیز جھونکوں نے اسحاق کی عبارت پر تو ریت کی تہہ جما دی تھی مگر ماریہ کی عبارت کا کچھ حصہ ابھی محفوظ تھا۔ "میری جان ..... تجھ پر قربان، میں

اسکاٹ لینڈ والے

صرف کنجوسی میں شہرت نہیں رکھتے بلکہ ان کی بذلہ سنجی و ظرافت بھی مشہور ہے۔ ایک ریفری نے ایک قصہ سنایا۔

"جنوبی امریکہ کی ایک فٹ بال ٹیم ایڈنبرا میں اسکاٹ لینڈ کی قومی ٹیم سے میچ کھیل رہی تھی۔ میں ریفری تھا۔ مقابلہ بڑا زبردست تھا۔ لوگ بار بار میرے فیصلے پر اعتراض کرتے۔ اسکاٹ لینڈ والے صفر کے مقابلے میں چار گول سے ہار گئے۔ جب میدان سے جانے لگے تو ایک کھلاڑی بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔

"ریفری! تمہارا کتا کہاں ہے؟"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کتا؟ کونسا کتا؟"

وہ شخص طنز آمیز انداز میں بولا۔ "کمال ہے۔ میں نے آج تک کسی اندھے کو بغیر کتے کے نہیں دیکھا۔"

تجھ سے محبت کرتی ہوں۔"

ماریہ نے یہ سب دیکھا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اسحاق کھسیایا ہوا تھا، بولا۔ "ماریہ افسوس کہ میرا ہواؤں پر کوئی اختیار نہیں۔"

ماریہ خاموش رہی لیکن اس کا دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔

جب یہ دونوں ساحل سمندر سے اپنے گھر واپس گئے، تو وہاں تہلکا سا مچا ہوا تھا۔ سردار دی جان کارلو اپنے گھوڑے پر سوار ہونے ہی والا تھا۔ نوجوان ویلیز ردیبو اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ خاندان کے بچے بوڑھے اور عورتیں ان دونوں کو حیرت اور خوشی سے دیکھ رہی تھیں۔ ماریہ کی ماں نے آگے بڑھ کر ماریہ کے رخساروں پر تھپڑوں کی بوچھار کر دی۔ "یہ تو کہاں چلی گئی تھی؟ ہمیں خواہ مخواہ پریشان کر دیا تم دونوں نے۔ اگر تو کچھ دیر اور نہ آتی تو تیرا باپ اور قبیلے کے دوسرے کئی جوان تیری تلاش میں جا چکے ہوتے۔"

سردار دی جان کارلو نے اپنے گھوڑے کو پاس کھڑے ہوئے ایک معمر شخص کے سپرد کیا اور اسحاق سے کہا۔ "ذرا میرے ساتھ تو آ۔"

اسحاق اس کے ساتھ خیمے میں چلا گیا۔ ویلیز ردیبو بڑی پھرتی سے گھوڑے سے اترا اور اس کو ایک درخت سے باندھ کر سردار کے پیچھے ہی چلا گیا۔ اس وقت سردار اسحاق سے کہہ رہا تھا۔ "تو نے کتنی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی ہے یہ؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "لیکن میں اس غلط فہمی میں تھا کہ ماریہ نے گھر میں بتا دیا ہوگا۔"

سردار نے کہا۔ "دیکھ نوجوان! اب تیری اقامت پرلطف نہیں رہی بہتر یہی ہے کہ تو یہاں سے چلا جا اور اپنی ماں کو جلد از جلد لے کر واپس آ۔"

اسحاق نے جواب دیا۔ "بہتر ہے اب میں قطعی چلا جاؤں گا کیونکہ مجھے بھی یہ بات پسند نہیں کہ یہاں مجھے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے۔"

سردار نے کہا۔ "اگر آج کہیں تو نے وہ غلطی کی ہوتی جس کا ہمیں شبہ تھا تو یقین کر، ہم تم دونوں کو جہاں کہیں پاتے قتل کر دیتے۔"

اسحاق نے سردار کو افسوسناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم دونوں اس طرح جاتے کیوں۔ کیا شرفا ایسا کرتے ہیں۔ کیا میں شریف نہیں ہوں؟ کیا آپکی بیٹی شریف نہیں ہے؟"

ویلیز ردیبو نے ایک بار پھر ان کی باتوں میں مداخلت کی، بولا۔ "سردار دی جان کارلو، میرا خیال ہے یہ نوجوان جھوٹا ہے، اور یہ اپنی ماں کو یہاں نہیں لا سکے گا۔"

اسحاق کو غصہ آ گیا، بولا۔ "میں جھوٹا نہیں میرے رقیب! اگر تو میرے ساتھ چلنا پسند کرے تو میں تجھ کو اپنے ساتھ قرطبہ لے جا سکتا ہوں تو جب وہاں میری ماں ازابلا سے ملے گا تو تجھے میری باتوں پر لازماً اعتبار کرنا پڑے گا۔"

اس وقت ماریہ کی ماں بھی بڑبڑاتی ہوئی داخل ہوئی وہ اپنے شوہر سردار دی جان کارلو پر برس پڑی۔ "جب تجھے انسان کی پہچان نہیں ہے تو اس اجنبی کو سہارا کیوں دیا تھا میں تو کہتی ہوں تو اپنے وعدے واپس لے لے اور اس کو یہاں سے رخصت کر دے۔"

لیکن سردار نے کہا۔ "میں مرد ہوں اور اپنے قبیلے کا سردار بھی۔ میں اپنے عہد اور وعدے سے کس طرح پھر سکتا ہوں۔" پھر اسحاق سے کہا۔ "اب تو یہاں سے چلا جا اور قرطبہ جانے کی تیاری کر۔"

اسحاق اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ماریہ پر کیا بیتی ۔۔۔ وہ بقیہ دن اور پوری رات ماریہ کا منتظر رہا مگر وہ نہیں آئی۔

دوسرے دن بھی وہ نہیں آئی لیکن رات کو ایک بوڑھا شخص اس سے ملنے آیا۔ اس شخص سے وہ انجیر کے باغ میں مل چکا تھا۔ اس نے اسحاق کو ایک خط دیا۔ یہ خط ماریہ نے لکھا تھا، ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس میں لکھا تھا۔

"اسحاق! میرے باپ کو یہ شبہ ہے کہ تو قرطبہ سے واپس نہیں آئے گا اس لیے اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ صبح جب تو باہر نکلے گا تو چند نوجوان تجھ پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ میرا باپ تجھے قتل کر دینا چاہتا ہے اس لیے تو آج رات ہی یہاں سے نکل جا۔ یہ بوڑھا تیری مدد کرے گا۔ انجیروں کے باغ کے اس پار تجھے ایک گھوڑا مل جائے گا تو اس پر بیٹھ کر فرار ہو جا۔ افسوس کہ میں تجھے الوداع نہیں کہہ سکتی ورنہ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ دو چار میل میں تیرا ساتھ دیتی لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ مجھ پر پہرے بٹھا دیے گئے ہیں۔ یہ یہودی بوڑھا جو میرا خط لے کر آیا ہے بہت شریف اور معقول انسان ہے۔ گھوڑے کا انتظام بھی یہی کرے گا۔ مجھ پر کیا بیتی اور کیا بیت رہی ہے جب تو قرطبہ سے اپنی ماں کو ساتھ لے کر آئے گا تو بتاؤں گی۔"

اسحاق نے اپنا سامان یکجا کیا اور بوڑھے کا انتظار کرنے لگا وہ رات کے پچھلے پہر دوبارہ آیا۔ اسحاق نے کچھ سامان اس کو دیا اور کچھ خود لیا اور سایہ دار درختوں کے پیچھے پیچھے چل کر انجیر کے باغ کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ یہاں ایک درخت سے بندھا ہوا گھوڑا کھڑا تھا۔ اسحاق نے اپنی پوٹلیاں گھوڑے پر رکھیں۔ بوڑھے یہودی کا شکریہ ادا کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر قرطبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ گھوڑے کو شمال میں بھگاتا رہا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ کہ کہیں اس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا لیکن وہ بڑی آسانی سے کورہ قرطبہ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ قرطبہ کا سرحدی شہر الیشانہ سامنے تھا۔ اس نے یہاں کی سرائے میں قیام کیا۔ یہ یہودیوں کا شہر تھا۔ ہر طرف یہودی آباد تھے۔ وہ ایک دن اور ایک رات سرائے میں رہا اور صبح ہوتے ہی آگے روانہ ہو گیا اور پھر بیانہ میں قیام کیا۔ بیانہ کی سرائے میں وہ لوگ بھی نظر آئے جنھیں وہ قرطبہ میں بھی دیکھ چکا تھا یہاں سے قرطبہ زیادہ دُور نہیں تھا۔ وہ یہاں منصوبے بنانے لگا کہ جب وہ ماں سے ملے گا تو کیا بات کرے گا۔ اس کو یہ یقین تھا کہ ماں اُس کی بات ضرور مان لے گی کیونکہ وہ سعدونہ کے ہاتھوں خاصی ذلتیں اُٹھا چکی تھی پھر اسے قاضی سعید کا خیال آیا۔ اسے قاضی سعید سے کوئی شکایت نہیں تھی اور وہ جانتا تھا کہ اگر قاضی سعید نے اسے اپنی حویلی میں لے جانا چاہا تو وہ شاید انکار نہ کر سکے۔

بیانہ کی سرائے میں بڑی بھیڑ بھاڑ تھی۔ لوگوں کی آمد و رفت میں بڑی تیزی تھی۔ سرائے کے باہر میدان میں کئی سو فوجی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ یہ اُن فوجیوں کو دیکھنے گیا۔ یہ خوبصورت اور جوان سپاہ لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اسحاق کو ان میں بھی چند چہرے شناسا نظر آئے۔ ابھی وہ انہیں اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور ایک آواز سنائی دی۔ "اسحاق! میں تیری تلاش میں نکلا ہوں۔"

اسحاق نے پیچھے مُڑ کر جو دیکھا تو اُس کے ہوش ہی جاتے رہے۔ یہ قاضی سعید کا خاص آدمی تھا اور قاضی جبر اور زور کے سارے کام اس شخص سے لیتا تھا۔ اس کا نام احمر تھا۔ احمر نے پھر اپنی بات دہرائی "میں تیری تلاش میں نکلا ہوں اسحاق!"

اسحاق چور سا بن گیا۔ پُوچھا "تم مجھے کہاں تلاش کرتے ؟"

احمر نے جواب دیا "میں ان فوجی جوانوں کے ساتھ مالقہ جا رہا تھا۔ کیونکہ قاضی کو کسی نے یہ خبر دی تھی کہ ان دنوں تو مالقہ کے کسی یہودی کی ملازمت کر رہا ہے۔ اس یہودی کا غالباً انجیر کا باغ ہے اور اسی باغ میں کوئی کام کر رہا ہے۔"

اسحاق نے پوچھا "اگر میں مالقہ میں نہ ملتا تو ؟"

احمر نے جواب دیا "بہر حال میں تجھے تلاش کر کے دم لیتا۔"

احمر نے اسے اپنی حراست میں لے لیا اور اسی دن قرطبہ روانہ ہو گیا۔ وہ باب جزیرۃ الخضرا سے قرطبہ میں داخل ہو گئے۔

راستے میں اسحاق نے احمر سے پُوچھا "کیا میں قیدی ہوں ؟"

احمر نے جواب دیا "نہیں مگر یہ احساس کیونکر ہوا ؟"

اسحاق نے کہا "تم لوگ جس طرح مجھ کو لیے جا رہے ہو اس سے ایسی شبہ ہوتا ہے۔"

احمر نے کہا "اسحاق! بات یہ ہے کہ قاضی سعید تیری غیر حاضری سے بہت پریشان تھے۔ دُوسری طرف وزیر ابن ابی عامر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے تیری تلاش اور بازیابی کا حکم دے دیا۔"

اسحاق پہلے اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا تھا مگر احمر نے اسے قاضی سعید کی عدالت میں پہنچا دیا۔ اس وقت قاضی سعید بیع جبری کے ایک مقدمے کی کارروائی میں مشغول تھے۔ اپنے سامنے اسحاق کو اچانک اور غیر متوقع جو دیکھا تو اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور "میرا بچہ میرا بچہ" کہتے ہوئے اسحاق کے سینے سے لگ گئے۔ قاضی سعید کی حیرت انگیز روش نے ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

قاضی سعید نے پوچھا "تو کہاں غائب ہو گیا تھا ؟"

اسحاق نے کہا "پہلے مجھے گھر لے چلیے پھر باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

قاضی اسحاق اسی وقت اسحاق کو اپنے ساتھ حویلی میں لے گیا۔

قاضی نے دُور ہی سے اپنی بیوی سعدونہ کو آواز دی اور کہا "دیکھ سعدونہ! کون آ گیا ؟"

سعدونہ اسحاق کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اُسے دعائیں دینے لگی۔

اسحاق کو نصر کی تلاش تھی وہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے قاضی سعید سے پوچھا "اور نصر کہاں چلا گیا ؟"

نصر کے نام پر سعدونہ اور قاضی بے حد اُداس ہو گئے۔ قاضی نے کہا "تیرے سامنے وہ بیمار تھا اور کچھ صحت یاب ہو گیا تھا مگر اسحاق! وہ اس کا سنبھالا تھا تیرے جانے کے دوسرے ہی دن وہ چل بسا۔"

سعدونہ ہچکیاں لے کر زور زور سے رونے لگی۔ اسحاق کو اس خبر نے بہت دکھ پہنچایا۔

قاضی نے کہا "اور دیکھ اسحاق اب تو کہیں نہیں جائے گا۔ یہیں ہمارے پاس اسی حویلی میں رہے گا۔"

اسحاق نے پوچھا "نصر کی موت پر میری ماں حویلی میں آئی تھی ؟"

قاضی سعید نے ایک سرد آہ بھری اور جواب دیا "ہاں وہ بھی آئی تھی لیکن کسی کی آمد اسے کیونکر روک سکتی تھی وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔"

کئی گھنٹے بعد بھی اسحاق کو حویلی سے باہر نہیں جانے دیا گیا آخر اُس نے قاضی سے کہا "بابا جان! میں ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

قاضی نے ٹھہر ٹھہر کر، رک رک کہنا شروع کیا "وہاں تو ایک ایک دن ہر کسی کو جانا ہے۔ کوئی جلدی چلا جائے گا کوئی بہ دیر۔ جب تو اپنی ماں کو ناراض کر کے چلا گیا تو وہ بیمار پڑ گئی۔ اس نے کھانا پینا ترک کر دیا تھا اور تیری یاد میں آنسو بہاتی رہتی تھی۔ وہ مجھ سے بے حد ناراض تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسے کھانا کھلاؤں لیکن اس نے میری بات نہیں مانی۔ [illegible] چند دنوں کے [illegible] ہو گئی تھا۔ اس پر بے ہوشی کے دورے پڑنے [illegible]

اسے جب بھی ہوش آتا، یہی پوچھتی "کیا اسحاق آگیا؟" میں جواب دیتا "ابھی نہیں۔" آخر اسی کیفیت میں وہ اس دنیا سے کوچ کر گئی۔"

قاضی کا دل بھر آیا۔ اسحاق تو زور زور سے رونے لگا۔ قاضی سعید نے اسے سمجھایا: "اسحاق! مرد اس طرح نہیں روتے۔ صبر کر۔"

اسحاق نے کہا: "میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ میں نے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔"

قاضی نے اسحاق کو سمجھانے کی کوشش کی "بیٹے اسحاق! اُن دنوں تم دونوں کی تذلیل اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ تو فرار ہونے میں حق بجانب تھا۔ ہم سب لکڑیوں کی پتلیاں ہیں اور کسی بازی گر کے اشارے اور مرضی پر ناچ رہے ہیں۔"

وہ اپنی ماں کے گھر گیا، وہ مقفل تھا۔ قاضی نے تالا کھولا۔ اسحاق کو اس مکان سے اپنی ماں کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پورے مکان میں چلتا پھرتا رہا اور وہاں کی ایک ایک بات یاد کر کے لوٹتا رہا۔

قاضی سعید نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا "بیٹے وہی جو کچھ ہونا تھا، ہو گیا۔ صبر کر کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے۔"

اب اسحاق کی ماریہ سے متعلق پوری عمارت زمین بوس ہو چکی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر وہ اپنی ماں کے بغیر مالقہ واپس گیا تو سردار دی جان کارلو اور ویلیز رہنہ ہو اُسے بے دردی سے قتل کر دیں گے۔ اب وہ جس مشکل میں پھنس گیا تھا بظاہر اس کا کوئی حل نہیں نظر آتا تھا۔ اسے ماریہ کا معصوم چہرہ بار بار تصور میں نظر آتا تھا۔ اس کو بعض اوقات یوں لگتا جیسے وہ سامنے کھڑی کہہ رہی ہے کہ اسحاق تو نہیں آئے گا۔

سوتے جاگتے، کھاتے پیتے ہر وقت ماریہ ہی یاد آتی رہتی۔ کئی بار اس کے جی میں آئی۔ وہ اس معاملے میں قاضی سعید سے مشورہ کرے لیکن یہ سوچ کر کہ اس مشورے سے حاصل کیا ہو گا۔ اس نے قاضی سے کوئی ذکر نہیں کیا۔

ایک دن سہ پہر کو حویلی میں بہت سارے مہمان آ گئے۔ یہ سعدونہ کی بہن تھی۔ سعدونہ کی بہن عاتکہ۔ اس کا شوہر اور چار بچے۔ ان میں سب سے بڑی ایک لڑکی تھی میمونہ۔ سارے بچے اسحاق سے بہت جلد مانوس ہو گئے۔ اور وہ ہر وقت اسے گھیرے رہتے۔

اسحاق کا خیال تھا کہ یہ لوگ چند دن رہ کر چلے جائیں گے، لیکن قاضی نے اُن کی بابت یہ بتایا کہ شوہر تو چلا جائے گا مگر باقی لوگ چھ ماہ مہمان رہیں گے۔"

اسحاق دل بہلانے کے لیے قاضی کے ساتھ عدالت جانا چاہتا تھا مگر قاضی نے اسے حکم دیا کہ جب تک حویلی میں مہمان موجود ہیں، وہ حویلی میں رہے۔ اسحاق کو مجبوراً حویلی میں رکنا پڑا۔ یہاں میمونہ اس سے بہت زیادہ باتیں کرنے لگی۔ اس لڑکی میں چند باتیں ایسی تھیں جو کہیں اور کم ہی ملتی تھیں۔ کسی بات کا برا نہیں مانتی تھی۔ رجائی تھی۔ کبھی مایوس نہیں ہوتی تھی۔ پڑھی لکھی تھی، شاعرہ تھی اور ان تمام خوبیوں کے علاوہ خوبصورت بھی تھی۔

اسحاق بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کو اندر سے بند کر لیا اور ماریہ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کو یاد کرنے لگا۔ اُسے سوچ سوچ کر رونا آ رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا سامنے میمونہ کھڑی ہے۔ میمونہ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور مرض پکڑ لیا۔ بولی "کیا تم رو رہے تھے؟"

اسحاق گھبرا گیا اور انگلیوں سے آنسوؤں سے پونچھ کر بولا۔ "نہیں تو۔"

میمونہ اپنی بات پر اڑی رہی، بولی "نہیں، تم رو رہے تھے مگر کیوں؟ کس کے لیے؟ کس کو یاد کر کے؟"

اسحاق نے جب دیکھا کہ اس شریر لڑکی سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہے تو جھوٹ بول دیا: "مجھے اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔"

میمونہ زور زور سے ہنسنے لگی "ماں کیوں یاد آ رہی تھی؟ کیا تم بچے ہو؟ ماں کو تو ننھے منے بچے یاد کرتے ہیں۔"

اسحاق نے جواب دیا: "نہیں میمونہ! بڑوں کو بھی اپنی مرحوم ماں یاد آتی ہے۔"

میمونہ نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو میرے ساتھ چل۔ میں تیرا غم غلط کروں گی۔ میں تجھ کو خوب خوب گھماؤں پھراؤں گی اور جب تو مناظرِ قدرت میں ڈوب جائے گا تو میں دیکھوں گی کہ تجھے اپنی ماں کس طرح یاد آتی ہے۔"

میمونہ اسے مرغزاروں میں لے گئی۔ دریائے شینل اور وادی کبیر کے ساحلوں پر گھومتی رہی۔ شاہ بلوط اور صنوبر کے باغات کی سیر کی۔ انار کے جھنڈ میں دونوں ہنستے کھیلتے رہے۔ اس دوران ماریہ بھی اسحاق کو یاد آتی رہی، کچھ دن شدت سے۔ اس کے بعد یادیں پرچھائیاں بنتی چلی گئیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ پرچھائیاں بھی دھندلا گئیں۔ میمونہ آندھی طوفان کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ اسحاق جو کچھ کر رہا تھا۔ اس کا ضمیر کچھ دن اس پر ملامت کرتا رہا مگر جب اُسے ماریہ کے باپ دی جان کارلو اور اس کے عاشق ویلیز رہنہ ہو اور ماریہ کی ماں کا رویہ یاد آتا تو اس کا خون کھول جاتا۔

جب میمونہ نے اسحاق کو پوری طرح فتح کر لیا تو قاضی سعید اور سعدونہ نے مل کر دونوں کی شادی کرا دی۔ ابھی شادی کو صرف دو ماہ گزرے تھے کہ وزیر ابن ابی عامر نے اُسے اچانک مدینۃ الزہرا میں طلب کر لیا۔ ابن ابی عامر نے اندلس کے انتہائی شمال مغربی ضلع کونہ کی تسخیر

کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس ضلع میں ایک جگہ تھی شنت یعقوب۔ ابن ابی عامر اس کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ یہاں حضرت مسیح کے حواری یعقوب بن زبدی کی قبر تھی۔ اندلس والوں کا عقیدہ تھا کہ اندلس میں مسیحیت حواری یعقوب بن زبدی ہی سے پھیلی ہے۔

ابن ابی عامر نے اس خطرناک مہم میں اسحاق کو اپنے ساتھ لے لیا۔ یہ لوگ کردنہ میں داخل ہو گئے مگر عیسائیوں نے انہیں اچانک روک دیا۔ مسلمانوں کا خاصا جانی نقصان ہوا۔ یہاں اسحاق نے غیر معمولی جرأت و جسارت کا ثبوت دیا اور اس جنگ میں وہ بہت زیادہ زخمی ہو گیا۔ ابن ابی عامر نے اس کا بڑی تن دہی اور توجہ سے علاج کرایا، اور صحت یاب ہونے میں کئی ماہ لگ گئے۔ ابن ابی عامر اس کی پامردی اور استقلال کا قائل ہو چکا تھا اور سب سے زیادہ جس بات نے ابی عامر کو متاثر کیا تھا وہ یہ تھا کہ اسحاق مسیحی والدین کا بیٹا ہونے کے باوجود اسلام کے لیے سرفروشانہ معرکہ آرا ہوا تھا۔ اس فوج میں اندلس کی مسیحی سپاہ بھی حلیف کی حیثیت سے ابن ابی عامر کے ساتھ تھی مگر جب یہ مسیحی سپاہ شنت یعقوب کے چرچ کے سامنے پہنچی تو اس میں انحراف اور بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے مگر اسحاق شنت یعقوب کے چرچ میں داخل ہونے کے بعد جیسا تھا ویسا ہی رہا حالانکہ یہ اسحاق کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ حواری یعقوب کی زیارت گاہ کے لیے اپنے دل و دماغ میں کتنی عزت اور احترام رکھتا تھا۔

وہ اپنے ہمدرد اور مربی ابن ابی عامر کے ساتھ فاتحانہ شان سے قرطبہ میں داخل ہوا تو ہزاروں شہریوں نے ان مجاہدین کا استقبال کیا۔ قاضی سعید، سعدونہ اور میمونہ نے اسحاق کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اسحاق قرطبہ واپس آنے کے بعد چند ماہ صاحب فراش رہا۔ ابن ابی عامر نے اسے الیشانہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ وہ الیشانہ میں آٹھ سال رہا، پھر اسے مالقہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ جب وہ مالقہ میں حاکم کی حیثیت سے داخل ہوا تو اس کی شادی کو دس سال گزر چکے تھے اور اب وہ دو لڑکیوں اور تین لڑکوں کا باپ تھا۔ ان دس بارہ سالوں میں مالقہ کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ اب اس کی شان ہی کچھ اور تھی۔ مالقہ کے لوگ اسے نہیں پہچان سکتے تھے، کہ یہ وہی اسحاق ہے جو انجیر کے باغ میں محنت مزدوری کیا کرتا تھا۔

وہ میمونہ اور بچوں کو لے کر ساحل سمندر پر گیا اور ان پہاڑیوں پر چڑھتا اُترتا رہا جن پر وہ ماریہ کے ساتھ گھوم پھر چکا تھا۔ پھر وہ نیچے آ گیا اور ساحلی ریت پر ٹہلنے لگا اور اس نے حافظہ اور یادداشت پر زور دے کر وہ جگہ پہچاننے کی کوشش کی جہاں دونوں ایک دوسرے کے عشق سے سرشار عہد و پیماں کیا کرتے تھے۔ پھر وہ اُن دکانوں پر گیا جو لکڑی کے تختوں پر سجی ہوئی تھیں اور وہاں سے اس نے موتیوں کا ایک ہار خریدا۔ ہار کے بعد مٹی کے سنہری برتن بھی خریدے۔ دو پیالے چار پلیٹیں۔ ان برتنوں پر خریدنے والوں کے لیے برکت و سعادت کی دعائیں کندہ کی ہوئی تھیں۔ آج اسے دس بارہ سال کا ماضی گزرے ہوئے کل کی طرح یاد آ رہا تھا۔ اسحاق خاموش جن حرکتوں کا مرتکب ہو رہا تھا۔ اس نے میمونہ کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔

اسحاق سمندری ساحل سے انجیر کے اس باغ کی طرف گیا، جہاں وہ کام کر چکا تھا اور جس کا مالک ایک یہودی تھا۔ وہ میمونہ اور بچوں کے ساتھ انجیر کے باغ میں گھس گیا۔ باغ کا مالک اس کے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ اس نے باغ کے اندر وہ جگہ بھی دیکھی جہاں ماریہ کا خاندان خیمہ زن تھا اور شاہ بلوط کا وہ درخت بھی پہچان لیا جہاں ماریہ اور اسحاق گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔

یہاں سے وہ جامع مسجد گیا اور سنگتروں کے دو رویہ درختوں کے نیچے چل پھر کر ماضی کی یاد تازہ کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ چرچ گیا۔ اب یہاں کا پادری کوئی دوسرا ہی شخص تھا۔ گھنی ابرو اور گنجے سر والا پادری۔ اس پادری نے مالقہ کے نئے حاکم کی شاندار پذیرائی کی۔ یہاں تک کہ جب اس نے عصر کی نماز کے لیے چرچ سے نکلنا چاہا تو پادری نے چرچ کی سیڑھیوں ہی پر جائے نماز بچھوا دی اور اسحاق نے چار رکعت فرض انہی سیڑھیوں پر ادا کریں۔

وہ اس ندی کے کنارے بھی گیا، جو موسم سرما اور موسم بہار میں بہتی تھی اور جب اونٹوں کی ایک قطار بھوسے سے لدی ہوئی "بعض البنائین بھوسے کی منڈی" نامی محلے کی طرف جاتی دکھائی دی تو کچھ زیادہ ہی بے چین ہو گیا۔

دوسرے دن وہ پھر انجیر کے باغ میں گیا اور میمونہ اور بچوں کو سبزہ زار پر بٹھا کر باغ کی دیکھ بھال کرنے والوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اس نے باغ کے نگراں سے پوچھا: "یہ باغ کتنے سالوں سے تیری ملکیت میں چلا آ رہا ہے؟"

باغ کے نگراں نے جواب دیا: "تقریباً چھ سال سے۔"

اسحاق نے پوچھا: "اس سے پہلے اس کا کون مالک تھا؟"

اس نے ذرا سا ذہن پر زور دے کر جواب دیا: "یوسف۔ یوسف نامی ایک یہودی۔"

اسحاق نے پوچھا: "یوسف کہاں چلا گیا باغ بیچ کر؟"

باغ کے نگراں نے جواب دیا: "سننے میں آیا ہے، اشبیلیہ چلا گیا۔ اشبیلیہ میں بھی یوسف کے کئی باغ ہیں انجیر کے۔"

اسحاق کو اچانک وہ بوڑھا یاد آ گیا جس نے آخری رات ماریہ کی ہمدردی میں اسحاق کو فرار ہونے کے لیے ایک گھوڑا فراہم کیا تھا۔ اسحاق نے پوچھا: "پہلے اس باغ میں ایک بوڑھا کام کیا کرتا تھا۔ وہ بوڑھا بھی یہودی ہی تھا......"

اسحاق کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ باغ کے نگراں

نے جواب دیا۔ میرے ملازم سارے وہی ہیں، پرانے، کیونکہ وہ تجربہ کار ہیں
اور اُن سے انجیر کے کاروبار اور فصل کی تیاری میں بڑی مدد ملتی ہے۔"

اسحاق نے بے چینی سے کہا۔ "ان ملازمین میں ایک بوڑھا بھی تھا اگر وہ بوڑھا ابھی زندہ اور موجود ہے تو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

باغ کے نگران نے بے دلی سے کہا۔ "بوڑھے تو کئی ہیں لیکن بہت زیادہ بوڑھا ایک ہی ہے، میں اُسے بلوائے دیتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد ایک ایسا بوڑھا اسحاق کے سامنے کھڑا کر دیا گیا جس کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں اور جس کے دونوں کان سفید بالوں سے چھپ چکے ہوئے تھے۔ یہ بوڑھا ڈرا ہوا تھا کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ مالقہ کا نیا حاکم معلوم نہیں کیوں اُسے بلا رہا ہے۔

بوڑھا سر جھکا کے کھڑا ہو گیا، بولا۔ "جناب! مجھ سے کوئی کام؟ میں مسلمانوں کا وفادار ہوں اور اپنے مذہبی معاملات میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا۔"

اسحاق نے اس بوڑھے کو حلیے اور آواز سے پہچان لیا، اس نے پوچھا۔ "بڑے میاں! آپ دس بارہ سال پہلے بھی اسی باغ میں کام کرتے تھے؟"

شاید اسحاق کی آواز نے بوڑھے کو چونکا دیا تھا، اس نے بھوؤں اور پلکوں سے گرانبار آنکھیں اسحاق کے چہرے پر گاڑ دیں اور کچھ دیر غور کرتا رہا پھر شاید پہچان لیا، بولا۔ "جناب! آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

اسحاق کے دل پر ایک چوٹ سی لگی، اس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔ "بابا! وہ لوگ کہاں چلے گئے؟ اور وہ لڑکی، کیا نام تھا اس کا؟"

بوڑھا تڑپ گیا، شاید وہ مالقہ کے حاکم کا خیال کر گیا تھا، ورنہ اسحاق کے اس سوال پر معلوم نہیں کیا کر گزرتا۔ نہایت کرب سے جواب دیا۔ "جناب! آپ نے تو حد کر دی، کمال کر دیا اس نے آپ کا بہت انتظار کیا، کیا نام تھا اس کے عاشق کا، ولیئر روبیو ساہی نے اور اس لڑکی کا جینا دوبھر کر دیا تھا، باپ ڈی جان کارلو اور ماں، دونوں نے اسے مجبور کیا۔ وہ ولیئر روبیو سے شادی کرلے، مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ ہر روز مالقہ کی شمالی سرحدوں کی طرف چلی جاتی اور آنے والے قافلوں میں آپ کو تلاش کرتی رہتی۔۔۔۔"

اسحاق نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ "پھر، پھر کیا ہوا میرے بزرگ دوست؟"

بوڑھے نے سرد آہ بھری، بولا۔ "پھر کیا ہونا تھا، جب وہ آپ کی طرف سے مایوس ہو گئی اور خاندان والوں کے دباؤ سے عاجز آگئی تو پہاڑی سے کود کر خودکشی کر لی۔"

بوڑھے کی آواز بھرا گئی تھی، اسحاق کی آنکھیں بھیگ گئیں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا طاری ہو گیا، اچانک بوڑھا پھر بولنے لگا "آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ اس کے بعد کیا ہوا؟"

اسحاق نے آہستہ سے پوچھا۔ "تو اس کے بعد بھی کچھ ہوا؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "سب سے زیادہ عبرتناک تو یہی ہے جو میں اب بتاؤں گا آپ کو۔" بوڑھے نے ذرا دم لیا پھر بولا۔ "اس کا خاندان یہاں کی گاتھ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ لوگ خودکشی کو انتہائی مذموم اور گھناؤنا فعل سمجھتے ہیں اور خودکشی سے مرنے والوں کو بڑی عبرتناک سزا دیتے ہیں۔"

اسحاق کو ایسا لگا گویا بوڑھے کا دماغ چل گیا ہے۔ "خودکشی سے مرنے والوں کو بڑی عبرتناک سزا دیتے ہیں۔ کیا مطلب؟" اس نے دبی زبان میں پوچھا۔ "مرنے والوں کو کس طرح سزا دی جا سکتی ہے؟"

بوڑھے نے کہا۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

وہ بوڑھا اسحاق کو اس شاہراہ پر لے گیا جو مالقہ سے رُندہ جاتی تھی۔ رُندہ مالقہ کا جنوب مغربی شہر تھا۔ یہاں سڑک کے بیچ میں ایک قبر بنی ہوئی تھی بوڑھے نے اس قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو یہاں سڑک کے بیچوں بیچ دفن کر دیا تاکہ ہر آنے جانے والا یہ جان جائے کہ مرنے والا خودکشی کر کے مرا ہے، چنانچہ جب تک ڈی جان کارلو کا خاندان یہاں رہا۔ جب بھی ادھر سے گزرتا لعنت ملامت کے خیال سے قبر پر تھوک کر گزرتا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی یہی کیا لیکن ادھر کئی سال سے سکون ہے۔"

اسحاق کے لیے اب بات ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ وہ قبر کے سرہانے بیٹھ کر آنسو بہانے لگا۔ اس نے اپنی پیشانی قبر سے لگا دی اس کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس دوران اس کے بیوی بچے بھی اسحاق کو تلاش کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ چکے تھے۔ میمونہ نے اپنے شوہر کو قبر پر سجدہ کرتے دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ دور ہی سے بولی۔ "ہائیں ہائیں، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

اسحاق کا دم گھٹتا جا رہا تھا، اس نے بمشکل خود کو کھڑا کیا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے میمونہ کو دیکھ کر جواب دیا۔ "میمونہ! یہ کسی جاں نثار عاشق لڑکی کی قبر ہے، میں جذباتی انسان ہوں۔ اس بوڑھے سے اس کی داستانِ عشق اور اس کا عبرتناک انجام جان کر میں بے قابو ہو چکا ہوں۔"

میمونہ دم بخود کچھ دیر وہاں کھڑی رہی، پھر اسحاق کو وہاں سے زبردستی ہٹا لے گئی۔

اسحاق نے دوسرے ہی دن قبر کو دیواروں میں قید کر دیا تاکہ آنے والے لوگ اس کی مزید بے حرمتی نہ کر سکیں۔



جنگ اور محبت

الیاس سیتاپوری

انسانی عظمت اور اس کا راز کیا ہے؟ اس سوال نے انسان کو بہت سرگرداں رکھا ہے۔ جواب کی تلاش اور جستجو میں ہمیں عظیم انسانوں کو پڑھنا اور سمجھنا پڑتا ہے۔ ان کی زندگی اور شخصیت کے چاروں طرف عظمت کے نور کا ہالہ نظر آتا ہے جس سے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ لوگ جب کچھ نہیں ہوتے تب بھی عظیم ہی نظر آتے ہیں اور جب شہرت پا جاتے ہیں تب بھی عظیم ہی ہوتے ہیں۔

شیر شاہ سوری جب فرید خان تھا تب بھی عظیم تھا، پھر جب وہ شیر خان ہو گیا تب بھی عظیم تھا اور پھر شیر شاہ بنا، اس وقت بھی عظیم تھا۔ جوشِ کردار، عدل و انصاف، زہد و تقویٰ اور انسان دوستی کا یہ پیکر اپنے قلیل پانچ سالہ دورِ حکومت میں وہ کام کر گیا جو دوسرے اپنے پچاس سالہ دور میں بھی نہیں کر سکے۔ مغل سلطنت کے نمک خوار مؤرخ اپنے آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر اسے ہمیشہ شیر خان ہی لکھتے رہے اور شیر شاہ لکھنا تک گوارا نہ کیا لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ شیر شاہ کی عظمت اس کے نام میں نہیں کام میں پنہاں ہے۔ وہ عظیم تھا، عظیم رہا، عظیم ہے اور عظیم رہے گا۔

اسی شیر شاہ سوری اور اس کے عہد کی داستان جو پُرلطف بھی ہے، پُراثر بھی اور پُراز واقعات بھی۔

۱۵۲۶ء میں جب مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے ہندوستان کے پٹھان فرماں روا ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے دی تو پورا ملک افراتفری اور انتشار کا شکار ہو گیا۔ کئی صوبے داروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور جو جس علاقے پر قابض یا تعینات تھا، وہاں کا سلطان بن گیا۔ شکست خوردہ مقتول بادشاہ ابراہیم لودھی کے رشتہ دار فاتح بادشاہ بابر سے ساز باز کر رہے تھے۔ اسی طرح بہار کا صوبے دار بہار خان بھی سلطان محمد بہار بن کر بہار پر حکومت کرنے لگا۔

آوارہ و سرگرداں جاگیردار بھی بہار کے حکمراں سلطان محمد بہار خان کے پاس جا جا کر اور پکے دار باتیں بنا کر اپنی جگہ بنانے لگے۔ انہی میں خواص پور، ٹانڈہ و سہسرام کے جاگیردار حسن خان سُور کا بیٹا فرید خان بھی شامل تھا۔ فرید خان کا باپ حسن خان سُور اپنی کمسن ہندو بیوی کا عاشق تھا۔ اس عورت نے اپنے بیٹوں کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر حسن خان کو اپنے لائق ترین بیٹے فرید خان کے خلاف کر دیا۔ اور فرید خان آزردہ و دل شکستہ ادھر ادھر گھوم پھر کر بہار کے خود ساختہ سلطان محمد بہار خان کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ سلطان محمد بہار خان فرید خان سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے فرید خان کو اتنی زیادہ عزت دی کہ ان دونوں کا بیشتر وقت ایک ساتھ گزرتا۔ سلطان محمد بہار خان نے فرید خان کو مختلف طریقوں سے خوب خوب جانچا اور پرکھا۔

اس نے دیکھا فرید خان علی الصبح اٹھ کر نماز پڑھتا ہے اور ظہر کی نماز کے بعد قیلولے کے بجائے قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ سلطان کو حیرت تھی کہ اتنے پابندِ صوم و صلوٰۃ جوان نے اپنے باپ سے ناراض ہو کر دوری اختیار کر رکھی ہے۔ وہ فرید خان سے چند باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن موقع محل دیکھ کر۔

سلطان محمد شکار پر جانے لگا تو فرید خان کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ سلطان نے فرید کے چہرے پر فرحت و تازگی کے بجائے بیزاری و بے چینی کی کیفیت محسوس کی۔ سلطان کو شبہ گزرا، شاید فرید خان شکار سے بچنا چاہتا ہے۔ سلطان نے کہا۔ "فرید خان ہم شکار کھیلنے جا رہے ہیں۔"

فرید خان نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "اگر معلوم ہے تو تُو خوش کیوں نہیں ہے؟ کیا تو شکار سے دلچسپی نہیں رکھتا؟"

فرید خان نے جواب دیا۔ "حضورِ والا! فرغانہ کا بابر کشاں کشاں ہمارے ملک تک آپہنچا ہے، میری ناقص رائے میں حضورِ والا کو شکار سے پرہیز کرنا چاہیے۔ دشمن ہمارے ملک میں ہے اور ہم جانوروں کا پیچھا کریں، یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔"

سلطان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا، ایک نے سلطان کی دل جوئی کی۔ "حضورِ والا! شکار بادشاہوں کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے میرا خیال ہے فرید خان درندوں سے ڈرتا ہے تبھی شکار سے کترا رہا ہے۔"

فرید خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "خوشامدی جوان! یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کس سے ڈرتا ہے۔"

سلطان نے ان کی نوک جھونک پر کوئی توجہ ہی نہ دی اور وہ دریائے گنگا کو عبور کر کے اس کے شمالی ساحل پر اتر گیا۔ یہاں سلطان کے بائیں طرف شمال سمت سے گنگا کی معاون ندی گنڈک آکر مل گئی تھی۔ سلطان کو نیپال کی ترائی میں شکار کھیلنا تھا۔

ہنکووں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ سلطان ہاتھی پر اپنی عماری سے جنگلی جانوروں کے دوڑنے بھاگنے کا منظر دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ سلطان کے مصاحبین بھی ہاتھیوں پر سوار تیروں سے اپنے شکار کو مار گرانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن فرید خان نے اپنے لیے ہاتھی کے بجائے گھوڑے کا انتخاب کیا تھا۔ فرید خان کے حاسد اسے گھوڑے پر سوار دیکھ کر منہ پھیر کر ہنس رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فرید خان نے شیخی میں گھوڑے کی سواری اختیار کر لی ہے۔

فرید خان نے جب یہ دیکھا کہ سلطانی مصاحبین کے نشانے خطا ہو رہے ہیں تو اس نے انہیں آواز دی: "صاحبان! ہاتھیوں سے نیچے آ جائیں، شکار زمین پر ہے، آسمانوں سے نیچے آ جائیں۔"

کہیں قریب ہی سے شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔ پورا جنگل گونج گیا اور مصاحبین کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔

سلطان نے آواز دی: "فرید خان! خطرہ۔ اوپر آ جا، شیر کہیں قریب ہی موجود ہے۔"

فرید نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ جھاڑی سے شیر نمودار ہو گیا، وہ آہستہ آہستہ فرید خان کی طرف بڑھا۔

فرید خان نے گھوڑے سے چھلانگ لگا دی۔ اس کے ہاتھ میں عریاں تلوار تھی۔

کئی مصاحبوں کی چیخیں نکل گئیں۔

سلطان نے کہا: "فرید خان! یہ کیا حماقت ہے؟ بچنے کی فکر کر۔"

فرید خان نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اس وقت اس کی نظریں شیر پر جمی تھیں۔ وہ اپنی توجہ لمحہ بھر کے لیے بھی کسی اور طرف نہیں کر سکتا تھا۔ شیر فرید خان کی طرف آتے آتے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ فرید خان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ شیر نے اچانک جست لگائی۔ وہ فرید خان کو چیر پھاڑ کر اس کا چہرہ نوچ لے جانا چاہتا تھا مگر فرید خان پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ شیر اس کے اوپر سے گزر کر دور جا گرا لیکن اس دوران فرید خان کی تلوار کی نوک اس کا پیٹ چاک کر چکی تھی۔ فرید خان نے زمین پر لیٹتے ہی اپنی تلوار کو شیر کے پیٹ کی طرف اٹھا دیا تھا چنانچہ جب شیر اوپر سے گزرا تو تلوار کی نوک اس کے پیٹ سے رگڑ کھاتی ہوئی شگاف ڈال گئی۔ شیر ایک بار پھر دہاڑا۔ اتنی دیر میں فرید خان پھرتی سے اٹھا اور زخمی شیر پر پے در پے وار کر کے اسے بے جان کر دیا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے آناً فاناً ہوا کہ سلطان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کئی مصاحبین ہاتھیوں پر بے ہوش ہو چکے تھے۔ کئی کی گھگھیاں بندھ گئی تھیں اور کپکپاہٹ سے ان کی آواز نہیں نکل رہی

... کے چھینٹوں نے فرید خان کے ستھرے لباس کو ... کر دیا تھا۔ فرید خان نے اپنی خون آلود تلوار کو مردہ شیر کی کھال سے رگڑ کر صاف کیا۔

سلطان نے فیلبان کو حکم دیا: "ہاتھی کو بٹھایا جائے۔"

فیلبان نے ہاتھی بٹھا دیا۔ سلطان عماری سے باہر آیا، اور تیز تیز قدموں سے چل کر فرید خان کے دونوں شانے پکڑ لیے۔ اس کا منہ اپنے سامنے کر لیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے۔ سلطان کی نظروں میں داد و تحسین تھی اور فرید خان کی نظروں میں عاجزی اور انکساری۔ سلطان نے بڑی گرم جوشی سے فرید خان کو اپنے گلے لگا لیا۔ بولا: "میں تجھے اتنا بہادر نہیں سمجھتا تھا۔"

فرید خان نے جواب دیا: "سلطان معظم! میں حیران ہوں کہ یہ کیا ہو گیا۔"

سلطان نے اپنے مصاحبین کو بھی وہیں بلا لیا۔ ان میں پرگنہ جونپور کا حاکم محمد خان سوری بھی شامل تھا۔ یہ امیر فرید خان کے سوتیلے بھائیوں کی بڑی طرفداری کرتا تھا۔ محمد خان سوری فرید خان کی بہادری سے خوش نہیں ہوا۔ سلطان محمد نے بطور خاص محمد خان کو مخاطب کیا: "محمد خان تو نے فرید خان کی بہادری دیکھی؟"

محمد خان نے جواب دیا: "دیکھی، حضور جس چیز کو بہادری فرما رہے ہیں وہ محض حسنِ اتفاق تھا۔ فرید خان کی جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ان حالات میں یہی کارنامہ انجام دے سکتا تھا۔"

سلطان نے فرید خان کی پشت تھپتھپائی: "نہیں محمد خان! یہ ایک کارنامہ ہے، عدیم المثال کارنامہ۔ میں فرید خان کو شیر خان کا خطاب دیتا ہوں۔" فرید خان کا چہرہ اپنی طرف پھیر کر کہا: "آج سے تو شیر خان ہے۔"

فرید خان نے سلطان کا شکریہ ادا کیا۔

محمد خان سور نے ایک بار پھر سلطان کو ورغلایا: "سلطان معظم! فرید خان کا باپ حسن خان مر چکا ہے اور سلطنت دہلی کی طرف سے فرید خان کو ٹانڈہ، خواص پور اور سہسرام کا حاکم تسلیم کیا جا چکا ہے جبکہ دیانت اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ فرید خان حکومت میں اپنے دونوں سوتیلے بھائیوں کو بھی شریک کرے۔"

سلطان نے جواب دیا: "محمد خان! یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ اب فرید خان شیر خان ہو چکا ہے۔"

فرید خان بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا لیکن جب بات ناقابلِ برداشت ہو گئی تو بول دیا: "حضور والا! حکومت کسی کی میراث نہیں ہوتی، جو حکومت کرنے کا اہل ہوتا ہے حکومت اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ خدا کے فضل سے میں اس کا اہل ہوں، پھر ایک اہل آدمی اپنی حکومت نااہلوں کے حوالے کیوں کرے۔"

محمد خان نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ دیا: "فرید خان تو گستاخ بھی ہے۔"

فرید خان نے بھی اپنی تلوار کا دستہ پکڑ لیا: "یہ گستاخی نہیں ...

آپ کی بات کا مدلّل جواب ہے۔"

سلطان کی تیوریوں پر بھی بل پڑ گئے، نہایت پُروقار لہجے میں دونوں کو سمجھایا: "تم دونوں اپنے بادشاہ کے روبرو نہیں جھگڑ سکتے، زیادہ حدِ ادب۔" پھر فرید خان سے کہا: "اور شیر خان! تو مجھے بے حد عزیز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو محمد خان سور سے گستاخی کرے۔" پھر محمد خان سور سے کہا: "محمد خان سور! تم میری بات غور سے سنو۔ اگر فرید خان کا اپنے سوتیلے بھائیوں سے کسی قسم کا تنازعہ چلا آرہا ہے تو یہ شکارگاہ اس تنازعے کے تصفیے کے لیے مناسب جگہ نہیں۔ گھروں کے مسائل گھروں ہی میں طے پانے چاہییں۔"

سلطان کے دوسرے مصاحبین بھی فرید خان سے ناخوش تھے اور اُن کی ناخوشی اُن کے حسد کی وجہ سے تھی۔ وہ اشاروں کنایوں میں فرید خان کی مذمت اور محمد خان سور کی حمایت کر رہے تھے۔ سلطان کی طبیعت انتہائی منغّص ہو چکی تھی۔ اس نے واپسی کا حکم دیا اور یہ سب مزید شکار کھیلے بغیر ہی واپس آ گئے۔

سلطان محل میں اس طرح داخل ہوا کہ کسی کو خدا حافظ کہنے کا بھی موقع نہ دیا۔ جملہ مصاحبین کا خیال تھا کہ سلطان، فرید خان اور محمد خان سور کو نقصان ضرور پہنچائے گا۔ فرید خان بھی سلطان کے بگڑے تیور سے پریشان ہو رہا تھا۔ وہ ابھی قیام گاہ میں بے دلی سے داخل ہوا۔ اس وقت وہ تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔ کبھی سوچتا کہ وہ سلطانی عتاب کا انتظار کیے بغیر چپ چاپ فرار ہو جائے اور کبھی دل یہ کہتا تھا کہ بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تقدیرِ الٰہی سے بھاگنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس نے رات کو عشا کی نماز پڑھی اور سکون کی خاطر قرآن پاک کو جیسے ہی کھولا چوبیسویں پارے کی سورۃ الزمر کی آیت نمبر ۵۳ سامنے آ گئی۔ "قُل یٰعِبَادِیَ الَّذِینَ اَسرَفُوا عَلٰی اَنفُسِہِم لَا تَقنَطُوا مِن رَّحمَۃِ اللہ (تو) ان کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔"

فرید خان شدتِ جذبات سے روہانسا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے قرآن پاک کو بوسہ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کانوں میں بس یہی گونج رہا تھا۔ لاتقنطو من رحمۃ اللہ، لاتقنطو من رحمۃ اللہ۔

فرید خان نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا: "الٰہ العالمین! میں تیری رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔"

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ فرید خان کو شبہ گزرا کہ شاید یہ اس کا واہمہ ہے لیکن دو ایک ہی لمحہ بعد کسی نے دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا۔ اس کا اپنا حقیقی چھوٹا بھائی نظام سامنے کھڑا ہے۔

فرید خان نے نظام کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے عرض کیا: "برادرِ محترم! آپ کو سلطان نے اسی وقت طلب فرمایا ہے۔"

فرید خان کے دل پر وسوسوں اور اندیشوں نے یلغار کر دی مگر اس یلغار کے باوجود ایک آواز اس پر حاوی تھی لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔

فرید خان نے درباری لباس پہنا اور نہایت سکون اور اعتماد کے ساتھ باہر جاتے ہوئے نظام سے پوچھا: "وہ سلطانی فرستادہ کہاں ہے؟"

نظام نے فرید خان کو سلطانی فرستادے سے ملوا دیا۔

فرید خان نے فکر و تردد سے عاری لہجے میں پوچھا: "کیا سلطان نے مجھے اسی وقت حاضری کا پابند کر دیا ہے؟"

شاہی فرستادے نے جواب دیا: "جی حضور! اسی وقت طلب فرمایا ہے بلکہ ابھی میرے ساتھ ہی تشریف لے چلیں۔"

فرید خان نے اپنے بھائی سے کہا: "نظام! میرے بھائی، میرے بیٹے! اگر سلطان کے پاس دیر ہو جائے تو بلاوجہ فکرمند نہ ہو جانا۔"

نظام نے کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ فرید خان اس سے پہلے ہی روانہ ہو گیا۔ نظام کھسیا کر رہ گیا۔

سلطان بڑی بے چینی سے فرید خان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے اور نہایت پھرتی اور مستعدی سے چہل قدمی میں مشغول تھا۔ جب شاہی خدام نے فرید خان کو سلطان کے روبرو پہنچایا تو وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رُک گیا۔ فرید خان نے نظریں جھکا لیں اور سلطان نے اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر مخاطب کیا: "شیر خان! اب تو فرید خان نہیں رہا۔ میں نے اپنے فرمان کے ذریعے سب کو مطلع کر دیا ہے کہ فرید خان شیر ہلاک کرنے کے بعد شیر خان ہو گیا ہے، اس لیے اب ہر کوئی تجھے شیر خان کہہ کر ہی مخاطب کرے گا۔"

فرید خان نے مودبانہ عرض کیا: "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھ پر اس قدر مہربان ہیں، میں کس زبان سے سلطان کا شکریہ ادا کروں؟"

سلطان نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں، کہا: "ابھی ابھی جب تک تو ہمارے پاس آیا نہیں تھا، میں اسی شک و شبہے میں مبتلا تھا کہ کہیں تو دل برداشتہ ہو کر سہسرام تو نہیں چلا گیا۔"

شیر خان نے جواب دیا: "آپ کا اندیشہ درست تھا سلطانِ معظم! میں معلوم نہیں کس طرح اپنی اہانت برداشت کر گیا میں نے گھر پہنچتے پہنچتے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ملازمت چھوڑ کر سہسرام چلا جاؤں مگر جب میرے رب نے مجھ سے یہ کہا کہ میں اس کی رحمت

سے مایوس نہ ہوں تو میں رک گیا۔"

"سلطان نے پوچھا۔ "کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں بلایا ہے؟"

شیر خان نے جواب دیا۔ "نہیں بندہ پرور، خاکسار علم غیب نہیں جانتا۔"

سلطان نے مسکرا کر کہا۔ "علم غیب سے تو ہم بھی محروم ہیں۔ ہم محمد خان سور سے ذرا بھی خوش نہیں۔ اس نے تیرے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے، میں سمجھتا ہوں بہت برا کیا۔"

شیر خان نے جواب دیا۔ "اب ان باتوں کو جانے دیجیے۔ میں نے ضبط و برداشت کی عادت ڈال لی ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "شیر خان! میں تیری ذہانت، علمیت، مستعدی اور اصول پسندی سے بے حد متاثر ہوں اور خوش بھی۔ تو بہادر بھی ہے، اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھے اپنے بیٹے جلال کا اتالیق بنا دوں۔۔۔"

شیر خان نے بے چین ہو کر سلطان سے نظریں ملانا چاہیں لیکن نہیں ملا سکا۔

سلطان بولتا رہا۔ "میں چاہتا ہوں میرے بیٹے جلال میں وہ ساری خوبیاں پیدا ہو جائیں جو تجھ میں موجود ہیں اس لیے میں نے تجھ کو جلال کا اتالیق نامزد کر دیا ہے۔"

شیر خان نے سلطان کا شکریہ ادا کیا۔

سلطان نے ایک بار پھر شیر خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اور شیر خان! میں نے جونپور کے حاکم محمد خان کو یہ حکم دے دیا ہے کہ وہ تیرے گھر سہسرام جائے اور تجھ کو جاگیر کی تقسیم پر آمادہ کرلے۔" پھر کسی قدر خاموشی کے بعد کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میرا یہ فیصلہ مناسب اور عادلانہ ہے۔"

شیر خان نے جواب دیا۔ "عدل نہایت محترم اور اعلیٰ خوبی ہے، جس حکمراں میں یہ خوبی نہ ہو، وہ حکمراں نہیں غاصب اور ظالم ہوتا ہے۔ میں کسی کی نیت اور خلوص پر شبہ نہیں کرتا مگر دبی زبان میں نہایت مودبانہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ حضور والا! اپنے نفس میں جھانک کر یہ ضرور معلوم کریں کہ میری بابت محمد خان کو جو حکم دیا گیا ہے وہ مبنی بر انصاف ہے بھی یا نہیں؟"

سلطان کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ "مبنی بر انصاف! میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔"

شیر خان نے جواب دیا۔ "سلطانِ معظم! جس طرح ایک ملک میں دو بادشاہ اور ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ایک جاگیر کے دو حاکم نہیں ہو سکتے۔ افسوس کہ میں اپنے سوتیلے بھائیوں کو اپنی حکومت میں شریک نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ انہیں روزینہ یا سالانہ برابر ملتا رہے گا۔"

سلطان سوچ میں پڑ گیا، کہا۔ "یہ تو تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے کہ جس طرح ایک ملک میں دو بادشاہ اور ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں ایک جاگیر میں دو حاکم کس طرح رہ سکتے ہیں۔۔۔"

شیر خان کے چہرے پر طمانیت، سکون اور خود اعتمادی کی چمک پیدا ہو گئی۔

سلطان نے کہا۔ "محمد خان سور جونپور چلا گیا ورنہ میں اس کو منع کر دیتا کہ وہ مجھے تنگ نہ کرے، بہر حال میں نے تجھ کو اپنے بیٹے جلال کا اتالیق مقرر کر دیا۔"

شیر خان نے عرض کیا۔ "سلطانِ معظم! میں چند دنوں کے لیے سہسرام جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟ آخر کیوں؟"

شیر خان نے جواب دیا۔ "کیوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ محمد خان سور کچھ گڑبڑ ضرور کرے گا۔"

سلطان نے جواب دیا۔ "اگر وہ گڑبڑ کرے گا تو میں اسے روک دوں گا، تو مت پریشان ہو۔"

شیر خان نے اصرار کیا۔ "حضور والا! اب میرا سہسرام جانا بہت ضروری ہو گیا ہے، خدا کے لیے مجھے نہ روکیے، چلا جانے دیجیے۔"

سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "واپسی کب ہوگی؟"

شیر خان نے جواب دیا۔ "کم از کم دو ماہ بعد۔"

سلطان نے کہا۔ "تو جا سکتا ہے لیکن دو ماہ بعد تیری واپسی اور اس دربار میں حاضری ضروری ہے۔"

شیر خان نے وعدہ کر لیا اور سلطان نے اسے اجازت دے دی۔

شیر خان دوسرے دن علی الصبح اپنے بھائی نظام کے ساتھ سہسرام روانہ ہو گیا۔

شیر خان سہسرام پہنچا تو پتہ چلا کہ اس کے دونوں سوتیلے بھائی سلیمان اور احمد جونپور کے حاکم محمد خان کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ شیر خان سہسرام میں گھوم پھر کر اس بات کا اندازہ لگاتا رہا کہ اس کی عدم موجودگی میں دونوں سوتیلے بھائیوں نے اس کے خلاف کیا کام کیا ہے۔ سہسرام کا ہر شخص شیر خان کا مداح تھا۔

اسی دوران جونپور کے حاکم محمد خان نے شادی نامی ایک نوجوان کو شیر خان کے پاس بھیجا۔ یہ خوبصورت نوجوان شیر خان کے قصر کے سامنے اپنے گھوڑے سے اترا اور اس ماحول کی ہر چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے شیر خان کے قصر کو خوب گھوم پھر کر دیکھا۔ قصر کے دربانوں نے شادی کو پکڑ لیا اور اس کا اتا پتا پوچھنے لگے۔

شادی نے جواب دیا۔ "لوگو! میں جونپور کے حاکم محمد خان کا فرستادہ ہوں، مجھے اپنے آقا شیر خان کے پاس لے چلو، میں اس کے نام ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔"

دربانوں نے شیرخان کو مطلع کیا کہ شادی نامی ایک خوبصورت نوجوان حاکم جونپور کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے اور باریابی کا طلبگار ہے۔ اس کو چند دن روکے رکھا جائے یا ایک دو دن بعد کا وقت دے دیا جائے۔ شیرخان نے حکم دیا۔ "شادی کو نہتا کر کے فوراً میرے پاس بھیج دیا جائے۔"

شیرخان کے آدمیوں نے شادی کو نہتا کر دیا۔ حالانکہ وہ اس پر تیار نہ تھا، دو مضبوط اور توانا آدمیوں نے نہتے شادی کو دونوں شانوں سے پکڑ کر شیرخان کے سامنے پیش کر دیا۔ شیرخان جس کمرے میں بیٹھا تھا اس کی دیواروں پر مختلف قسم کے ہتھیار لٹکے ہوئے تھے اور شیرخان کی چوکی پر شیر کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اس کا خود چوکی پر ایک طرف رکھا ہوا تھا اور عریاں تلوار اور پیش قبض خود کے پاس رکھے ہوئے تھے۔

آنے والوں کے قدموں کی آہٹیں سن کر شیرخان نے ان کی طرف دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

شادی نے دربانوں کی شکایت کی۔ "شیرخان! میں جونپور کے حاکم محمد خان کا خاص آدمی ہوں تیرے آدمیوں نے میری بے عزتی کی ہے انہیں ۔۔۔"

شیرخان نے بات کاٹ دی۔ "محمد خان کا کوئی خط ہے تو میرے حوالے کر۔"

شیرخان کی آواز اور لہجے میں کوئی بات تھی جس نے شادی کو مرعوب کر دیا۔ اس نے خریطے میں سے ایک خط نکال کر شیرخان کے حوالے کر دیا۔ شیرخان نے خط پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"شیرخان! تیرے بھائی احمد اور سلیمان ایک مدت سے میرے مہمان ہیں۔ یہ دونوں اپنے حصے اور ورثے سے محروم ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سب کے ولی نعمت سلطان محمد نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں ثالث بن کر سلیمان اور احمد کو ان کا حق دلوا دوں چنانچہ تم جب کہو میں دونوں بھائیوں کو تمہارے پاس بھیج دوں تاکہ وہ تم سے اپنا حق اور حصہ وصول کر لیں۔"

شیرخان نے خط پڑھ کر شادی سے پوچھا۔ "تو محمد خان کے پاس کیا کرتا ہے؟"

شادی نے جواب دیا۔ "میں اپنے ولی نعمت محمد خان کے دشمنوں سے ملاقاتیں کرنے کے لیے ملازم رکھا گیا ہوں۔ میری پہلی ملاقات تو اس نوع کی ہوتی ہے جس طرح تم سے ہوئی ہے اور اگر میں ملاقات سے مایوس ہو جاتا ہوں تو دوسری ملاقات میدان جنگ میں کرتا ہوں۔"

شیرخان نے جواب دیا۔ "تو اب جا سکتا ہے انشاء اللہ دوسری ملاقات کے لیے میں میدان جنگ میں ضرور پہنچوں گا۔"

شادی نے پوچھا۔ "اور خط کا جواب؟"

شیرخان نے جواب دیا۔ "میرا جواب یہ ہے کہ حکومت اور سلطنت ناقابل تقسیم ہوتی ہے یہ اس کو دی جاتی ہے جو اس کا اہل ہوتا ہے۔ مجھے اپنی حکومت میں کسی دوسرے کی شمولیت اور حصے داری کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں۔ بادشاہ مروجہ اصولوں اور روایتوں کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ انشاء اللہ ہم دونوں میدان جنگ میں اس طرح ملیں گے کہ حق ہماری طرف ہو گا اور ناحق دوسری طرف۔"

شادی نے شیرخان کے کمرے کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔ "شیرخان یہ ہتھیار دیواروں ہی پر سجے رہتے ہیں یا انسانی جسموں پر بھی سجتے ہیں؟"

شیرخان نے جواب دیا۔ "یہ ہتھیار کبھی میرے دشمنوں کے جسموں پر سجے رہتے تھے لیکن جب میں نے انہیں زیر کر لیا تو ان کے جسموں پر سے اتار کر دیواروں پر سجا دیا۔" پھر دیوار کے خالی حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس خالی حصے کے لیے مجھے تمہارے ہتھیار درکار ہیں امید ہے تم لوگ مایوس نہیں کرو گے۔"

شادی نے پاؤں پٹخا، بولا۔ "شیرخان! میری بے عزتی نہ کرو تم کیا تم ۔۔۔"

شیرخان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ "اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

دونوں آدمی شادی کو شانوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

شیرخان اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں چلاتا اور سوچتا رہا، پھر اٹھا اور قلم دوات اور کاغذ اٹھا لایا، اور کاغذ پر موٹا موٹا لکھا

لاتقنطوا من رحمۃ اللہ

(اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)

اس کاغذ کو دیوار کے اس حصے پر چسپاں کر دیا، جو ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتا تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنے بھائی نظام کو طلب کیا اور اسے حکم دیا۔ "نظام! تو فوراً الہ آباد چلا جا، وہاں کوڑہ اور مانکپور کے مغل حاکم جنید برلاس سے ملاقات کر اور اسے ہماری وضعداری اور دوستی کا یقین دلا کیونکہ یہاں سہسرام میں بڑے خطرات ہیں اگر میں یہاں ناکام رہا تو پھر جنید برلاس ہی کے پاس پناہ لوں گا۔"

نظام نے کہا۔ "بھائی شیرخان! اگر جنید برلاس نے ہماری دوستی کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھا تو پھر؟ تب پھر؟"

شیرخان نے جواب دیا۔ "اب وقت نہ ضائع کر، فوراً جنید برلاس کو دوست بنانے کی کوشش کر۔ بقیہ کام میں خود کر لوں گا۔"

نظام چلا گیا اور شیرخان متوقع حملے کے بچاؤ اور احتیاطی تدابیر پر غور کرنے لگا۔

○

حاکم جونپور محمد خان، شادی کی زبان سے شیرخان کا جواب

سن کر چراغ پا ہو گیا۔ اس نے شادی کو حکم دیا: "فوج کو تیاری کا حکم دے اور پھر فوج کے ساتھ سلیمان اور احمد کو لے کر شیر خان کے علاقوں میں گھس جا۔ وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور شیر خان اور اس کے آدمیوں کو بے دخل کر کے سلیمان اور احمد کو وہاں کا حاکم بنا دے۔"

شادی اپنے آقا کے حکم پر فوج لے کر سہسرام کے لیے روانہ ہو گیا لیکن سہسرام سے پہلے اس کو ٹانڈہ اور خواص پور کے شقہ داروں سے مقابلہ کرنا تھا اور یہ شقہ دار شیر خان کے ملازم تھے۔ ٹانڈہ کے شقہ دار کو شیر خان کی ہدایت پہلے ہی موصول ہو چکی تھی۔ شیر خان نے اس کو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ اگر محمد خان کی فوج اس کے علاقے میں گھسنے کی کوشش کرے تو اسے روک دیا جائے اور اسے کچل کر محمد خان کے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے کیونکہ بہترین اور مفید ترین جنگ وہی ہوتی ہے جو دشمن کی زمین پر لڑی جائے۔

ٹانڈہ کا شقہ دار فوج لے کر ٹانڈہ کے باہر نکلا اور شادی کا راستہ روک لیا۔

شادی نے شیر خانی شقہ دار کو سمجھایا: "دیکھ میرا تیرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں سہسرام شیر خان کے پاس جا رہا ہوں۔ میرا راستہ نہ روک۔"

شقہ دار نے جواب دیا: "تیرا راستہ میں نہیں روکوں گا تو کون روکے گا؟ جب میں تجھے سہسرام جانے دوں گا تب تو تو جائے گا۔ میں تجھے جانے ہی کیوں دوں گا؟"

شادی کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ اس نوجوان کو محمد خان نے بطورِ خاص شادی کے ساتھ کر دیا تھا کیونکہ اس نے محمد خان کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ شیر خان کو اپنی خوش گفتاری سے اس پر آمادہ کرے گا کہ وہ اپنے سوتیلے بھائی سلیمان اور احمد کو اپنی حکومت میں شریک کر لے۔ اس نوجوان کا بس یہی ایک تعارف تھا کہ وہ کسی پٹھان قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور لودھیوں کی شکست نے اسے بہت آزردہ اور غمگین کر دیا تھا۔ وہ کسی حال میں بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ پٹھان آپس ہی میں خون خرابہ کرتے رہیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے شادی سے پیچھے جانے کی درخواست کی اور خود شیر خانی شقہ دار کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ اور اس سے پوچھا: "برادرِ عزیز! ہم لوگ جنگ نہیں چاہتے۔ ہمیں شیر خان کے پاس چلا جانے دو۔ ہم اپنے معاملات اس سے طے کر کے واپس چلے جائیں گے۔ ہم خون خرابہ نہیں چاہتے۔"

شقہ دار نے جواب دیا: "اگر تمہیں شیر خان سے بات کرنا تھی تو اس فوج کو اپنے ساتھ نہیں لانا تھا۔ اس فوج کو واپس بھیج دو، میں تمہیں شیر خان کے پاس چلا جانے دوں گا۔"

شادی نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور آڑی تلوار سے اپنے ساتھی کو پیچھے ہٹایا: "حمید! یہ باتوں کا وقت نہیں ہے، کام کا وقت ہے۔"

حمید نے شادی کو روکنے کی کوشش کی مگر نہیں روک سکا۔ شیر خانی شقہ دار نے اپنے گھوڑے کا رُخ موڑا اور اپنی معمولی سی فوج میں واپس چلا گیا۔ شادی نے اپنی فوج کی طرف مُڑ کر دیکھا اور گھوڑے پر آگے کی طرف جھک کر تلوار کو ہوا میں لہرا کر سپاہیوں کو حملے کا اشارہ کیا۔ شادی کی فوج ہزاروں میں اور شیر خانی سپاہ سینکڑوں میں تھی۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہو گئیں۔

حمید کو بڑا دُکھ تھا، اُس نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا وہ محاذِ جنگ سے ہٹ کر جامن کے ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر جنگ کا نظارہ کرنے لگا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ اس لڑائی سے افسردہ ہو گیا ہے۔

شادی نے اپنے ماہر تیر اندازوں کو حکم دیا: "اگر تم شیر خانی شقہ دار کو مار کر گرا دو تو یہ جنگ ابھی ختم ہو جائے گی۔"

تیر اندازوں نے خود کو آہستہ آہستہ فوج سے الگ کیا اور نصف دائرہ بناتے ہوئے شیر خانی شقہ دار کی طرف بڑھے پھر جب انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب اُن کے تیروں کی بوچھاڑ شقہ دار کو بچنے ہی نہیں دے گی تو انھوں نے ایک ساتھ تیر چھوڑے۔ اُن کا منصوبہ کامیاب ہوا اور تیروں نے شقہ دار کو اس کے کئی سپاہیوں سمیت زخمی کر کے خاک و خون میں لٹا دیا۔ وہ گھوڑوں سے نیچے گر گئے اور انہی کے گھوڑوں نے انھیں روند کر راہِ فرار اختیار کی۔ سپاہیوں نے اپنے سردار کو زمین پر گرتے دیکھا تو اُن کے پاؤں اکھڑ گئے اور جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔

شادی فاتحانہ آبادی میں داخل ہوا اور اپنے مخالفوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے آتش زنی اور لوٹ مار کا حکم دے دیا۔ مکانوں کو لوٹا جانے لگا اور لوٹ مار کے بعد انھیں آگ لگا دی گئی۔ مکینوں نے گھروں کو خالی کر دیا اور اِدھر اُدھر پناہ کی تلاش میں بھاگنا شروع کر دیا۔ حمید نے اس لوٹ مار اور آتش زنی میں کوئی حصہ نہیں لیا، جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ ایک خاندان بھاگتا ہوا بدحواس اُس کے پاس سے گزرا۔ حمید کو ان پر رحم آ گیا اور وہ اُن کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا: "رُک جاؤ، ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔"

یہ لوگ سہم کر رُک گئے، یہ کل پانچ افراد تھے۔ ایک بوڑھی عورت، ایک اس کا شوہر پچاس پچپن سال کا، ایک نوجوان بمشکل پچیس سال کا رہا ہو گا۔ ایک اس کی بہن بمشکل اٹھارہ، انیس سال کی، ایک چھوٹی بہن چار سال کی رہی ہو گی۔

پانچ نفری خاندان کا بزرگ حمید کی طرف بڑھا اور انتہائی لجاجت سے پوچھا: "بہادر نوجوان! ہماری خطا؟ ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

حمید نے جواب دیا: "تمھاری خطا یہ ہے کہ تم مفتوح ہو۔"

وہ لوگ تھر تھر کانپنے لگے۔ حمید نے انھیں تسلی دی: "لیکن تم لوگ ڈرو مت اور یہیں میرے پاس کھڑے رہو۔"

کافی دیر بعد جب لوٹ مار کا سلسلہ موقوف ہوا، حمید ان سب کو لے کر شادی کے پاس پہنچا۔ شادی نے انھیں دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں پوچھا: "یہ کون ہیں؟"

حمید نے جواب دیا: "میں خود نہیں جانتا یہ کون لوگ ہیں، مگر یہ جانتا ہوں کہ یہ اسی مفتوح بستی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ سب تھالے آدمیوں سے جان بچا کر بھاگے جا رہے تھے کہ میں نے انھیں روک لیا۔"

شادی مسکرایا: "مگر کیوں روک لیا؟"

حمید نے کہا: "پتہ نہیں کیوں روک لیا۔ میں نے انھیں پناہ دی ہے اور انھیں ان کے گھر میں دوبارہ بسانا چاہتا ہوں۔"

شادی نے لڑکی کو بغور دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ یہ حسین ترین لڑکی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو گھونگھٹ میں چھپا رکھا تھا مگر شادی نے اس کی ایک جھلک اچھی طرح دیکھ لی تھی، بولا: "سمجھا، میں سمجھ گیا کہ تو نے انھیں کیوں پناہ دی ہے۔"

حمید نے گویا شادی کی بات سنی ہی نہیں، اس نے کہا: "تم لوگ میرے ساتھ آؤ اور بتاؤ کہ اس بستی میں تمھارا کون سا گھر ہے؟"

یہ لوگ اب بھی خوفزدہ تھے۔ حمید آٹھ دس سپاہیوں کی نگرانی میں انھیں گھر لے گیا۔ یہ بستی کے باہر کھیتوں کے سامنے ایک مکان تھا۔ نسبتاً دوسرے گھروں سے بہتر۔ مکان کی چھتیں کھپریلوں کی تھیں۔ دروازے پر نیم کے درخت کا سایہ تھا۔

اس مقفل مکان کو کسی نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ کنجی کہیں گر گئی تھی، دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر جھگڑا ہونے کا الزام بھی لگاتے رہے اور کنجی بھی تلاش کرتے رہے۔ جب کنجی نہیں ملی تو حمید سے استدعا کی تالا توڑ دیا جائے۔

حمید نے تالا توڑ کر انھیں اندر پہنچا دیا اور سپاہیوں سے کہا۔ "تم لوگ اس گھر پر پہرہ دو۔ ہم نے انھیں پناہ دی ہے۔"

جب حمید واپس جانے لگا تو بڑے میاں نے حمید کو آواز دی۔ "بیٹے! میری ایک بات تو سنتا جا۔"

حمید نے پلٹ کر پوچھا: "کون سی بات؟"

بڑے میاں نے لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ لڑکی نے حمید سے کہا: "آپ ہمارے محسن ہیں، میں آپ کو یوں نہیں جانے دوں گی۔"

لڑکی کی آواز میں ترنم تھا، کھنک تھی۔ حمید کو اپنے دل کی نیّا ہچکولے کھاتی محسوس ہوئی، جواب دیا: "میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں دوبارہ آؤں گا آپ کے پاس۔"

لڑکی نے حسرت سے کہا: "کیا ایک کٹورا پانی بھی نہیں پئیں گے اس گھر کا؟"

حمید نے لڑکی کو دیکھنا چاہا مگر نہیں دیکھ سکا۔ دوپٹے میں چھپا ہوا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

حمید نے لڑکی کے ہاتھ سے پانی سے لبریز کٹورا لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ خالی کٹورا واپس کرتے ہوئے کہا: "اب تو میں نے آپ کی شکایت رفع کر دی، اب تو میں جا سکتا ہوں؟"

لڑکی کے باپ نے پوچھا: "اب تو اس گھر کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا؟"

حمید نے جواب دیا: "نہیں، آپ لوگ مطمئن رہیں۔"

لڑکی کی ماں نے پوچھا: "اب کب آؤ گے؟"

حمید نے جواب دیا: "شاید پانچ سات دن نہ آ سکوں ابھی، لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ میں آؤں گا ضرور۔"

لڑکی کی ماں نے کہا: "ہم لوگ تمھارا انتظار کریں گے، افسوس کہ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ کیا ہو، کون ہو؟"

حمید نے جواب دیا: "میرا نام حمید ہے۔ میں کون ہوں، کیا ہوں یہ سب بتانے کا ابھی موقع نہیں پھر کبھی بتا دوں گا۔"

باپ نے پوچھا: "تب پھر تم آؤ گے ضرور؟"

حمید نے جواب دیا: "ضرور آؤں گا میں وعدہ جو کر رہا ہوں۔"

جب حمید واپس جا رہا تھا تو پورا گھر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ان میں بڑی لڑکی سب سے پیچھے تھی۔ اس کا جی تو چاہ رہا تھا کہ حمید کو جاتے ہوئے دیکھے مگر شرم نے اسے روک رکھا تھا، پھر اس نے اپنی ماں کی بغل میں منہ ڈال کر حمید کو واپس جاتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کی۔

❀

شیر خان سسرام میں اپنے شقہ دار کی شکست کی خبر سن کر مایوس ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شادی اپنی فتح مند فوج کے ساتھ سسرام آ دھمکے گا اور اس میں فی الحال مقابلے کی سکت نہیں تھی۔ وہ سسرام سے بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ بھاگ کر جائے گا کہاں۔ اس کے آدمی شادی اور اس کی فوج کی متوقع گزرگاہوں میں پھیلے ہوئے تھے تاکہ وہ جیسے ہی نمودار ہو، شیر خان وہاں سے فرار ہو جائے۔ جب حمید اپنے گھوڑے پر گرد و غبار اڑاتا ہوا سسرام کے در پر نمودار ہوا تو شیر خان کے آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔ "تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟"

حمید نے جواب دیا: "میں شیر خان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

شیر خان کے آدمیوں نے حمید کو شیر خان کے روبرو پہنچا دیا۔ شیر خان نے اسے پہچاننے کی کوشش کی مگر نہیں پہچان سکا۔

حمید بھی شیر خان کو بڑے غور سے دیکھتا رہا، بولا: "تو تم ہو شیر خان!"

شیر خان نے کہا: "مگر میں نے تم کو نہیں پہچانا۔ تو میرے پاس کیوں اور کس کا بھیجا ہوا آیا ہے؟"

حمید نے صاف صاف بتا دیا۔ "شیر خان! تم بدظن نہ ہو جانا۔ میں حاکم جونپور محمد خان کا آدمی ہوں اور شادی نے ٹانڈہ، خواص پور کو میرے سامنے ہی فتح کیا ہے۔"

شیر خان نے زہر خند کیا، بولا: "تو شاید مجھ سے یہ کہنے آیا ہے کہ میں سسرام کو لڑے بھڑے بغیر ہی شادی کے حوالے کر دوں۔"

حمید نے جواب دیا: "نہیں! میں یہ کہنے نہیں آیا۔ میں تم سے ملنا چاہتا تھا، میں نے تمہارا بڑا ذکر سن رکھا ہے۔"

شیر خان نے بے رخی سے کہا: "تیرا نام کیا ہے؟"

حمید نے جواب دیا: "حمید لودھی۔ میں لودھی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں، لودھیوں کا آخری فرماں روا ابراہیم لودھی میرا رشتے میں چچا لگتا تھا۔ آہ لودھیوں کو مغلوں نے خاک میں ملا دیا۔"

شیر خان نے بدستور بے رخی برقرار رکھی، بولا: "اگر تو لودھی خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو اس وقت میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

حمید نے جواب دیا: "صرف یہ کہنے کہ آپس کی جنگ و جدال بند کر دو مغلوں کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے اگر اس ملک میں پٹھانوں کو زندہ اور عزت سے زندہ رہنا ہے تو وہ آپس کے اختلافات ختم کر دیں اور شیر و شکر بن کر رہنا سیکھیں۔"

شیر خان نے کہا: "لڑائی کا آغاز میں نے نہیں، جونپور کے حاکم محمد خان اور شادی نے کیا ہے۔"

حمید نے کہا: "اگر تم دونوں بھائیوں کو ان کا حق دے دیتے تو اس فوج کشی کی نوبت ہی نہ آتی۔"

شیر خان اپنے موقف پر ڈٹا رہا، بولا: "سلیمان اور احمد نااہل ہیں۔ میں ان نااہلوں کے ہاتھوں اپنی جاگیر برباد نہیں ہونے دوں گا۔"

حمید نے پوچھا: "اگر تمہاری جاگیر چھین کر تمہارے بھائیوں میں تقسیم کر دی گئی تو؟"

شیر خان نے جواب دیا: "اگر ایسا ہوا تو یہ میرے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی اور میں اس ناانصافی کو کبھی برداشت نہیں کروں گا اور جب تک زندہ رہوں گا ناانصافی کو انصاف میں بدل دینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

حمید نے پوچھا: "اب تم کیا کرو گے؟"

شیر خان نے جواب دیا: "یہ میں تجھے کیوں بتاؤں؟ تو میرے مخالفوں کا آدمی ہے میں اپنے ارادوں سے تجھے کیوں مطلع کروں؟"

حمید نے کہا: "شیر خان! میں تمہارا مخلص دوست ہوں، میں تمہاری خداداد صلاحیتوں کا دل سے معترف ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تم غیر معمولی انسان بن کر ابھرو۔ میں تمہیں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ اگر بات صلح اور نرمی سے بن جائے تو خون خرابہ نہ کرو اور پھر کر کے دکھاؤ۔ میں لودھیوں کے بعد سوریوں میں ہندوستان کی حکومت منتقل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔"

شیر خان نے استہزائیہ انداز میں کہا: "شاید تو میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ سردست میں سسرام تک کو نہیں بچا سکتا اور تو پورے ملک کی بادشاہت کی باتیں کر رہا ہے۔"

حمید نے کہا: "شاید میں اس پہلی ملاقات میں اپنے دل کی باتیں سمجھا نہیں پا رہا ہوں لیکن دو چار دن میں اپنے دل کی باتیں تمہیں بخوبی بتا سکوں گا۔"

شیر خان نے جواب دیا: "کل تک تو میرا مہمان ہے اس کے بعد واپس جا کر شادی وغیرہ کو بتا دے کہ وہ مجھ سے لڑ بھڑ کر جاگیر تو چھین سکتا ہے لیکن میرے ارادے میرے عزائم نہیں بدل سکتا۔"

حمید نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی: "شیر خان! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میں لودھی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ حکومت دوبارہ لودھیوں کو مل جائے۔ دراصل میں اس پٹھان کی تلاش میں ہوں جو ہم سب کی عزت آبرو ہو گا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

شیر خان مسکرایا: "اگر تو میرا مخلص ہے تو مجھے مشورہ دے کہ میں کہاں بھاگ جاؤں؟"

حمید نے کہا: "کیا بھاگنا اتنا ضروری ہے؟ کیا صلح نہیں ہو سکتی؟"

شیر خان نے جواب دیا: "میں بھاگوں گا نہیں، باعزت پسپائی اختیار کروں گا۔ میں تجھ سے یہی مشورہ چاہتا ہوں کہ میں کہاں جاؤں؟"

حمید نے جواب دیا: "بہار کے سلطان بہار محمد کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تو تمہاری بڑی قدر کرتا ہے۔"

شیر خان نے جواب دیا: "نہیں! میں وہاں نہیں جاؤں گا کیونکہ بہار کا حکمراں جونپور کے حاکم محمد خان کا گہرا دوست ہے۔ وہ میری وجہ سے اپنے دوست کو ناراض نہیں کرے گا۔"

حمید نے کہا: "پھر جو کچھ بھی تمہارے جی میں آئے کرو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

شیر خان نے اپنے مہمان کو جس کمرے میں ٹھہرایا تھا، اس کی بہت نگرانی کا حکم دے دیا۔

وہ عشاء کے بعد تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، گڑگڑا کر بولا: "یا الٰہ العالمین! میری رہنمائی فرما۔ میں کہاں جاؤں، کیا کروں؟"

کافی دیر بعد اس کے تصور میں بابر مغل فاتح کی شبیہ ابھری، اس کے بعد کڑہ مانک پور کے مغل حاکم جنید برلاس کا خیال آ گیا۔ یہاں وہ اپنے چھوٹے بھائی نظام کو پہلے ہی روانہ کر چکا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے شیر خان جنید برلاس کے پاس جانے پر آمادہ ہو چکا تھا۔

شیر خان نے حمید کو بتایا: "مجھے جہاں جانا ہے ذرا دیر بعد چلا جاؤں گا، تو بھی جہاں جانا چاہے چلا جا۔"

حمید نے جواب دیا: "شیر خان! میں تمہارے ساتھ چلوں گا، کیونکہ میں نے اپنی قسمت کو تمہاری قسمت سے وابستہ کر دیا ہے۔"

شیر خان نے کہا: "لیکن میں تجھے نہیں لے جاؤں گا۔"

حمید نے بڑے کرب سے کہا: "شیر خان! مجھ پر اعتبار کرو، میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں تمہارا بہی خواہ، ہمدرد اور دوست ہوں۔"

شیر خان نے جواب دیا: "یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب یقین آ جائے گا میں تجھے دوست بنا لوں گا۔"

حمید اداس ہو گیا، بولا: "شیر خان! کیا تم انسانوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟ کیا میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے؟ میں نے پورے ہندوستان میں تم کو ہی اس لائق سمجھا تھا کہ اپنا ساتھی، اپنا مثالی تصور بناؤں لیکن تم ہی مجھے اپنے پاس سے بھگا رہے ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی قسمت پر ماتم کروں یا تمہاری قسمت پر۔"

شیر خان نے جواب دیا: "افسوس حمید خان! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اللہ نے چاہا، پھر کبھی ملاقات ہوگی۔"

شیر خان نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا کہ وہ جنید برلاس کے پاس جا رہا ہے جسے ساتھ چلنا ہو چلے۔

شام ہوتے ہوتے شیر خان اپنے ساتھیوں کو لے کر مانک پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

حمید کچھ دیر کھڑا شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا، اس کے بعد وہ خود بھی گھوڑے پر بیٹھ کر ٹانڈہ روانہ ہو گیا۔

ٹانڈہ میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھا اس گھرانے میں پہنچا، جن سے دوبارہ آنے کا وعدہ کر آیا تھا۔

جب وہ دروازے پر پہنچا تو لڑکا گھر سے نکل کر کہیں جانے والا تھا، وہ حمید کو دیکھتے ہی اندر واپس چلا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازے کے دونوں پٹ اس کے لیے کھل گئے۔

بڑے میاں مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے، بولے: "ہمیں یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے کیونکہ تم ایک سچے انسان ہو۔"

حمید شیر خان کا اعتماد حاصل نہیں کر سکا تھا اس لیے اداس تھا بولا: "شاید میں بہت جلد آ گیا ہوں، اگر میں اس کے ساتھ چلا گیا ہوتا تو اتنی جلدی نہ آتا۔"

بڑے میاں نے چونک کر پوچھا: "کس کے ساتھ، یعنی کس کے ساتھ؟"

حمید نے جواب دیا: "میں اپنے ایک دوست کی بات کر رہا ہوں میں اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔"

بڑے میاں نے پوچھا: "کیوں؟ وہ اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گیا؟"

اتنی دیر میں گھر کے سارے افراد دروازے پر آ پہنچے تھے۔

بڑی بی نے کہا: "یہ کیا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، اندر بلا لو۔ دروازے پر باتیں کرتے رہنا کہاں کی شرافت ہے۔"

حمید کو اندر بلا لیا گیا۔ کنبے والوں نے حمید کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بڑی بی کا روؤاں روؤاں خوش تھا، بولیں: "مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

حمید نے جواب دیا: "میں نے وعدہ جو کر لیا تھا۔"

بڑے میاں نے کہا: "اب باتیں ہی کرتی رہو گی یا کچھ کھانے پینے کو بھی دو گی۔"

بڑی بی فوراً چلی گئیں۔ بڑے میاں نے اپنے سوا سب کو چلتا کر دیا۔ انھوں نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا: "تمہارا خاندان کہاں ہے؟"

حمید نے جواب دیا: "میرا کوئی خاندان نہیں۔"

بڑے میاں نے حیرت سے پوچھا: "کوئی خاندان نہیں! کیا مطلب؟"

حمید نے جواب دیا: "ہاں میرا کوئی خاندان نہیں۔"

بڑے میاں سوالیہ نظروں سے حمید کو دیکھنے لگے۔ بولے: "بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

حمید نے جواب دیا: "میں دہلی کا رہنے والا ہوں۔ مغل فاتح بابر نے دہلی کو فتح کیا تو اس میں میرے خاندان کا صفایا ہو گیا۔ اب میں تنہا زندگی سے بیزار ادھر ادھر بھاگا پھر رہا ہوں۔"

بڑے میاں نے ایک سرد آہ بھری: "تب پھر ہم دونوں ہی یکساں مصیبتوں کے شکار ہیں۔ میرا خاندان بھی ایک ایسی ہی مصیبت سے گزر چکا ہے، خوب!" پھر پوچھا: "مگر یہ تم چلے کہاں گئے تھے؟"

حمید نے جواب دیا: "اب کیا بتاؤں کہ کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے جونپور کے حاکم محمد خان کے دامن دولت سے خود کو وابستہ کر لیا ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ محمد خان اور شیر خان آپس میں برسرپیکار ہونے والے ہیں تو میں بے چین ہو گیا کیونکہ میں نہیں برداشت کر سکتا کہ پٹھان آپس میں خون خرابہ کریں۔ میں نے محمد خان کو سمجھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا پھر میں شیر خان کو سمجھانے چلا گیا۔۔۔۔"

بڑے میاں نے چونک کر حمید کی طرف دیکھا: "تو تم شیر خان کے پاس سہسرام گئے تھے؟"

حمید نے جواب دیا: "ہاں میں شیر خان کے پاس گیا تھا۔"

"شیر خان سے ملاقات ہوئی؟"

"ہاں ملاقات ہوئی۔"

بڑے میاں نے بے دلی سے پوچھا: "کیا بات چیت ہوئی؟"

حمید نے جواب دیا: "میں نے شیر خان کو بہت سمجھایا کہ وہ جنگ جدل سے باز رہے مگر وہ نہیں مانا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ شیر خان اپنے

بھائیوں کو ان کا حق دے دے تو یہ جنگ کے بادل چھٹ جائیں۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ شیر خان کی دلیل بھی بڑی مضبوط ہے وہ کہتا ہے کہ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اس طرح ایک جاگیر میں دو حاکم کیسے رہیں گے۔ وہ اپنے حق کی حمایت اور تحفظ میں جنگ کو ناگزیر اور لازمی سمجھتا ہے۔"

بڑے میاں نے نفرت سے کہا: "شیر خان اچھا آدمی نہیں ہے۔"

پھر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی: "ابراہیم! ذرا ادھر تو آنا۔"

آواز سن کر اس کا بیٹا ابراہیم بڑے میاں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

بڑے میاں نے کہا: "یہ میرا بیٹا ابراہیم ہے آج تم اسے دوسری بار دیکھ رہے ہو۔ کیا تم نے دونوں بار اسے چادر اوڑھے نہیں دیکھا؟"

حمید کو یاد آیا کہ ابراہیم کو اس نے دونوں ہی بار چادر اوڑھے ہوئے ہی دیکھا ہے، کہا: "ہاں میں نے ابراہیم کو دونوں ہی مرتبہ چادر میں لپٹا ہوا ہی دیکھا ہے۔۔۔۔"

بڑے میاں نے پرجوش لہجے میں بات کاٹ دی۔ "اور تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ایسا کیوں ہے؟"

حمید نے جواب دیا: "شاید اب میں اس پر ضرور غور کرتا اور آپ سے اس کا سبب بھی پوچھتا۔"

بڑے میاں نے نفرت انگیز لہجے میں اپنے بیٹے ابراہیم کو حکم دیا: "چادر اتار دے۔"

ابراہیم نے چادر اتار دی۔ چادر کے اندر سے جو کچھ برآمد ہوا۔ اس میں ابراہیم کا سیدھا ہاتھ غائب تھا۔

حمید نے گھبرا کر پوچھا: "اس ہاتھ کو کیا ہوا؟"

بڑے میاں نے جواب دیا: "ابراہیم کا یہ ہاتھ شیر خان کے ظلم و ستم کی نذر ہو گیا۔ میں اور میرا خاندان شیر خان سے نفرت کرتے ہیں۔"

حمید نے پوچھا: "مگر یہ کس طرح ہوا؟"

بڑے میاں نے جواب دیا: "جب شیر خان کا باپ حسن خان زندہ تھا، یہ ان دنوں کی بات ہے۔ شیر خان کے باپ حسن خان نے شیر خان کو اپنی جاگیر کا داروغہ بنا دیا تھا۔ میرا خاندان شیر خان کی جاگیر میں آباد تھا اور ہم سے شیر خان کو یہ شکایت تھی کہ مالیہ اور لگان کی ادائیگی سالوں کی باقی ہے۔ شیر خان نے ہم سے بقایا جات طلب کیے۔ ہم لوگوں نے وقت مانگا اس نے وقت دینے سے انکار کر دیا اور ہم پر فوج کشی کر دی ہم نے بھی شیر خان کا مقابلہ کیا۔" بڑے میاں نے سرد آہ بھر کر کہا: "پھر شیر خان جیت گیا۔ میرا بھائی مارا گیا۔ یہ ابراہیم میرا بھتیجا ہے اس کا سیدھا ہاتھ کٹ گیا۔ یہ کنبہ میرے بھائی کا ہے۔ میرا تو کوئی کنبہ ہی نہیں۔ میری بیوی کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ ابراہیم کی ماں میری بھاوج ہے اور اس کی اولاد میرے بھتیجی بھتیجے۔"

بڑے میاں اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

حمید نے پوچھا: "کیا آپ لوگوں نے واقعی سالوں سے حساب کتاب نہیں کیا تھا؟"

بڑے میاں نے تلخی سے جواب دیا: "سالوں کا حساب باقی تھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ فوج کشی کر دی جائے۔"

حمید نے کہا: "چونکہ مجھے حالات و واقعات کا صحیح علم نہیں ہے اس لیے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

بڑے میاں کا انداز ہی بدل گیا۔ "جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم سب شیر خان کے ظلم و جور کے شکار ہیں تو تمہیں اس پر یقین کر لینا چاہیے۔"

حمید نے جواب دیا: "بزرگوار! افسوس کہ میں آپ کا ہم خیال نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ بات ثابت ہو گئی کہ شیر خان ظالم ہے تو میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اور شیر خان سے اس کے ظلم و ستم کا حساب کتاب کروں گا۔"

بڑے میاں کے گویا پرانے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ بیزاری سے حمید کے پاس سے اٹھ کر جاتے ہوئے قدرے تلخی سے حمید کو مخاطب کیا: "نوجوان! مجھے اس کا اعتراف ہے کہ تم نے میرے اس چھوٹے سے کنبے کی جان بچائی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں شیر خان کی مدح سرائی شروع کر دوں تم میرے سامنے میرے دشمن کی تعریف نہیں کر سکتے۔"

بڑے میاں اپنی بھاوج کے پاس چلے گئے اور اسے مطلع کیا۔ "بھابی! یہ شخص آپ کی بربادیوں کے ذمے دار شیر خان کا مداح ہے۔ میں اس کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

بھابی نے بڑے میاں کو سمجھانے کی کوشش کی: "عثمان علی! شیر خان کا مداح ہونا بری بات نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کو شیر خان سے فائدے پہنچے ہوں۔ ہر شخص کے اپنے ذاتی تجربات ہوتے ہیں اور انہی تجربات کی بنیاد پر وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے محبت یا نفرت کرتا ہے۔ ایک ایسا ہی تلخ تجربہ تمہیں شیر خان سے متنفر کیے ہوئے ہے اور شاید کوئی خوشگوار تجربہ اس نوجوان کو شیر خان سے محبت اور مدح سرائی پر مجبور کر رہا ہو۔"

بڑے میاں نرم پڑ گئے: "جب میں اپنے مرحوم بھائی کو یاد کرتا ہوں اور ابراہیم کا کٹا ہوا ہاتھ دیکھتا ہوں تو میرے دل و دماغ میں نفرت اور انتقام کا آتش فشاں ابلنے لگتا ہے۔"

بھاوج نے عثمان علی کو مزید سمجھایا: "عثمان علی جو کچھ ہو چکا اس کو بھلا دو اور اس شریف نوجوان سے بگاڑ نہ کرو۔" پھر کچھ سوچ کر پوچھا: "اس نے اپنے خاندان کے بارے میں کچھ بتایا؟"

بڑے میاں نے بیزاری سے منہ پھیر کر جواب دیا۔ "دہلی کا رہنے والا ہے کہتا تھا پانی پت کی جنگ میں پورا خاندان مارا گیا۔ اب بالکل تنہا ہے۔"

بھاوج کے چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی، پوچھا۔

"رہتا کہاں ہے؟"

عثمان علی نے جواب دیا۔ "کچھ پتہ نہیں۔ یہ میں نے نہیں پوچھا۔"

بھاوج نے کہا۔ "عثمان علی! تم اس سے باتیں کرو۔ میں اس کے لیے کھانا تیار کر رہی ہوں اگر کسی طرح بات بن جائے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔"

عثمان علی نرم پڑ گیا، واپس جاتے ہوئے کہا۔ "بہر حال ایک بات طے ہے اگر اس نوجوان کو ہم میں رہنا ہے تو اس کو ہماری ہی طرح سوچنا ہوگا۔ میں اور ابراہیم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ شیر خان سے اپنی بربادیوں کا حساب کتاب ضرور کریں گے۔ اگر حمید کو ہمارے ساتھ رہنا ہے تو اسے بھی ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔"

اتنے میں ان دونوں کے پاس ابراہیم بھی پہنچ گیا۔ عثمان علی نے اس سے پوچھا۔ "کیوں ابراہیم! ہمیں شیر خان سے حساب کتاب کرنا ہے یا نہیں؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "انشاء اللہ! اس کے لیے میرا ایک ہی ہاتھ کافی ہے۔"

لیکن ابراہیم کی ماں نے ان دونوں سے اختلاف کیا، بولی۔

"عثمان علی! کیا تمہارا بھائی ظلم اور سرکشی پر نہیں اتر آیا تھا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اس نے شیر خان کو للکارا، اس سے بغاوت کی اور مارا گیا۔ اس نے زندگی بھر مجھے تکلیفیں پہنچائیں، اپنی اولاد تک کو خوش نہیں رکھا۔ وہ میرا شوہر تھا لیکن میں اس کی تعریف نہیں کر سکتی۔"

ابراہیم نے کہا۔ "لیکن ماں! میرے باپ کی مذمت نہ کرو۔"

ماں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "تو چپ رہ، تیرے باپ کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر بھائی عثمان علی کی شفقتیں شامل حال نہ ہوتیں تو آج اس خاندان کا معلوم نہیں کیا حشر ہو چکا ہوتا۔"

عثمان علی چپ چاپ حمید کے پاس چلا گیا، ابراہیم بھی وہاں سے ہٹ گیا۔ ابراہیم کی بہن کلثوم چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی، وہ عثمان علی اور ابراہیم کی باتوں سے غمگین ہو گئی تھی۔ مگر ماں کی باتوں نے اسے خوش کر دیا۔

☆

حمید کو شیر خان میں جو عزم، حوصلہ اور غیرت مندی نظر آئی تھی وہ مسحور کن تھی۔ اس کو یقین ہو چکا تھا کہ شیر خان ایک ایک دن کوئی غیر معمولی شخص ثابت ہوگا۔ اس گھر میں جہاں وہ رہ رہا تھا، شیر خان کے خلاف نفرتیں تھیں، جذبہ انتقام تھا، غصہ اور غیظ و غضب تھا۔ شادی اپنی فوج کے ساتھ سہسرام کی طرف بڑھ رہا تھا اس کو حمید کا انتظار تھا مگر حمید اس کے ساتھ جانے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے شادی سے کہہ دیا کہ وہ آگے نہیں جائے گا، کیونکہ شیر خان جنگ سے گریز کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ حمید نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ شیر خان کا ساتھ اختیار کرے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شیر خان اس پر اعتبار نہیں کرتا مگر وہ مایوس نہیں ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ضرور ہو جائے گا۔

ماں کا رویہ بہت اچھا تھا، کلثوم کے انداز میں تکلف اور احتیاط پائی جاتی تھی۔ عثمان علی میں ابتدا جیسی بات نہیں رہی تھی۔ اس کے طور طریق میں سرد مہری پیدا ہو گئی تھی، اور ابراہیم اپنے چچا کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ ان حالات میں حمید کا اس گھر میں رہنا دشوار ہو رہا تھا۔

ایک دن عثمان علی اور ابراہیم اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کو چلے گئے۔ تو حمید نے باورچی خانے کے در پر کھڑا ہو کر ماں سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہیں کلثوم بھی موجود تھی۔ چھوٹی بچی زینب کھیل کود میں مشغول تھی۔

حمید نے ماں سے پوچھا۔ "یہ چچا عثمان علی اور ابراہیم کہاں چلے گئے؟"

ماں نے جواب دیا۔ "زمینوں کی دیکھ بھال کرنے، کیوں؟"

حمید نے کلثوم کی طرف دیکھا، دونوں کی نظریں ملیں، کلثوم نے سر جھکا لیا۔ ماں سر جھکائے کام میں مصروف تھیں۔ حمید نے کہا۔ "ماں! ان دونوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔"

ماں نے جواب دیا۔ "کوئی ایسی بات تو تھی نہیں جو بتا کر جاتے۔"

حمید نے کہا۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے ماں! میں محسوس کر رہا ہوں کہ چچا عثمان علی مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے رہتے ہیں اور ابراہیم اپنے چچا کا تابع ہے۔"

ماں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں ہے حمید بیٹے! میں نے تو یہ بات نہیں محسوس کی۔"

حمید نے کہا۔ "آپ کو یہ باتیں نہیں محسوس ہوں گی ماں! ان کا تعلق مجھ سے ہے اور میں انہیں محسوس کر رہا ہوں۔"

ماں نے کہا۔ "عثمان علی شیر خان سے نفرت کرتا ہے اور تم اس کی تعریف کرتے ہو، تم کو بھی ذرا احتیاط کرنی چاہیے۔"

حمید نے جواب دیا۔ "ماں! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے؟"

کلثوم نے تڑپ کر حمید کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں یاسیت تھی، التجا تھی، درخواست تھی، خوشامد تھی۔

ماں نے کہا: "اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوا، تمھیں یہ گھر ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کون سا گھر ہے جہاں اختلافات نہیں ہوتے۔ کیا اختلاف کی وجہ سے لوگ گھروں کو چھوڑ دیتے ہیں؟"

حمید نے پوچھا: "ماں! مگر یہ میرا گھر کب ہے۔ جن کا گھر ہوتا ہوگا وہ نہیں چھوڑتے ہوں گے۔"

ماں نے حمید کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "اگر تم اسے اپنا گھر سمجھو گے تو یہ تمھارا ہو جائے گا ورنہ لوگ برس ہا برس گھروں میں رہ کر بھی اجنبی ہی رہتے ہیں۔ گھر کو اپنا گھر سمجھنے سے گھر بنتا ہے۔"

حمید نے دیکھا کلثوم کنکھیوں سے اسے دیکھے جا رہی ہے۔ حمید کو اس پر ترس آ رہا تھا۔

ماں نے چپ دیکھ کر مزید کہا: "حمید! بات سیدھی سی ہے میرے بچوں کا باپ جیسا کچھ بھی تھا، اُن کا باپ اور میرا شوہر تھا۔ اس نے پچھلے کئی برسوں سے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ شیر خان نے اس کی سرکشی کو طاقت سے کچل دیا اور شیر خان نے یہ جو کچھ کیا تنہا میرے شوہر کے ساتھ نہیں کیا بلکہ اس فہرست میں اور کئی نام بھی شامل ہیں ان سب کو کچل کر رکھ دیا۔ جب میں یہ سوچتی ہوں کہ اگر شیر خان کی جگہ میرا شوہر ہوتا اور شوہر کی جگہ شیر خان تو وہ بھی یہی کچھ کرتا۔"

حمید نے کہا: "پھر آپ عثمان علی اور ابراہیم کو سمجھائیں کہ وہ اس معاملے میں زیادہ جذباتی نہ بنیں۔"

ماں نے جواب دیا: "میں انھیں برابر سمجھاتی رہتی ہوں، میں تھکی نہیں ہوں بس ذرا وقت لگے گا۔"

حمید نے کہا: "پھر میں یہ کروں گا کہ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے چلا جاؤں....."

ماں نے بات کاٹ دی، بولی: "اگر تم نے یہاں سے جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو تمھیں روک بھی کون سکتا ہے بشوق چلے جاؤ۔ اپنی خوشی سے آئے تھے اپنی مرضی سے چلے جاؤ گے۔"

حمید وہاں سے ہٹ آیا۔ ماں اداس ہو گئیں انھوں نے جاتے ہوئے حمید کی طرف دیکھا تک نہیں۔ حمید کے چلے جانے کے بعد وہ بڑبڑانے لگیں: "بھائی عثمان علی کو بیٹھے بیٹھے معلوم نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ وہ گڑے مُردے اکھیڑنے لگتے ہیں۔ وہ معلوم نہیں یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اُن کے دل پر لگے ہوئے زخم کسی دوسرے کو نہیں تڑپائیں گے۔"

کلثوم اضطراری حالت میں اٹھی اور باورچی خانے سے نکل گئی۔ ماں نے کہا: "میں تو اس نوجوان کو روک نہیں سکی، ہاں تم اگر روک سکو تو روک لو۔"

کلثوم ادھر اُدھر وحشت سے دیکھتی ہوئی حمید کے کمرے تک پہنچ گئی۔ اس نے کھڑکی کی درز سے جھانک کر دیکھا۔ حمید نے فرش پر ایک چادر بچھا رکھی تھی اور اس پر اپنے کپڑے رکھ رہا تھا۔ کلثوم اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ آہستہ آہستہ چل کر کمرے کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کمرے میں اس کا سایہ جو پڑا تو حمید نے گھوم کر دیکھا اپنے سامنے کلثوم کو کھڑا دیکھ کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ کھل کر رہ گیا: "کلثوم یہ تم!"

کلثوم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں، ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ تھرتھراتی آواز میں آہستہ سے پوچھا: "کیا آپ جا رہے ہیں؟"

حمید نے جواب دیا: "ہاں کلثوم!"

کلثوم نے آنکھیں بھینچ لیں اور آہستہ سے کہا: "اچھا خدا حافظ۔" وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ حمید کانپ گیا بھاگ کر کلثوم کا راستہ روک لیا، بولا: "کیا اس طرح خدا حافظ کہا جاتا ہے؟"

کلثوم نے مغموم آواز میں جواب دیا: "کیا اس طرح رخصت ہوا جاتا ہے؟"

حمید نے ادھر اُدھر دیکھا وہاں دُور دُور تک کوئی نہیں تھا، آہستہ سے کہا: "کلثوم! کیا تم جانتی ہو کہ میں اس گھر میں کس کی وجہ سے آیا تھا؟"

کلثوم نے جواب دینے کے بجائے ڈبڈبائی آنکھوں سے حمید کی طرف دیکھا۔ حمید نے اپنے دامن سے کلثوم کے آنسو پونچھنا چاہے، بولا: "تم پوچھتی کیوں نہیں کلثوم کہ میں اس گھر میں کس کی وجہ سے آیا تھا۔"

کلثوم نے حمید کے دامن سے اپنی آنکھیں بچائیں، بولی: "اب میں کچھ بھی نہیں پوچھوں گی۔"

حمید نے کہا: "کلثوم! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

کلثوم نے جواب دیا: "میں جانے والوں سے کیا باتیں کروں! خدا حافظ کہہ دینے کے بعد کسی بات کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی۔"

حمید نے کہا: "کلثوم! تم خود سوچو کہ میں اس گھر میں کب تک مہمان بنا رہوں گا!"

کلثوم نے جواب دیا: "آپ کو اس گھر میں کس نے مہمان سمجھا ہے۔"

حمید نے کہا: "خود میں نے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں اس گھر میں اچانک حادثاتی طور پر داخل ہوا تھا پھر مہمان بن کر آ گیا اور مہمان کو ایک نہ ایک دن تو جانا ہی پڑتا ہے۔"

کلثوم نے کہا: "آپ نے خود کو مہمان سمجھ رکھا ہے ورنہ میری ماں کی تو یہی خواہش رہی ہے کہ آپ زمینوں کے معاملات میں چچا عثمان علی کا ہاتھ بٹائیں اور اسی گھر میں رہیں۔"

حمید نے جواب دیا: "مجھ سے ایسا کہا تو کبھی بھی نہیں گیا۔"

کلثوم نے کہا: "ہر بات کہی تو نہیں جاتی بس سمجھ لی جاتی ہے۔"

حمید نے کہا: "مگر افسوس کہ میں ان زمینوں کا آدمی نہیں ہوں۔ میرے آبا و اجداد سپاہی رہے ہیں میں بھی سپاہی ہوں اور میرے کام کی زمین میدانِ کارزار ہے میں رزم گاہ کے لیے پیدا ہوا ہوں۔"

کلثوم روہانسی ہوگئی، چڑ کر بولی "پھر یہاں اس گھر میں کیا کر رہے ہو، چلے جاؤ اپنی زمینوں پر۔ معلوم نہیں تم مردوں کو میدانِ کارزار کی زمینیں کیوں اچھی لگتی ہیں۔ وہ زمینیں جو آدمیوں کو کھا جاتی ہیں۔ میں تو تمہیں اُن زمینوں کی طرف بھیجنا چاہتی ہوں جو ہمیں کچھ دیتی ہیں، جہاں فصلیں اُگتی ہیں جہاں پھل لگتے ہیں مگر تم لوگ قبرستان کی طرف بھاگتے ہو۔"

کلثوم کی باتوں نے حمید کے دل پر بڑا اثر کیا۔ بولا "کلثوم! میں بڑا دکھی انسان ہوں۔ میں نے جس میدان میں اپنا سب کچھ گنوا دیا تھا، اب میں سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ معاشرے میں عزت دار وہی ہیں جو مرد میدان ہیں۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ان آنکھوں میں میرا مقام ہے اور تمہارے دل میں میں نے کوئی جگہ بنا لی ہے تو میں کہیں بھی رہوں، آخر کار یہیں چلا آؤں گا۔"

کلثوم نے کہا "ہم سب کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اگر آپ میری زبان سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ میں۔۔۔ کہ میں۔۔۔"

وہ بات پوری نہیں کر سکی اور منہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کر روتی ہوئی چلی گئی۔

حمید اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا اور ان حالات میں اس کو کیا کرنا چاہیے جب کلثوم نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ بھی مضمحل اور اداس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بھیگی ہوئی چادر کے کپڑے اٹھا کر کھونٹیوں پر ٹانگ دیے اور چادر تہہ کر کے لکڑی کے صندوق میں رکھ دی۔

●

حمید کچھ دن کے لیے اور رُک گیا۔ وہ کلثوم کو ناراض کر کے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ماں اس کے رُک جانے سے خوش تھیں۔ مگر عثمان علی انتہائی کوشش کے باوجود اپنی سابقہ گرم جوشی بحال نہیں کر سکا تھا۔ حمید موقع کی تلاش میں تھا وہ کلثوم سے چند باتیں کر کے اسے اپنے اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔

یہ سردیوں کے دن تھے۔ عثمان علی کو اچانک زمینوں پر جانا پڑ گیا۔ وہ ابراہیم کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے جاتے جاتے حمید سے کہا "حمید! اگر تو جانا چاہے تو میری واپسی تک نہ جانا۔ اس کے بعد چلے جانا۔"

عثمان علی کی اس بات نے حمید کے دل پر چوٹ سی لگائی، وہ بوکھلا گیا اور فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ عثمان علی کو کیا جواب دے۔ وہ انتہائی جذباتی تھا، اس کی بھوک پیاس اور نیند تک اُڑ گئی۔ عثمان علی زہر میں بجھا تیر حمید پر چلا کر زمینوں پر جا چکا تھا۔ عثمان علی کی یہ بات ماں اور کلثوم نے بھی سن لی تھی۔ وہ دونوں اس کے ردِ عمل سے پریشان ہو رہی تھیں چنانچہ عثمان علی کے چلے جانے کے بعد ماں نے اس کے زخمی دل پر پھایا رکھنا چاہا۔ بولیں "عثمان علی بھی غموں سے سٹھیا گیا ہے۔"

حمید نے جواب دیا "نہیں ماں! ایسی بات نہیں ہے چچا عثمان کی بات میں اُن کی خواہش پائی جاتی ہے اب مجھے نہیں رُکنا چاہیے۔"

ماں نے کہا "میں عثمان علی کو سمجھا دوں گی۔"

حمید جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں چارپائی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ وہ اس خاندان سے کہاں اور کس حال میں ملا تھا، پھر دوبارہ اس گھر میں کس طرح آیا۔ ساری باتیں تصور میں گھوم رہی تھیں پھر وہ اُٹھا اور اپنا سامان باندھ لیا۔ اس کی چستی اور تیزی مفقود ہو چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کلثوم اس بار بھی اس کے پاس آئے گی اور اُسے روکنے کی کوشش کرے گی اُس نے کپڑے کی پوٹلی باندھنے کے دوران کئی بار دروازے کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر کلثوم کو تلاش کرنے لگا۔ آخر اچانک اس کی نظر اس حال میں کلثوم پر پڑی کہ وہ اپنی ماں کے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ کلثوم نے بھی اُسے دیکھ لیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے کمرے کے در پر رُکی پھر صحن کے مقابل برآمدے میں چلی گئی۔ حمید بھی وہیں پہنچ گیا۔ یہاں رنگ برنگے پھولوں کی بیلیں دیواروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ کلثوم ایک بیل کے سائے تلے بچھی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئی۔ حمید اس کے پاس جا کھڑا ہوا، آہستہ سے آواز دی "کلثوم!"

کلثوم نے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں "مجھے افسوس ہے۔ چچا عثمان علی کی طرف سے میں معافی مانگ رہی ہوں۔"

حمید نے جواب دیا "کلثوم! معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے جو بے غیرتی اختیار کر لی تھی، اس کا یہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔"

کلثوم نے کہا "کہیں دل برداشتہ ہو کر چلے نہ جانا۔"

حمید نے جواب دیا "کلثوم! میں تم سے جانے کی اجازت لینے آیا ہوں۔"

کلثوم کو اس پر حیرت نہیں ہوئی، شاید وہ یہ خبر سننے کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی۔ پوچھا "پھر کب آؤ گے؟"

حمید نے جواب دیا "کچھ پتہ نہیں مجھے خود پتہ نہیں کہ میں پھر کب آؤں گا۔"

کلثوم نے کہا "جانے سے پہلے اماں سے چند باتیں کر لینا وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔"

حمید نے کہا "میں ابھی اُن سے باتیں کیے لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ماں کے پاس جانے کے لیے مڑا مگر کلثوم نے یہ کہہ کر اُسے روک دیا کہ وہ اس وقت سوئی ہوئی ہیں۔

حمید کی جان میں جان آئی، بولا: "میں تم سے بھی چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

کلثوم نے جواب دیا: "کرو۔"

حمید کو کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بالآخر اٹک اٹک کر بولا: "کلثوم! دراصل غلطی میری ہی تھی مگر تمھاری محبت نے مجھے بے غیرت بنا دیا تھا۔ جونپور کا حاکم محمد خان میرا انتظار کر رہا ہے اور میں یہاں ۔۔۔"

کلثوم نے کہا: "میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اب کیا ہوگا؟"

حمید نے جواب دیا: "کلثوم! وہی ہوگا جو تم چاہو گی۔ میرا آئندہ کا رویہ تمھارے جواب کا تابع ہوگا۔"

کلثوم نے شرما کر پوچھا: "میں کب تک آپ کا انتظار کروں گی؟"

حمید کو اس سوال نے خوش کر دیا۔ یہ ایسا سوال تھا جس میں حمید کے سوال کا جواب بھی موجود تھا۔

حمید نے کہا: "کلثوم! میں یہاں سے نکل کر شیر خان کو تلاش کروں گا پھر اس کے ساتھ قسمت آزمائی میں لگ جاؤں گا اور جب تقدیر یاوری کرے گی اور میں صاحبِ حیثیت ہو جاؤں گا تمھارے پاس واپس آجاؤں گا۔"

کلثوم شیر خان کے ذکر پر چونک گئی، بولی: "میں واپسی کی مدت پوچھ رہی ہوں اور یہ بار بار آپ شیر خان کا نام کیوں لیتے ہیں؟"

حمید نے جواب دیا: "سردست میں خود نہیں جانتا کہ اس میں کتنا وقت لگے گا۔ شیر خان میرے لیے ایک مثالی انسان ہے میں اس سے متاثر ہوں اور اسی جیسا بن جانا چاہتا ہوں۔"

کلثوم نے کہا: "جب آپ یہ جانتے ہیں کہ میرے گھر کا ہر فرد شیر خان سے چڑتا ہے، جلتا ہے تب پھر آپ بار بار ہمارے سامنے اس کا نام کیوں لیتے ہیں؟"

حمید نے جواب دیا: "اس لیے کہ میں اس سے نہیں چڑتا، میں اس سے نہیں جلتا وہ میری محبوب ترین شخصیت ہے۔"

کلثوم نے سُنی اَن سُنی کر دی، پوچھا: "مجھے تو بس یہ بتا دیجیے کہ آپ واپس کب آئیں گے؟"

حمید نے جواب دیا: "کہہ تو دیا کہ میں خود نہیں جانتا کہ واپس کب آؤں گا لیکن کبھی نہ کبھی واپس آؤں گا ضرور۔"

کلثوم نے محزنیہ لب و لہجے میں کہا: "آپ جب بھی آجائیں، میں انتظار کروں گی، بالوں کی سفیدی تک۔"

حمید نے پوچھا: "لیکن یہ وعدہ تم کس طرح کر سکتی ہو؟ کیا تم اپنی ماں، اپنے چچا عثمان علی اور بھائی ابراہیم کی ضدوں اور مرضیوں کے خلاف ثابت قدم رہ سکو گی؟"

کلثوم نے جواب دیا: "میں جو کچھ کہہ رہی ہوں آزما لینا مگر ایک بات۔ ایک وعدہ آپ کو بھی کرنا ہے۔"

حمید نے پوچھا: "کون سا وعدہ؟"

کلثوم نے کہا: "آپ جہاں کہیں بھی رہیں یہ یاد رکھیں کہ میں انتظار کر رہی ہوں۔ آپ کو اور لڑکیاں اور عورتیں بھی مل سکتی ہیں مگر میں آپ کا انتظار کروں گی ۔۔ ہر حال میں۔"

اس کے بعد اس نے حمید کو ایک رومال دیا۔ حمید نے اس رومال کو کھولا تو دیکھا اس میں دو آنکھیں بنی ہوئی ہیں، حیرت سے پوچھا: "کلثوم! یہ دو آنکھیں! یہ کیوں! ان کا مطلب؟"

کلثوم نے آنکھیں بند کر کے: "یہ میری آنکھیں ہیں، منتظر، آپ کی منتظر آنکھیں۔ آپ اس رومال کو ہر وقت اپنے پاس رکھیے گا اور وقتاً فوقتاً انھیں دیکھ کر یہ یاد کر لیا کیجیے گا کہ کوئی آپ کا انتظار کر رہا ہے اور خاص کر اس وقت ضرور، جب کوئی لڑکی یا عورت ۔۔۔"

وہ بات پوری نہیں کر سکی، رونے لگی۔

حمید نے کلثوم کے رومال سے اس کے آنسو خشک کرنا چاہے مگر وہ پیچھے ہٹ گئی، بولی: "اس رومال کو اپنی آنکھوں سے لگائے رکھنا، میرے آنسوؤں کے لیے میرا اپنا دامن کافی ہے۔"

اس کے بعد کلثوم حمید کے پاس نہیں ٹھہری۔ وہ بھاگتی ہوئی ماں کے کمرے میں گھس گئی۔ حمید حیران و پریشان ہونقا سا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب کلثوم کی ماں بیدار ہو کر باہر آجائے گی لیکن کچھ دیر انتظار کرنے کے باوجود جب دونوں میں سے ایک بھی باہر نہ آئی تو حمید دبے قدموں ایڑی کے بل چل کر ماں کے کمرے تک پہنچا، وہ اندر سے بند تھا اس نے کھڑکی کے ایک چھوٹے سوراخ سے جھانک کر اندر دیکھا۔ ماں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور کلثوم ان کی رانوں پر بیٹھی تھی، ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں، اس نے سنا ماں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں: "تجھ کو ایسا وعدہ نہیں کرنا تھا کلثوم! تو مردوں کو نہیں جانتی۔"

کلثوم سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

ماں نے پوچھا: "جب تو نے اس سے انتظار کرنے کا وعدہ کیا، تو اس نے کیا کہا تھا؟"

کلثوم نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا: "وہ کہتے تھے میں واپس ضرور آؤں گا۔"

ماں نے پوچھا: "مگر کب؟ کتنے دنوں بعد؟ واپسی کی کوئی مدت نہیں بتائی اس نے۔"

کلثوم نے جواب دیا: "مدت نہیں بتائی لیکن میں نے طے کر دیا ہے کہ میں بالوں کی سفیدی تک اس کا انتظار کروں گی۔"

ماں نے ۔۔۔ میں کلثوم کے سر پر دو چپت رسید کر دیا ۔۔۔

لیکن آواز میں کہا: "یہ تو نے کیا کیا کلثوم! تو نہیں جانتی ان ارادوں کو۔ میری بچی، تو انتظار کرتی رہ جائے گی اور وہ شخص تجھے بھول کر کہیں اور شادی کر لے گا۔"

کلثوم رونے لگی۔ ماں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں، بولی: "میں اُس سے بات کروں گی اور اس سے تیرا وعدہ واپس لے لوں گی۔ میں اس سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اگر وہ چار سال کے اندر اندر نہ آیا تو میں اپنی بچی کی شادی کہیں اور کر دوں گی۔"

کلثوم اٹھ کر بیٹھ گئی، بولی: "ماں! خدا کے لیے اس سے ایسی بات نہ کرنا۔ میں نے جو کہہ دیا، میں زندگی بھر اس کا انتظار کروں گی۔"

ماں اٹھ کر کھڑی ہو گئی، بولی: "تو تو پاگل ہو گئی ہے۔"

حمید پنجوں کے بل بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پلنگ پر لیٹ کر چادر اوڑھ لی۔ کچھ دیر بعد جب ماں اس سے بات کرنے پہنچی تو اُسے سوتا ہوا دیکھ کر واپس چلی گئی اور کلثوم سے کہا: "اور کر وعدہ زندگی بھر انتظار کرنے کا۔ وہ تو تیری طرف سے بے فکر ہو کر لمبی تان کے سو رہا ہے۔"

❖

حمید عثمان علی اور ابراہیم کا انتظار کر رہا تھا۔ ماں نے پہلے تو حمید سے صاف صاف بات کرنا چاہی تھی لیکن کلثوم نے رو رو کر ماں کو روک دیا۔ بس اتنی سی بات کہہ کر رہ گئی: "بیٹے! کلثوم لڑکی ہے، لڑکی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا اور اگر۔۔۔ خدانخواستہ اگر گھر گرہستی میں پھنس جاؤ تو ہمیں اس کی اطلاع ضرور کر دینا تاکہ میں بھی کلثوم کا بندوبست کر دوں۔"

حمید نے جواب دیا: "میں واپس آؤں گا ماں، میں ضرور واپس آؤں گا، آپ بے فکر رہیں۔"

جب عثمان علی واپس آ گیا اور حمید کو رختِ سفر باندھے دیکھا تو براہِ راست حمید سے بات نہیں، کلثوم کی ماں سے پوچھا: "کیا یہ جا رہا ہے؟"

ماں نے جواب دیا: "ہاں جا رہا ہے۔"

عثمان علی نے پوچھا: "مگر کہاں؟"

ماں نے جواب دیا: "کچھ پتہ نہیں، یہ تو اسی سے پوچھ لو۔"

عثمان علی نے کہا: "آپ کو نہیں بتایا کچھ؟ کچھ بھی نہیں؟"

ماں نے جواب دیا: "نہ تو میں نے اس سے یہ پوچھا ہے اور نہ اس نے خود سے یہ بتایا ہے۔"

حمید باہر نکل گیا، اس نے گھوڑا نکالا اور اس کی پشت پر زین کسنے لگا۔

عثمان علی نے حمید کی پوٹلی اٹھائی اور کلثوم کی ماں سے پوچھا: "یہی پوٹلی اس کے ساتھ جائے گی یا کچھ اور بھی؟"

کلثوم کو اپنے چچا عثمان علی کی حرکتوں پر غصہ بھی آ رہا تھا اور رونا بھی۔ دوڑ کر اُن کے پاس پہنچی اور پوچھا: "چچا جان! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

عثمان علی نے اس کے بھاری پپوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: "حمید کی پوٹلی دینے جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا غریب کو خواہ مخواہ اتنی زحمت کرنا پڑے گی۔" پھر پپوٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "یہ آنکھیں کیا ہو گیا ہے کلثوم! کیا آنکھیں دُکھنے آ گئیں؟ ان میں دوا ڈلوا، آنکھیں بڑی نعمت ہوتی ہیں، ان کی فوراً پروا کرنا چاہیے۔"

باہر نکل کر عثمان علی نے حمید کی پوٹلی اس کے حوالے کر دی، بولا: "یہ اندر رہ گئی تھی، میں نے سوچا تم بار بار کیوں تکلیف کرو، میں ہی لے آیا۔"

ماں، چھوٹی بچی زینب اور ابراہیم دروازے پر موجود تھے لیکن ان میں کلثوم نہیں تھی۔

حمید نے زینب کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جھک کر اس کی پیشانی چوم لی، پوچھا: "زینب مجھے کبھی یاد کرو گی یا نہیں؟"

زینب نے پوچھا: "کتنی دیر میں آؤ گے واپس؟"

حمید نے جواب دیا: "بہت دنوں بعد مگر واپس ضرور ضرور آؤں گا۔"

پھر ابراہیم سے ہاتھ ملایا۔ اس نے اپنے چچا کی طرف دیکھا۔ اور سرد مہری سے ہاتھ ہلا کر چھوڑ دیا۔

ماں کی طرف دیکھا، وہ کہہ رہی تھیں: "دیکھو واپس ضرور آنا، میں انتظار کروں گی تمہارا۔"

حمید ماں کے قریب چلا گیا۔ ماں نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں۔

بالکل آخر میں وہ عثمان علی سے مخاطب ہوا، بولا: "چچا جان! اجازت۔"

چچا عثمان علی نے کہا: "چلو کچھ دُور تو پیدل چلو، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

حمید گھوڑے کی لگام پکڑ کر چچا عثمان علی کے ساتھ چلنے لگا۔

عثمان علی نے چلتے چلتے کہا: "تم نے اپنی واپسی کی مدت نہیں بتائی۔"

حمید نے جواب دیا: "نہیں، کیونکہ میں جو مقصد لے کر جا رہا ہوں پتہ نہیں وہ کتنی مدت میں پورا ہو۔"

عثمان علی نے کہا: "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمہارا کوئی اعتبار نہیں۔ میں کلثوم کے سلسلے میں تمہارا انتظار نہ کروں۔"

حمید نے جواب دیا: "جیسی آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

عثمان علی نے کہا: "اور جب واپس آنا تو یہ خوشخبری لے کر کہ تم نے کلثوم کے مرحوم باپ کا بدلہ لے لیا۔"

حمید نے کہا: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

عثمان علی نے جواب دیا: "یہ کہ میں شیر خان کو کبھی بھی معاف نہیں کر سکتا، اگر تم میرے مرحوم بھائی کے داماد بننا چاہتے ہو تو تمھیں شیر خان کو قتل کر دینا چاہیے۔ یہ کام اس کا بیٹا ابراہیم نہیں انجام دے سکتا کیونکہ وہ ایک ہاتھ کا ہے۔"

حمید نے کہا: "لیکن افسوس! کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"

عثمان علی نے جواب دیا: "تب پھر تم اس گھر میں واپس نہ آنا۔"

حمید نے دبی زبان میں کہا: "لیکن میں نے ماں اور کلثوم سے واپسی کا وعدہ کر لیا ہے۔"

عثمان علی نے نفرت سے کہا: "وہ دونوں عورتیں ہیں۔ اس گھر کا سرپرست میں ہوں اور جب تک میں راضی نہ ہو جاؤں کوئی ایک شخص بھی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔"

حمید نے عثمان علی کی بات کا جواب نہیں دیا اور اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

عثمان علی نے جلدی جلدی کہا: "میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم واپس نہ آؤ کیونکہ اس دوران مایوسی کلثوم کے زخموں کو بھر دے گی اور میں اس کو کسی دوسری طرف راغب کر سکوں گا۔"

حمید نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا: "اچھا جناب خدا حافظ۔"

عثمان علی غصے میں بولا: "عجیب جنگلی ہے یہ نوجوان بھی، ذرا سی بھی تہذیب نہیں۔"

٭

حمید جونپور گیا، وہاں سے شیر خان کی بابت معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ مانک پور جنید برلاس کے پاس گیا ہوا ہے۔ جنید برلاس مغل فرماں روا بابر کے وزیر خواجہ نظام الدین کا چھوٹا بھائی اور کڑہ مانک پور کا حاکم تھا۔ ان دنوں شیر خان جنید برلاس کا مہمان تھا اور وہ اس مغل حاکم سے اپنے علاقوں کی واپسی کے لیے فوجی مدد مانگ رہا تھا۔ رسمی سی درخواست پر شیر خان کو فوجی مدد مل گئی۔ ان دنوں ملکی سیاست کی بساط پر شاطر اپنی اپنی چالیں چلنے میں مشغول تھے۔ مغل قدیم جاگیرداروں کی چپقلش سے خوش تھے۔ انھیں حلیفوں کی تلاش تھی چنانچہ جب شیر خان جنید برلاس کا حلیف بن گیا تو اسے فوجی مدد فراہم کر دی گئی۔ شیر خان اپنی اس فوج کے ساتھ خواص پور، ٹانڈہ اور سہسرام واپس آ رہا تھا۔ اسی عالم میں حمید اس سے دوبارہ ملا۔ شیر خان اس سے نہایت گرمجوشی سے ملا کیونکہ اسے حمید پر اعتبار نہیں تھا۔ حمید نے اسے یقین دلانا چاہا: "میں نے محمد خان کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔ میں شیر خان تمھارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

شیر خان نے جواب دیا: "تو میرے ساتھ رہ، لیکن خبردار جو دغا و فریب سے کام لیا۔"

حمید نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی: "اگر تمھارے ساتھ میں فریب کروں تو مجھ پر اللہ کے کلام کی مار پڑے۔"

شیر خان نے حمید کو اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ محمد خان کے علاقے پر حملہ آور ہو گیا۔ محمد خان شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد شیر خان اپنے علاقوں کی طرف بڑھا اور اپنے بھائیوں کو شکست دے کر ان پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ حمید شیر خان کی فوج کے ساتھ کلثوم کے مکان کے سامنے سے گزرا۔ اس کا جی چاہا کہ ان لوگوں سے ملتا چلے لیکن وہ نہیں گیا۔ اور سہسرام چلا گیا۔

شیر خان نے جنید برلاس کے سپاہیوں کو انعام و اکرام دے کر ان سب کے دل موہ لیے۔

شیر خان کے عزائم ہی کچھ اور تھے، اس نے حمید پر کڑی نظر رکھی تھی اور اب وہ اس پر کسی حد تک اعتماد کرنے لگا تھا۔

ایک دن اس نے کہا: "حمید! اگر تو میرا ساتھ دینا چاہتا ہے تو میرے ساتھ چل، میں آگرے بابر کے دربار تک جانا چاہتا ہوں۔"

حمید نے جواب دیا: "میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

اب حمید کے دل میں شیر خان کے لیے کچھ زیادہ ہی احترام پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ 'تم' سے 'آپ' کہنے لگا تھا۔

آگرے جانے سے پہلے شیر خان نے جونپور کے حاکم محمد خان کو اس کی جاگیر یہ کہہ کر واپس کر دی کہ میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں، میں آپ کو اب بھی اپنا چچا سمجھتا ہوں، میرا جھگڑا تو میرے بھائیوں سے تھا جو ختم ہو گیا۔

محمد خان نے شیر خان کا شکریہ ادا کیا اور اپنی جاگیر پر دوبارہ متصرف ہو گیا۔

شیر خان نے اپنی جاگیر کا انتظام اپنے بھائی نظام کے سپرد کر دیا اور خود جنید برلاس کے ساتھ آگرے روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں حمید اس کے ساتھ تھا۔ شیر خان نے حمید سے سرگوشی میں کہا: "ذرا مغلوں کے نظم و نسق پر نظر رکھنا، کیونکہ یہ مشاہدہ ہمارے کام آئے گا۔"

جنید برلاس نے شیر خان کا بابر سے تعارف کرایا تو بابر شیر خان سے بڑے تپاک سے پیش آیا۔ وہ کئی دن تک بابر کے پاس آتا جاتا رہا۔ شیر خان کی تیز طرار نظروں نے مغلوں کے نظم و نسق میں جو شگاف

دیکھنے میں کامیاب ہو گئی تھیں جو ملازمین اور منصب داروں نے رشوتوں کے لین دین سے پیدا کر رکھا تھا۔ شیر خان نے حمید سے کہا: "مغل بادشاہ اپنے امراء اور مصاحبین پر اتنا زیادہ اعتماد کرنے لگا ہے کہ وہ رشوت کے کاروبار کو نظر انداز کرتا جا رہا ہے۔"

حمید نے جواب دیا: "لیکن شیر خان! بابر فاتح ہے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس لیے نرمی اور مروت سے پیش آ رہا ہے کہ انہی کی مدد اور کوششوں سے ہندوستان کا بادشاہ بنا ہے۔"

شیر خان نے کہا: "حمید! اگر میرے ہم قوم میرا ساتھ دیں دیں تو میں مغلوں کو ہندوستان سے نکال باہر کروں۔"

حمید کو شیر خان کی بات پر یقین نہیں آیا وہ اسے شیر خان کی خوش فہمی سمجھنے لگا۔

شیر خان کی نگاہیں بابر اور اس کے رفقائے کار کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے اس دربار میں بابر کے جانشین ہمایوں کو بھی دیکھا ہمایوں کی شخصیت شیر خان کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکی۔

جنید برلاس شیر خان پر بہت زیادہ مہربان تھا۔ وہ شیر خان کو شاہی دستر خوان پر لے گیا۔ بابر کے دستر خوان پر امراء اور معززین مودب بیٹھے تھے۔ شیر خان محفل میں داخل ہوا اور ادھر ادھر اپنے لیے نشست تلاش کرنے لگا۔ بابر کے قریب جگہ خالی تھی۔ شیر خان وہیں بیٹھ گیا۔ بابر کو شیر خان کی جرأت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے جنید برلاس سے ترکی زبان میں کہا: "مجھے اس نوجوان میں فتنہ و فساد کی بو محسوس ہوتی ہے۔"

جنید برلاس نے جواب دیا: "یہ ہمارا دوست ہے اور اس کی وجہ سے بہت سارے پٹھان ہمارے دوست بن گئے ہیں اور چونکہ پٹھان اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں اس لیے اس میں کافی خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔"

دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے لگے ہوئے تھے۔ کھانے کا آغاز ہوا شیر خان نے نہایت بے باکی اور بے تکلفی سے کھانا کھانا شروع کر دیا۔ شیر خان سے ذرا دور اور بابر کے قریب ماہیچہ کی قاب رکھی ہوئی تھی۔ شیر خان کی نظریں بار بار ماہیچہ پر پڑ رہی تھیں۔ وہ اس قاب میں سے کچھ نکال کر کھانا چاہتا تھا۔ آخر اس نے اپنی کمر سے خنجر نکالا اور اس سے ماہیچہ کے چند ٹکڑے کیے اور خنجر کی نوک ہی سے انہیں کھانے لگا۔

بابر اس کی اس حرکت کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے شیر خان کی ادا پسند آئی۔ جنید برلاس کو ایک بار پھر مخاطب کیا: "جنید! اس کے انداز شاہانہ ہیں۔ یہ شخص کبھی نہ کبھی سلطنت مغلیہ کے لیے مصیبت ثابت ہو گا۔"

جنید برلاس نے جواب دیا: "بیشک اس افغان میں غیر معمولی اوصاف پائے جاتے ہیں۔"

بابر نے کہا: "میرے بعد ہمایوں مرزا کے لیے مصیبت بن جائے گا، کیوں نہ اسے قید کر لیا جائے۔"

جنید برلاس نے بادشاہ کی خواہش سے اختلاف کیا: "حضور والا اگر اس افغان کو قید کر لیا گیا تو افغانوں کا مغلوں پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور وہ دربار میں آنا جانا چھوڑ دیں گے۔"

بابر نے کہا: "تب پھر اس افغان پر نظر رکھی جائے۔"

جنید برلاس نے اس کا وعدہ کر لیا۔ شیر خان کھانے میں مشغول تھا۔ وہ دونوں کی باتیں بغور سنتا رہا۔ چونکہ اسے ترکی نہیں آتی تھی اس لیے وہ ان دونوں کی باتوں کا لفظاً اور معناً مطلب تو نہیں سمجھ سکا لیکن انداز اور قیاس سے یہ ضرور سمجھ لیا کہ بابر اور جنید برلاس اسی کی بابت کچھ ناخوش گوار باتیں کر رہے ہیں۔

شیر خان کی تیز قوت فیصلہ اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ باہر نکلا تو اپنی قیام گاہ پر نہیں گیا۔ حمید کو بلوا کر فوراً سہسرام روانہ ہو گیا۔ حمید پریشان تھا کہ وہ آگرہ چھوڑنے میں اتنی عجلت کیوں کر رہا ہے۔ اس نے پوچھا: "محترم شیر خان! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

شیر خان نے جواب دیا: "میں محسوس کر رہا ہوں کہ بابر کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔"

حمید نے پوچھا: "کیا بابر نے آپ کی بے عزتی کی ہے؟"

شیر خان نے جواب دیا: "ایسی کوئی بات نہیں، مگر میری کوئی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی ہے۔"

حمید چپ ہو گیا مگر اسے یقین تھا کہ شیر خان جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں جھوٹ شامل نہیں ہو گا۔

واپسی میں اس نے جنید برلاس کو ایک خط کے ذریعے مطلع کر دیا "چونکہ میری عدم موجودگی میں میری اپنی جاگیر کا نظم و نسق ابتر ہو چکا ہے اس لیے میں فوراً ہی اپنی جاگیر پر واپس جا رہا ہوں۔"

سہسرام پہنچ کر شیر خان نے اپنی مہم تیز کر دی اور اپنی فتوحات کی حدود بڑھانے لگا۔ اسی دوران شیر خان نے سنا کہ چنار کا حاکم قتل کر دیا گیا۔ شیر خان کو اس خبر نے چونکا اور ہوشیار کر دیا۔ اس نے عالم خیال میں دیکھا کہ چنار کی ملکہ لاڈو اس کی طرف دست شوق بڑھا رہی ہے لیکن درمیان میں کچھ حاسد اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ شیر خان بیوہ ملکہ لاڈو کے پاس تعزیت کرنے گیا تو امراء نے اس کی نگرانی شروع کر دی۔

ملکہ لاڈو نے پردے کے پیچھے سے شیر خان کو دیکھنا چاہا مگر نہیں دیکھ سکی۔

شیر خان نے سوگوار لہجے میں کہا: "محترم خاتون! مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے شوہر کو قتل کر دیا گیا۔"

ملکہ لاڈو نے کہا۔ "شیر خان! میں تیرا انتظار کر رہی تھی، خدا کا شکر ہے کہ تو آ گیا۔" اس کے بعد اس نے اپنے روبرو کھڑے ہوئے ایک امیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لوگوں کے چہرے تو کسی اور طرف ہوتے ہیں مگر کان ہماری طرف۔ پاگلوں، احمقوں کی طرح۔ بس۔"

شیر خان نے کہا۔ "آپ نے درست فرمایا، میں تائید کرتا ہوں۔"

ملکہ لاڈو نے کھڑے ہوئے امیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ شخص جو بظاہر ایک ساکت اور بے جان بُت کی طرح کھڑا ہے، دوسرے امراء کا مخبر ہے۔"

شیر خان نے جواب دیا۔ "ملکہ عالیہ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

ملکہ لاڈو نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تو میری مدد کرے۔" پھر پوچھا۔ "کیا تو میری وہی مدد کر سکتا ہے جس کی میں طالب ہوں؟"

شیر خان نے عرض کیا۔ "آپ کہہ کر تو دیکھیں میں آپ کی ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

ملکہ لاڈو شوخی سے مسکرا رہی تھی، بولی۔ "شیر خان! ایک بار پھر سوچ لے کہیں مکر نہ جانا۔"

شیر خان نے ساکت و صامت امیر کی طرف دیکھا وہ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا تھا یہاں تک کہ جب ملکہ لاڈو نے شیر خان کے کان سے اپنا منہ لگا دیا تو امیر پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

ملکہ لاڈو کہہ رہی تھی۔ "شیر خان! میں تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں تاکہ تو چنار کا نظم و نسق سنبھال سکے۔"

امیر ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا مگر آخری باتیں نہیں سن سکا۔

شیر خان نے ملکہ لاڈو سے جو کچھ سنا تھا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ وہ اس پر غور کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھتا تھا کہ پہلے اس امیر کو بے بس اور معطل کر دیا جائے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور امیر کو گریبان سے پکڑ لیا۔ "تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟"

امیر نے جواب دیا۔ "میں ملکہ کا تابع فرمان ہوں محض ملکہ کی خوشنودئ طبع کی خاطر کھڑا رہتا ہوں۔"

شیر خان نے اس کو بے بس کر کے ایک کمرے میں قید کر دیا۔ "میرا خیال ہے تو کھڑے کھڑے بہت زیادہ تھک چکا ہے اب چند دن آرام کر۔"

ملکہ لاڈو شیر خان کی باتوں سے بہت خوش ہوئی، اس نے کہا۔ "تو شیر خان میں یہ کہہ رہی تھی کہ چنار کا نظم و نسق چلانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں تجھ سے شادی کر کے اس کا نظم و نسق تیرے حوالے کر دینا چاہتی ہوں۔"

شیر خان نے دبی زبان میں پوچھا۔ "اگر میں انکار کر دوں تو؟"

ملکہ لاڈو نے جواب دیا۔ "تب میں تجھے بے وقوف سمجھوں گی۔ اور چنار کی حکومت کسی لودی کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔"

شیر خان مسکرایا۔ "لیکن میں بے وقوف نہیں ہوں، میں اس شرط پر آپ سے شادی کر سکتا ہوں کہ آپ آئندہ نظم و نسق سلطنت میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کریں گی۔"

ملکہ لاڈو نے اس کا وعدہ کر لیا۔

ملکہ نے اسی وقت قاضی کو طلب کر لیا۔ وہ محل ہی میں موجود تھا۔ وہ شیر خان جو بیوہ ملکہ لاڈو کی مزاج پرسی اور تعزیت کے لیے آیا تھا ملکہ کا شوہر بن گیا اور خوش طالعی نے اسے چنار کا حاکم بنا دیا چنار کا قلعہ اپنی مضبوطی کے لیے بہت مشہور تھا اور اب وہ ایک مضبوط سُور پٹھان کے قبضے میں جا چکا تھا۔

شیر خان نے حمید کو چنار کے قلعے میں بلا لیا۔ حمید نے یہاں جو کچھ دیکھا وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن جب اسے سب کچھ معلوم ہو گیا تو اس نے بھی ایک خطرے کی پیش گوئی کی۔ "محترم شیر خان! مغل حکومت آپ کو چنار کا حکمران نہیں تسلیم کرے گی۔"

شیر خان نے پوچھا۔ "کیوں؟"

حمید نے جواب دیا۔ "چنار کا حکمران مغل حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے، اب جب کہ اس کا نامزد حکمران مر چکا ہے وہ مرحوم کی جگہ اپنا حاکم نامزد کرے گی۔"

اب شیر خان کے تیور ہی کچھ اور تھے اس نے کہا۔ "میں خوب جانتا ہوں کہ مغلوں سے کس طرح نمٹا جائے۔ میں مغلوں سے پنجہ آزمائی کروں گا اور انہیں باور کرا دوں گا کہ حکومت اس کی ہوتی ہے جس کے دست و بازو میں اسے سنبھالنے کی قوت ہوتی ہے۔"

حمید اس وقت بہت خوش تھا، اس نے شیر خان کی بابت جو رائے قائم کی تھی وہ ہو بہو صحیح ہوتا جا رہا تھا۔

○

آگرے میں بابر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی لاش کو بابر کی وصیت کے مطابق کابل کے تاکستان کے سائے میں دفن کی خاطر روانہ کیا جا چکا تھا۔ کاروبار سلطنت ہمایوں نے سنبھال لیا۔ نصیر الدین ہمایوں نے۔ شیر خان حیران تھا کہ یہ کمزور شخص پورے ہند کے اقتدار کو کس طرح سنبھالے گا۔ شیر خان کی تیز اور دور رس نظریں حالات کا جائزہ لے رہی تھیں، وہ موقع کی تلاش میں تھا جب وہ ہمایوں پر کاری ضرب لگائے گا۔

حمید اس شاطر، چالاک اور عقلمند افغان کے حوصلے اور حسنِ تدبیر کی داد دے رہا تھا۔ اب شیر خان اس پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ جب شیر خان چنار کا حکمران بن گیا تو حمید کی حیثیت میں بھی فرق

آگیا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے شیر خان کی بابت جو سوچا تھا، جو اندازہ لگایا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوتا جا رہا تھا۔ اب جب کہ اس کی حیثیت غیر معمولی ہو گئی تھی، اسے کلثوم یاد آ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر کلثوم کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن جب اسے عثمان علی یاد آتا تو اس کا دل بجھ جاتا۔

جب شیر خان اس کے پاس ہی کہیں ہوتا تو اسے عثمان علی کی قتل والی شرط یاد آ جاتی اور وہ کانپ جاتا۔ وہ سوچتا اتنے عظیم انسان کو کس طرح قتل کیا جا سکتا ہے؟ ایسے موقعوں پر حمید بہت اداس ہو جاتا۔ وہ اکثر آنسو بہاتا رہتا۔ خود شیر خان نے بھی کئی بار اس کو روتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شیر خان سوچتا، شاید حمید کو اپنا خاندان اور خاندان کے مردہ لوگ یاد آتے ہیں اور اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

شیر خان نے ایک دن قصداً اس کے خاندان کا ذکر چھیڑ دیا پوچھا۔ "حمید! کیا یہ سچ ہے کہ تیرے خاندان میں، یعنی تو اپنے خاندان کا واحد زندہ فرد ہے؟"

حمید نے جواب دیا۔ "محترم شیر خان! میں نے کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولا۔"

شیر خان کو اپنا غافل اور لاپروا باپ حسن اور سخت گیر سوتیلی ماں یاد آ گئی۔ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "دوست! تجھ کو تو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ تیرا خاندان تباہ و برباد ہو چکا لیکن میری طرف دیکھ، میری بپتا سن۔ میرا تو باپ بھی موجود تھا۔ میں اس کی موجودگی میں در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ میری ایک سوتیلی ماں تھی جو میرے وجود کو اپنے گھر میں نہیں برداشت کر سکتی تھی۔"

حمید نے کہا۔ "آپ پھر بھی خوش قسمت ہیں اور ایک میں ہی کیا، زمانہ دیکھ رہا ہے کہ خوش قسمتی نے آپ کی انگلی پکڑ لی ہے اور آپ اپنی مطلوبہ منزل کی طرف چل پڑے ہیں مگر میں ۔۔۔ میں، بدقسمتی اب بھی میرے ساتھ ہے۔"

نصف رات بیت چکی تھی۔ ملکہ لاڈو اندرا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن حمید کی پرسوز باتوں نے اسے روک رکھا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شیر خان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ سو گیا۔ حمید اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ پہلے تو اس نے یہ کوشش کی کہ جب تک شیر خان سوتا ہے وہ اس کے پاس بیٹھا اس کی حفاظت کرے لیکن یہاں اچانک اسے عثمان علی یاد آ گیا۔ عثمان علی، کلثوم اس کی ماں اور اس کا بیٹا ابراہیم اور ننھی سی زینب۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے دیکھا عثمان علی اس کے سامنے کھڑا اسے لعنت ملامت کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ "او احمق نوجوان! کس بات کی دیر ہے، شیر خان تیرے سامنے آنکھیں بند کیے پڑا ہے آگے بڑھ اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دے اور میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو شیر خان کو قتل کر دے تو کلثوم کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔"

حمید گھبرا گیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور شیر خان کے سوئے ہوئے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

جب بات قابو سے باہر ہو گئی تو وہ شیر خان کے پاس سے اٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے دور کوہستانی سلسلوں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ وہ پہاڑیوں پر اگے ہوئے درختوں اور سبزے میں چھپے ہوئے پتھروں کے حسن میں کھو گیا لیکن عثمان علی بلائے بے درماں کی طرح یہاں بھی آ گیا اور پوچھا۔ "تب پھر تو نے کیا فیصلہ کیا؟ کیا کلثوم کو کسی اور سے بیاہ دیا جائے؟"

حمید کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "چچا عثمان علی! ذرا انتظار کیجیے۔"

پھر اس نے ماں کو دیکھا۔ ماں قہر آلود نظروں سے سامنے کھڑی کلثوم کو ڈانٹ رہی تھی۔ "لڑکی! یہ تو نے کیا کیا، کہ زندگی بھر انتظار کرنے کا بے ہودہ وعدہ کر لیا۔"

اس نے چشم تصور ہی سے دیکھا، کلثوم کہہ رہی تھی۔ "ماں! میں حمید کا انتظار کروں گی سفید بالوں تک۔"

حمید کو ایسا لگا گویا وہ کلثوم پر بڑا ظلم کر رہا ہے معلوم نہیں کس طرح اس کا دماغ جو بہکا تو وہ غیر ارادی طور پر ایک بار پھر شیر خان کے سرہانے کھڑے ہو کر سوچنے لگا۔ اس نے شیر خان سے کہا۔ "شیر خان! میرے دوست! میں تجھے کس طرح مار سکتا ہوں میں تو مارنا تو رہا ایک طرف، میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

حمید نے دیکھا، شیر خان اچانک بیدار ہو چکا ہے شیر خان نے حمید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں پوچھا۔ "حمید! کیا بات ہے تو رو کیوں رہا ہے؟"

حمید نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "کوئی خاص بات نہیں محترم شیر خان!"

شیر خان نے پوچھا۔ "پھر تو رو کیوں رہا ہے؟"

حمید نے اپنا منہ چھپا لیا۔ "کوئی خاص بات نہیں شیر خان!"

شیر خان نے اس سے کہا۔ "حمید خان! کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں سو گیا تھا؟ نہیں میں سویا نہیں تھا۔ میں نے اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے تجھ کو کچھ عجیب و غریب کیفیات میں مبتلا دیکھا ہے، تو بڑبڑا بھی رہا تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آخر یہ سب کیا ہے اور تو کیا چاہتا ہے؟"

حمید نے جب یہ دیکھا کہ بات کو چھپایا نہیں جا سکتا تو گھ

ایک سڑک پر ٹریفک اکثر جام ہو جاتا تھا۔ وہاں ایک شخص کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اپنا ایک دوست پیدل جاتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اسے آواز دے کر کہا "آؤ، کار میں بیٹھ جاؤ، جہاں کہو گے پہنچا دوں گا۔" اس کے دوست نے انکار میں سر ہلایا۔ "معاف کرنا دوست! مجھے جلدی پہنچنا ہے۔"

بھرا کر جواب دیا: "خان محترم! ہم لوگ آپ سے کیا چھپائیں، میں آپ سے کچھ چھپانا بھی چاہوں تب بھی نہیں چھپا سکتا۔ خانِ محترم! میں نے ایک لڑکی سے محبت کی ہے۔ لڑکی کے چچا نے شادی کے سلسلے میں ایک شرط لگا دی ہے جسے میں کسی صُورت پُورا نہیں کر سکتا۔"

شیر خان نے پُوچھا: "وہ شرط کیا ہے؟"

حمید نے جواب دیا: "افسوس یہ ایک راز کی بات ہے جسے میں نہیں بتا سکتا۔"

شیر خان نے کہا: "میں اس شرط کو جاننے کے لیے اصرار نہیں کروں گا لیکن تو میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھے گا، جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔"

حمید چونک پڑا، بولا: "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ کیا یہ آپ کا قول ہے؟"

شیر خان نے جواب دیا: "ہاں یہ میرا اپنا قول ہے۔"

حمید نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا: "محترم شیر خان! میں آپ کو یہ بتا چکا ہوں کہ میرا تعلق حکمراں لودھی خاندان سے ہے۔ میں ابراہیم لودھی کا بھتیجا ہوں اور اپنی اس خاندانی برتری اور وجاہت کی وجہ سے میں خود کو آپ کی صحبت کے شایانِ شان سمجھتا ہوں۔۔۔"

شیر خاں نے حمید کی بات کاٹ دی، بولا: "بات مختصر کر حمید لودھی! کام زیادہ ہیں اور وقت کم۔"

حمید نے نادم ہو کر پوچھا۔ "محترم شیر خان! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جب آپ کے والد مرحوم نے آپ کو اپنی جاگیر کا داروغہ بنایا تھا تو آپ نے اپنی جاگیر کے بعض شقہ داروں پر ظلم و زیادتی کی تھی، اُن کے خلاف فوج کشی کی تھی اور ان میں سے بعض کو قتل اور کچھ کو زخمی کر دیا تھا۔"

شیر خان نے حمید کو غور سے دیکھا، جواب دیا: "ہاں میں نے ایسا کیا تھا۔ انھوں نے میرے خلاف بغاوت کی تھی، وہ خود مختار ہو گئے تھے، اُن میں ایک شخص تھا عنایت علی۔ یہ اُن سرکشوں کا امیر تھا۔ وہ میرے مقابلے پر آیا اور مارا گیا۔ میں نے اس کی زمین اس کی بیوہ کے پاس رہنے دی۔ میرا خیال ہے عنایت علی کا ایک بھائی عثمان علی بھی تھا۔ عنایت علی کے بعد شاید وہی اس کنبے کا سربراہ بن گیا تھا۔"

حمید اندر سے لرز رہا تھا، اس نے پوچھا: "کیا وہ لوگ آپ سے خوش ہوں گے؟"

شیر خان نے جواب دیا: "میں خوشی اور ناخوشی کی پروا نہیں کرتا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا میرا ضمیر آج تک مطمئن ہے اور پھر زمانے بھر کو خوش وہی شخص رکھ سکتا ہے جو منافق ہو یا ظالم و جابر۔"

حمید چپ ہو گیا، پھر موضوع ہی بدل دیا: "محترم شیر خان! کیا یہ صحیح ہے کہ ہمایوں ہم پر فوج کشی کرنے والا ہے؟"

شیر خان نے کہا: "موضوع نہ بدل، تو نے جس لڑکی سے محبت کی ہے اس کے چچا نے کیا شرط لگا دی ہے؟"

حمید نے لاپروائی سے جواب دیا: "وہ کہتا ہے کہ میں اس کی زمینوں کی دیکھ بھال کروں وہ جنگ و جدل سے نفرت کرتا ہے وہ سپاہیوں کو خونی اور قاتل کہتا ہے۔"

شیر خان نے کہا: "یہ تو بڑی بے ہودہ شرط ہے اس کی۔"

حمید نے کہا: "اس کی اسی بے ہودہ شرط ہی نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

شیر خان نے پوچھا: "لڑکی سے جُدا ہوئے کتنے سال ہو گئے؟"

حمید نے جواب دیا: "تقریباً ساڑھے تین سال۔"

شیر خان نے کہا: "میں نے انتہائی پریشانی اور مایوسی کی حالت میں قرآن پاک سے ایک فال نکالی تھی۔ اس وقت میرے خدا نے میرے سامنے سورۃ الزمر کی یہ آیت کر دی تھی لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔ اس آیت نے میرے حوصلے بلند کر دیے اور میں نے اب تک جتنا بھی عروج حاصل کیا ہے اس کے پیچھے یہی آیت کارفرما ہے۔"

حمید نے کئی بار اس آیت کا ورد کیا اور ایک نیا ولولہ اور ایک نیا حوصلہ محسوس کرنے لگا۔

o

ہمایوں کو شیر خان کے عزائم سے بغاوت کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے شیر خان کو حکم دیا کہ وہ چنار کی حکومت مغل جرنیل میر ہندو بیگ کے حوالے کر دے۔

شیر خان نے انکار کر دیا۔ میر ہندو بیگ، ہمایوں کے پاس واپس چلا گیا اور شیر خان کے جواب سے آگاہ کر دیا۔ اب بات ہمایوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ ہمایوں ایک لاکھ فوج لے کر چنار کی طرف روانہ ہو گیا۔ شیر خان کو ہمایوں کی یلغار کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ پانچ ہزار فوج کے ساتھ قلعے سے نکلا اور چوسا نامی مقام پر دریائے گنگا کے جنوبی کنارے پر خیمہ زن ہو گیا۔ ان دنوں بارشیں بہت زیادہ ہو رہی تھیں۔ ہمایوں کا لشکر کیچڑ اور ندی نالوں کو عبور کرتا ہوا دریائے گنگا کے شمالی کنارے پر خیمے نصب کرنے لگا۔ دونوں لشکر آمنے سامنے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

شیر خان نے ہمایوں کے ٹڈی دل لشکر کو دیکھتے ہوئے

اپنی حفاظت کے لیے خندق کھودنا شروع کر دی۔ اس کام میں اس کے ساتھی بھی ہاتھ بٹا رہے تھے۔ شیر خان نے پھاوڑا سنبھالا اور مزدوروں کی طرح خندق کھودنے لگا۔ جمید نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

دوسری طرف ہمایوں نے اپنا خیمہ ایک اونچی جگہ نصب کرایا اور پل سازی کے ماہرین کو حکم دیا کہ پل تعمیر کریں۔ اسی دوران ہمایوں نے ملا محمد عزیز نامی ایک شخص کو اپنا قاصد بنا کے شیر خان کے پاس روانہ کیا۔ ملا محمد عزیز کسی زمانے میں شیر خان کا دوست رہ چکا تھا۔ جب وہ شیر خانی لشکر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا شیر خان شدید گرمی میں آستینیں چڑھائے خندق کھودنے میں مصروف ہے۔

شیر خان کو اس کے آدمیوں نے ملا عزیز کی آمد کی خبر دی، تو وہ خندق سے باہر نکلا، پانی منگوا کر ہاتھ دھویا اور حکم دیا کہ اس جگہ شامیانہ نصب کیا جائے۔

شامیانہ لگ گیا تو شیر خان وہیں زمین پر بے تکلف بیٹھ گیا اور پوچھا، "کہو کیسے آنا ہوا؟"

ملا عزیز نے جواب دیا، "بادشاہ نے پوچھا ہے کہ شیر خان آخر چاہتا کیا ہے؟"

شیر خان نے کہا، "جتنا مختصر بادشاہ کا سوال ہے اتنا ہی مختصر میرا جواب ہے۔ تم ہمایوں سے کہہ دینا کہ تم خود تو لڑنا چاہتے ہو مگر تمہارا لشکر نہیں لڑنا چاہتا۔ اسی طرح میں خود تو لڑنا نہیں چاہتا مگر میں کیا کروں میرا لشکر لڑنے پر مصر ہے۔"

ملا عزیز نے کہا، "لیکن یہ بات میں خود بادشاہ سے کس طرح کہہ سکتا ہوں؟"

شیر خان نے کہا، "کیوں؟ اس میں قباحت کیا ہے؟ تو بادشاہ کا قاصد ہے۔ بادشاہ نے میرے نام ایک پیغام تجھے دیا۔ تو نے مجھے پہنچا دیا۔ اب میں اس کا جواب دے رہا ہوں وہ بادشاہ کو پہنچا دے۔"

ملا عزیز نے عذر پیش کیا، "شیر خان! آپ میرے دوست رہ چکے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے بے تکلفانہ باتیں کر سکتا ہوں مگر بادشاہ تو بادشاہ ہے میں اس کا دوست کبھی بھی نہیں رہا پھر میں اس سے یہ کس طرح کہوں گا کہ شیر خان نے کہا ہے کہ بادشاہ خود تو لڑنا چاہتا ہے مگر اس کا لشکر نہیں لڑنا چاہتا۔"

شیر خان مسکرانے لگا۔ "نقل کفر، کفر نہ باشد۔ بادشاہ کو اس کے حریف کا صاف صاف جواب پہنچا دینا عین دیانت داری ہے اور اگر بادشاہ میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں کہ وہ حقیقت اور سچائی کو تحمل اور بردباری سے گوارا کرے تو آخر کار ایک نہ ایک دن اسے شاہی سے نیچے آنا پڑے گا۔"

ملا عزیز نے کہا، "دوست! آپ کی نصیحتیں اور عالمانہ باتیں اپنی جگہ۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں آپ کا جواب بادشاہ کے گوش گزار کس طرح کروں؟"

شیر خان نے ملا عزیز کو بادام کا شربت پلایا اور اسے تسلیاں دینے لگا، "تو میرا دوست رہ چکا ہے اس لیے میں تیری یہ مشکل آسان کر دوں گا۔ میں تیرے ساتھ اپنا ایک آدمی کیے دیتا ہوں۔ تجھے جو کچھ تیرے بادشاہ سے کہنا ہے میرا آدمی دلیری سے کہہ دے گا۔"

اس کے بعد شیر خان نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا۔ "شیخ خلیل کو حاضر کیا جائے۔"

کچھ دیر بعد ایک بزرگ کو شیر خان کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا۔ شیر خان نے ان بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ملا عزیز! یہ بزرگ شیخ خلیل بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں۔ انہیں خدا نے بڑی جرأت اور دلیری بخشی ہے۔"

شیر خان شیخ خلیل کو ایک طرف لے گیا اور انہیں کچھ سمجھاتا رہا پھر انہیں ملا عزیز کے ساتھ ہمایوں کے پاس روانہ کر دیا۔

شیخ خلیل نے ہمایوں کو صاف صاف بتا دیا، "جناب والا! شیر خان میرا ولی نعمت بنگلے کے سوا کسی اور علاقے سے سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ وہاں بھی خطبہ اور سکہ بادشاہ کے نام ہی کا برقرار رکھا جائے گا۔ اس عہد کے لیے شیر خان قسم کھانے کو بھی تیار ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا، "کیا شیر خان واقعی جنگ نہیں چاہتا؟"

شیخ خلیل نے کہا، "بیشک شیر خان جنگ سے نفرت کرتا ہے۔"

بادشاہ نے کہا، "میں خود بھی جنگ سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ جنگ جانوں کو ہلاک، املاک کو برباد، خاندانوں کو نابود اور منتشر اور کاروبار کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ اگر شیر خان بنگلے پر اسی طرح قابض رہنا چاہتا ہے کہ وہاں خطبہ اور سکہ میرے نام کا رہے گا تو مجھے اس کی یہ شرط منظور ہے۔"

شیخ خلیل نے پوچھا، "پھر میں اپنے ولی نعمت سے کیا کہہ دوں؟"

بادشاہ نے جواب دیا، "شیر خان سے کہہ دیجیے کہ مجھے اس کی یہ بات پسند آئی۔ وہ بنگلے پر مغل سلطنت کے نمائندے کی حیثیت سے حکومت کرے اور وہاں سکہ اور خطبہ میرے ہی نام کا برقرار رہے۔ میں خوش ہمہ خدا خوش۔"

ہمایوں جنگ سے تنگ آیا ہوا تھا اس نے شیر خان کی بات مان لی تھی، وہ مطمئن ہو چکا تھا۔

جب شیخ خلیل نے بادشاہ کی رضامندی کی خوش خبری شیر خان کو سنائی تو جمید نے پوچھا، "محترم شیر خان! کیا جنگ کے بادل چھٹ گئے؟ کیا آپ دونوں میں صلح ہو گئی؟"

شیر خان مسکرایا۔ بولا۔ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔"

رات کا پہر، دریا کی طرف سے سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی۔ مینڈکوں اور جھینگروں کی ملی جلی آوازوں نے رات کے سناٹے کو توڑ دیا تھا۔ اس سناٹے میں شیر خان نے اپنی فوج کو تیار کیا اور پل کر عبور کر گیا۔ شیر خان کا مشہور جرنیل خواص خان فوج کے معتد بہ حصے کے ساتھ شبخون مارنے آگے بڑھا۔ حمید شیر خان کے ساتھ تھا اور وہ شیر خان کی عہد شکنی سے خوش نہیں تھا۔

خواص خان نے ہمایوں کے غافل اور سوئے ہوئے لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہر طرف شور و غل برپا ہو گیا۔

ہمایوں سوتے سے بیدار ہو گیا، پوچھا۔ "یہ شور و غل کیسا ہے؟"

بادشاہ کے خدمت گاروں نے مطلع کیا۔ "جہاں پناہ! شیر خان نے عہد شکنی کی ہے اور اس نے ہماری سپاہ پر شب خون مارا اور اس کے سپاہی حضور کی تلاش میں ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔"

ہمایوں گھبرا گیا، وہ اپنے بالائی خیمے میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اس نے وضو کیا اور اپنے سرداروں سے کہا۔ "میں وضو کر کے نماز پڑھوں گا اور اس دوران تم سب شیر خانی لشکر سے نبرد آزما ہو جاؤ۔"

مغل سپاہ افغانوں سے گتھم گتھا ہو چکی تھی چند سردار بادشاہ کے خیمے میں داخل ہوئے اور وہاں سے اس افواہ کی تصدیق کرنی چاہی کہ بادشاہ اپنی سپاہ کو افغانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کہیں فرار ہو چکا ہے۔ انھیں بادشاہ نشیبی خیمے میں نہیں ملا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی ان کی ہمتیں جواب دے گئیں ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔

شیر خان نے حکم دیا۔ "پل کو توڑ دیا جائے۔"

پل توڑ دیا گیا۔ شیر خان بادشاہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

بادشاہ نے بوکھلاہٹ میں اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ گھوڑا دریا میں ڈبکیاں کھانے لگا۔ اسی عالم میں نظام نامی ایک شخص چمڑے کی مشک لیے بادشاہ کے پاس پہنچا اور اس مشک کے سہارے بادشاہ کو دوسرے کنارے پہنچایا۔ ہمایوں آگرے کی طرف بھاگا۔ شیر خان کے جرنیل خواص خان نے اس کا پیچھا کیا۔

ہمایوں آگرے سے فوج لے کر پھر پلٹا اور اس بار قنوج کے قریب معرکہ کارزار گرم ہوا۔ شیر خان نے پھر شکست دی۔ اور ہمایوں فرار ہو کر لاہور چلا گیا۔ شیر خان نے آگرے پر قبضہ کر لیا اور ہمایوں کے تعاقب میں لاہور روانہ ہو گیا۔ ہمایوں نے شیر خان کے تعاقب کی خبر سنی تو لاہور بھی چھوڑ دیا اور سندھ کی طرف فرار ہو گیا۔

"**ابو**! کیا ایڈیسن نے سب سے پہلے بولنے والی مشین بنائی تھی؟"

"نہیں بیٹا۔ سب سے پہلے بولنے والی مشین تو اللہ میاں نے بنائی ہے ایڈیسن نے تو ایسی مشین بنائی ہے جسے حسب ضرورت خاموش بھی کیا جا سکتا ہے۔"

•••

ماں نے بیٹے کو سمجھایا۔ "میری خواہش ہے کہ تم ایک اچھے بچے بنو۔"

بیٹے نے کہا۔ "اگر آپ مجھے دس روپے دیں تو میں اچھا بچہ بن سکتا ہوں۔"

"کیا تم اپنے ابو کے نقش قدم پر نہیں چل سکتے؟" ماں نے دریافت کیا۔ پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اپنے ابو کی طرح مفت میں اچھا بننا سیکھو۔"

اب شیر خان شیر شاہ بن چکا تھا۔ حمید کی خوشی کی انتہا نہ رہی وہ اب بھی شیر شاہ کے قریب تھا لیکن شیر شاہ کی غیر معمولی مصروفیات نے دونوں کے درمیان ایک فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔

اسی دوران ٹانڈے کا ایک شخص حمید کو تلاش کرتا ہوا آگرے پہنچا، اور اس نے حمید کو یہ منحوس خبر سنائی کہ کلثوم کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے اور عثمان علی نے اپنی شرط یاد دلائی ہے۔

حمید کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس نے پوچھا۔ "کسی نے کوئی خط بھی دیا ہے یا ساری باتیں زبانی ہی کہلا دی گئی ہیں؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "خط تو کسی نے بھی نہیں دیا لیکن وہ سب تمہارا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔"

حمید کا دل ٹانڈہ جانے کے لیے تڑپنے لگا، بولا۔ "میں عنقریب ٹانڈے جاؤں گا مگر میں شیر خان کا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس شخص نے حمید کے کان میں کہا۔ "میں یہاں ملازمت کی تلاش میں آیا ہوں کیا تم مجھے شیر خان کے ذاتی خدمت گاروں میں ملازمت دلوا سکتے ہو؟"

حمید کا ماتھا ٹھنکا، بولا۔ "نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا، اور یوں بھی شیر خان کسی پر اعتماد مشکل ہی کرتا ہے۔"

اس شخص نے کہا۔ "ٹھیک ہے پھر میں خود ہی کوشش کروں گا۔"

حمید نے اس کا دل ٹٹولا، پوچھا۔ "پھر تم واپس کب جاؤ گے؟"

اس نے جواب دیا۔ "کچھ پتہ نہیں جب بھی میرا کام ہو جائے گا۔ چلا جاؤں گا۔"

حمید نے کہا، "تم جب بھی ٹانڈے واپس جاؤ، چچا عثمان علی سے کہہ دینا کہ اب وہ کلثوم کی شادی کسی سے بھی کر سکتے ہیں۔"
اس شخص کے چہرے پر رونق آ گئی، بولا، "تو کیا تم کلثوم سے دستبردار ہو گئے؟"
حمید نے جواب دیا، "ہاں کیونکہ میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ چچا عثمان کی شرط پوری کروں۔"
وہ شخص ہنسنے لگا، بولا، "تو گویا انگور کھٹے ہیں۔"
حمید نے جواب دیا، "یہی سمجھ لو۔"
اس شخص نے حمید کے کاندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا، بولا، "دوست! اب پھر ایک کام کرو۔ جس کام کی تم اپنے آپ میں ہمت نہیں پاتے ہو، میں اس کے لیے خود کو مستعد اور اہل محسوس کر رہا ہوں۔ تم نے کلثوم سے دستبرداری اختیار کی اور میں کلثوم کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم اگر چاہو تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔"
حمید نے جواب دیا، "افسوس کہ میں وہ کام نہیں کر سکتا۔"
اس شخص نے کہا، "اچھا پھر تم خاموش رہو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔"
حمید نے افسوس کا اظہار کیا، "افسوس! ایک لڑکی کی محبت نے تجھے اتنا اندھا اور بہرا کر دیا ہے کہ تو افغان قوم کے ایک ایسے محسن کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔ تو نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ جو کام میں خود نہیں کرنا چاہتا، تجھ کو کرنے دوں گا۔ اب تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو یہاں سے چلا جا ورنہ میں تجھ کو گرفتار کرا دوں گا۔"
وہ شخص ناراض ہو کر چلا گیا۔

❖

شیر شاہ بادشاہ بننے کے بعد بہت زیادہ مصروف ہو گیا۔ اس نے رفاہِ عامہ کے بہت سارے کام کیے۔ ایک طرف تو وہ اپنی سلطنت کی حدود بڑھا رہا تھا اور دوسری طرف سڑکیں اور سرائیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ ایک سڑک پشاور سے شروع ہوتی اور بنگال کے سونار گاؤں تک چلی گئی۔ دوسری لاہور سے ملتان، تیسری آگرے سے جودھپور اور چتوڑ تک اور چوتھی آگرے سے برہان پور تک۔ سڑک کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے اور سترہ سو سرائیں تعمیر کرائیں۔ ان میں قافلے اور مسافر قیام کرتے۔ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کے رہائش اور خوراک کے لیے الگ الگ انتظام تھا۔ ہر سرائے کے ساتھ ایک کنواں اور ایک پختہ مسجد موجود تھی، ایک موذن اور ایک امام بھی۔ اور ایک پولیس افسر بھی۔ شاہی ڈاک کے لیے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو گھوڑے بھی موجود رہتے تھے۔

شیر شاہ کی زندگی میں سکون نام کی کوئی چیز بھی نہ تھی۔ وہ اپنے حصے کا کام جلد از جلد کر ڈالنا چاہتا تھا، جیسے کوئی اس کے کان میں کہہ رہا تھا کہ شیر شاہ وقت کم ہے اور کام زیادہ ـــــ وہ بجلی کی طرح چاروں طرف کوند رہا تھا۔
حمید نے جب دیکھا کہ شیر شاہ سے ملاقات دشوار بات ہے تو وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ٹانڈے چلا گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان دنوں چچا عثمان علی گھر میں نہیں تھے۔ ربیع کی فصل تیار کھڑی تھی۔ چچا عثمان علی اپنی زمینوں پر تھے۔ حمید کے پہنچتے ہی گھر میں رونق سی دوڑ گئی۔ گھر میں کلثوم اور زینب کے علاوہ ایک بڑی بی بھی رہ رہی تھیں۔ ابراہیم اپنے چچا عثمان علی کے ساتھ زمینوں میں گیا ہوا تھا۔
کلثوم اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس کی دیکھا دیکھی زینب بھی رونے لگی۔ حمید نے دونوں کی پشت تھپتھپائی اور انہیں تسلیاں دینے لگا۔ "کلثوم! افسوس! کہ تم دونوں اپنی ماں کے غم کو آسانی نہیں بھلا سکیں۔ یہی حال میرا بھی ہے میں تم دونوں کے غم کو اپنے دل پر براہ راست محسوس کرتا رہتا ہوں۔"
کلثوم نے کہا، "میں تو کہیں کی بھی نہیں رہی۔ چچا عثمان طعنے دیا کرتے ہیں اور بھائی ابراہیم کبھی کبھی طنزاً کہہ دیتے ہیں کہ عشق شرفا کے لیے ننگ ہے۔"
حمید نے جواب دیا، "جس کی جتنی عقل ہوتی ہے وہ بات بھی اتنی ہی کرتا ہے۔" پھر پوچھا، "کلثوم! یہ تو بتا ماں کو بیماری کیا تھی؟"
کلثوم نے ایک سرد آہ بھری، جواب دیا، "یہ کہ وہ مجھے دلہن بنا ہوا نہیں دیکھ سکیں گی اور تم انہیں دھوکا دے گئے۔"
حمید کی پیشانی پر بیزاری کی شکنیں پڑ گئیں، بولا، "کلثوم! میں جنگوں میں بری طرح الجھ گیا تھا لیکن اس کے باوجود میں تجھ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں نے تجھے ہر جگہ اور ہر دن یاد کیا ہے۔"
قریب ہی کھڑی ہوئی زینب نے ان کی باتوں میں مداخلت کی، بولی، "میں تو باجی سے ہمیشہ یہ کہا کرتی تھی کہ آپ کی ہچکیوں کا یہ مطلب ہے کہ آپ انہیں باجی کو یاد کرتے ہیں۔"
حمید نے کنکھیوں سے کلثوم کی طرف دیکھا، بولا، "کلثوم! تجھ سے بچھڑ کر میں کہیں کا بھی نہیں رہ گیا تھا۔۔۔۔"
کلثوم نے جواب دیا، "آپ مرد ہیں، آپ کی اس قسم کی مصروفیات ہوتی ہیں، آپ اپنا غم غلط کر سکتے ہیں مگر لڑکیاں اور عورتیں۔ یہ کہاں جائیں۔ گھر کی دیواریں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں اور چھتیں بیتے دنوں کی یاد دلاتی ہیں۔ لوگ اور زیادہ مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔"
حمید نے بڑی بی کی طرف اشارہ کیا، "یہ کون ہیں؟"

کلثوم نے جواب دیا۔ "ہماری رشتے کی پھوپھی۔ گھر میں کسی بوڑھے کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔"

حمید نے پوچھا۔ "چچا عثمان علی کا کیا حال ہے؟ وہ کیا کہتے رہتے ہیں؟"

کلثوم نے جواب دیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کس طرح بدلا جائے۔ وہ شیر خان سے آج بھی اتنی ہی نفرت کرتے ہیں جتنی دس بارہ سال پہلے کیا کرتے تھے۔ شیر خان کی کامیابیاں انھیں کانٹوں پر لٹا رہی ہیں۔"

حمید نے کہا۔ "اب ان حالات میں کلثوم تو خود ہی بتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور یہ تو طے ہے کہ میں شیر شاہ کو نہیں مار سکتا۔"

کلثوم نے جواب دیا۔ "میری تو قسمت ہی بری ہے، میں کیا مشورہ دوں؟"

حمید نے کلثوم کو چھیڑا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ میری عدم موجودگی میں تیرا ایک اور عاشق بھی پیدا ہو چکا ہے؟"

کلثوم نے ڈبڈبائی آنکھوں سے حمید کی طرف دیکھا۔ "آپ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ ایسے دس عاشق بھی میرے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کر سکتے۔"

حمید نے کلثوم کے آنسو اپنے دامن پر لے لیے۔ بولا۔ "ارے پگلی میں تو یوں ہی ازراہ مذاق پوچھ رہا تھا۔"

کلثوم نے کہا۔ "حمید! میرا دل بہت دکھی ہے۔ باتوں کی چوٹیں میرے دل میں ناسور پیدا کر سکتی ہیں۔"

حمید نے کہا۔ "میری توبہ۔ اب میں ایسی باتیں نہیں کروں گا۔ بس ایک سوال اور کروں گا۔ تو نے جس شخص کو میرے پاس بھیجا تھا ماں کے انتقال کی خبر دے کر، وہ کون تھا؟"

کلثوم نے سوالیہ نظروں سے حمید کو دیکھا اور پوچھا۔ "وہ کچھ کہتا تھا؟"

حمید نے جواب دیا۔ "وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے چچا عثمان علی کی شرط کے بارے میں کیا سوچا۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ آگرے سے اس لیے پہنچا ہے کہ وہاں کسی طرح شیر شاہ کا قرب حاصل کرے اور پھر اس کا کام تمام کر کے تجھ کو تیرے چچا سے حاصل کر لے۔"

کلثوم نے کہا۔ "لیکن ایسا ہو گا نہیں۔ اب میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی جو ہونا تھا ہو گیا۔"

حمید نے کہا۔ "اچھا، اب باتیں ختم۔ میں اس گھر میں چند دن سکون سے رہنا چاہتا ہوں۔"

کلثوم اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ محض تعزیت کرنے یا آمد کا کوئی اور بھی مقصد ہے؟ اور یہ کہ اس نے کلثوم کی بابت کیا سوچا؟ لیکن وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی وہ سارے سوالات کر سکتی تھی مگر صرف اس لیے نہیں کر سکتی کہ کہیں ان سوالوں کے جوابات سے اس کا دل اور زیادہ زخمی نہ ہو جائے اور وہ جن باتوں کو سننا نہیں چاہتی حمید کی زبان سے وہی باتیں نہ نکل جائیں۔

حمید نے غسل کیا، کپڑے بدلے، کھانا کھایا اور سو گیا۔ اس گھر میں اس کو جتنی چین کی نیند آئی تھی وہ برسوں سے اس کو ترستا رہا تھا۔ رشتے کی پھوپھی اس نوجوان کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ انھوں نے ان دونوں کی باتیں بڑی دل چسپی سے سنیں۔ وہ حمید سے کہہ دینا چاہتی تھیں کہ جب تک بھائی عثمان علی کھیتوں سے واپس نہ آ جائیں حمید کہیں اور رہے لیکن وہ ہمت نہیں کر سکیں۔ انھوں نے دیکھا کلثوم نے حمید کی ہر بات کا اسی طرح خیال رکھا ہے جس طرح کوئی بیوی اپنے شوہر کا رکھتی ہے۔ انھیں اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ اگر انھوں نے حمید کو کچھ کہا تو کلثوم ہی مداخلت کر بیٹھے گی اور وہ حمید کے سلسلے میں اپنی پھوپھی کی کوئی بات بھی نہیں مانے گی۔

حمید نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سو گیا۔ کلثوم کھانا پکانے لگی۔ پھوپھی نے اس دن جیسا اہتمام کبھی پہلے اس گھر میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر کڑھ رہی تھیں۔ آخر جب ان سے رہا نہیں گیا تو باورچی خانے میں کلثوم کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں، اور پوچھا۔ "کلثوم! یہ نوجوان کون ہے؟"

کلثوم نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "حمید! وہ اس گھر میں والدہ مرحومہ کی زندگی میں بھی رہ چکا ہے۔ اس کے علاوہ یہی وہ نوجوان ہے جس نے ہمارے پورے کنبے کو ہلاک ہونے سے بچا لیا تھا۔"

"لڑکیوں کو یہ بات خاص طور سے یاد رکھنا چاہیے کہ عشق و محبت کے شعلوں سے کھانا نہیں پکایا جا سکتا۔"

آج کی لڑکیاں وہ پردہ پسند کرتی ہیں جو مرد کی عقل پر پڑا ہو۔

رخسانہ: "تم نے اس نوجوان اور خوب صورت لڑکی کو دیکھا؟ وہ مسلسل مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پہلی مرتبہ جب میں نے تمھیں دیکھا تھا تو بے اختیار میرا قہقہہ نکل گیا تھا۔"

"مجھ سے کئی مرتبہ کہا جا چکا ہے کہ میں شادی کر لوں۔"

"کس نے کہا ہے؟"

"ابو اور امی نے!"

پھوپھی نے پوچھا: "بھائی عثمان علی کا اس نوجوان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کلثوم نے جواب دیا: "پھوپھی جان! وہ حمید سے ناراض رہتے ہیں۔"

پھوپھی کو ایک نکتہ مل گیا، بولیں: "کلثوم! تو نے جس طرح اس نوجوان کو اپنے گھر میں جگہ دی ہے شریفوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر تو میری بات مانے تو میں تجھے مشورہ دوں۔"

کلثوم نے کہا: "دیجیے مشورہ۔"

پھوپھی نے کہا: "تو اس نوجوان کو آج ہی اس گھر سے رخصت کر دے۔ میں ڈرتی ہوں اگر اس کی موجودگی ہی میں چچا عثمان علی واپس تشریف لے آئے تو کیا ہوگا، وہ میری تو بری طرح خبر لیں گے۔"

کلثوم نے جواب دیا: "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔"

پھوپھی نے کہا: "تو اس نوجوان کو چند دنوں کے لیے کہیں اور بھیج دے۔ اس طرح آپس کی محبتیں برقرار رہتی ہیں۔"

کلثوم نے جواب دیا: "پھوپھی جان! جہاں تک محبت کا سوال ہے یہ ہر حال میں بحال رہتی ہے افسوس کہ میں حمید کو کہیں اور نہیں جانے دوں گی۔ وہ جب تک ٹانڈے میں ہے اسی گھر میں رہے گا۔"

پھوپھی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے: "پھر میں کیا جواب دوں گی تیرے چچا کو؟"

کلثوم نے جواب دیا: "آپ کو جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں، میں خود جواب دے لوں گی۔"

پھوپھی بڑبڑانے لگیں: "بھائی عثمان علی آ جائیں تو میں ان سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ میں اس گھر میں نہیں رہوں گی جس گھر میں بڑوں کا ادب نہ ہو بڑے کس طرح رہیں گے؟"

کلثوم پھوپھی کی بڑبڑاہٹ سنتی رہی، اس نے پھوپھی کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کیونکہ وہ بات کو زیادہ نہیں بڑھانا چاہتی تھی۔

حمید نے آٹھ دن یوں گزار دیے کہ ان دونوں کو وقت کا کوئی احساس ہی نہ ہوا۔ ان دونوں کے قہقہوں سے گھر گونجتا رہا۔ زینب بھی بہت خوش رہتی تھی، بس ایک پھوپھی تھیں جن کا منہ سوجا رہتا تھا۔ اس دوران کلثوم نے ایک بار بھی حمید سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ واپس کب جائے گا۔ اس سوال سے اس کی روح ہی خشک ہوتی تھی۔ دوسری طرف حمید کا یہ حال تھا کہ وہ جلد از جلد شیر شاہ کے پاس واپس جانا تھا مگر کلثوم کی محبت نے اس کے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ کہہ دے: "کلثوم! میں جا رہا ہوں" مگر کہہ نہیں سکا۔ اتنی سی بات کہنے کے لیے جتنی ہمت اور حوصلہ درکار تھا، اس سے وہ محروم تھا۔

جو بات کلثوم اور حمید نہیں کر سکتے تھے، زینب نے کہہ دی۔ اس نے ناشتے کے دوران حمید سے پوچھا: "حمید بھائی! اب آپ واپس تو نہیں جائیں گے؟"

زینب کے اس سوال نے دونوں کی دھڑکنیں تیز کر دیں، پھوپھی کے چہرے پر تازگی پیدا ہو گئی۔ وہ اس سوال کا جواب سننے کے لیے ان تینوں کے قریب جا بیٹھیں۔

حمید نے کلثوم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: "زینب! فی الحال تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔"

زینب نے پوچھا: "کب؟"

حمید نے جواب دیا: "میں تو یہاں تعزیت کرنے آیا تھا۔ میں نے یہاں آنے کی شیر شاہ سے اجازت بھی نہیں لی، وہ تو میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

اس بار کلثوم نے کہا: "انتظار تو کسی نہ کسی کو ہونا ہی ہے، میں کہتی ہوں اب جنگ و جدل کی زندگی چھوڑ دیجیے اور یہاں روکھی سوکھی جو میسر ہے اسی پر قناعت کیجیے۔"

حمید نے جواب دیا: "کلثوم! اگر میں ایسا چاہوں بھی تو کیا ممکن ہے۔ چچا عثمان سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اپنی شرط یاد دلاتے رہیں گے۔ میں اس کا کیا علاج کروں گا؟"

کلثوم نے کہا: "آپ تو اس شرط سے بے بس ہو گئے۔ لیکن میں بے بس نہیں ہوں چچا عثمان علی کو میں خود جواب دے لوں گی۔"

حمید نے کہا: "اس کے باوجود مجھے ایک بار تو شیر شاہ کے پاس جانا ہی پڑے گا۔"

کلثوم اداس ہو گئی: "آپ کو شیر خان مجھ سے زیادہ عزیز ہے شاید۔"

حمید نے جواب دیا: "بات یہ نہیں ہے کلثوم! میں شیر شاہ کا دوست ہوں، ملازم ہوں، ہم دونوں نے ایک ساتھ کئی سال گزارے ہیں۔ میں یہاں اس سے مل کر نہیں آیا۔ میں اس سے ایک بار، بلکہ آخری بار ضرور ملوں گا اس کے بعد تیرے پاس چلا آؤں گا۔"

کلثوم نے پوچھا: "پھر کب جائیں گے اپنے ولی نعمت شیر شاہ کے پاس؟"

حمید نے کلثوم کے لہجے میں گہرا طنز محسوس کیا، اسے کلثوم پر رحم بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی، اس نے کہا: "کلثوم! مجھے بات چیت میں طنز اور استہزا ذرا بھی پسند نہیں، میں جانتا ہوں کہ شیر شاہ نے تم لوگوں کو دکھ پہنچایا ہے اور تمہارے دلوں پر ایک ایسا زخم لگایا ہے جو شاید کبھی بھی مندمل نہ ہو سکے لیکن اس کے باوجود وہ میرا ولی نعمت ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں، والہانہ محبت، جس کی سرحدیں عقیدت سے ملی ہوئی ہیں۔"

کلثوم نے کوئی جواب دیے بغیر حمید کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن زمینوں پر سے کلثوم کا بھائی ابراہیم واپس آ گیا۔ منجھ کٹا ابراہیم۔ اس نے اپنی بہن کلثوم کو بتایا کہ چچا تین دن

بعد واپس آئیں گے۔ پھر جب اس نے حمید کو اپنے گھر میں آزادانہ چلتے پھرتے دیکھا تو اُس کے مزاج میں درشتگی آگئی۔ حمید نے اس کو سلام کیا مگر ابراہیم نے اس کو جواب نہیں دیا وہ حمید کو دیکھتا ہوا اپنی کلثوم کے پاس چلا گیا۔ کلثوم اس وقت کپڑے دھو رہی تھی۔ ابراہیم نے تیوریوں پر بل ڈال رکھے تھے۔ اُس نے پوچھا: "کلثوم! یہ کب آیا تھا؟"

کلثوم نے جواب دیا: "آٹھ دس دن ہوئے، کیوں؟"

ابراہیم نے کہا: "جب گھر میں کوئی مرد نہیں تھا تو اسے ٹھہرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

کلثوم کپڑے دھونا بھول گئی۔ حیرت سے بھائی کو دیکھ کر پوچھا۔ "یہ آپ بول رہے ہیں یا چچا عثمان علی؟"

ابراہیم نے جواب دیا: "یہ میں بول رہا ہوں لیکن چچا عثمان علی بھی اس شخص کو گھر میں دیکھ کر یہی سوال کرتے۔"

کلثوم نے کہا: "تم لوگ احسان فراموش ہو۔ جب ہم لوگ ٹانٹے کے شعقہ دار کی بزریت کے بعد جان بچانے کی خاطر یہاں سے بھاگ رہے تھے اگر اس دن اس نوجوان نے ہمارا ساتھ نہ دیا ہوتا تو نہ یہ گھر ہوتا نہ ہم لوگ۔ آپ لوگوں نے اتنی جلدی اس احسان کو بھلا دیا۔"

ابراہیم کو کچھ شرم سی محسوس ہوئی۔ بولا: "کلثوم! میں کیا کروں چچا عثمان علی کی ضد نے مجھے بھی مجبور کر رکھا ہے، اب اگر ان کی بات نہ مانی جائے تو ہماری سرپرستی کون کرے گا؟"

کلثوم نے جواب دیا: "اب ہم لوگ بچے نہیں رہے، اپنے اچھے برے کی تمیز بھی ہے۔"

ابراہیم نے کہا: "پھر بھی چچا عثمان علی ہی ہمارے بزرگ ہیں۔ ہمیں اُن کی بات تو ماننی ہی پڑے گی اور وہ اس نوجوان کو بالکل پسند نہیں کرتے اور اگر نوجوان حمید چچا حمید کی بات مان لے تو اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ملیں گے اور یہ ہمیں غیر نہیں پائیں گے۔"

کلثوم نے کہا: "آپ حمید سے کوئی بات نہیں کریں گے بھائی! میں چچا عثمان علی کا انتظار کر رہی ہوں اور جو باتیں آپ یا حمید نہیں کر سکتے، میں کروں گی۔" بولتے بولتے وہ خاموش ہو گئی۔ پھر کچھ دیر بعد پھر بولنے لگی: "چچا عثمان علی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ جن زمینوں سے روزی کما رہے ہیں وہ شیر خان ہی کی عطا کردہ ہیں اور پھر یہ بات کسے نہیں معلوم کہ میری ماں حمید کو پسند کرتی تھیں۔"

ابراہیم کی نفرت میں کچھ کمی واقع ہو گئی۔ بہن کے دلائل نے اسے مرعوب کر دیا تھا۔

رات کو ابراہیم نے حمید کو کھانے پر پکڑ لیا۔ وہ بہت خوشگوار کیفیت میں تھا۔ حمید سے پوچھا: "کیا بات ہے بھائی حمید! کیا تم بھی مجھ سے ناراض ہو؟"

حمید نے جواب دیا: "میں کسی سے ناراض نہیں ہو سکتا۔" اُن

شگفتہ

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"یہ میری اور تمہاری دوسری ملاقات ہے۔ اتنے اہم فیصلے اتنی مختصر سی واقفیت میں نہیں کیے جاتے۔"

"میری واقفیت مختصر نہیں، بہت پرانی ہے۔ میں پچھلے پانچ سال سے اسی بینک میں ملازمت کر رہا ہوں، جس میں تمہارا اور تمہارے ابو کا اکاؤنٹ ہے۔"



دونوں کے پاس کلثوم بھی آگئی۔

کلثوم نے کہا: "تب پھر آپ میری مدد کریں اور چچا عثمان علی کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔"

حمید نے جواب دیا: "چچا عثمان علی کو میں کیسے راضی کر سکتا ہوں!"

کلثوم نے کہا: "میرے مخاطب آپ نہیں بھائی ابراہیم ہیں۔"

ابراہیم نے کہا: "شیر خان سے میں بھی نفرت کرتا ہوں، لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس نفرت کے سہارے نہ تو زندہ رہا جا سکتا ہے اور نہ ہی خوشگوار زندگی گزاری جا سکتی ہے۔"

کلثوم کو اپنے بھائی میں اتنی نمایاں تبدیلی حیران کر رہی تھی وہ پھولی نہیں سما رہی تھی۔

ابراہیم نے پوچھا: "آپ کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں یہاں؟"

حمید نے جواب دیا: "عارضی طور پر نہیں، تعزیت کرنے آیا تھا۔ اب میں اس لیے واپس جانا چاہتا ہوں کہ اپنے مربی اور محسن کی خدمت کروں گا واپس آکر۔"

ابراہیم نے کہا: "بھائی حمید! یہ کیا کہہ دیا آپ نے کہ مربی اور محسن، ہمارے گھر میں آپ کا محسن تو کوئی بھی نہیں، ہاں آپ کے احسانات ہم پر ضرور ہیں۔"

حمید نے جواب دیا: "میں نے آپ لوگوں کو اس لیے محسن کہا تھا کہ آپ نے مجھے اپنے گھر میں رکھا تھا۔ ایک طرح سے میری خدمت کی تھی۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کا میں احسان مند ہمیشہ ہی رہوں گا۔"

کلثوم نے کہا: "آپ ایسی باتیں نہ کیجیے۔"

ابراہیم نے کہا: "اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چچا عثمان علی کو بدل کے رہوں گا۔"

رات کا کھانا ان سب نے ایک ہی دسترخوان پر کھایا۔ زینب ایک کی صورت دیکھتی اور اُن کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتی مگر اس کے کچھ پلے نہ پڑتا۔

دوسرے دن علی الصبح کسی نے دروازے پیٹنے شروع کر دیے۔ ابراہیم نے دروازہ کھولا اور یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ چچا عثمان علی

اس کے سامنے کھڑے ہیں، اُس نے حیرت سے کہا۔ "چچا آپ!"

چچا نے قہر اور طنز کی نظروں سے ابراہیم کو دیکھا اور پوچھا۔

"میری آمد نے تجھے حیران کیوں کر دیا؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "آپ نے کئی دن بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔"

چچا عثمان علی پوچھا۔ "وہ ہے یا چلا گیا؟"

ابراہیم چچا کے سوال کا مفہوم سمجھ چکا تھا مگر پھر بھی تجاہل سے کام لیا، پوچھا۔ "وہ کون؟"

چچا کو غصہ آ گیا، بولے۔ "خوب! تو گویا تو 'وہ' کا مطلب نہیں سمجھا۔"

ابراہیم اپنی بات پر اڑا رہا، بولا۔ "چچا! آپ تھکے ہوئے نظر آتے ہیں، جائیں غسل کریں کپڑے بدلیں۔"

چچا نے کوئی جواب دیے بغیر اندر جا کر بوتلی رکھی اور خود مصلے بچھا کر نماز ادا کی۔ اتنی دیر میں گھر کے سارے ہی افراد جاگ چکے تھے۔

چچا عثمان علی نے اچانک پھوپھی کے بارے میں پوچھ لیا۔ "اور تیری پھوپھی کہاں چلی گئیں؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "اپنے کمرے میں ہوں گی۔"

چچا نے اُن کے کمرے کی طرف جائزے کی نظریں ڈالیں اور پوچھا۔ "تو نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کب کا آیا ہوا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "جب میں یہاں آیا تھا تو حمید گھر میں موجود تھا، پوچھنے پر معلوم ہوا آٹھ دس دن کا آیا ہوا ہے۔"

چچا عثمان علی بڑبڑانے لگا۔ "میری کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں، مگر میں پھر بھی شیر خان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ میں اگر چاہوں تو بھی اس نفرت کو ختم نہیں کر سکتا۔ جس نے میرے عنایت علی کو مقتول کر دیا تھا۔"

اس کے بعد وہ پھوپھی کے کمرے میں چلے گئے۔ انھوں نے کسی تمہید کے بغیر صاف صاف بات کی۔ "یہ کب کا آیا ہوا ہے؟"

پھوپھی نے چچا عثمان علی کو دیکھا تو ان کے چہرے پر شگفتگی سی پیدا ہو گئی۔ پوچھا۔ "تم کب آئے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "ابھی ابھی بس چلا آ رہا ہوں۔"

پھوپھی ایک دم اداس ہو گئیں، بولیں۔ "اچھا ہوا جو تم آ گئے ورنہ میں تو اس گھر سے اکتا گئی تھی۔ میں عاجز آئی ہوئی تھی۔"

چچا عثمان علی نے بے چینی اور غصے سے کہا۔ "کیا بات تھی؟"

پھوپھی نے کہا۔ "عثمان علی کیا قیامت قریب ہے؟ جو لڑکیوں سے حیا اٹھتی جا رہی ہے۔"

چچا عثمان علی نے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہوئی؟ کچھ بتائیں تو سہی۔"

پھوپھی نے پوچھا۔ "یہ نوجوان کون ہے؟ اپنے خاندان سے تو ہے نہیں۔"

چچا عثمان علی سب کچھ سمجھ گئے تھے مگر کام تجاہل سے لیے جا رہے تھے، کہا۔ "یہ اپنے خاندان کا نہیں ہے مگر یہ یہاں کیوں ٹھہرا۔"

پھوپھی نے جواب دیا۔ "میں تو اس پر ناراض ہوئی تھی مگر جب کلثوم نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا تو میں مجبور ہو گئی اور چپ سادھ لی۔"

چچا عثمان نے بگڑ کر کہا۔ "میں نے آپ کو اس گھر میں اس لیے چھوڑا تھا کہ آپ ان سب کی بزرگ بن کر رہیں گی مگر آپ نے بچوں کا کردار ادا کیا، آپ کو ایسا نہیں کرنا تھا۔"

پھوپھی تیوریاں چڑھا کر کھڑی ہو گئیں۔ "عثمان علی! تم مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے، جو کچھ کہنا سننا ہے گھر والوں سے کہو۔ میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی مگر جب میں نے کلثوم کے تیور میں یہ محسوس کیا کہ وہ اس گھر کی مالک ہے اور میں کچھ بھی نہیں تو میں خاموش ہو گئی۔"

چچا عثمان علی نرم پڑ گئے۔ پوچھا۔ "آپ نے یہاں کیا کیا دیکھا؟"

پھوپھی نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور کہا۔ "اللہ میری توبہ۔ غیر مردوں سے کہیں اس طرح باتیں کی جاتی ہیں جس طرح کلثوم اس سے کرتی تھی۔ اس نے تو بس حد ہی کر دی۔ اللہ میری توبہ۔"

چچا عثمان علی کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا! انھوں نے پھوپھی سے کہا۔ "ذرا کلثوم کو یہیں بلوا بھیجیے اور اس کے ساتھ ہی ابراہیم کو بھی یہیں لے آئیے۔"

پھوپھی دونوں کو بلانے چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئیں۔ کلثوم نے چچا کو سلام کیا، جس کا جواب سرد مہری سے دیا گیا۔ چچا عثمان علی کلثوم سے نظریں نہیں ملا رہے تھے، انھوں نے پوچھا۔ "کلثوم کیا میں نے اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھا؟"

کلثوم نے جواب دیا۔ "کون کہتا ہے کہ آپ نے اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھا؟"

چچا نے کہا۔ "کیا میں نے اپنے مرحوم بھائی کے بعد تم سب کو اپنی اولاد کی طرح نہیں رکھا؟"

کلثوم نے پھر وہی جواب دیا۔ "کون کہتا ہے، میں نے تو ایسی کوئی بات کی نہیں۔"

چچا نے جھنجھلائے لہجے میں کہا۔ "کلثوم! تو جھوٹی ہے، میں حمید سے نفرت کرتا ہوں مگر تو نے اسے اپنے گھر میں ٹھہرایا اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ میں جانتا ہوں کلثوم! وہ تیرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اور وہ اس سے پہلے بھی یہاں رہ چکا تھا لیکن ٹھہرانے سے پہلے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ وہ اس گھر کا کچھ بھی نہیں، ہاں تیری ماں کی ایک خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی۔ انھیں حمید سے بڑی دلچسپی تھی مگر وہ بھی اتنی ہمت نہیں کر سکیں کہ میری مرضی کے خلاف حمید کو

اپنا داماد بنا لیتیں۔"

کلثوم نے بڑی ہمت سے کام لیا، بولی: "حمید نے ہماری جانیں بچائی تھیں اور ہم لٹنے سے محفوظ رہے تھے اب کیا ہم اسے دھتکار کر احسان فراموشوں میں شامل ہو جائیں؟"

چچا عثمان علی کو یہ امید نہیں تھی کہ کلثوم یوں مقابلے پر آجائے گی۔ اُسے غصّہ تو بہت آیا، مگر ضبط و تحمل سے کام لیا۔ کلثوم کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی۔ بولا: "کلثوم! میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں بھائی عنایت علی کی موت کا بدلہ شیر خان سے ضرور لوں گا، اور اگر ہم خود انتقام نہ لے سکے تو کسی اور سے یہ کام کرا لیں گے چنانچہ میں اپنی یہ قسم پوری کر کے رہوں گا۔ اگر تجھے اپنے مرحوم باپ سے ذرا بھی محبت ہوگی تو تو اس میں میرا ساتھ دے گی۔"

کلثوم نے جواب دیا: "لیکن عمِ محترم! اللہ معاف کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔"

چچا عثمان علی نے جب یہ دیکھا کہ کلثوم کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تو انھوں نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ بولا: "میں نے عبداللہ خان کو تیری ماں کی موت کی خبر دے کر حمید کے پاس بھیجا تھا۔ عبداللہ خان تجھ سے شادی کا خواہش مند ہے میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ کسی طرح شیر خان کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو میں بھی اس کی خواہش پوری کر دوں گا۔ جب تک عبداللہ واپس نہیں آ جاتا میں حمید کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

ابراہیم نے پوچھا: "لیکن عمِ محترم! کیا آپ کو امید ہے کہ عبداللہ خان اتنا بڑا کام انجام دے لے گا؟"

چچا نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ کلثوم بول اٹھی: "شادی مجھے کرنی ہے میں عبداللہ خان کو نہیں جانتی۔ اگر وہ آپ کی خواہش پوری بھی کر دے گا تو بھی میں آپ کے عہد کی پابندی نہیں کروں گی۔ میں نے اپنے باپ کا خون معاف کیا۔"

چچا عثمان ایک دم بگڑ گئے۔ چیخ کر بولے: "تو کون ہوتی ہے اپنے باپ کا خون معاف کر دینے والی۔ ابراہیم نے تو معاف نہیں کیا جو عنایت علی کا بیٹا ہے اور خود میں نے تو معاف نہیں کیا کیونکہ میں مرحوم کا بھائی ہوں۔"

ابراہیم نے بھی اپنی بہن کا ساتھ دیا۔ بولا: "عمِ محترم! میں نے بھی اپنا خون معاف کیا کیونکہ میں اپنی بہن کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔"

چچا عثمان علی بے بس اور مجبور ہو چکے تھے لیکن ہتھیار ڈال دینا اُن کے اصول اور مسلک کے خلاف تھا۔ چنانچہ انھوں نے نرمی کو ترک اور سختی کو اختیار کیا۔ بولے: "تب پھر مجھے بھی کچھ سوچنا پڑے گا جب تم لوگ میرے وفادار نہیں ہو تو میں وفاداری کیوں اختیار کروں اب میں بھی تم دونوں سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔ اپنی زمینوں کی

مس جینیس نے اپنے ایک طالب علم کے بارے میں اُس کی ماں کو ایک مختصر سا رقعہ بھیجا جس پر تحریر تھا: "محترمہ! عامر کے جسم سے بدبو آ رہی ہے از راہِ کرم اسے اچھی طرح نہلا دھلا کر پڑھنے بھیجا کریں۔"

دوسرے دن مس جینیس کو طالب علم کی والدہ کا رقعہ موصول ہوا اُس نے لکھا تھا "میرا بیٹا عامر گلاب کا پھول نہیں ہے اُسے سونگھو نہیں بلکہ تعلیم دو۔"

دیکھ بھال تم خود کرو گے۔"

ابراہیم نے پوچھا: "لیکن عمِ محترم! یہ کیوں؟"

چچا عثمان علی نے جواب دیا: "آج تم دونوں کی باتوں نے میرا دل توڑ دیا ہے میں تم دونوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ جو کر سکتا ہوں وہ یہی ترکِ تعلق ہے کلثوم نے اپنی راہ کا جو انتخاب کیا ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں اور جب ہم دونوں کے درمیان کا اتفاق اور اعتماد ہی اٹھ گیا تو پھر یہ گاڑی کس طرح چلے گی۔ کسی طرح بھی نہیں۔"

چچا عثمان کی یہ دھمکی کام کر گئی، ابراہیم نے کہا: "عمِ محترم! آپ یہ کام میرے سپرد کر دیں میں حمید کے ساتھ شیر خان کے پاس جاؤں گا اور موقع پا کر اپنے باپ کا بدلہ لے لوں گا میرے باپ کا بدلہ کوئی اور کیوں لے؟"

چچا عثمان علی نے جواب دیا: "ابراہیم! حمید کی شائستہ شخصیت ہے وہ نہ تو خود ایسا کرے گا اور نہ کسی اور کو ایسا کرنے دے گا۔"

کلثوم نے اُن کی باتوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی اور ان سب کو باتیں کرتا چھوڑ کر باہر نکل گئی، جاتے جاتے کہتی گئی: "آپ لوگ جو چاہیں کریں یہ ساری تخریبی باتیں ہیں گھروں کو اجاڑنے اور برباد کرنے والی باتیں۔ پہلے تو صرف میرا باپ مارا گیا تھا اب ایسا لگتا ہے بھائی ابراہیم بھی واپس نہیں آئیں گے۔"

چچا عثمان علی نے کلثوم کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے: "کلثوم۔ کلثوم۔ میری بات تو سن۔ کہاں چلی؟"

جب وہ کلثوم کے پیچھے کمرے سے باہر نکلا، اس نے باہر حمید کو کھڑے دیکھا شاید وہ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ چچا عثمان علی کا اچانک آمنا سامنا جو ہوا تو وہ گھبرا گئے اس گھبراہٹ میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی، وہ کلثوم کو تو بھول گئے۔ حمید پر برس پڑے: "جب سے تو ہمارے خاندان میں آیا ہے ہم سب کا سکھ چین غارت کر دیا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ آخر تو چاہتا کیا ہے؟"

حمید نے جواب دیا۔ "میں واپس جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ایک ہنستا کھیلتا خاندان جہنم کدہ بن جائے۔"

چچا عثمان علی حمید کو مکان کے باہر باغیچے میں لے گئے۔ یہ باغیچہ مکان سے قدرے فاصلے پر عام پگڈنڈی سے ملحق واقع تھا۔ اس میں آم، جامن، املی، کمرکھ، پپیتے، بیل، لیموں اور کروندے کے درختوں کی کثرت تھی۔ باغیچے کی فضا میں انواع و اقسام کی ملی جلی خوشبو میں لیموں کی ترش خوشبو سب پر غالب آگئی تھی۔ یہ باغیچہ چچا عثمان علی کا تھا۔ وہ اس باغیچے میں کمرکھ کے درخت تلے سبزے پر بیٹھ گئے۔ اب اُن کا رویہ بہت نرم ہوچکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی تلخی اور ترشی کو گھر ہی میں چھوڑ آئے ہوں۔ انھوں نے حمید کو سبزے پر بٹھالیا، بولے۔ "حمید! میں تیرا احسان مند ہوں کیونکہ تو نے ایک بار ہمارے خاندان کو موت اور بربادی سے بچایا تھا۔ کلثوم سمجھتی ہے کہ میں بے حس اور احسان فراموش انسان ہوں لیکن ایسا نہیں ہے۔۔۔۔"

حمید نے بات کاٹ دی۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ "صرف یہ کہ تو کلثوم کا پیچھا چھوڑ دے اور جہاں سے آیا ہے وہیں واپس چلا جا۔"

حمید نے جواب دیا۔ "میں چلا جاؤں گا لیکن جب تک آپ مجھے صاف صاف یہ نہ بتائیں کہ آپ مجھ سے بیزار کیوں ہیں، میں نہیں جاؤں گا۔"

چچا عثمان نے جواب دیا۔ "بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تیرے خاندان سے واقف نہیں ہوں تو کہتا ہے کہ لودھی خاندان کا آخری فرماں روا ابراہیم لودھی تیرا چچا تھا مگر میں کس طرح یقین کرلوں، اس کا کوئی ٹھوس ثبوت تو پیش کر ورنہ میں ایک گمنام خاندان کے نوجوان کو اپنا داماد نہیں بنا سکتا۔"

حمید نے کہا۔ "میں جو کچھ ہوں آپ کو بتا چکا ہوں کیا میرے عادات و اطوار میرے قول کی گواہی نہیں دیتے؟"

چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ کوئی ثبوت کوئی شہادت؟"

حمید نے کہا۔ "اس کے علاوہ کوئی ثبوت کوئی شہادت نہیں۔"

چچا عثمان نے کہا۔ "تب پھر تو آگرے واپس چلا جا ہمارا پیچھا چھوڑ دے۔"

حمید نے جواب دیا۔ "میں اس طرح نہیں جاؤں گا، اور وہ شرط! شیر خان والی! اُس کا کیا ہوگا؟"

چچا عثمان علی نے کہا۔ "شیر خان والی شرط تو اس لیے رکھ دی گئی تھی کہ نہ تو وہ پوری کرے گا اور نہ کلثوم تیرے حوالے کی جائے

حمید نے نہایت مضبوط لہجے میں کہا۔ "کلثوم مجھ سے محبت کرتی ہے میں اُسے اس جہنم میں نہیں رہنے دوں گا۔"

چچا عثمان علی ایک دم کھڑے ہوگئے۔ اُن کی پیشانی غصے کی شکنوں سے پُر تھی، انھوں نے کہا۔ "حمید! یہ کام اتنا آسان بھی نہیں جتنا تو سمجھ رہا ہے میں تیرا ہر قدم، ہر در، ہر گھر، ہر گلی، ہر موڑ اور ہر چوراہے پر مقابلہ کروں گا اور یہ ثابت کردوں گا کہ تو نے ہمیں جتنا کمزور سمجھ رکھا ہے ہم اتنے کمزور نہیں ہیں۔ ہم ہتھیاروں سے، باتوں سے، دلیلوں سے، دولت سے، وسائل سے، ہر طرح ہر ذریعے سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔"

حمید نے حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔ "تو یہ بات ہے؟ آپ مجھ سے مقابلہ کریں گے؟"

چچا عثمان علی نے جواب دیا۔ "ہاں، میں تجھ سے مقابلہ کروں گا۔"

حمید نے پوچھا۔ "تو پھر دیر کس بات کی؟ یہ مقابلہ جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے، آج ہی، اسی وقت۔"

چچا عثمان علی کا غصے سے چہرہ سرخ ہوگیا، بولے۔ "تو یہیں موجود رہے گا۔ میں دو ڈھالیں اور تلواریں لے کر ابھی واپس آتا ہوں ہم دونوں یہیں اسی باغیچے کے سبزہ زار پر آج یہ فیصلہ کریں گے، کہ کلثوم کے پاس کسے رہنا ہے۔"

چچا عثمان علی سیدھے گھر گئے اور دو ڈھالیں، دو تلواریں اور دو نیزے لے کر حمید کے پاس پہنچ گئے۔

حمید نے ایک ڈھال، ایک تلوار، اور ایک نیزہ چچا عثمان سے لے کر مقابلے کی دعوت دے دی۔

وہ دونوں باغیچے ہی کے سبزہ زار پر مقابلہ کے لیے کھڑے ہوگئے۔ چچا عثمان علی کو اپنی شمشیر زنی پر بڑا ناز تھا، ان کا خیال تھا کہ حمید کو زیر کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

چچا عثمان علی مسکرا رہے تھے، بولے۔ "لوگ میری تلاش میں یہاں تک آئیں، میں چاہتا ہوں اس سے پہلے ہی جو ہونا ہے ہو جائے۔"

حمید نے جواب دیا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

چنانچہ دونوں شمشیریں سونت کر ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ شمشیریں نیام سے نکلیں، بجلیاں سی کوندنے لگیں اور دونوں ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد چچا عثمان علی کے ہاتھ سے شمشیر چھوٹ کر دور جا گری۔ حمید نے آگے بڑھ کر شمشیر کی نوک چچا کے پیٹ پر رکھ دی مگر اسے دبایا نہیں، اس نے کہا۔ "چچا عثمان علی! اگر میں چاہوں تو اسی وقت آپ کا کام تمام کردوں۔"

چچا عثمان علی پر شکست کی خجالت اور شرمندگی طاری تھی،

روہانسی آواز میں کہا "حمید! مجھے قتل کر دے تاکہ میں کئی ندامتوں سے پیچھا چھڑاؤں۔"

حمید نے شمشیر کی نوک چچا عثمان علی کے پیٹ پر سے ہٹالی، کہا "نہیں، میں آپ کو ماروں گا نہیں۔ آپ نے میری خاندانی وجاہت پر شبہ کیا لیکن میں نے اسے ثابت کر دیا۔ اٹھیے اور میری مخالفت ترک کر دیجیے۔ اس طرح میں یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو شیر شاہ کو بھی ہلاک کر دوں لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔"

چچا عثمان علی خاموش تھے گویا ان کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔

جب دونوں گھر واپس جا رہے تھے تو انھیں راستے میں ابراہیم مل گیا۔ وہ دونوں کو تلاش کر رہا تھا جب اس نے انھیں ڈھالوں شمشیروں اور تیروں سمیت اپنی طرف آتے دیکھا تو چکرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا تھا؟

حمید نے گھر کے دروازے پر کلثوم کو کھڑے دیکھا۔ اس نے ان دونوں کو اس حال میں دیکھا تو مجسم سوال بن گئی۔ حمید نے اپنا سامان سنبھالا اور کلثوم سے کہا "کلثوم! میں جا رہا ہوں تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرا انتظار کرے گی اپنے اس وعدے پر قائم رہنا میں واپس ضرور آؤں گا۔" پھر چچا عثمان علی سے کہا "اور اب آپ خاموش رہیں گے کیونکہ اگر میں چاہتا تو آپ کو قتل کر دیتا مگر میں نے آپ کو معاف کر دیا، صرف اس خیال سے کہ آپ کلثوم کے چچا ہیں، اور میں لودھی خاندان کا ایک شہزادہ۔"

یہ سب کیا ہو گیا تھا اور کیا ہو رہا تھا، نہ ابراہیم سمجھ سکا، نہ کلثوم۔ کلثوم کے پیچھے زینب کھڑی تھی، وہ بھی مجسم سوال بنی ہوئی تھی۔

حمید جوش اور جذبے سے سرشار کلثوم، زینب اور ابراہیم کو محو حیرت چھوڑ کر آگے چلا گیا۔ چچا عثمان کو سکوت نے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ابراہیم اور کلثوم نے بار بار یہ معلوم کرنا چاہا کہ حمید اور ان میں کیا واقعات اور حالات پیش آئے جو وہ بالکل چپ گم صم ہو کر رہ گئے ہیں۔ چچا عثمان بالکل بدل چکے تھے۔ انھوں نے اپنا سکوت توڑا تو ان میں یہ حیرت انگیز تبدیلی پائی گئی کہ وہ نہ تو حمید کی مخالفت کرتے تھے اور نہ ہی حمایت۔ انھوں نے کلثوم پر بھی دباؤ ڈالنا چھوڑ دیا۔



وہ آگرے پہنچا اور شیر شاہ کے دربار میں حاضری دی۔ شیر شاہ اس کی گمشدگی سے فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ شیر شاہ کی مہمات میں ادھر ادھر دوڑتا بھاگتا رہا۔ وہ کئی سال جنگوں میں الجھا رہا۔ حمید اس کے ساتھ ساتھ رہا لیکن اس دوران ملاقاتیں بہت کم ہو گئیں۔

اسی دوران شیر شاہ نے کالنجر کا رخ کیا، کالنجر کا قلعہ اپنی مضبوطی کے لیے بہت مشہور تھا۔ جب وہ اس مہم پر جا رہا تھا تو اس نے حمید کو طلب کیا۔ اس نے حمید کو کئی ماہ بعد دیکھا تھا، دیکھتے ہی پوچھا "حمید! تو کہاں رہتا ہے؟ مجھ سے ملاقات کیوں نہیں ہوتی؟"

حمید نے جواب دیا "اب آپ جہاں پناہ ہو گئے ہیں میں آپ کا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا۔"

شیر شاہ نے کہا "تو نے مجھ سے جاگیر وغیرہ بھی نہیں لی آخر کیوں؟"

حمید نے جواب دیا "میں جاگیر لے کر کیا کروں گا؟ اکیلا آدمی۔ جو وقت آپ کی صحبت میں گزر جائے میرے لیے بہت قیمتی اور یادگار ہے۔"

شیر شاہ مسکرایا اور کہا "اب تو لڑکیاں اپنے عاشقوں سے مہر میں میرا سر مانگتی ہیں۔"

حمید گھبرا گیا، حیرت سے پوچھا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

شیر شاہ نے حکم دیا "اس شخص کو حاضر کیا جائے جس نے کل نماز کی حالت میں مجھے قتل کر دینا چاہا تھا۔"

جب یہ شخص سامنے لایا گیا تو حمید نے اسے پہچان لیا۔ عبداللہ خان تھا۔ حمید گھبرایا کہ کہیں یہ جاہل اور اجڈ انسان اس سلسلے میں اس کا نام نہ لے۔

شیر شاہ نے اس شخص سے پوچھا "سچ سچ بتا کہ تو مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟"

عبداللہ خان نے جواب دیا "بادشاہ سلامت! سچی بات تو یہ ہے کہ میں جس لڑکی سے محبت کرتا ہوں اس کا چچا آپ کا بدترین دشمن ہے، اس نے کہا تھا کہ میں اس شرط پر اپنی بھتیجی کی شادی تجھ سے کروں گا کہ تو اس کے سامنے شیر شاہ کا سر پیش کرے گا۔"

عبداللہ خان ذرا بھی نہیں ہچکچا رہا تھا۔

شیر شاہ نے کہا "جب میں مروں گا تو اپنے ورثا کو ہدایت کر جاؤں گا کہ وہ میرا سر کاٹ کر تیرے حوالے کر دیں، تاکہ تجھے تیری محبوبہ مل جائے۔" پھر حمید سے پوچھا "اور تو نے بھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے اس لڑکی نے تجھ سے کیا چیز مانگی تھی مہر میں؟"

حمید بہت گھبرایا ہوا تھا، بولا "اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔"

شیر شاہ نے جواب دیا "تو شریف لگتی ہے شاید۔"

شیر شاہ نے حملہ آور کو چھوڑ دیا اور کہا "جا، اور میری موت کا انتظار کر۔"

وہ شخص فوراً فرار ہو گیا۔

یہاں سے شیر شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کالنجر روانہ ہو گیا۔ کئی دن بعد وہ کالنجر کے قلعے کے سامنے نمودار ہوا۔ وقت ضائع کیے بغیر قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا، سرنگیں کھودنے کا حکم دیا۔ ایک طرف قلعے

کی دیوار کے نیچے بارود کا ذخیرہ رکھا ہوا تھا۔ شیر شاہ اپنے گھوڑے پر سوار ادھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ وہ قلعے کے کمزور حصے کو تلاش کر رہا تھا۔

حمید اُس کے بارودی ذخیرے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

سارا دن یونہی گزر گیا، اور رات خیموں میں بسر کی۔

دوسرے دن علی الصبح شیر شاہ بیدار ہوا، وضو کیا، نماز پڑھی اور اس کے بعد اس نے لوگوں کو حاضری کا حکم دیا۔ جب لوگ اس کو سلام کرتے تو وہ کہتا: "کوئی اور ہے یا بس؟ کسی کو مجھ سے کچھ مانگنا ہے؟"

کسی نے عرض کیا: "میں کئی سال سے اپنے گھر نہیں گیا مجھے چھٹی دی جائے۔"

شیر شاہ نے اس کی تحقیقات کرائی جب یہ جان لیا کہ وہ سچا ہے تو عین محاذِ جنگ پر چھٹی دے دی۔

وہ دیر تک اسی طرح پوچھتا رہا اور دیتا رہا۔ آخر میں پوچھا "حمید لودھی کہاں ہے؟ اس کو حاضر کیا جائے۔"

لوگ حمید کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگے جب حمید کو شیر شاہ کے سامنے لایا گیا تو شیر شاہ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور بقیہ کو رخصت کر دیا، اس کے بعد شیر شاہ نے حمید سے پوچھا۔

"تو کئی سال سے اپنے گھر نہیں گیا، آخر کیوں؟"

حمید نے جواب دیا: "میرا کوئی گھر نہیں بندہ پرور! پھر میں کہاں جاؤں؟"

شیر شاہ اسے دیکھتا رہا: "وہ لڑکی تو تیرا انتظار کر رہی ہوگی؟"

حمید نے بڑے کرب سے جواب دیا: "میرا کوئی بھی انتظار نہیں کر رہا ہوگا بندہ پرور!"

شیر شاہ نے کہا: "تو نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے حمید! میں نے ٹانڈہ خواص پور کی جاگیر تیرے نام کر دی تو اگر جانا چاہے تو ابھی وقت جا سکتا ہے۔"

حمید نے ازراہِ اخلاق کہا: "میں اپنی پوری زندگی آپ کی خدمت میں گزار دینا چاہتا ہوں جہاں پناہ!"

شیر شاہ نے کہا: "جہاں پناہ نہیں شیر خان کہہ حمید لودھی! میں تیرے لیے اب بھی شیر خان ہوں حمید!"

حمید نے نہایت عقیدت اور محبت سے شیر شاہ کی شکل دیکھی اور اپنا سر جھکا لیا۔

شیر شاہ نے کہا: "اچھا کالنجر کا قلعہ سر کرنے کے بعد میں خود ٹانڈہ جاؤں گا اور تیرا قصہ نمٹا دوں گا۔"

ربیع الاول کی نو تاریخ تھی اور جمعہ کا دن۔ شیر شاہ نے دوپہر کا کھانا چند علماء اور فضلاء کے ساتھ کھایا ان میں حمید لودھی بھی شامل تھا۔ شیر شاہ کھانے کے دوران جہاد کے فضائل بیان کرتا رہا۔ اس نے کہا "اگر مسلمان زندہ بچ جائے تو غازی اور مارا جائے تو شہید کہلاتا ہے، اس سے بہتر سودا اور کیا ہو سکتا ہے؟"

علماء نے اس کی تائید کی اور اس سلسلے کے چند اثر انگیز واقعات بھی سُنائے حاضرین پر رقت طاری ہو گئی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شیر شاہ نے پوچھا "دریا خان سروانی کہاں چلا گیا؟"

دریا خان سروانی حمید کے پیچھے کھڑا تھا وہیں سے آواز دی: "بندہ حاضر ہے۔"

شیر شاہ نے پوچھا: "بانوں کا ذخیرہ کہاں ہے؟"

دریا خاں سروانی شیر شاہ کو بانوں کے ذخیرے کے پاس لے گیا۔ شیر شاہ اس بارودی ذخیرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور حکم دیا: "انہیں آگ دکھا کر قلعے کے اندر پھینکا جائے۔"

حکم کی تعمیل کی گئی اور بان قلعے کے اندر پھینکے جانے لگے۔ دوسری طرف سے مسلمان سرنگوں کے ذریعے قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

شیر شاہ دیدبان پر چڑھ گیا۔ یہاں سے کالنجر کے قلعہ کے اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا قلعے کے اندر لوگ ادھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔

شیر شاہ دیدبان سے نیچے آیا اور بارودی بانوں کو اپنی مرضی سے قلعے کے اندر پھینکنے لگا اسی دوران ایک گولہ قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر بارودی ذخیرے پر گرا آگ بھڑک اٹھی اور گولے پھٹنے لگے۔

شیر شاہ اپنے رفقاء کے ساتھ بارودی ذخیرے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ شعلوں نے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اس کے ساتھی اس بُرے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے شیر شاہ گر گیا۔ چند جاں نثاروں نے اسے کھینچ کر دور کیا۔ لوگوں نے پاس ہی ایک چھوٹا سا ڈیرہ لگایا۔

شیر شاہ جھلس کر سیاہ پڑ چکا تھا وہ اچانک اٹھا اور دوڑتا ہوا ڈیرے میں داخل ہو گیا اور پھر بے ہوش ہو کر گر گیا۔ حمید چند خدمت گزاروں کے ساتھ ڈیرے میں داخل ہوا تو شیر شاہ کو کسی قدر ہوش آ چکا تھا، چیخ کر حکم دیا: "یہاں کیا لینے آئے ہو جاؤ اور قلعے کو سر کرو۔"

خیمے میں موجود لوگ باہر چلے گئے اور شیر شاہ کے حکم کی تعمیل میں جوش و خروش سے لڑنا شروع کر دیا۔

اس دن گرمی بھی بہت زیادہ تھی۔ اطباء نے اس کے جسم پر صندل اور گلاب کا لیپ کیا وہ بے چینی سے اطباء سے پوچھتا رہا: "قلعہ کا کیا ہوا، سر ہوا یا نہیں؟ یہ دیر کیوں لگ رہی ہے؟"

کچھ دیر بعد عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ چند امراء دوڑتے ہوئے

شیر شاہ کے پاس پہنچے اور خوشخبری سنائی۔ "قلعہ فتح ہو گیا، قلعہ سر کر لیا گیا۔"

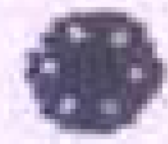
شیر شاہ نے فتح کی خوشخبری کو مسکراتے ہوئے سنا اور بے ہوش ہو گیا، وہ پوری رات بے ہوش رہا دوسرے دن ربیع الاول کی دس تاریخ تھی شیر شاہ اب بھی زندہ تھا اور ہوش میں آ چکا تھا۔ اس عالم میں اس نے حمید کو طلب کیا۔ جب حمید اس کے پاس بیٹھ گیا تو شیر شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے کان کو قریب لانے کا حکم دیا۔ شیر شاہ کا چہرہ کافی سوج چکا تھا جس سے وہ بھیانک ہو گیا تھا۔

حمید نے اپنا کان شیر شاہ کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

شیر شاہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا "حمید لودھی! جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے ٹانڈے واپس جاؤ اور اپنی محبوبہ کو یہ خوشخبری سنا دو کہ شیر شاہ کو میں نے ایک سازش کے ذریعے ہلاک کر دیا۔"

حمید چیخ مار کر رو دیا۔ اس سے بولا نہیں جاتا تھا۔

شیر شاہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ طبیبوں نے بڑی کوشش کی مگر وہ اسے بچا نہیں سکے آخر آدھی رات کو یہ برق خاطف اندھیروں میں ڈوب گئی۔



شیر شاہ کی لاش کو اس کی آبائی جاگیر سسرام لے جایا گیا اور وہاں ایک تالاب کے بیچ میں اس کی ابدی آرام گاہ تیار کی گئی، اتنی شاندار کہ بعض مورخین نے اسے آگرے کے تاج محل پر ترجیح دی۔

بھورے پتھر کی یہ عمارت مردانہ طاقت اور ابدی سکون کی آئینہ دار ہے۔

حمید جاگیر کے کاغذات لے کر ٹانڈے چلا گیا۔ اس کا دل ٹوٹا ہوا تھا اور جسم بوجھل تھا اس کا گھوڑا بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ٹانڈے کے گلی کوچوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آج بھی سالوں پہلے جیسے تھے۔

جب اس نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی تو اندر سے ابراہیم کا چہرہ نمودار ہوا، وہ حمید کو دیکھ کر خوش ہو گیا مگر پھر پیچھے ہی چچا عثمان علی نے دور سے پوچھا "کون ہے؟" تو ابراہیم کی خوشی کافور ہو گئی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حمید اندر داخل ہوا تو سامنے سے چچا عثمان علی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ چند سالوں میں کچھ زیادہ ہی بوڑھے ہو گئے تھے۔ انھوں نے حمید کا نہایت جوش و خروش سے استقبال کیا۔ حمید کی نظریں کلثوم کو تلاش کر رہی تھیں۔

چچا عثمان علی نے زور زور سے آوازیں دینی شروع کر دیں "ارے کلثوم بیٹی تو کہاں چلی گئی دیکھ تو سہی یہ کون آیا ہے؟"

ایک کمرے سے کلثوم نمودار ہوئی اور آہستہ آہستہ چچا عثمان علی کی طرف بڑھی وہ ابھی تک حمید کو نہیں دیکھ سکی تھی کیونکہ حمید دالان کے ایک ستون کی آڑ میں کھڑا تھا۔

چچا عثمان علی نے حمید کو شانوں سے پکڑ کر کلثوم کے سامنے کر دیا۔ "دیکھ تو سہی یہ کون آ گیا؟"

کلثوم نے حمید کو دیکھا تو شرما گئی۔ اس کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ مارے خوشی کے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

چچا عثمان علی ان دونوں کو ایک کمرے میں لے گئے اور اپنے ہاتھوں سے بستر ٹھیک کر کے اس پر حمید کو بٹھا دیا، بولے۔ "حمید لودھی! مجھے یقین تھا تم ایک نہ ایک دن ضرور آؤ گے۔ سو میرا خیال درست نکلا۔" پھر ابراہیم سے کہا "یہ تو کھڑا کیا دیکھ رہا ہے جا حمید کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر۔"

حمید حیران تھا کہ اتنے سالوں میں چچا عثمان علی کتنے بدل گئے ہیں۔ سرہانے حمید بیٹھا تھا اور پائنتی کلثوم۔ کلثوم بیٹھی رو رہی تھی۔

حمید نے ٹانڈے کی جاگیرداری کے کاغذات چچا عثمان علی کے حوالے کر دیے۔

چچا عثمان علی نے اعلان کر دیا "حمید ٹانڈے میں اس مرد کی قدر کرتا ہوں۔"

چند دنوں بعد چچا عثمان علی نے ان دونوں کی شادی کر دی۔

شادی کے کئی دن بعد چچا عثمان علی حمید کو ایک طرف لے گئے اور سرگوشی میں سوال کیا "حمید! مجھے ایک سوال نے پریشان کر دیا ہے، اس سوال کا جواب تیرے علاوہ کوئی اور نہیں دے سکتا۔"

حمید نے کہا "پوچھیے کون سا سوال ہے؟ اگر میرے پاس اس کا جواب ہے تو میں ضرور دوں گا۔"

چچا عثمان علی نے پوچھا "یہ شیر شاہ کیسا آدمی تھا، اس نے اپنے قاتل کو ٹانڈے کی جاگیر بخش دی۔"

حمید نے تڑپ کر پوچھا "چچا عثمان علی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

چچا عثمان علی نے جواب دیا "مجھ سے چھپانا بے کار ہے کیونکہ مجھے سب کچھ پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ کیا بارود والی سازش میں تیرا ہاتھ نہیں تھا؟"

حمید نے محسوس کیا، جلے جھلسے بھیانک چہرے والے شیر شاہ نے اپنے ہونٹوں کو اس کے کان پر رکھ دیا ہے اور کہہ رہا ہے "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے ٹانڈے واپس جاؤ اور اپنی محبوبہ کو یہ خوشخبری سنا دے کہ شیر خان کو ایک سازش کے ذریعے میں نے ہلاک کر دیا۔"

اب حمید سمجھ چکا تھا کہ چچا عثمان علی اس سے اتنے خوش کیوں تھے حمید کی ساری خوشی ختم ہو گئی تھی۔ وہ خود کو دنیا کا بدترین انسان سمجھ رہا تھا، بدترین گناہگار جس نے کوئی گناہ کیا تو نہیں تھا مگر ایک وہ گناہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے سرنگوں کر گیا۔